

پیش لفظ

پیر کاہل علیہ السلام کو میں نے آپ کے لئے لکھا ہے۔ آپ سب کی زندگی میں آنے والے اُس موڑ کے لئے، جب روشنی یا تاریکی کے انتخاب کا فیصلہ ہم پر چھوڑ دیا جاتا ہے، ہم چاہیں تو اس راستے پر قدم بڑھادیں جو روشن ہے اور چاہیں تو تاریکی میں داخل ہو جائیں۔

روشنی میں ہوتے ہوئے بھی انسان کو آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔ اگر وہ ٹھوکر کھائے بغیر زندگی کا سفر طے کرنا چاہتا ہے تو تاریکی میں داخل ہونے کے بعد آنکھیں کھلی رکھیں یا بند کوئی فرق نہیں پڑتا، تاریکی ٹھوکر دے گا تو تاریکی میں قدم دھرنے کے بعد ٹھوکر لگنے سے پہلے ہی انسان کو بچھٹا دے گا۔

مگر بعض دفعہ تاریکی میں قدم دھرنے کے بعد ٹھوکر لگنے سے پہلے ہی انسان کو بچھٹا دے گا۔ وہ داپس اُس موڑ پر آنا چاہتا ہے جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ تب صرف ایک چیز اس کی مدد کر سکتی ہے، کوئی آواز جو رہنمائی کا کام کرے اور انسان اطاعت کے علاوہ کچھ نہ کرے۔

پیر کاہل علیہ السلام وہی آواز ہے، جو انسان کو تاریکی سے روشنی تک لاسکتی ہے اور لاتی ہے۔ اگر انسان روشنی چاہے تو ”یقیناً ہدایت انہیں کو دی جاتی ہے جو ہدایت چاہتے ہیں۔“ آئیے ایک بار پھر پیر کاہل علیہ السلام کو سنیں!

باب ۱



”میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟“ ہاں پوچھتے ہو تو ان میں سے دو سوچ میں پڑ گئی ہوں
ایک لباس لے لیتے ہوئے قدرے بے بسی سے مسکرائی۔
”بہت مشکل ہے اس سوال کا جواب دینا۔“
”کیوں مشکل ہے؟“ جو یہ نے اس سے پوچھا۔
”کیونکہ میری بہت ساری خواہشات ہیں اور ہر خواہش ہی میرے لئے بہت اہم ہے۔“ اس نے
سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں آڈیو ریم کے مقبی حصے میں دھار کے ساتھ زمین پر ٹپک لگائے بیٹھی تھیں۔
ایک ایسی سی کلاسز میں آج ان کا آٹھواں دن تھا اور اس وقت وہ دونوں اپنے فری ہیریڈ میں
آڈیو ریم کے مقبی حصے میں آکر بیٹھ گئی تھیں۔ لیکن مومک پھلی کے دانوں کو ایک ایک کر کے کھاتے

ہوئے جو یہ نے اس سے پوچھا۔

"تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے امام؟"

امام نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی۔

"پہلے تم بتاؤ، تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟" امام نے جواب دینے کے

بجائے اٹلا سوال کر دیا۔

"پہلے میں نے پوچھا ہے، تمہیں پہلے جواب دینا چاہئے۔" جو یہ نے گردن ہلائی۔

"اچھا..... ٹھیک ہے..... مجھے اور سوچنے دو۔" امام نے فوراً ہار مانتے ہوئے کہا: "میری زندگی کی

سب سے بڑی خواہش؟" وہ بڑبڑائی۔ "ایک خواہش تو یہ ہے کہ میری زندگی بہت لمبی ہو۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟" جو یہ فیسی۔

"بس پچاس، ساٹھ سال کی زندگی مجھے بڑی چھوٹی لگتی ہے..... کم سے کم سو سال تو ملنے چاہئیں

انسان کو دنیا میں..... اور پھر میں اتنا سب کچھ کرنا چاہتی ہوں..... اگر جلدی مری جاؤں گی تو پھر میری

ساری خواہشات اذھوری رہ جائیں گی۔" اس نے مونگ پھلی کا ایک دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا اور.....؟" جو یہ نے کہا۔

"اور یہ کہ میں ملک کی سب سے بڑی ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں..... سب سے اچھی آئی سیٹلسٹ۔

میں چاہتی ہوں جب پاکستان میں آئی سرجری کی تاریخ لکھی جائے تو اس میں میرا نام ٹاپ آف والٹ

ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے آسمان کو دیکھا۔

"اچھا اور اگر کبھی تم ڈاکٹر نہ بن سکیں تو.....؟" جو یہ نے کہا: "آخر یہ میرٹ اور قسمت کی بات

ہے۔"

"ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ میں اتنی محنت کر رہی ہوں کہ میرٹ پر ہر صورت آؤں گی۔ پھر میرے

والدین کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ میں اگر یہاں کسی میڈیکل کالج میں نہ جا سکی تو وہ مجھے بیرون ملک بھجوا

دیں گے۔"

"پھر بھی اگر کبھی ایسا ہو کہ تم ڈاکٹر نہ بن سکو تو.....؟"

"ہو ہی نہیں سکتا..... یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے میں اس پر ویشن کے لئے سب

کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ یہ میرا خواب ہے اور خوابوں کو بھلا کیسے چھوڑایا بھلا جاسکتا ہے۔ اسپاٹل....."

امام نے قطعی انداز میں سر ہلاتے ہوئے ہتھیلی پر رکھے ہوئے دانوں میں سے ایک اور دانہ منہ

میں ڈالا۔

"زندگی میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا..... کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے، فرض کرو کہ تم ڈاکٹر نہیں بن

پائیں تو.....؟ پھر تم کیا کرو گی.....؟ کیسے ری ایکٹ کرو گی؟" امام اب سوچ میں پڑ گئی۔

"پہلے تو میں بہت روؤں گی۔ بہت ہی زیادہ..... کئی دن..... اور پھر میں مری جاؤں گی۔"

جو یہ یہ بے اختیار ہنسی "اور ابھی کچھ دیر پہلے تو تم یہ کہہ رہی تھیں کہ تم لمبی زندگی چاہتی ہو..... اور

ابھی تم کہہ رہی ہو کہ تم مری جاؤ گی۔"

"ہاں تو پھر زندہ رہ کر کیا کروں گی۔ سارے پلانز ہی میرے میڈیکل کے حوالے سے ہیں..... اور

یہ چیز زندگی سے نکل گئی تو پھر باقی رہے گا کیا؟"

"یعنی تمہاری ایک بڑی خواہش دوسری بڑی خواہش کو ختم کر دے گی؟"

"تم یہی سمجھ لو....."

"تو پھر اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ تمہاری سب سے بڑی خواہش ڈاکٹر بننا ہے، لمبی زندگی پانا

نہیں۔"

"تم کہہ سکتی ہو....."

"اچھا..... اگر تم ڈاکٹر نہ بن سکیں تو پھر مرد کی کیسے..... خودکشی کرو گی یا طبعی موت؟" جو یہ نے

بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"طبعی موت ہی مردوں کی..... خودکشی تو کرسی نہیں سکتی۔" امام نے لا پرواہی سے کہا۔

"اور اگر تمہیں طبعی موت آنے لگی تو..... میرا مطلب ہے جلد نہ آئی تو پھر تو تم ڈاکٹر نہ بننے کے

باوجود بھی لمبی زندگی گزارو گی۔"

"نہیں، مجھے پتا ہے کہ اگر میں ڈاکٹر نہ بنی تو پھر بہت جلد مری جاؤں گی۔ مجھے اتنا دکھ ہو گا کہ میں تو

زندہ رہی نہیں سکوں گی۔" وہ یقین سے بولی۔

"تم جس قدر خوش مزاج ہو، میں کبھی یقین نہیں کر سکتی کہ تم کبھی اتنی دلچسپی ہو سکتی ہو کہ رد و کر

مر جاؤ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ تم ڈاکٹر نہیں بن سکیں۔ look funny۔" جو یہ نے اس بار اس کا

مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔

"تم اب میری بات چھوڑو، اپنی بات کرو، تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟" امام

نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو....."

"کیوں رہنے دوں.....؟ بتاؤ نا؟"

"تمہیں برا لگے گا؟" جو یہ نے کچھ ہنچکاتے ہوئے کہا۔

امام نے گردن موڑ کر حیرانی سے اسے دیکھا۔ "مجھے کیوں برا لگے گا؟"

جو یہ خاموش رہی۔

"اُنہی کیا بات ہے جو مجھے بری لگے گی؟" امامہ نے اپنا سوال دہرایا۔

"بری لگے گی۔" جو یہ نے دم آواز میں کہا۔

"آخر تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کا میری زندگی سے کیا تعلق ہے کہ میں اس پر برا مانوں گی۔" امامہ نے اس بار قدرے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "کہیں تمہاری یہ خواہش تو نہیں ہے کہ میں ڈاکٹر نہ ہوں؟" امامہ کو اچانک یاد آیا۔

جو یہ ہنس دی۔ "نہیں..... زندگی صرف ایک ڈاکٹر بن جانے سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔" اس نے کچھ فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"پہیلیاں بھجوانا چھوڑو اور مجھے بتاؤ۔" امامہ نے کہا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں، میں برا نہیں مانوں گی۔" امامہ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وعدہ کرنے کے باوجود میری بات سننے پر تم بری طرح ناراض ہو گی۔ بہتر ہے ہم کچھ اور بات کریں۔" جو یہ نے کہا۔

"اچھا میں اندازہ لگاتی ہوں، تمہاری اس خواہش کا تعلق میرے لئے کسی بہت اہم چیز سے ہے..... رائٹ.....؟" امامہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا جو یہ نے سر ہلایا۔

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میرے لئے کون سی چیز اتنی اہم ہو سکتی ہے کہ میں..... وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔

"مگر جب تک میں تمہاری خواہش کی نوعیت نہیں جان لیتی، میں کچھ بھی اندازہ نہیں کر سکتی۔ بتا دو جو یہ..... پلیز..... اب تو مجھے بہت سی زیادہ تجسس ہو رہا ہے۔" اس نے منت کی۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ امامہ غور سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی، کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جو یہ نے سر اٹھا کر امامہ کو دیکھا۔

"میرے پروفیشن کے علاوہ میری زندگی میں فی الحال جن چیزوں کی اہمیت ہے وہ صرف ایک ہی ہے اور اگر تم اس کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتی ہو تو کہہ میں برا نہیں مانوں گی۔" امامہ نے سنجیدگی سے کہا۔

جو یہ نے قدرے چونک کر اسے دیکھا، وہ اپنے ہاتھ میں موجود ایک انگوٹھی کو دیکھ رہی تھی۔ جو یہ یہ مسکرائی۔

"میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تم....." جو یہ نے اسے اپنی خواہش بتائی۔

امامہ کا چہرہ یک دم سفید پڑ گیا۔ وہ شاکد خشی یا حیرت زدہ..... جو یہ اندازہ نہیں کر سکی، مگر اس کے چہرے کے تاثرات یہ ضرور بتا رہے تھے کہ جو یہ کے منہ سے نکلنے والے جملے اس کے ہر اندازے کے برعکس تھے۔

"میں نے تم سے کہا تھا تم برا مانو گی۔" جو یہ نے جیسے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی مگر امامہ کچھ کہے بغیر اسے دیکھتی رہی۔

☆.....☆.....☆

معیز مطلق کے مل چلا تا ہوا اور دسے دو ہوا ہو گیا، اس کے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر تھے۔ اس کے سامنے کھڑے بارہ سالہ لڑکے نے اپنی چھٹی ہوئی ٹی شرٹ کی آستین سے اپنی ناک سے بہتا ہوا خون صاف کیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹینس ریکٹ ایک بار پھر پوری قوت سے معیز کی ٹانگ پر دے مارا۔ معیز کے مطلق سے ایک بار پھر چیخ نکلی اور وہ اس بار سیدھا ہو گیا۔ کچھ بے یقینی کے عالم میں اس نے خود سے دو سال چھوٹے بھائی کو دیکھا جو اب بغیر کسی لحاظ اور مرقت کے اسے اس ریکٹ سے پیٹ رہا تھا جو معیز کچھ دیر پہلے اسے پینے کے لئے لے کر آیا تھا۔

اس وقت میں ان دونوں کے درمیان ہونے والا یہ تیسرا جھگڑا تھا اور تینوں بار جھگڑا شروع کرنے والا اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ معیز اور اس کے تعلقات ہمیشہ ہی ناخوشگوار رہے تھے۔

ان کا جھگڑا بچپن سے لے کر اب سے کچھ پہلے تک صرف زبانی کلامی باتوں اور دھمکیوں تک ہی محدود رہتا تھا، مگر اب کچھ عرصے سے دونوں ہاتھ پائی پر بھی اتر آئے تھے۔

آج بھی یہی ہوا تھا وہ دونوں اسکول سے اکٹھے واپس آئے تھے اور گاڑی سے اترتے ہوئے اس کے چھوٹے بھائی نے بڑی درشتی کے ساتھ پیچھے ڈکی سے اس وقت اپنا بیگ کھینچ کر نکالا جب معیز اپنا بیگ نکال رہا تھا۔ بیگ کھینچتے ہوئے معیز کے ہاتھ کو بری طرح رگڑ آئی۔ معیز بری طرح ہلکایا۔

"تم اندھے ہو چکے ہو؟"

وہ اطمینان سے اپنا بیگ اٹھائے بے نیازی سے اندر جا رہا تھا، معیز کے چلانے پر اس نے پلٹ کر اس کو دیکھا اور لاڈلے لڑکے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ معیز کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی، وہ تیز قدموں سے اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔

"اگر دوبارہ تم نے ایسی حرکت کی تو میں تمہارا ہاتھ توڑ دوں گا۔" اس کے قریب پہنچتے ہوئے معیز ایک بار پھر دھاوا۔ اس نے بیگ کندھے سے اُتار کر نیچے رکھ دیا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"نکالوں گا..... تم کیا کرو گے.....؟ ہاتھ توڑ دوں گے؟ اتنی ہمت ہے؟"

"یہ میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب تم دوبارہ یہ حرکت کرو گے۔" معیز اپنے کمرے کی

طرف بڑھا۔

مگر اس کے بھائی نے پوری قوت سے اس کا بیک کھینچے ہوئے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

”نہیں تم مجھے ابھی بتاؤ۔“ اس نے معیو کا بیک اٹھا کر دور پھینک دیا۔ معیو کا چہرہ سرخ ہو گیا اس نے زمین پر پڑا ہوا اپنے بھائی کا بیک اٹھا کر دور اچھال دیا۔ ایک لمبے کا انتھار کئے بغیر اس کے بھائی نے پوری قوت سے معیو کی ٹانگ پر ٹھوک ماری۔ جو اب اس نے پوری قوت سے چھوٹنے بھائی کے منہ پر مکارا جو اس کی ناک پر لگا۔ اگلے ہی لمحے اس کی ناک سے خون نکلنے لگا۔ اتنے شدید جلنے کے باوجود اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ اس نے معیو کی ٹانگیں کھینچے ہوئے اس کا گھاد ہانے کی کوشش کی۔ معیو نے جواب اس کی شرٹ کو کارلز سے کھینچا اسے شرٹ کے پٹنے کی آواز آئی۔ اس نے پوری قوت سے اپنے چھوٹے بھائی کے پیٹ میں مکارا اس کے بھائی کے ہاتھ سے اس کی ٹانگیں نکل گئی۔

”ظہر میں تمہیں اب تمہارا ہاتھ توڑ کر دکھاتا ہوں۔“ معیو نے اسے گالیاں دیتے ہوئے لاؤنچ کے ایک کونے میں پڑے ہوئے ایک ریکٹ کو اٹھا لیا اور اپنے چھوٹے بھائی کو مارنے کی کوشش کی مگر اگلے ہی لمحے ریکٹ اس کے بھائی کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پوری قوت سے گھما کر اتنی برق رفتاری کے ساتھ اس ریکٹ کو معیو کے پیٹ میں مارا کہ وہ سنبھل یا خود کو بچا بھی نہیں سکا۔ اس نے یکے بعد دیگرے اس کی کمر اور ٹانگ پر ریکٹ برسا دیئے۔

اندر سے ان دونوں کا بڑا بھائی اشتعال کے عالم میں باہر لاؤنچ میں آگیا۔

”کیا تکلیف ہے تم دونوں کو..... گھر میں آتے ہی ہنگامہ شروع کر دیتے ہو۔“ اس کو دیکھتے ہی چھوٹے بھائی نے اٹھا ہوا ریکٹ نیچے کر لیا تھا۔

اور تم..... تمہیں شرم نہیں آتی اپنے سے بڑے بھائی کو مارتے ہو۔“ اس کی نظر اب اس کے ہاتھ میں پکڑے ریکٹ پر گئی۔

”نہیں آتی۔“ اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کہتے ہوئے ریکٹ ایک طرف اچھال دیا اور بڑی بے خوفی سے کچھ فاصلے پر پڑا ہوا اپنا بیک اٹھا کر اندر جانے لگا۔ معیو نے بلند آواز میں میز صیباں چڑھتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا۔

”تم کو اس کا خیال زہ بھگتا پڑے گا۔“ وہ ابھی تک اپنی ٹانگ سہلار ہاتھ۔

”sure why not.“ (ہاں، کیوں نہیں) ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ میز صیباں کے آخری سرے پر ڈک کر اس نے معیو سے کہا: ”اگلی بار تم ہیٹ لے کر آنا..... ٹینس ریکٹ سے کچھ مزہ نہیں آیا..... تمہاری کوئی بڑی نہیں ٹوٹی۔“ معیو کو اشتعال آگیا۔

”تم اپنی ناک سنبھالو..... وہ یقیناً ٹوٹ گئی ہے۔“

معیو غصے کے عالم میں میز صیباں کو دیکھتا رہا، جہاں کچھ دیر پہلے وہ کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

سبز سانٹھار چرڈز نے دوسری رو میں کھڑکی کے ساتھ پہلی کرسی پر بیٹھے ہوئے اس لڑکے کو چوٹی بار گھورا۔ وہ اس وقت بھی بڑی بے نیازی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ قافو قافو باہر سے نظریں ہٹاتا..... ایک نظر سبز سانٹھا کو دیکھتا۔ اس کے بعد پھر اسی طرح باہر جھانکنے لگتا۔

اسلام آباد کے ایک غیر ملکی اسکول میں وہ آج پہلے دن اس کلاس کی بیالوجی پڑھانے کے لئے آئی تھیں۔ دو ایک ڈپلومیٹ کی بیوی تھیں اور کچھ دن پہلے ہی اسلام آباد اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھیں۔ بچنگ ان کا پروفیشن تھا اور جس جس ملک میں ان کے شوہر کی پوسٹنگ ہوئی وہ وہاں سفارت خانہ سے منسلک اسکولز میں پڑھاتی رہیں۔

اپنے سے پہلے بیالوجی پڑھانے والی ٹیچر سبز میمرن کی سکیم آف ورک کو ہی جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کلاس کے ساتھ کچھ ابتدائی تعارف اور گفتگو کے بعد دل اور نظامہ دور ان خون کی ڈایا گرام رائٹنگ بورڈ پر ہٹاتے ہوئے اسے سمجھانا شروع کیا۔

ڈایا گرام کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اس لڑکے کو کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے دیکھا۔

پرائی ٹیکنیک کا استعمال کرتے ہوئے اپنی نظریں اس لڑکے پر مرکوز رکھتے ہوئے انہوں نے اچانک بولنا بند کر دیا۔ کلاس میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ اس لڑکے نے سر گھما کر اندر دیکھا۔ سبز سانٹھار چرڈز سے اس کی نظریں ملیں۔ سبز سانٹھار چرڈز مسکرائیں اور ایک بار پھر انہوں نے اپنا ٹیچر شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک انہوں نے اسی طرح بولتے ہوئے اپنی نظریں اس لڑکے پر رکھیں، جواب اپنے سامنے پڑی نوٹ بک پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا اس کے بعد سبز سانٹھار چرڈز نے اپنی توجہ کلاس میں موجود دوسرے اسٹوڈنٹس پر مرکوز کر لی۔ ان کا خیال تھا وہ خاصا شرمندہ ہو چکا ہے دوبارہ باہر نہیں دیکھے گا مگر صرف دو منٹ کے بعد انہوں نے اسے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر متوجہ دیکھا۔ دو ایک بار پھر بولتے بولتے خاموش ہو گئیں۔ بلا توقف اس لڑکے نے گردن موڑ کر پھر ان کی طرف دیکھا، اس بار سبز سانٹھار چرڈز مسکرائیں نہیں، بلکہ قدرے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے ایک بار پھر ٹیچر دینا شروع کر دیا۔ چند لمبے گزرنے کے بعد انہوں نے رائٹنگ بورڈ کو دیکھنے کے بعد دوبارہ اس لڑکے کو دیکھا تو وہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر کچھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس بار غیر محسوس طور پر ان کے چہرے پر کچھ ناراضی نمودار ہوئی اور وہ کچھ جھنجھلاتے ہوئے خاموش ہوئیں اور ان کے خاموش ہوتے ہی اس لڑکے نے کھڑکی کے باہر سے اپنی نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا، اس بار اس لڑکے کے ماتھے پر بھی کچھ ٹھنٹیں تھیں۔ ایک نظر سبز سانٹھار چرڈز کو ناگواری سے دیکھ کر وہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

اس کا انداز اس قدر توچن آمیز تھا کہ سزا ستار چڑھ کر کاچرہ سرخ ہو گیا۔

”سالار! تم کیا دیکھ رہے ہو؟“ انہوں نے سختی سے پوچھا۔

”nothing.....“ ایک لفظی جواب آیا۔ وہ اب چپتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں کیا ہے، میں کیا پڑھا رہی ہوں؟“

”hope so“ اس نے اتنے روڈ انداز میں کہا کہ ستار چڑھنے کے لیے دم ہاتھ میں پکڑا ہوا مارکر

کیپ سے بند کر کے ٹیبل پر پھینک دیا۔

”یہ بات ہے تو پھر یہاں آؤ اور یہ ڈایا گرام بنا کر اس کو لیبل کرو۔“ انہوں نے اسٹیج کے ساتھ

رائٹنگ بورڈ کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ یکے بعد دیگرے لڑکے کے چہرے پر کئی رنگ آئے۔ انہوں

نے کلاس میں بیٹھے ہوئے اسٹوڈنٹس کو آپس میں نظروں کا تبادلہ کرتے دیکھا۔ وہ لڑکا اب سرد نظروں

کے ساتھ ستار چڑھ کر ڈکھ رہا تھا، جیسے ہی انہوں نے رائٹنگ بورڈ سے آخری نشان صاف کیا وہ اپنی

کرسی سے ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا۔ تیز قدموں کے ساتھ اس نے ٹیبل پر پڑا ہوا مارکر اٹھایا اور

برقی رفتار کے ساتھ رائٹنگ بورڈ پر ڈایا گرام بنانے لگا۔ پورے دو منٹ ستاون سیکنڈ کے بعد اس

نے مارکر پر کیپ لگا کر اسے میز پر اسی انداز میں اچھالا، جس انداز میں ستار چڑھنے اچھالا تھا اور

ستار چڑھ کر ڈکھ رہا تھا۔ دیکھ کر انہوں نے اسے مارکر اچھالنے یا اپنی کرسی

کی طرف جاتے نہیں دیکھا۔ وہ بے یقینی کے عالم میں رائٹنگ بورڈ پر تین منٹ سے بھی کم عرصہ میں بنائی

جانے والی اس labelled ڈایا گرام کو دیکھ رہی تھیں جسے بنانے میں انہوں نے دس منٹ لئے تھے اور وہ

ان کی ڈایا گرام سے زیادہ اچھی تھی۔ وہ کہیں بھی معمولی سی غلطی بھی نہیں دھونڈ سکیں۔ کچھ خفیف سی ہوتے

ہوئے انہوں نے گردن موڑ کر ایک بار پھر اس لڑکے کو دیکھا وہ بھر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

دس منٹ نے تیسری بار دروازے پر دستک دی، اس بار اندر سے امامہ کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

”امامہ! میں ہوں..... دروازہ کھولو۔“ دس منٹ نے دروازے سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ اندر

خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر بعد دروازے کا لاک کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دس منٹ نے دروازے کے ونڈل کو ہٹا کر

دروازہ کھول دیا۔ امامہ اس کی جانب پشت کیے اپنے بیڈ کی طرف بڑھی۔

”تمہیں اس وقت کیا کام آن پڑا ہے مجھ سے؟“

”آخر تم نے اتنی جلدی دروازہ کھول بند کر لیا تھا۔ ابھی تو دس بجے ہیں.....“ دس منٹ نے کہا۔

داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”بس خیر آ رہی تھی مجھے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ دس منٹ اس کا چہرہ دیکھ کر چمک گیا۔

”تم روری تھیں؟“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ امامہ کی آنکھیں سرخ اور سوئی ہوئی تھیں اور

وہ اس سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”نہیں رو نہیں رہی تھی، بس سر میں کچھ درد ہو رہا تھا۔“ امامہ نے مسکرائے کی کوشش کی۔

دس منٹ نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹیبل پر چمک کرنے کی کوشش کی۔

”کہیں بخار تو نہیں ہے۔“ اس نے کچھ تشویش بھرے انداز میں کہا اور پھر ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”بخار تو

نہیں ہے..... پھر تم کوئی ٹیبلٹ لے لیتیں۔“

”میں لے چکی ہوں۔“

”اچھا تم سو جاؤ..... میں باتیں کرنے آیا تھا مگر اب اس حالت میں کیا باتیں کروں گا تم سے۔“

دس منٹ نے قدم باہر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ امامہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خود بھی اٹھ

کر اس کے پیچھے گئی اور دس منٹ کے باہر نکلنے ہی اس نے دروازے کو پھر لاک کر لیا۔ بیڈ پر اوٹھ کر منٹ

کر اس نے ٹیبلے میں منہ چھپا لیا۔ وہ ایک بار پھر آنکھوں کے ساتھ روری رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

تیرہ سال کا وہ لڑکا اس وقت ٹی وی پر میوزک شو دیکھنے میں مصروف تھا، جب طیبہ نے اندر

جھانکا۔ بے یقینی سے انہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا اور پھر کچھ ناراضی کے عالم میں اندر چلی آئیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ انہوں نے اندر آتے ہی کہا۔

”ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے ٹی وی سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

”ٹی وی دیکھ رہا ہوں..... فار گاڈ سیک۔“ تمہیں احساس ہے کہ تمہارے پیچھے زور ہے ہیں؟“ طیبہ

نے اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔

”سوٹ.....“ اس لڑکے نے اس بار کچھ ٹنگی سے کہا۔

”سوٹ؟“ تمہیں اس وقت اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان ہونا چاہیے نہ کہ یہاں اس

بے ہودہ شو کے سامنے۔“ طیبہ نے ڈانٹا۔

”مجھے جتنا پڑھنا تھا میں پڑھ چکا ہوں آپ سامنے سے ہٹ جائیں.....“ اس کے لہجے میں ناگواری

آگئی۔

”پھر بھی اٹھو اور اندر جا کر پڑھو۔“ طیبہ نے اسی طرح کھڑے کھڑے اس سے کہا۔

”نہ میں یہاں سے اٹھوں گا نہ اندر جا کر پڑھوں گا۔ میری اسٹڈیز اور پیچھے میرا مسئلہ ہیں۔ آپ کا

نہیں۔

”اگر تمہیں اتنی پروا ہو تو اسطریز کی تو اس وقت تم یہاں بیٹھے ہو تے؟“

”step aside“ اس نے طیبہ کے جیلے کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی بدتمیزی کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

”آج تمہارے پیلا آجائیں تو میں ان سے بات کرتی ہوں۔“ طیبہ نے اسے دھمکانے کی کوشش کی۔
”ابھی بات کر لیں۔ کیا ہو گا؟ پیلا کیا کر لیں گے۔ جب میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے جتنی تیاری کرنی ہے میں نے کر لی ہے تو پھر آپ کو کیا مسئلہ ہے؟“

”یہ تمہارے سالانہ امتحان ہیں، تمہیں احساس ہونا چاہئے اس بات کا۔“ طیبہ نے یک دم اپنے لہجے کو نرم کرتے ہوئے کہا۔

”میں کوئی دو چار سال کا بچہ نہیں ہوں کہ میرے آگے پیچھے پھرنا پڑے آپ کو۔ میں اپنے معاملات میں آپ سے زیادہ سمجھ دار ہوں، اس لئے یہ تمہارے کاسم کے جیلے مجھ سے مت یو لاکریں۔ ایگزیم ہو رہے ہیں۔ اسٹڈیز پر دھیان دو، اس وقت تمہیں اپنے کمرے میں ہونا چاہئے۔“

”میں تمہارے قادر سے بات کروں گی۔“

”what a rubbish“

وہ بات کرتے کرتے فٹے میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوٹ اس نے پوری قوت سے سامنے والی دیوار پر دے مارا اور پاؤں پٹخا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ طیبہ کچھ بے بسی اور خلقت کے عالم میں اسے کمرے سے باہر نکلتی رہیں۔

☆.....☆.....☆

فلوینا فرانس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پکٹ میز پر رکھے ہوئے ایک نظر ہال میں دوڑائی، بھیج شروع ہونے میں ابھی دس منٹ باقی تھے اور ہال میں موجود اسٹوڈنٹس کتابیں، نوٹس اور نوٹ بکس پکڑے تیزی سے صفحے آگے پیچھے کرتے ان پر آخری نظریں ڈال رہے تھے۔ ان کی جسمانی حرکات سے ان کی پریشانی اور اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ فلوینا فرانس کے لئے یہ ایک بہت ناموس سین تھا پھر ان کی نظریں ہال کے تقریباً درمیان میں بیٹھے ہوئے سالار پر جا ٹھہریں۔ پچیس اسٹوڈنٹس میں اس وقت وہ واحد اسٹوڈنٹ تھا جو اطمینان سے اپنی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں اسکیل پکڑے آہستہ آہستہ اسے اپنے جوتے پر مارتے ہوئے وہ اطمینان سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، فلوینا کے لئے یہ سین بھی نیا نہیں تھا۔ اپنے سات سالہ کیریئر میں انہوں نے بھیڑ کے دوران سالار کو اسی بے فکری اور لا پرواہی کا مظاہرہ کرتے پایا تھا۔

نوج کر دو منٹ پر انہوں نے سالار کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے Moq's پر مبنی Objective Paper تھمایا، تیس منٹ کے بعد اسے وہ بھیجے ان سے لے لیا تھا۔ نوج کر دس منٹ پر انہوں نے سالار کو اپنی کرسی سے کھڑا ہوتے دیکھا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی ہال میں اس سے پیچھے موجود تمام اسٹوڈنٹس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بھیجے ہاتھ میں لئے فلوینا فرانس کی طرف جا رہا تھا۔ فلوینا فرانس کے لئے یہ بھی نیا سین نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی یہی کچھ دیکھتی آئی تھیں۔ تیس منٹ میں حل کیا جانے والا بھیجے وہ آٹھ منٹ میں حل کر کے ان کے سر پر کھڑا تھا۔

”بھیجے کو دو بارہ دیکھ لو۔“ انہوں نے یہ جملہ اس سے نہیں کہا۔ وہ جانتی تھیں اس کا جواب کیا ہو گا۔ ”میں دیکھ چکا ہوں۔“ وہ اگر اسے ایک بار پھر بھیجے دیکھنے پر مجبور کر تیں تو وہ ہمیشہ کی طرح بھیجے زلے جا کر اپنی کرسی کے پیچھے پر رکھ کر بازو سینے پر پلٹ کر بیٹھ جاتا۔ انہیں یاد نہیں تھا کبھی اس نے ان کے کہنے پر بھیجے کو دو بارہ چیک کیا ہو اور وہ یہ تسلیم کرتی تھیں کہ اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے بھیجے میں کسی ایک بھی غلطی کو ڈھونڈنا بہت مشکل کام تھا۔

انہوں نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ہاتھ سے بھیجے پکڑ لیا۔

”تم جانتے ہو سالار! میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا کیا ہے؟“ انہوں نے بھیجے پر نظر ڈالنے ہوئے کہا: ”کہ میں تمہیں تیس منٹ کا..... بھیجے..... تیس منٹ..... کے بعد Submit کرواتے ہوئے دیکھوں۔“ وہ ان کی بات پر خفیف سے انداز میں مسکرایا۔ ”آپ کی یہ خواہش اس صورت میں پوری ہو سکتی ہے مگر اگر میں یہ بھیجے ۱۵۰ سال کی عمر میں حل کرنے بیٹھوں۔“

”نہیں میرا خیال ہے ۱۵۰ سال کی عمر میں تم یہ بھیجے دس منٹ میں کرو گے۔“

اس بار وہ ہنسا اور واہیں مڑ گیا۔ فلوینا فرانس نے ایک نظر اس کے بھیجے کے صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک سرسری سی نظر بھی انہیں یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ وہ اس بھیجے میں کتنے نمبر گنوائے گا..... ”زیر د۔“

☆.....☆.....☆

سلٹی نے اپنی جی کے ہاتھوں میں گفٹ بھیجے میں لیے ہوئے پکٹ کو جبرائی سے دیکھا۔

”یہ کیا ہے اماں؟ تم تو اریکٹ مٹی تھیں۔ شاید کچھ کتابیں لینی تھیں تمہیں؟“

”ہاں ای اچھے کتابیں ہی لینی تھیں، مگر کسی کو تحفے میں دینے کے لئے۔“

”کس کو تحفہ دینا ہے؟“

”وہ لاہور میں ایک دوست ہے میری، اس کی سالگرہ ہے۔ اسی کے لئے خرید رہا ہے کوئیر سروس کے ذریعے بھجوا دوں گی کیونکہ مجھے تو ابھی یہاں رہنا ہے۔“

”لاؤ پھر مجھے دے دو یہ پکٹ، میں دس سو کو دوں گی، وہ بھجوا دے گا۔“

”نہیں ای! میں ابھی نہیں بھجواؤں گی۔۔۔ ابھی اس کی ساگرہ کی تاریخ نہیں آئی۔“ سلتی کو لگا جیسے وہ ایک دم گھبرا گئی ہو۔ انہیں حیرانی ہوئی۔ کیا یہ گھبرانے والی بات تھی؟

تین سال پہلے امامہ کی وجہ سے انہیں بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہیں اور ان کے شوہر ہاشم کو۔ وہ تب اپنی بیٹی کے بارے میں بہت فکر مند تھیں اور ہاشم ان سے زیادہ مگر جھپٹے تین سال میں سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اب اس کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن تھے۔ خاص طور پر اسجد سے اس کی نسبت ملے کر کے۔ وہ جانتی تھیں امامہ اسجد کو پسند کرتی ہے اور صرف وہی نہیں اسجد کو کوئی بھی پسند کر سکتا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک اچھا لڑکا تھا۔۔۔۔۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ اسجد سے نسبت ملے ہوئے پر بہت خوش ہوئی تھی۔ اسجد اور اس کے درمیان پہلے بھی خاصی دوستی اور بے تکلفی تھی مگر بعض دفعہ انہیں لگتا جیسے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت چپ ہوتی جا رہی ہے۔ وہ پہلے ایسی نہیں تھی۔

”مگر اب وہ اسکول جانے والی بچی بھی تو نہیں رہی۔ میڈیکل کالج کی اسٹوڈنٹ ہے۔۔۔۔۔ پھر وقت بھی کہاں ہوتا ہے اس کے پاس۔۔۔۔۔“ سلتی بیٹھ خود کو تسلی دے لیتیں۔

وہ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ بڑی دونوں بیٹیوں کی وہ شادی کر چکی تھیں۔ ایک بیٹے کی بھی شادی کر چکی تھیں جب کہ دو بیٹے اور امامہ غیر شادی شدہ تھے۔

”اچھا ہی ہے کہ یہ سنجیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ لڑکیوں کے لئے سنجیدگی اچھی ہوتی ہے۔ انہیں جتنی جلدی اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔“ سلتی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے امامہ سے نظریں بنالیں۔ وہ چھٹیوں میں گھبرا آئی ہوئی تھی اور جتنے دن وہ یہاں رہتی ان کی نظریں اس پر ہی طبع مرکوز رہتیں۔

”پتا نہیں یہ ساجد کہاں رہ گیا ہے جو بھی کام اس کے ذمے لگاؤ بس بھول ہی جاؤ۔“ انہیں اچانک اپنے ملازم کا خیال آیا۔ جس کے پیچھے وہ لاؤنچ میں آئی تھیں۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ لاؤنچ سے نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

یہ نیا ایر ہاؤس تھی۔ نیا سال شروع ہونے میں تیس منٹ باقی تھے۔ دس لڑکوں پر مشتمل چودہ چودہ سال کے لڑکوں کا وہ گروپ جھپٹے دو گھنٹے سے اپنے اپنے موٹر سائیکل پر شہر کی مختلف سڑکوں پر اپنے کرب و کمانے میں مصروف تھا، ان میں سے چند نے اپنے ہاتھ پر چنگار بینڈز باندھے ہوئے تھے جن پر نئے سال کے حوالے سے مختلف پینامات درج تھے۔ وہ لوگ ایک گھنٹہ پہلے پوش علاقے کی ایک بڑی ہیر مارکیٹ میں موجود تھے اور وہاں وہ مختلف لڑکیوں پر آوازے کستے رہے تھے۔

اپنی پانکس پر سوار اب مختلف سڑکوں پر چکر لگا رہے تھے، ان کے پاس فائر کریکڑز موجود تھے

جنہیں وہ وقتاً فوقتاً چلا رہے تھے۔ پونے بارہ پر وہ جم خانہ کے باہر موجود تھے جہاں پارکنگ لائٹ گاڑیوں سے بھر چکا تھا۔ یہ گاڑیاں ان لوگوں کی تھیں جو جم خانے میں نئے سال کے سلسلے میں ہونے والی ایک پارٹی میں آئے تھے۔ ان لڑکوں کے پاس بھی اس پارٹی کے دعوتی کارڈ موجود تھے، کیونکہ ان میں سے تقریباً تمام کے والدین جم خانہ کے ممبر تھے۔

وہ لڑکے اندر پہنچے تو گیارہ بج کر پچھن منٹ ہو رہے تھے چند منٹوں بعد ڈانس فلوور سمیت تمام بچکوں کی لائٹس آف ہو جاتی تھیں اور اس کے بعد باہر لان میں آتش بازی کے ایک مظاہرہ کے ساتھ نیا سال شروع ہونے پر لائٹس آن ہوتا تھیں اور اس کے بعد تقریباً تمام رات وہاں رقص کے ساتھ ساتھ شراب پی جاتی، جس کا اہتمام نئے سال کی اس تقریب کے لئے جم خانہ کی انتظامیہ خاص طور پر کرتی تھی۔ لائٹس آف ہوتے ہی وہاں ایک طوفان بدتمیزی کا آغاز ہو جاتا تھا اور وہاں موجود لوگ اسی ”طوفان بدتمیزی“ کے لئے وہاں آئے تھے۔

پندرہ سالہ وہ لڑکا بھی دس لڑکوں کے اس گروپ کے ساتھ آنے کے بعد اس وقت ڈانس فلوور پر راک بیٹ پر ڈانس کر رہا تھا، ڈانس میں اس کی مہارت قابل دید تھی۔

بارہ بجتے میں دس سینکڑہرہ جانے پر لائٹس آف ہو گئیں اور ٹھیک بارہ بجے لائٹس ایک دم دوبارہ آن کر دی گئیں۔

اندھے مرنے کے بعد سینکڑ گھنٹے والوں کی آوازیں اب شور اور خوشی کے قہقہوں اور چیخوں میں بدل گئی تھیں چند سینکڑ پہلے ختم جانے والا میوزک ایک بار پھر بجایا جانے لگا۔ وہ لڑکا اب اپنے دوستوں کے ساتھ باہر پارکنگ میں آ گیا جہاں بہت سے لڑکے اپنی اپنی گاڑیوں کے ہارن بجا رہے تھے۔ ان ہی لڑکوں کے ساتھ بیڑ کے کین پکڑے وہ وہاں موجود ایک گاڑی کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس لڑکے نے گاڑی کی چھت پر کھڑے کھڑے اپنی جیکٹ کی جیب سے بیڑ کا ایک بھرا ہوا کین نکالا اور پوری طاقت سے کچھ فاصلے پر کھڑی ایک گاڑی کی وڈا اسکرین پر دے مارا۔ ایک دھماکے کے ساتھ گاڑی کی وڈا اسکرین چور چور ہو گئی وہ لڑکا اطمینان کے ساتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا کین پیتا رہا۔

☆ ☆ ☆

وہ جھپٹے آدھے گھنٹے سے کامران کو وڈیو گیم کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر موجود اسکرین کوئی خاص اضافہ نہیں ہو رہا تھا، شاید اس کی وجہ وہ مشکل ٹریک تھا جس پر کامران کو گاڑی ڈرائیو کرنی تھی۔ سالار لاؤنچ کے صوفوں میں سے ایک صوفے پر بیٹھا اپنی ٹوٹ بک پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا، مگر وقتاً فوقتاً نظر اٹھا کر دیکھ کر اسکرین کو بھی دیکھ رہا تھا جہاں کامران اپنی جدوجہد میں مصروف تھا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد اس نے ٹوٹ بک بند کر کے سامنے پڑی میز پر رکھ دی۔ پھر منہ پر ہاتھ

رکھ کر جمائی روکی۔ دونوں ناٹکیں سامنے پڑی میز پر رکھ کر اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سر کے پیچھے باندھے وہ کچھ دیر اسکرین کو دیکھتا رہا، جہاں کامران اپنے تمام پاسز ضائع کرنے کے بعد ایک بار پھر نیا ٹیم کھیلنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"کیا براہم ہے کامران؟" سالار نے کامران کو مخاطب کیا۔

"ایسے ہی..... نیا ٹیم لے کر آیا ہوں مگر اسکو کرنے میں بڑی مشکل ہو رہی ہے۔" کامران نے بے زاری سے کہا۔

"اچھا مجھے دکھاؤ....." اس نے صوفے سے اٹھ کر ریوٹ کنٹرول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

کامران نے دیکھا۔ پہلے بیس سیکٹ میں ہی سالار اسے جس اسپینڈ پر دوڑا ہاتھ اس اسپینڈ پر کامران اب تک نہیں دوڑا پایا تھا۔ جو ٹریک اسے بہت مشکل لگ رہا تھا وہ سالار کے سامنے ایک بچکانہ چیز محسوس ہو رہا تھا۔ ایک منٹ بعد وہ جس اسپینڈ پر گاڑی دوڑا ہاتھ اس اسپینڈ پر کامران کے لئے اس پر نظر میں جانا مشکل ہو گیا جب کہ سالار اس اسپینڈ پر بھی گاڑی کو کھل طور پر کنٹرول کئے ہوئے تھا۔

تین منٹ کے بعد کامران نے پہلی بار گاڑی کو ڈنگ گاتے اور پھر ٹریک سے اتر کر ایک دھماکے کے ساتھ جاہ کرتے دیکھا۔ کامران نے کچھ مسکراتے ہوئے مرکز سالار کو دیکھا۔ گاڑی کیوں جاہ ہوئی تھی وہ جان گیا تھا ریوٹ اب سالار کے ہاتھ کے بجائے میز پر پڑا تھا اور وہ اپنی نوٹ بک اٹھائے کھڑا ہو رہا تھا۔ کامران نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ "بہت بورنگ ٹیم ہے۔" سالار نے تبصرہ کیا اور کامران کی ناگوں کو پھلانگتے ہوئے لاؤنچ سے باہر نکل گیا۔ کامران ہونٹ پیچھے سات ہندسوں پر مبنی اس اسکو گود کچھ رہا تھا جو اسکرین کے ایک کونے میں جگہ رہا تھا، کچھ نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں اس نے ہیروئی دروازے کو دیکھا جس سے وہ غائب ہو ا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ دونوں ایک بار پھر خاموش تھے، امجد کو ابھمن ہونے لگی۔ امام اتنی کم گو نہیں تھی جتنی وہ اس کے سامنے ہو جاتی تھی۔ پچھلے آدھے گھنٹے میں اس نے کتنی کے لفظ بولے تھے۔

وہ اسے بچپن سے جانتا تھا۔ وہ بہت خوش مزاج تھی۔ ان دونوں کی نسبت ٹھہرائے جانے کے بعد بھی ابتدائی سال میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ امجد کو اس سے بات کر کے خوشی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بلا کی حاضر جواب تھی، مگر پچھلے کچھ سالوں میں وہ یک دم بدل گئی تھی اور میڈیکل کالج میں جا کر تو یہ تبدیلی اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ امجد کو بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا جیسے اس سے بات کرتے ہوئے وہ حد درجہ محتاط رہتی ہے۔ کبھی وہ ابھی ہوئی سی محسوس ہوتی اور کبھی اسے اس کے لہجے میں عجیب سی سرد مہری محسوس ہوتی۔ اسے لگتا وہ جلد از جلد اس سے چھٹکارا پا کر اس کے پاس سے اٹھ کر چلی جانا

چاہتی ہے۔

اس وقت بھی وہ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔

"میں کئی بار سوچتا ہوں کہ میں خواہتا وہی تمہارے لئے یہاں آنے کا تردد کرتا ہوں..... تمہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہو گا کہ میں آؤں یا نہ آؤں۔" امجد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ وہ اس کے بالقابل لان چیز پر بیٹھی دور باؤنڈری وال پر چڑھی ہوئی تل کو گھور رہی تھی۔ امجد کی شکایت پر اس نے گردن ہلائے بغیر اپنی نظریں تل سے ہٹا کر امجد پر مرکوز کر دیں۔ امجد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا مگر وہ خاموش رہی تو اس نے لفظوں میں کچھ رد و بدل کے ساتھ اپنا سوال ڈہرایا۔

"تمہیں میرے نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا امام۔" کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟

"اب میں کیا کہہ سکتی ہوں اس پر؟"

"تم کم از کم انگار تو کر سکتی ہو۔ میری بات کو جھٹا تو سکتی ہو کہ ایسی بات نہیں ہے۔ میں لفظ سوچ رہا ہوں اور....."

"ایسی بات نہیں ہے، آپ لفظ سوچ رہے ہیں۔" امام نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ اس کا لہجہ اب بھی اتنا ہی ٹھنڈا اور چہرہ اتنا ہی بے تاثر تھا جتنا پہلے تھا، امجد ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

"ہاں، میری دعا اور خواہش تو یہی ہے کہ ایسا نہ ہو اور میں واقعی لفظ سوچ رہا ہوں مگر تم سے بات کرتے ہوئے میں ہر بار ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔"

"کس بات سے آپ ایسا محسوس کرتے ہیں؟" اس بار پہلی بار امجد کو اس کی آواز میں کچھ ناراضی جھلکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"بہت سی باتوں سے..... تم میری کسی بات کا ذہنک سے جواب ہی دیتیں۔"

"حالانکہ میں آپ کی ہر بات کا ذہنک سے جواب دینے کی بھرپور کوشش کرتی ہوں..... لیکن

اب اگر آپ کو میرے جواب پسند نہ آئیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"

امجد کو اس بار بات کرتے ہوئے وہ کچھ مزید خفا محسوس ہوئی۔

"میں نے یہ کب کہا کہ مجھے تمہارے جواب پسند نہیں آئے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ میری ہر بات کے جواب میں تمہارے پاس..... ہاں اور نہیں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ تو مجھے لگتا ہے میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔"

"اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں گے کہ تم ٹھیک ہو؟ تو میں اس کا جواب ہاں یا نہیں میں ہی دوں گی۔ ہاں اور نہیں کے علاوہ اس سوال کا جواب کسی قدر سے دیا جاسکتا ہے تو آپ مجھے وہ دے دیں، میں وہ کر دوں گی۔" وہ بالکل سنجیدہ تھی۔

"ہاں اور نہیں کے ساتھ بھی تو کچھ کہا جاسکتا ہے..... اور کچھ نہیں، تم جو اب اس معاملہ میں پوچھ سکتی ہو۔"
"میں آپ کا کیا حال پوچھوں، ظاہر ہے اگر آپ میرے گھر آئے ہیں، میرے سامنے بیٹھے مجھ سے باتیں کر رہے ہیں تو اس کا واضح مطلب تو یہی ہے کہ آپ ٹھیک ہیں ورنہ آپ اس وقت اپنے گھر، اپنے بستر پر پڑے ہوتے۔"

"یہ قارمیلٹی ہوتی ہے امام.....!"

"اورے آپ جانتے ہیں، میں قارمیلٹیئر پر یقین نہیں رکھتی۔ آپ بھی مجھ سے میرا حال نہ پوچھا کریں۔ میں بالکل سائنڈ نہیں کروں گی۔" امجد جیسے لاجواب ہو گیا۔
"ٹھیک ہے قارمیلٹیئر کو چھوڑو، بندہ کوئی اور بات کر لیتا ہے۔ کچھ ڈسکس کر لیتا ہے۔ اپنی مصروفیات کے بارے میں ہی کچھ بتا دیتا ہے۔"

"امجد! میں آپ سے کیا ڈسکس کروں..... آپ بزنس کرتے ہیں۔ میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں..... آپ سے میں کیا پوچھوں، اسٹاک مارکیٹ کی پوزیشن.....؟ فرینڈ bullish تھا یا bearish انڈیکس میں کتنے پوائنٹس کا اضافہ ہوا یا اگلی کتنا سنٹ کہاں بھیج رہے ہیں؟ اس بار گورنمنٹ نے آپ کو کتنی رپیٹ دی؟" اس کا لہجہ اب بھی اتنا ہی سرد تھا یا آپ سے اتنا ہی ڈسکس کروں، کون سے عوامل انسان کے جگر کو متاثر کر سکتے ہیں۔ بالی پاس سرجری میں اس سال کون سی نئی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ دل کی دھڑکن بحال کرنے کے لئے کتنے سے کتنے دولت کا الیکٹریک شک دیا جاسکتا ہے۔ تو ہم دونوں کی مصروفیات تو یہ ہیں اب ان کے بارے میں ڈسکشن سے آپ اور میں محبت اور بے تکلفی کی کون سی منزلیں طے کریں گے۔ وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

امجد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اب وہ اس لمحہ کو کوس رہا تھا جب اس نے امام سے شکایت کی تھی۔
"اور بھی تو مصروفیات ہوتی ہیں انسان کی۔" امجد نے قدرے کمزور لہجہ میں کہا۔
"نہیں پڑھائی کے علاوہ میری تو اور کوئی مصروفیات نہیں ہیں۔" امام نے تعلیمیت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"پہلے بھی تو ہم دونوں آپس میں بہت سی باتیں کرتے تھے۔" امام نے اس کی بات کاٹ دی۔
"پہلے کی بات چھوڑیں، اب میں وقت ضائع کرنا انورڈ نہیں کر سکتی۔ حیرت مجھے آپ پر ہو رہی ہے، آپ بزنس میں ہو کر اتنی انیچور اور ایجوٹل سوچ رکھتے ہیں۔ آپ کو تو خود بہت پر یکھیل ہوتا چاہئے۔"

امجد کچھ بول نہ سکا۔

"ہم دونوں کے درمیان جو رشتہ ہے وہ ہم دونوں جانتے ہیں۔ اب اگر آپ میری پر یکھیل اپروچ

کو بے اتفاقی، بے نیازی، ناراضی سمجھیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ یہاں بیٹھی ہوں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میں اس رشتے کو اہمیت دیتی ہوں ورنہ کوئی اجنبی تو اس طرح یہاں میرے ساتھ بیٹھ کر چائے نہیں پی سکتا۔" وہ ایک لمحے کے لئے ٹکی۔ "اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ کے آنے یا نہ آنے سے مجھے کوئی فرق پڑے گا یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں ہی بہت مصروف رہتے ہیں۔ ہم ماڈرن ایجنسی کی پیداوار ہیں نہ میں کوئی ہیر ہوں کہ آپ کے لئے گھی کی چوری لے جا کر گھنٹوں آپ کی بانسری سنتی رہوں گی نہ ہی آپ رانجھے کے قہیلے سے تعلق رکھتے ہیں کہ میرے لئے گھنٹوں یہ فریضہ سرانجام دیں۔ سچ یہی ہے کہ فرق واقعی نہیں پڑتا کہ ہم دونوں ملیں یا نہ ملیں، باتیں کریں یا نہ کریں۔ ہمارا رشتہ وہی رہے گا جو اب ہے یا آپ کو لگتا ہے اس میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے؟"

اگر امجد کے ماتھے پر پینہ نہیں آیا تھا تو اس کی واحد وجہ دسمبر کا مہینہ تھا ان دونوں کی عمر میں آٹھ سال کا فرق تھا مگر اس وقت پہلی بار امجد کو یہ فرق اٹھارہ سال کا محسوس ہوا تھا۔ وہ اسے اپنے سے اٹھارہ سال بڑی لگی تھی۔ دو بیٹے پہلے دو انیس سال کی ہوئی تھی مگر اس وقت امجد کو لگ رہا تھا جیسے وہ نین اتناج سے سیدھی ادھیڑ عمری میں چلی گئی تھی اور خود وہ ایک بار پھر Pre-teen میں آ گیا تھا۔ وہ اس کے بالفاظ، ٹانگ پر ٹانگ رکھے امجد کے چہرے پر نظریں جمائے اسی بے تاثر انداز میں اس کے جواب کی منتظر تھی۔ امجد نے کرسی کے ہتھے پر ٹکے اس کے ہاتھ میں مٹکی کی انگوٹھی کو دیکھا اور ٹھنکدار کر اپنا گلا صاف کرنے کی کوشش کی۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو؟ میں صرف اس لئے ڈسکشن کی بات کر رہا تھا کہ ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ڈویلپ ہو سکے۔"

"امجد! میں آپ کو بہت اچھی طرح سمجھتی اور جانتی ہوں اور یہ جان کر مجھے افسوس ہوا کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے درمیان ابھی بھی کسی انڈر اسٹینڈنگ کو ڈویلپ کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا خیال تھا ہم دونوں کے درمیان ابھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔"

وہ امجد کا دن نہیں تھا، امجد نے اعتراف کیا۔
"اور اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ اتناوی اور بزنس کو ڈسکس کر کے ہم کوئی انڈر اسٹینڈنگ ڈویلپ کر لیں گے تو ٹھیک ہے، آئندہ ہم بھی ڈسکس کر لیا کریں گے۔" امام کے لہجہ میں لاپرواہی کا عنصر واضح تھا۔
"تم کو میری بات بری لگی ہے؟"

"بالکل بھی نہیں..... میں کیوں برا مانوں گی؟" اس کے لہجہ میں موجود حیرت کے عنصر نے امجد کو مزید شرمندہ کیا۔
"شاید میں نے غلط بات کی ہے۔" "شاید نہیں یقیناً۔" اس نے تینوں لفظوں پر باری باری زور

دیتے ہوئے کہا۔

"تم جانتی ہو میرے نزدیک یہ رشتہ کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ میرے بہت سے خواب ہیں۔ اس رشتے کے حوالے سے، تمہارے حوالے سے۔" امجد نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ اماں بے تاثر چہرے کے ساتھ اسی تیل کو دیکھ رہی تھی۔

"شاید اس لئے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس رشتے کے حوالے سے کوئی خوف نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں، یہ رشتہ ہم دونوں کی مرضی سے ہوا ہے۔"

وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بڑے جذب سے کہہ رہا تھا اور یکدم ہی اسے ایک بار پھر یہ احساس ہونے لگا تھا جیسے وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ اس کی بات نہیں سن رہی تھی۔ امجد کو لگا وہ ایک بار پھر خود سے باتیں کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک بہت بڑی کوٹھی کے عقب میں موجود انگیسی سے میوزک کی آواز باہر لائن تک آرہی تھی۔ باہر موجود کوئی بھی شخص انگیسی کے اندر موجود لوگوں کی قوت برداشت پر حیرانی کا اظہار کر سکتا تھا لیکن وہ انگیسی کے اندر موجود لوگوں کی حالت دیکھ لیتا تو وہ اس حیران کن قوت برداشت کی وجہ جان جاتا۔ انگیسی کے اندر موجود چھ لڑکے جس حالت میں تھے اس حالت میں اس سے زیادہ تیز اور بلند میوزک بھی ان پر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا اور جہاں تک ساتویں لڑکے کا تعلق تھا تو وہ ایسی کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔

انگیسی کا وہ کمرہ اس وقت دھوپ کے مرغولوں اور عجیب قسم کی بو سے بھرا ہوا تھا، قالین پر ایک مشہور ریٹورنٹ سے لائے گئے کھانے کے کٹلے ہوئے ڈبے اور ڈسپوزیبل پلٹیں، جیسے بھی پڑے تھے۔ قالین پر کھانے پینے کی بچی بچی چیزیں اور ہڈیاں بھی ادھر ادھر جھگی گئی تھیں۔ سوفٹ ڈرنک کی پلاسٹک کی بوتلیں بھی ادھر ادھر لڑکھ رہی تھیں۔ کچپ کی بوتلوں سے نکلنے والی کچپ قالین کو کچھ اور بدلتا بناتی تھی۔ وہ سات لڑکے اسی قالین پر ایک دوسرے سے کچھ قاصدے پر براجمان تھے۔ ان کے سامنے قالین پر بیڑ کے خالی کینز کا ایک ڈمیر بھی لگا ہوا تھا اور تقریباً کا یہ سلسلہ وہیں تک نہیں لڑکا تھا اس وقت وہ ان ڈرگز کو استعمال کرنے میں مصروف تھے جن کا انتظام ان میں سے ایک نے کیا تھا۔

پچھلے دو ماہ میں وہ تیسری بار اس ایڈوجر کے لئے اکٹھے ہوئے تھے اور ان تین مواقع پر وہ چار مختلف قسم کی ڈرگز استعمال کر چکے تھے۔ پہلی بار انہوں نے وہ ڈرگ استعمال کی تھی جو ان میں سے ایک کو اپنے باپ کی دواؤں سے ملی تھی۔ دوسری بار انہوں نے جو ڈرگ استعمال کی تھی وہ انہوں نے اپنے ایک اسکول فیلو کے توسط سے اسلام آباد کے ایک کلب سے خریدی تھی اور اس بار وہ جو ڈرگ استعمال کر

رہے تھے وہ انہوں نے ایک ٹرپ پر اوپینڈی کی ایک مارکیٹ میں ایک افغان سے خریدی تھی۔ تینوں مواقع پر انہوں نے ان ڈرگز کے ساتھ اکلوجل کا استعمال کیا تھا جس کا حصول ان کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اس وقت بھی ان سات لڑکوں میں سے چھ لڑکے پوری طرح نشے میں تھے۔ ان میں سے ایک ابھی بھی کانپتے ہاتھوں کے ساتھ ڈرگ کو سوکھنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ دو لڑکے سگریٹ پیٹے ہوئے باقی لڑکوں کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی گفتگو کر رہے تھے۔ صرف ساتواں لڑکا مکمل طور پر ہوش میں تھا اس لڑکے کا چہرہ pimples / مہاسوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کے گلے میں موجود ایک سیاہ رنگ ڈوری میں تین چار تانبے کی عجیب سی شکلوں کے زیورات پڑے ہوئے تھے۔ ایلو س پر پیٹلے اسٹائل کے کارلز والی ایک چمکر ڈارک بلو شرٹ کے ساتھ وہ ایک بے ہودہ سی سرنگی جیٹو پہنے ہوئے تھا جس کے دونوں گھٹنوں پر میڈو کا چہرہ پینٹ کیا گیا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول کر اپنی دائیں طرف موجود لڑکوں پر ایک اچنی نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر اس سرنگی کے باوجود وہ ایسا کوئی تاثر نہیں دے رہی تھیں کہ وہ باقی لڑکوں کی طرح مکمل طور پر نشے کی گرفت میں تھا۔ چند منٹ انہیں دیکھنے کے بعد اس نے سیدھے ہوتے ہوئے ڈیبا میں موجود باقی ڈرگ کون میں ڈال دی اور ایک چھوٹے سے سڑکے کے ساتھ اسے سوکھنے لگا۔ کافی دیر کے بعد اس نے اسٹرا کو ایک طرف پھینک دیا اور اپنے ساتھ کی پور پر تھوڑی سی ڈرگ رکھ کر زبان کی نوک کے ساتھ کچھ دلچسپی، تجسس مگر احتیاط کے ساتھ اسے چکھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے برقی رفتار کے ساتھ اپنے بائیں جانب تھوکا، ڈرگ پختیاً بہت اچھی کوالٹی کی تھی۔ اس کی آنکھیں اب پہلے سے زیادہ سرخ ہو رہی تھیں مگر ابھی بھی وہ اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی اس سرگرمی سے کچھ زیادہ بھگولا نہیں ہوا۔ ایک دو منٹ کے بعد اس نے اپنے پاس قالین پر پڑے ہوئے بیڑ کے can سے چند گھونٹ لیتے ہوئے جیسے ڈرگ کے ذائقے کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ can رکھنے کے بعد وہ چند منٹ تک کون میں موجود ڈرگ کو دیکھتا رہا دوسرے لمحے لڑکے اس وقت تک نشے میں پوری طرح دھت کار ہٹ پر اندھے سیدھے پڑے تھے مگر وہ اب بھی اسی طرح بیٹھا تھا، can میں موجود بیڑ کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ ہر سوچ انداز میں اس سب کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں اب متورم ہو رہی تھیں مگر ان میں موجود چمک بتا رہی تھی کہ وہ ابھی بھی مکمل طور پر نشے میں نہیں ہے۔

یہ اس کے ساتھ تیسری بار ہوا تھا۔ پہلی دو بار ڈرگ استعمال کرنے کے بعد بھی وہ اسی طرح بیٹھا رہا تھا، جب کہ اس کے دوست بہت جلد نشے میں دھت ہوئے تھے۔ رات کے پچھلے پہر وہ ان لوگوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر خود گھر آ گیا تھا۔ آج بھی وہ یہی کرنا چاہتا تھا۔ کمرے کے اندر موجود ڈرگ کی بو سے اب پہلی بار وہ ایجنے لگا تھا اس نے کھڑا ہونے کی کوشش کی اور وہ لڑکھڑایا۔ اپنی لڑکھڑاہٹ پر قابو

پاتے ہوئے وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ نیچے جھک کر اس نے کاپٹ سے کی رنگ، والٹ اور کریڈٹ کارڈ اٹھائے پھر آگے بڑھ کر اس نے اسٹیریو کو بند کر دیا۔ اپنی ستورم اور سرخ آنکھوں سے اس نے کمرے میں ایک نظر دوڑائی۔ یوں جیسے وہ کوئی چیز یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ایک بار پھر نیچے بیٹھ کر اس نے جاگڑ پینے اور ان کے تسوں کو ٹٹوں کے گرد لپیٹ کر گرہ باندھی پھر دروازے کا لاک کھول کر وہ باہر نکل گیا۔ روشنی سے یک دم وہ کوریڈر کی تاریکی میں آ گیا تھا۔ اندھیرے میں اپنا راستہ ڈھونڈتے ہوئے وہ انٹیکسی کے بیرونی دروازے کو کھولا ہوا باہر لان میں آ گیا۔ انٹیکسی کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے اپنی ناک سے کوئی چیز بہتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بایاں ہاتھ اٹھا کر اس نے اپنے اوپری ہونٹ پر رکھا اس کی انگلیاں جھپپانے لگی تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اپنی انگلیوں کو انٹیکسی کی بیرونی لائٹ کی روشنی میں دیکھا۔ اس کی پوروں پر خون کے قطرے لگے ہوئے تھے، اس نے اپنی ٹراؤز کی جیب ٹٹولتے ہوئے اندر سے ایک رد مال برآمد کیا اور اپنی پوروں پر لگا ہوا خون صاف کیا اس کے بعد اسی رد مال کے ساتھ اس نے اپنے ناک سے چپکنے والا خون صاف کیا اسے اپنے حلق میں کوئی چیز جھپتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے کھانکھار کر اپنا گلا صاف کرنے کی کوشش کی۔ اسے اب اپنے سینے میں بھی ٹھنکن کا احساس ہونے لگا۔ چند گہرے سانس لے کر اس نے اس ٹھنکن کو کم کرنے کی کوشش کی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے دو تین بار نیچے تھوکا اور ایک بار پھر سیڑھیاں اترنے کے لئے قدم بڑھایا۔ وہ یک دم ٹھٹھک گیا۔ اس کے ناک میں عجیب سی سنسانٹ ہوئی اور پھر یک دم کوئی چیز پوری قوت سے پہنچ گئی۔ وہ بے اختیار کمر کے بل جھک گیا۔ ایک دھماکی صورت میں اس کی ناک سے نکلنے والا خون سیڑھیوں پر گرنے لگا تھا۔ ماربل پر پھسلتا ہوا خون، دوا سے دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

گالف کلب میں تقریباً تقسیم انعامات منعقد کی جارہی تھی۔ سولہ سالہ سالار سکندر بھی انڈر سکین میں کیپٹن کی میس seven under par کے اسکور کے ساتھ پہلی پوزیشن کی ٹرائی وصول کرنے کے لئے موجود تھا۔

سکندر عثمان نے سالار سکندر کا نام پکارے جانے پر تالیاں بجاتے ہوئے اس ٹرائی کیبنٹ کے بارے میں سوچا، جس میں اس سال انہیں کچھ مزید تبدیلیاں کروانی پڑیں گی۔ سالار کو ملنے والی شیلڈز اور ٹرائی کی تعداد اس سال بھی پچھلے سالوں جیسی ہی تھی۔ ان کے تمام بچے ہی پڑھائی میں بہت اچھے تھے مگر سالار سکندر باقی سب سے مختلف تھا۔ ٹرائی، شیلڈز اور سرٹیفیکیشن کے معاملے میں وہ سکندر عثمان کے باقی بچوں سے بہت آگے تھا۔ ۱۵۰ آئی کیو کیل کے حامل اس بچے کا مقابلہ کرنا ان میں سے کسی کے لئے ممکن

تھا بھی نہیں۔

فخریہ انداز میں تالیاں بجاتے ہوئے سکندر عثمان نے دائیں طرف بھٹی ہوئی اپنی بیوی سے سرگوشی میں کہا: "یہ گالف میں اس کی تیرہویں اور اس سال کی چوتھی ٹرائی ہے۔"

"ہر چیز کا حساب رکھتے ہو تم۔" اس کی بیوی نے مسکراتے ہوئے جیسے قدرے ستائشی انداز میں اپنے شوہر سے کہا، جس کی نظریں اس وقت مہمان خصوصی سے ٹرائی وصول کرتے ہوئے سالار پر مرکوز تھیں۔

"صرف گالف کا اور کیوں، وہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔" سکندر عثمان نے اپنی بیوی کو دیکھا جواب سیٹ کی طرف جاتے ہوئے سالار کو دیکھ رہی تھی۔

"I bet" اگر یہ اس وقت اس مقابلے میں شرکت کرنے والے پروفیشنل کھلاڑیوں کے ساتھ کھیل رہا ہو تا تو بھی اس وقت اس کے ہاتھ میں یہی ٹرائی ہوتی۔ "سکندر عثمان نے بیٹے کو دودھ سے دیکھتے ہوئے کچھ فخریہ انداز میں دعویٰ کیا۔ سالار اب اپنی سیٹ کے اطراف میں موجود دوسری سیٹوں پر موجود دوسرے انعامات حاصل کرنے والوں سے ہاتھ ملانے میں مصروف تھا۔ ان کی بیوی کو سکندر عثمان کے دعویٰ پر کوئی حیرانی نہیں ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھیں سالار کے بارے میں یہ ایک باپ کا جذباتی جملہ نہیں تھا۔ وہ واقعی اتنا ہی غیر معمولی تھا۔

اسے دو ہفتے پہلے اپنے بھائی زہیر کے ساتھ اسی گالف کورس پر افکارہ ہول پر کھیلنا جانے والا گالف کا میچ یاد آیا۔ rough میں اتفاقاً گر جانے والی ایک بال کو وہ جس صفائی اور مہارت کے ساتھ واپس گرین پر لایا تھا اس نے زہیر کو بخیریت کر دیا، وہ پہلی بار سالار کے ساتھ گالف کھیل رہا تھا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا۔" افکارہ ہول کے حاضر تک کسی کو بھی یہ یاد نہیں تھا کہ اس نے یہ جملہ کتنی بار بولا تھا۔

rough سے کھیل جانے والی اس شات نے اگر اسے بخیریت کیا تھا تو سالار سکندر کے Pullers نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔ گیند کو ہول میں جاتے دیکھ کر اس نے کلب کے سہارے کھڑے کھڑے صرف گردن موڑ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں سالار سکندر اور اس ہول کے درمیان موجود فاصلے کو ماپا تھا اور پھر جیسے بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے سالار کو دیکھا۔

"آج سالار صاحب اچھا نہیں کھیل رہے۔" زہیر نے مڑ کر بے یقینی کے عالم میں اپنے پیچھے کھڑے کیڑی کو دیکھا جو گالف کارٹ پکڑے سالار کو دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

"ابھی یہ اچھا نہیں کھیل رہا؟" زہیر نے کچھ استہزاء سے انداز میں کلب کے کیڑی کو دیکھا۔ "ہاں صاحب ورنہ بال بھی rough میں نہ جاتی۔" کیڑی نے بڑے معمول کے انداز میں انہیں بتایا۔ "آپ آج یہاں پہلی بار کھیل رہے ہیں اور سالار صاحب پچھلے سات سال سے یہاں کھیل رہے ہیں۔"

میں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ آج وہ اچھا نہیں کھیل رہے۔

کیدی نے زیر کی معلومات میں اضافہ کیا اور زیر نے اپنی بہن کو دیکھا جو غریب انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

"انگلی بار میں پوری تیاری کے ساتھ آؤں گا اور انگلی بار کھیل کی جگہ کا انتخاب بھی میں کروں گا۔" زیر نے کچھ خفت کے عالم میں اپنی بہن کے ساتھ سالار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"any time any place" (کسی بھی وقت کسی بھی جگہ) انہوں نے اپنے بیٹے کی طرف سے اپنے بھائی کو براہ اعتماد انداز میں چیلنج کرتے ہوئے کہا "میں تمہیں اس ویک اینڈ پر ٹی اے اور ڈی اے کے ساتھ کراچی بلواتا چاہتا ہوں۔" انہوں نے سالار کے قریب پہنچ کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ سالار مسکرایا۔

"کس لئے.....؟"

"میرے behalf پر تمہیں کراچی پیئر آف کارس کے صدر کے ساتھ ایک میچ کھیلنا ہے میں اس بار الیکشن میں اس سے ہار اہوں، مگر وہ اگر کسی سے گالف کا میچ ہار گیا تو اسے پارٹ ایک ہو جائے گا اور وہ بھی ایک بچے کے ہاتھوں so let's settle the scores بھائی کی بات پر ہنسی تھیں، مگر سالار کے ماتھے پر چند قطرے نمودار ہو گئے تھے۔

"بچہ؟" اس نے ان کے جیلے میں موجود واحد قابل اعتراض نقطہ پر زور دیتے ہوئے اسے دہرایا۔ "میرا خیال ہے انکل! مجھے کل آپ کے ساتھ اٹھارہ موٹر کا ایک اور ٹیم کرنا پڑے گا۔"

☆.....☆.....☆

احمد دروازہ کھول کر اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوا۔

"امی! آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"ہاں کہو..... کیا بات ہے؟"

احمد صوفے پر بیٹھ گیا۔ "آپ ہاشم انکل کی طرف نہیں گئیں؟"

"جی نہیں۔ کیوں کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں اماں اس ویک اینڈ پر آئی ہوئی ہے۔"

"اچھا..... آج شام کو چلیں گے..... تم گئے تھے وہاں؟" کھلیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں گیا تھا۔"

"کیسی ہے وہ..... اس بار تو خاصے عرصے کے بعد آئی ہے۔" کھلیہ کو یاد آیا۔

"ہاں دوما کے بعد....." کھلیہ کو احمد کچھ الجھا ہوا لگا۔

"کوئی مسئلہ ہے؟"

"امی! مجھے اماں پچھلے کچھ عرصے سے بہت بدلی بدلی لگ رہی ہے۔" اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"بدلی بدلی؟ کیا مطلب؟"

"مطلب تو میں شاید آپ کو نہیں سمجھا سکتا، بس اس کا رویہ میرے ساتھ کچھ عجیب سا ہے۔" احمد نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"آج تو وہ ایک معمولی سی بات پر ناراض ہو گئی۔ پہلے جیسی کوئی بات ہی نہیں رہی اس میں..... میں سمجھ نہیں پار ہاں کہ اسے ہو اکیا ہے۔"

"تمہیں وہم ہو گیا ہو گا احمد..... اس کا رویہ کیوں بدلنے لگا..... تم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو کر سوچ رہے ہو۔" کھلیہ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

"نہیں امی..... پہلے میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید مجھے وہم ہو گیا ہے لیکن اب خاص طور پر آج مجھے اپنے یہ احساسات صرف وہم نہیں لگے ہیں۔ وہ بہت اگڑے سے انداز میں بات کرتی رہی مجھ سے۔" "تمہارا کیا خیال ہے، اس کا رویہ کیوں بدل گیا ہے؟" کھلیہ نے برش میز پر رکھے ہوئے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا؟"

"تم نے پوچھا اس سے؟"

"ایک بار نہیں کئی بار....."

"پھر.....؟"

"ہر بار آپ کی طرح وہ بھی یہی کہتی ہے کہ مجھے غلط فہمی ہو گئی ہے۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"کبھی وہ کہتی ہے اسٹریز کی وجہ سے ایسا ہے..... کبھی کہتی ہے وہ اب بچھو رہی ہیں اس لئے....."

"یہ ایسی کوئی غلط بات تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے واقعی یہ بات ہو۔" کھلیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"امی! بات سمجھ گئی کی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ مجھ سے کھرانے لگی ہے۔" احمد نے کہا۔

"تم فضول باتیں کر رہے ہو احمد! میں نہیں سمجھتی کہ ایسی کوئی بات ہو گی، ویسے بھی تم دونوں تو

بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہو، ایک دوسرے کی عادات سے واقف ہو۔"

کھلیہ کو بیٹے کے خدشات بالکل بے معنی لگے۔

"ظاہر ہے۔ عمر کے ساتھ کچھ تبدیلیاں آتی جاتی ہیں، اب بچے تو رہے نہیں ہو تم لوگ..... تم

معمولی معمولی باتوں پر پریشان ہونے کی عادت چھوڑ دو....." انہوں نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ویسے بھی ہاشم بھائی اگلے سال اس کی شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ بعد میں اپنی تعلیم

کمل کرتی رہے گی۔ کم از کم وہ تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔" کلیڈ نے انکشاف کیا۔

"انکل نے ایسا کب کہا؟" امجد کچھ چونکا۔

"کئی بار کہا ہے..... میرا خیال ہے وہ لوگ تو تیاریاں بھی کر رہے ہیں۔" امجد نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔

"ہو سکتا ہے امامہ اسی وجہ سے قدرے پریشان ہو۔"

"ہاں ہو سکتا ہے..... بہر حال یہ ہی صحیح ہے۔ اگلے سال شادی ہو جانی چاہئے۔" امجد نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ سولہ سترہ سال کا ایک دبلا پتلا مگر لمبا لڑکا تھا، اس کے چہرے پر بلوغت کا وہ گہرا دواں نظر آرہا تھا جسے ایک بار بھی شبید نہیں کیا گیا تھا اور اس روئیں نے اس کے چہرے کی مصمصیت کو برقرار رکھا تھا۔ وہ اسپورٹس شارٹس اور ایک ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے ہوتے تھا۔ اس کے جیروں میں کاشن کی جرابیں اور جاگرز تھے، جو گم چماتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی بے چینی اور اضطراب تھا۔

وہ اس وقت ایک پر جھوم مرکز کے بچوں کے بچوں کے ایک بیوی ڈیوٹی موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا تیزی سے تقریباً اسے اڑائے لے جا رہا تھا۔ وہ کسی قسم کے ہیملٹ کے بغیر تھا اور بہت ریش انداز میں موٹر سائیکل کو چلا رہا تھا۔ اس نے دو دفعہ ٹکٹل توڑا..... تین دفعہ خطرناک طریقے سے کچھ گاڑیوں کو اور ٹک کیا..... چار دفعہ بائیک چلاتے چلاتے اس کا آگاہیہ اٹھا دیا اور کتنی ہی دیر دور تک صرف ایک پیسے پر بائیک چلاتا رہا..... دو دفعہ دائیں بائیں دیکھے بغیر اس نے برقی رفتار سے اپنی مرضی کا ٹرن لیا..... ایک دفعہ وہ زگ زبگ انداز میں بائیک چلانے لگا، دھمے دفعہ اس نے پوری رفتار سے بائیک چلاتے ہوئے اپنے دونوں پاؤں اٹھا دیئے۔

بھر یک دم اسی رفتار سے بائیک چلاتے ہوئے اس نے دن وے کی خلاف ورزی کرتے اس لین کو توڑا اور دوسری لین میں زنانے کے ساتھ ٹکس گیا، سامنے سے آتی ہوئی ٹریک کی بریکیں یک دم چرچانے لگیں..... اس نے نفل اسپینڈر پر بائیک چلاتے ہوئے یک دم ہینڈل پر سے اپنے ہاتھ ہٹا دیئے۔ بائیک پوری رفتار کے ساتھ سامنے سے آنے والی گاڑی کے ساتھ ٹکرائی، وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ہوا میں بلند ہوا اور پھر کسی چیز پر گر..... اسے اندازہ نہیں ہوا۔ اس کا ذہن تاریک ہو چکا تھا۔

وہ دونوں لڑکے اسٹیج پر ایک دوسرے کے بالفاظیل روزمرہ کے پیچھے کھڑے تھے، مگر ہال میں موجود اسٹوڈنٹس کی نظریں ہمیشہ کی طرح ان میں سے ایک پر مرکوز تھیں، وہ دونوں ہیڈ بوائے کے

استحاب کے لئے کنوینٹ کر رہے تھے اور وہ پروگرام بھی اس کا ایک حصہ تھا۔ دونوں کے روزمرہ پر ایک ایک پوسٹر لگا ہوا تھا، جن میں سے ایک پر ووٹ فار سالار اور دوسرے پر ووٹ فار فیضان لکھا ہوا تھا۔

اس وقت فیضان ہیڈ بوائے بن جانے کے بعد اپنے ممکنہ اقدامات کا اعلان کر رہا تھا، جب کہ سالار پوری سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھتے میں مصروف تھا۔ فیضان اسکول کا سب سے اچھا مقرر تھا اور اس وقت بھی وہ اپنے جوش و خلبات کے کمال دکھانے میں مصروف تھا اور اسی برٹش لب و لہجہ میں بات کر رہا تھا جس کے لئے وہ مشہور تھا۔ بہترین سٹوڈنٹس کی وجہ سے اس کی آواز اور انداز دونوں ہی خاصے متاثر کن تھے۔ ہال میں بلاشبہ سکوت طاری تھا اور یہ خاموشی صرف اسی وقت فوجی جب فیضان کے سپورٹرز اس کے کسی اچھے جملے پر داد دینا شروع ہوتے ہال یک دم تالیوں سے گونج اٹھتا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ جب اپنے لئے ووٹ کی اپیل کرنے کے بعد خاموش ہوا تو ہال میں اگلے کئی منٹ تالیاں اور سیٹیاں بجتی رہیں۔ ان تالیاں بجانے والوں میں خود سالار سکندر بھی شامل تھا۔ فیضان نے ایک قاتمانہ نظر ہال پر اور سالار پر ڈالی اور اسے تالیاں بجاتے دیکھ کر اس نے گردن کے ہلکے سے اشارے سے اسے سراہا، سالار سکندر آسمان حریف نہیں تھا یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

اسٹیج سیکرٹری اب سالار سکندر کے لئے انٹروسمٹ کر رہا تھا۔ تالیوں کی گونج میں سالار نے بولنا شروع کیا۔

"مذہبانک فرینڈز....." وہ ایک لمحہ ٹھہرا۔ "فیضان اکبر ایک مقرر کے طور پر یقیناً ہمارے اسکول کا دانش ہیں۔ میں یاد دہراؤں کوئی بھی ان کے مقابلے میں کسی اسٹیج پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اس نے فیضان کے چہرے کو دیکھا۔ جس پر ایک فخریہ مسکراہٹ ابھر رہی تھی مگر سالار کے جملے کے باقی حصے نے اگلے لمحے اس مسکراہٹ کو غائب کر دیا۔

"اگر معاملہ صرف باتیں بتانے کا ہو تو....."

ہال میں جگہ سی کلکلاٹھیں ابھریں۔ سالار کے لہجے کی سنجیدگی برقرار تھی۔

"مگر ایک ہیڈ بوائے اور مقرر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مقرر کو باتیں کرنی ہوتی ہیں۔ ہیڈ بوائے کو کام کرنا ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان فرق talker اور doer کا ہوتا ہے اور

great talkers are not great doers سالار کے سپورٹرز کی تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔

"میرے پاس فیضان اکبر جیسے خوب صورت لفظوں کی روانی نہیں ہے۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میرے پاس صرف میرا نام ہے اور میرا متاثر کن دیکھاؤ اور مجھے کنوینٹ کے لئے لفظوں کے

کوئی دریا نہیں بہانے، مجھے صرف چند الفاظ کہنے ہیں۔" وہ ایک بار پھر زکا۔

"trust me and vote for me" (مجھ پر اعتماد کریں اور مجھے ووٹ دیں)۔

اس نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے جس وقت اپنے ہانگ کو آف کیا اس وقت ہال تالیوں سے گونج رہا تھا ایک منٹ چالیس سیکنڈ میں وہ اسی پے گئے اور calculated انداز میں بولا تھا، جو اس کا خاصا تھا..... اور اسی ڈیزہ منٹ نے فیضان کا تختہ کر دیا تھا۔

اس ابتدائی تعارف کے بعد دونوں امیدواروں سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ سالار سکندر ان جوابات میں بھی اتنے ہی اختصار سے کام لے رہا تھا جتنا اس نے اپنی تقریر میں لیا تھا۔ اس کا سب سے طویل جواب چار جملوں پر مشتمل تھا جب کہ فیضان کا سب سے مختصر جواب بھی چار جملوں پر مشتمل نہیں تھا۔ فیضان کی وہ فصاحت و بلاغت جو پہلے اس کی خوبی سمجھی جاتی تھی اس وقت اس اسٹیج پر سالار کے مختصر جوابات کے سامنے چرب زبانی نظر آرہی تھی اور اس کا احساس خود فیضان کو بھی ہو رہا تھا، جس سوال کا جواب سالار ایک لفظ یا ایک جملے میں دیتا، اس کے لئے فیضان کو عاداتاً تمہید یا مدحی پڑتی اور سالار کا اپنی تقریر میں اس کے بارے میں کیا ہوا یہ تبصرہ وہاں موجود اسٹوڈنٹس کو کچھ اور صبح محسوس ہوتا کہ ایک مقرر صرف باتیں کر سکتا ہے۔

”سالار سکندر کو ہیڈ بوائے کیوں ہونا چاہئے؟“ سوال کیا گیا۔

”کیونکہ آپ بہترین شخص کا انتخاب چاہتے ہیں۔“ جواب آیا۔

”کیا یہ جملہ خود ستائشی نہیں ہے؟“ اعتراض کیا گیا۔

”نہیں یہ جملہ خود شناسی ہے۔“ اعتراض کو رد کر دیا گیا۔

”خود ستائشی اور خود شناسی میں کیا فرق ہے؟“ ایک بار پھر جیسے ہوئے لہجے میں پوچھا گیا۔

”وہی جو فیضان اکبر اور سالار سکندر میں ہے۔“ سنجیدگی سے کہا گیا۔

”اگر آپ کو ہیڈ بوائے نہ بنایا تو آپ کو کیا فرق پڑے گا؟“

”فرق مجھے نہیں آپ کو پڑے گا۔“

”کیسے.....؟“

”اگر بہترین آدمی کو ملک کا لیڈر نہ بنایا جائے تو فرق قوم کو پڑتا ہے، اس بہترین آدمی کو نہیں۔“

”آپ اپنے آپ کو پھر بہترین آدمی کہہ رہے ہیں۔“ ایک بار پھر اعتراض کیا گیا۔

”کیا اس ہال میں کوئی ایسا ہے جو خود کو برے آدمی کے ساتھ equate کرے؟“

”ہو سکتا ہے ہو؟“

”پھر میں اس سے ملتا چاہوں گا۔“ ہال میں ہنسی کی آوازیں ابھریں۔

”ہیڈ بوائے بننے کے بعد سالار سکندر جو تہدیلیاں لائے گا اس کے بارے میں بتائیں۔“

”تہدیلی بتائی نہیں جاتی دکھائی جاتی ہے اور یہ کام میں ہیڈ بوائے بننے سے پہلے نہیں کر سکتا۔“

چند اور سوال کئے گئے پھر اسٹیج نیکرٹری نے حاضرین میں سے ایک آخری سوال لیا۔ وہ ایک سری لنکن لڑکا تھا جو کچھ شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا۔

”مگر آپ میرے ایک سوال کا جواب دے دیں تو میں اور میرا پورا گروپ آپ کو ووٹ دے گا۔“ سالار اس کی بات پر مسکرایا۔ ”جواب دینے سے پہلے میں جاننا چاہوں گا کہ آپ کے گروپ میں کتنے لوگ ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بیس.....“ اس لڑکے نے کہا۔

سالار نے سر ہلایا ”او کے۔ سوال کریں۔“

”آپ کو کچھ حساب کتاب کرتے ہوئے مجھے بتانا ہے کہ اگر ہم 267895 میں 952852 کو جمع کریں پھر اس میں سے 399999 کو تفریق کریں پھر اس میں 929292 کو جمع کریں اور اسے.....“ وہ سری لنکن لڑکا غبر غبر کر ایک کاغذ پر لکھا ہوا ایک سوال پوچھ رہا تھا۔ ”مجھے کے ساتھ ضرب دیں پھر اسے دو کے ساتھ تقسیم کریں اور جواب میں 492359 کو جمع کر دیں تو کیا جواب آئے.....“ وہ لڑکا اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔

”8142473 بڑی برق رفتاری کے ساتھ سالار نے جواب دیا۔ اس لڑکے نے کاغذ پر ایک نظر دوڑائی اور پھر کچھ بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے تالیاں بجانے لگا۔ فیضان اکبر کو اس وقت اپنا آپ ایک ایکٹر سے زیادہ نہیں لگا۔ پورا ہال اس لڑکے کے ساتھ تالیاں بجانے میں مصروف تھا۔ فیضان اکبر کو وہ پورا پروگرام ایک مذاق محسوس ہونے لگا۔

ایک لمحے کے بعد جب وہ سالار سکندر سے پہلے اس اسٹیج سے اتر رہا تھا تو وہ جانتا تھا کہ وہ مقابلے سے پہلے ہی مقابلہ ہار چکا تھا۔ 150 کے آئی کیو لیول والے اس لڑکے سے اسے زندگی میں اس سے پہلے کبھی اتنا حسد محسوس نہیں ہوا۔

☆.....☆.....☆

”ایمانہ آپا! آپ لاہور کب جائیں گی؟“

”وہ اپنے فرائض کو دیکھتے ہوئے چوگی۔ سر اٹھا کر اس نے سعد کو دیکھا۔ وہ سائیکل کی رفتار کو اب بالکل آہستہ کئے اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔

”کل..... کیوں.....؟ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ایمانہ نے اپنی قائل بند کرتے ہوئے کہا۔

”جب آپ چلی جاتی ہیں تو میں آپ کو بہت مس کرتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”کیوں.....؟“ ایمانہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیونکہ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور آپ میرے لئے بہت سے کھلونے لاتی ہیں اور آپ مجھے

میر کر دانے لے کر جاتی ہیں اور آپ میرے ساتھ کھیتی ہیں اس لئے۔" اس نے تفصیل جواب دیا۔
 "آپ مجھے اپنے ساتھ لاہور نہیں لے جاسکتیں؟" امامہ اندازہ نہیں کر سکی، یہ تجویز تھی یا سوال.....
 "میں کیسے لے جاسکتی ہوں..... میں تو خود ہاسٹل میں رہتی ہوں، تم کیسے رہو گے وہاں؟" امامہ نے کہا۔

سعد سائیکل چلاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا پھر اس نے کہا "تو پھر آپ جلدی یہاں آیا کریں۔"
 "اچھا۔ جلدی آیا کروں گی۔" امامہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم ایسا کیا کرو کہ مجھ سے فون پر بات کر لیا کرو۔ میں فون کیا کروں گی جہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سعد کو اس کی تجویز پسند آئی۔ سائیکل کی رفتار میں اضافہ کرتے ہوئے وہ لان کے لمبے لمبے پتھر کاٹنے لگا۔ امامہ بے دھیانی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔

وہ اس کا بھائی نہیں تھا، دس سالہ سعد پانچ سال پہلے ان کے گھر آیا تھا کہاں سے آیا تھا اس کے بارے میں وہ نہیں جانتی تھی، کیونکہ اسے اس کے بارے میں اس وقت کوئی تجسس نہیں ہوا تھا مگر کیوں لایا گیا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ سعد اب دس سال کا تھا اور وہ گھر میں بالکل مکمل مل گیا تھا۔ امامہ سے وہ سب سے زیادہ مانوس تھا۔ امامہ کو اس پر اکثر ترس آتا۔ ترس کی وجہ اس کا لاوارث ہونا نہیں تھا۔ ترس کی وجہ اس کا مستقبل تھا..... اس کے دو چچاؤں اور ایک تایا کے گھر بھی اس وقت اسی طرح کے گود لئے ہوئے بیچے پل رہے تھے۔ وہ ان کے مستقبل پر بھی ترس کھانے پر مجبور تھی۔

فائل کاٹھ میں پکڑے سائیکل پر لان میں کھوٹے سعد پر نظریں جمائے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ اسی طرح کی بہت سی سوچوں میں الجھ جاتی تھی مگر اس کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ چاروں اس وقت لاہور کے ریڈ لائن ایریا میں موجود تھے۔ ان کی عمریں اٹھارہ، انیس سال کے لگ بھگ تھیں اور اپنے حلیے سے وہ چاروں اپر کلاس کے لگتے تھے مگر وہاں پر نہ ان کی عمر کوئی نمایاں کر دینے والی چیز تھی نہ ہی ان کی اپر کلاس سے تعلق رکھنے کی امتیازی خصوصیت..... کیونکہ وہاں پر ان سے بھی کم عمر لڑکے آتے تھے اور اپر کلاس اس علاقے کے مستقل کسٹمرز میں شامل تھی۔

چاروں لڑکے ریڈ لائن ایریا کی نوٹی ہوئی گلیوں سے گزرتے جا رہے تھے، تین لڑکے آپس میں باتیں کر رہے تھے، جب کہ صرف چوتھا قدرے تجسس اور دلچسپی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، بچوں لگ رہا تھا جیسے وہ پہلی بار وہاں آیا تھا اور ان تینوں کے ساتھ تھوڑی دیر بعد ہونے والی اس کی کھٹک سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ واقعی وہاں پہلی بار آیا تھا۔

گلی کے دونوں اطراف میں کھلے دروازوں میں بٹاؤ سنگھار کئے نیم عریاں کپڑوں میں ملبوس ہر عمر اور ہر شکل کی عورت کھڑی تھیں سفید..... سافولی..... سیاہ..... گندی..... بہت خوب صورت..... درمیانی..... اور معمولی شکل و صورت والی۔

گلی میں سے ہر شکل اور عمر کا مرد گزر رہا تھا۔ وہ لڑکا وہاں سے گزرتے ہوئے ہر چیز پر غور کر رہا تھا۔
 "تم یہاں کتنی بار آئے ہو؟" چلتے چلتے اس لڑکے نے اچانک اپنے دائیں طرف چلنے والے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ لڑکا جواباً "کتنی بار.....؟" یہ تو پتا نہیں..... اب تو کتنی بھی بھول چکا ہوں، اکثر آتا ہوں یہاں پر۔" اس لڑکے نے قدرے فخریہ انداز میں کہا۔

"ان عورتوں میں مجھے تو کوئی اٹریکشن محسوس نہیں ہو رہی۔"

"nothing special about them" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"اگر کہیں رات ہی گزارنی ہو تو کم از کم environment (ماحول) تو اچھا ہو۔"

"it's such a dirty, filthy place." (یہ تو بہت ہی گندی جگہ ہے) اس نے گلی میں موجود

گڑھوں اور کوڑے کے ڈھیروں کو دیکھتے ہوئے کچھ ناگواری سے کہا۔

"پھر گرل فرینڈز کے ہوتے ہوئے یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے اس بار اپنی بیٹیوں اچکاتے ہوئے کہا۔

"اس جگہ کا اپنا ایک چارم ہے۔ گرل فرینڈز اور یہاں کی عورتوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ گرل فرینڈز اس طرح کے ڈانس تو نہیں دکھا سکتیں جو ابھی کچھ دیر بعد تم دیکھو گے۔" تیسرا لڑکا ہنسنا۔ "اور پھر پاکستان کی جس بڑی ایکٹریس کا ڈانس دکھانے ہم جہیں لے جا رہے ہیں وہ تو میں....."

دوسرے لڑکے کی بات کو پہلے لڑکے نے کاٹ دیا۔ "اس کا ڈانس تو تم پہلے بھی مجھے دکھائے ہو۔"
 "اے وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بھائی کی شادی پر ایک بچہ لایا تھا..... مگر یہاں پر تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

"وہ ایکٹریس تو ایک پوش علاقے میں رہتی ہے پھر یہاں کیوں آتی ہے؟" پہلے لڑکے نے کچھ غیر مطمئن انداز میں اس سے پوچھا۔

"یہ تم آج خود اس سے پوچھ لیتا میں کبھی اس سے اس طرح کے سوال نہیں کرتا۔" دوسرے لڑکے کی بات پر باقی دونوں لڑکے ہنسے مگر تیسرا لڑکا اسی طرح چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

ان کا سفر بالآخر اس گلی کے آخر میں ایک عمارت کے سامنے ختم ہو گیا، عمارت کے نیچے موجود دکان سے تینوں لڑکوں نے سوچے کے بہت سے ہار خریدے اور اپنی کلائیوں میں لپیٹ لئے۔ ایک ہار

دوسرے لڑکے نے اس لڑکے کی کھائی میں بھی پیٹ دیا جو وہاں آنے پر اعتراض کر رہا تھا پھر ان لوگوں نے وہاں سے پان خریدے۔ تمباکو والا پان دوسرے لڑکے نے اس لڑکے کو بھی دیا جو شاید زندگی میں پہلی بار پان کھا رہا تھا۔ پان کھاتے ہوئے وہ چاروں اس عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اوپر پہنچ کر پہلے لڑکے نے ایک بار پھر تنہی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔ وہ جگہ بہت صاف ستھری اور خاصی حد تک آراستہ تھی۔

گاؤ کیے اور چاند نیاں بھیجی ہوئی تھیں اور ہار یک پر دے لہرا رہے تھے، کچھ لوگ پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ رقص ابھی شروع نہیں ہوا تھا ایک عورت لہجی ہوئی ان کی طرف آئی۔ اس کے چہرے پر ایک خوب صورت مصنوعی مسکراہٹ تھی ہوئی تھی اس نے دوسرے لڑکے کو مخاطب کیا پہلے لڑکے نے غور سے اس عورت کو دیکھا۔ او جڑ عمر کی وہ عورت اپنے چہرے پر بے تماشائیک اپ تھوپے اور بالوں میں موہے اور گلاب کے سبھرے لٹکائے، ہیلوں کی ایک چمکھڑی ہوئی سرخ ساڑھی میں ملبوس تھی۔ جس کا بلاؤ ذرا اس کے جسم کو چھپانے میں ناکام ہو رہا تھا مردہ جسم کو چھپانے کے لئے پہنا گیا بھی نہیں تھا۔ ان چاروں کو وہ ایک کونے میں لے گئی اور وہاں اس نے انہیں بٹھادیا۔

پہلے لڑکے نے وہاں بیٹھتی ہی منہ میں موجود پان اُس اگالہ دن میں تھوک دیا، جو ان کے قریب موجود تھا کیونکہ پان منہ میں ہوتے ہوئے اس سے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا، پان کا ذائقہ بھی اس کے لئے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ تینوں لڑکے وہاں بیٹھے مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے جب کہ پہلا لڑکا اس ہال کے چاروں طرف موجود گاؤں کیوں سے ٹیک لگائے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہا جن میں سے کچھ اپنے سامنے شراب کی بوتلیں اور نوٹوں کی گندیاں رکھے بیٹھے تھے۔ ان میں سے اکثریت سفید لہجے کے کھف لگے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس نے عید کے اجتماعات کے علاوہ آج پہلی بار کسی اور جگہ پر سفید لباس پہننے والوں کا اتنا بڑا اجتماع دیکھا تھا۔ خود وہ اپنے ساتھیوں کی طرح سیاہ جینز اور اسی رنگ کی آدمیے بازوؤں والی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ ان کی عمر کے کچھ اور لڑکے بھی وہاں انہیں کی طرح جینز اور ٹی شرٹس میں ملبوس تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور عورت اسی طرح کے چمچے چمکھڑے رنگوں والے کپڑوں میں ملبوس وہاں آکر ہال کے درمیان میں بیٹھ کر ایک غزال سانے لگی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ ساڑھوے بھی تھے۔ دو غزلیں سانے اور اپنے اوپر اچھالے جانے والے کچھ نوٹ اٹھا کر وہ خاصی خوش اور مطمئن والہی چلی گئی اور اس کے جانے کے فوراً بعد ہی ظہم انڈسٹری کی وہ ایکٹریس ہال میں داخل ہوئی اور ہال میں موجود ہر مرد کی نظر اس سے جیسے چپک کر رہ گئی تھی۔ اس نے ہال میں باری باری چاروں طرف گھوم کر ہر ایک کوسر کے اشارے سے خوش آمدید کہا تھا۔

سازندوں کو اس بار کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ کیسٹ پلیئر پر باری باری چند ہیجان انگیز گانے لگائے گئے تھے جن پر اس عورت نے اپنا رقص پیش کرنا شروع کیا تھا اور کچھ دیر پہلے کی خاموشی ایک دم ختم ہو گئی تھی چاروں طرف موجود مرد اس عورت کو داد و تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ شراب نوشی میں مصروف تھے۔ ان میں سے کچھ جو زیادہ جوش میں آ رہے تھے وہ اُنھ کو اس ایکٹریس کے ساتھ ڈانس میں مصروف ہو جاتے۔

ہال میں واحد شخص جو اپنی جگہ پر کسی حرکت کے بغیر بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا وہی لڑکا تھا مگر اس کے باوجود یہ اندازہ لگا مشکل نہیں تھا کہ وہ اس ایکٹریس کے رقص سے خاصا مفلوج ہو رہا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب اس ایکٹریس نے اپنا رقص ختم کیا تو وہاں موجود آدمی سے زیادہ مرد ایسا غفلت ہو چکے تھے، واپس مگر جانا ان کے لئے زیادہ مسئلہ اس لئے نہیں تھا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی گھر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ سب وہاں رات گزارنے آئے تھے۔ ان چاروں نے بھی رات وہاں گزاری۔

اگلے دن وہاں سے واپسی پر گاڑی میں اس دوسرے لڑکے نے جمائی لیتے ہوئے پہلے لڑکے سے پوچھا، جو اس وقت لاہروائی سے گاڑی سے باہر دیکھنے میں مصروف تھا۔

”کیسا رہا یہ تجربہ؟“

”اچھا تھا.....“ پہلے لڑکے نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

”بس اچھا تھا..... اور کچھ نہیں..... تم بھی بس.....“ اس نے قدرے ناراضی کے عالم میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کبھی کبھار جانے کے لئے اچھی جگہ ہے..... اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں..... مگر something special والی کوئی بات نہیں ہے۔ میری گرل فرینڈ اس لڑکی سے بہتر ہے جس کے ساتھ میں نے رات گزاری ہے۔“

اس لڑکے نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

☆.....☆.....☆

ڈانٹک نیکل پر ہاشم بین کی پوری فیملی موجود تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ سب آپس میں خوش گپوں میں بھی مصروف تھے۔ موضوع گفتگو اس وقت امامہ تھی جو اس ویک اینڈ پر بھی اسلام آباد میں موجود تھی۔

”بابا..... آپ نے یہ بات نوٹ کی کہ امامہ دن بہ دن مسجد سے مسجد ہوتی جا رہی ہے۔“ وہم نے قدرے چمپیرنے والے انداز میں امامہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ یہ تو میں بھی چھپے کئی ماہ سے نوٹ کر رہا ہوں۔" ہاشم بھین نے دسم کی بات پر بچی کے چہرے سے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

امامہ نے چاولوں کا چھوٹا منہ میں رکھتے ہوئے دسم کو گھور دیا۔
"کیوں امامہ! کوئی مسئلہ ہے؟"

"بابا! یہ بڑی فضول باتیں کرتا ہے اور آپ بھی خواستہ اس کی باتوں میں آ رہے ہیں۔ میں اپنی اسطر کی وجہ سے مصروف اور سنجیدہ ہوں۔ اب ہر کوئی دسم کی طرح نکلا تو نہیں ہوتا۔" اس نے اپنے ساتھ بیٹھے دسم کے کندھے پر کچھ ناراضی سے ہلکا سا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"بابا! آپ ذرا اندازہ کریں، میڈیکل کے شروع کے سالوں میں اس کا یہ حال ہے تو جب یہ ڈاکٹر بن جائے گی تب اس کا کیا حال ہو گا۔" دسم نے امامہ کی تنبیہ کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔
"سالوں گزر جایا کریں گے مس امامہ ہاشم کو مسکرائے ہوئے۔"

ڈانٹنگ نیمبل پر موجود لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ان دونوں کے درمیان یہ فوک جمو یک ہیٹھ ہی رہتی تھی۔ بہت کم مواقع ایسے ہوتے تھے جب دونوں اکٹھے ہوں اور ان کے درمیان آپس میں جھگڑا نہ ہو۔ مستقل بنیادوں پر ہوتے رہنے والے ان جھگڑوں کے باوجود امامہ کی سب سے زیادہ دوستی بھی دسم کے ساتھ ہی تھی۔ اس کی وجہ شاید ان کی اوپر تلے کی پیداوار کی بھی تھی۔

"اور آپ تصور کریں کہ....." اس بار امامہ نے اسے اپنی بات مکمل کرنے نہیں دی، اس نے اس کے کندھے پر پوری طاقت سے مکا مار دیا۔ دسم پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔

"ہمارے گھر میں ایک ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا کے سوا اور کیا کیا ہو سکتا ہے۔ آپ اس کا مظاہرہ دیکھ رہے ہیں اس سے آپ یہ اندازہ بھی لگا سکتے ہیں کہ آج کل کے ڈاکٹر زوارڈ میں مریضوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہوں گے۔ ملک میں بڑی جلدی ہوئی شرح اموات کی ایک وجہ....."

"بابا! اس کو منع کریں۔" امامہ نے بالآخر ہتھیار ڈالتے ہوئے ہاشم بھین سے کہا۔

"دسم....." ہاشم بھین نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے دسم کو جھڑکا، وہ بڑی سعادت مندی سے فوراً خاموش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اس نے چہرے لٹکانے کو گراؤنگز میں خالی کر دیا اور پھر اسے بند کر کے چلا دیا۔ خانساں اسی وقت اندر آیا۔

"چھوٹے صاحب! انہیں، میں آپ کی مدد کر دوں۔" وہ اس کی طرف بڑھا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"نہیں میں خود کر لیتا ہوں۔ تم مجھے دودھ کا ایک گلاس دے دو۔" اس نے گراؤنگز آف کرتے ہوئے کہا۔ خانساں ایک گلاس میں دودھ لے کر اس کے پاس چلا آیا۔ دودھ کے آدھے گلاس میں اس نے گراؤنگز میں موجود تمام پاؤڈر ڈال دیا اور ایک چمچ سے اچھی طرح ہلانے لگا پھر ایک ہی سانس میں دودھ پی گیا۔

"کھانے میں آج کیا پکایا ہے تم نے؟" اس نے خانساں سے پوچھا۔

خانساں نے کچھ ڈشز منوانی شروع کر دیں۔ اس کے چہرے پر کچھ ناگوار یا بھری۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا، سونے جا رہا ہوں، مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔"

اس نے سختی سے کہا اور بچن سے نکل گیا۔

چروں میں پہنچی ہوئی ہانسی چپل کو وہ فرش پر تقریباً گھسیٹ رہا تھا۔ اس کی شین بڑی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شرٹ کے چند ایک کے سوا سارے ہی شین کھلے ہوئے تھے۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے دروازے کو لاک کر لیا اور وہاں موجود جہازی ساز کے میوزک سسٹم کی طرف گیا اور کمرے میں یوٹن کا منو لگا دیا۔ وہ منہ بے ترتیبی کے عالم میں لیٹ گیا۔
when a man loves a woman کا بلند آواز میں بچنے لگا۔ وہ ریوٹ لے کر اپنے بیڈ پر آ گیا اور اوندھے منہ بے ترتیبی کے عالم میں لیٹ گیا۔

اس کا ریوٹ والا پایاں ہاتھ بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا اور مسلسل مل رہا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں بھی میوزک کے ساتھ گردش میں تھے۔

کمرے میں بیڈ اور اس کے اپنے طبقے کے علاوہ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ کہیں پر کچھ بھی بے ترتیب نہیں تھا۔ کہیں پر گرد کا ایک ذرہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ میوزک سسٹم کے پاس موجود دیواری فلیٹ میں تمام آلات اور ڈیجیٹل کیسٹس بڑے اچھے طریقے سے لگی ہوئی تھیں۔ ایک دوسری دیوار میں موجود دیسکس پر کئی بوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ کونے میں بڑی ہوئی کمپیوٹر نیمبل سے عیاں تھا کہ اسے استعمال کرنے والا بہت آدمی گناہ ہے۔ کمرے کی مختلف دیواروں پر ہالی وڈ کی اکثر میمو اور وہاں کے چینلز کے پوسٹرز لگے تھے۔ ہاتھ روم کے دروازے اور کمرے کی کڑکیوں کے شیشوں کو پٹے پوائے میگزین سے کالی گچی کچھ مائل ٹری کیوڈ تصویروں سے سجایا گیا تھا، کمرے میں پہلی بار داخل ہونے والا دروازہ کھولتے ہی بہت بڑی طرح چمکتا کیونکہ بالکل سامنے کڑکیوں کے شیشوں پر موجود وہ تصویروں چند لمحوں کے لئے دیکھنے والوں کو تصویروں نہیں بلکہ اصل لڑکیاں نظر آتی تھیں۔ ان تصویروں کو وہاں لگاتے ہوئے ترتیب کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ میوزک سسٹم جس دیوار کے ساتھ موجود تھا اسی دیوار کے ایک کونے میں دیوار پر ایک الیکٹرونک گٹار لٹکایا گیا تھا اور اسی کونے میں ایک کی بورڈ بھی اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا۔ دیوار پر گٹار سے کچھ فاصلے پر piccolo، فلوٹ اور oboe بھی لٹکائے گئے تھے اس کمرے کے کمین کو بیٹینا میوزک سے گہری

"نہیں، اس سے پہلے کا ضروری کام یہ ہے کہ تم ہمیں کچھ کھانے پلانے لے چلو۔" رابعہ نے مدافعت کرتے ہوئے کہا۔

"فی الحال تو یہاں سے چلیں، ہاسٹل جانا ہے مجھے۔" امامہ یک دم آنکھ کرکڑی ہو گئی تو وہ بھی اٹھ گئیں۔

"دیے جویریہ! تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟" ساتھ چلتے ہوئے نضب نے جویریہ سے پوچھا۔
 "بھئی، امامہ نہیں چاہتی تھی..... اس لئے میں نے بھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔" جویریہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ امامہ نے سڑ کر ایک بار پھر جویریہ کو گھورا اس کی نظروں میں حسیہ تھی۔
 "امامہ کیوں نہیں چاہتی تھی..... میری تنگنی ہوئی تو میں تو شور مچاتی ہر جگہ، وہ بھی اس صورت میں جب یہ میری اپنی مرضی سے ہوئی۔" نضب نے بلند آواز میں کہا۔
 امامہ نے اس بار کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

☆.....☆.....☆

"آپ کا بیٹا آبادی کے اس ۲.۵ فیصد حصے میں شامل ہے، جو ۱۵۰ سے زیادہ کا آئی کیو یول رکھتے ہیں۔ اس آئی کیو یول کے ساتھ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ غیر معمولی سہی مگر غیر متوقع نہیں ہے۔" اس غیر ملکی اسکول میں سالار کو جاتے ہوئے ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا تھا جب سکندر عثمان اور ان کی بیوی کو وہاں بلا دیا گیا تھا۔ اسکول کے سائیکالوجسٹ نے انہیں سالار سکندر کے مختلف آئی کیو ٹیسٹ کے بارے میں بتایا تھا جس میں اس کی پرفارمنس نے اس کے مندرجہ زور سائیکالوجسٹ کو حیران کر دیا تھا۔ اس اسکول میں وہ ۱۵۰ کا آئی کیو یول والا پہلا اور واحد بچہ تھا اور چند ہی دنوں میں وہ وہاں سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔

سکندر عثمان اور ان کی بیوی سے ملاقات کے دوران سائیکالوجسٹ کو اس کے بچپن کے بارے میں کچھ اور کھوج لگانے کا موقع ملا۔ وہ کافی دلچسپی سے سالار کے کیس کو اسٹڈی کر رہا تھا اور دلچسپی کی یہ نوعیت پروفیشنل نہیں ذاتی تھی۔ اپنے کیریئر میں وہ پہلی بار اس آئی کیو کے بچے کا سامنا کر رہا تھا۔

سکندر عثمان کو آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ سالار اس وقت صرف دو سال کا تھا اور غیر معمولی طور پر وہ اس عمر میں ایک عام بچے کی نسبت زیادہ صاف لہجے میں باتیں کرتا تھا اور باتوں کی نوعیت ایسی ہوتی تھی کہ وہ داران کی بیوی اکثر حیران ہوتے۔

ایک دن جب وہ اپنے بھائی سے فون پر بات کرنے کے لئے فون کر رہے تھے تو سالار ان کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اس وقت فی دی لاؤنج میں بیٹھے تھے اور فون پر باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ فی دی بھی دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے فون رکھ دیا۔ ریسپونڈر رکھنے کے فوراً بعد انہوں نے سالار کو فون کا ریسپونڈر اٹھاتے ہوئے دیکھا۔

"ہیلو انگل! میں سالار ہوں۔" وہ کبر رہا تھا۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اطمینان سے ریسپونڈر کان سے لگائے کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔

"میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟" سکندر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پہلے ان کے ذہن میں یہی آیا کہ وہ جھوٹ سوت فون پر باتیں کر رہا ہے۔

"پاپا میرے پاس بیٹھے فی دی دیکھ رہے ہیں۔ نہیں، انہوں نے فون نہیں کیا، میں نے خود کیا ہے۔" وہ اس کے اگلے پہلے پر چڑ گئے۔

"سالار! کس سے باتیں کر رہے ہو؟" سکندر نے پوچھا۔

"انگل شاہنواز سے۔" سالار نے سکندر کو جواب دیا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ریسپونڈر اس سے لے لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس نے غلطی سے کوئی نمبر ملا لیا ہو گا یا پھر لاسٹ نمبر کو ری ڈائل کر دیا ہو گا۔ انہوں نے کان سے ریسپونڈر لگایا، دوسری طرف ان کے بھائی ہی تھے۔

"یہ سالار نے نمبر ڈائل کیا ہے۔" انہوں نے معذرت کرتے ہوئے اپنے بھائی سے کہا۔

"سالار نے کیسے ڈائل کیا وہ تو بہت چھوٹا ہے۔" ان کے بھائی نے دوسری طرف کچھ حیرانی سے پوچھا۔
 "میرا خیال ہے اس نے آپ کا نمبر ری ڈائل کر دیا ہے۔ اتفاق سے ہاتھ لگ گیا ہو گا۔ ہاتھ مار رہا تھا سٹ پر۔" انہوں نے فون بند کر دیا اور ریسپونڈر بچے رکھ دیا۔ سالار جو خاموشی کے ساتھ ان کی گفتگو سننے میں مصروف تھا ریسپونڈر کے پیچھے رکھتے ہی اس نے ایک بار پھر ریسپونڈر اٹھا لیا۔ اس بار سکندر عثمان اسے دیکھنے لگے، وہ بالکل کسی میچور آدمی کی طرح ایک بار پھر شاہنواز کا نمبر ڈائل کر رہا تھا اور بیوی روائی کے ساتھ۔ وہ ایک لمحہ کے لئے دم بخود رہ گئے تھے۔ دو سال کے بچے سے انہیں یہ توقع نہیں تھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کریڈل دیا دیا۔

"سالار! تمہیں شاہنواز کا نمبر معلوم ہے؟" انہوں نے حیرانی کے اس جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔
 "ہاں۔" بڑے اطمینان سے جواب دیا گیا۔

"کیا نمبر ہے؟" اس نے بھی روائی کے ساتھ وہ نمبر دہرا دیا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ تنگنی کے اعداد سے واقف ہو گا اور پھر وہ نمبر.....
 "تمہیں یہ نمبر کس نے سکھایا؟"

"میں نے خود سیکھا ہے۔"

"کیسے؟"

"ابھی آپ نے ملایا تھا۔" سالار نے ان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کتنی آتی ہے؟"

”ہاں۔“

”کہاں تک۔“

”بہتر ڈسک۔“

”ناؤ۔“

وہ مشین کی طرح شروع ہو گیا۔ ایک ہی سانس میں اس نے انہیں سو تک گنتی سنا دی۔ سکندر عثمان کے ہیٹ میں مل پڑنے لگے۔

”اچھا۔ میں ایک اور نمبر ڈائل کرتا ہوں میرے بعد تم اسے ڈائل کرنا۔“ انہوں نے ریسیور اس سے لیتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ سالار کو یہ سب ایک دلچسپ کھیل کی طرح لگا۔ سکندر عثمان نے ایک نمبر ملایا اور پھر فون بند کر دیا۔ سالار نے فوراً ریسیور ان سے پکڑ کر انہیں کی روانی کے ساتھ وہ نمبر ملایا۔ سکندر عثمان کا سر گھومتے لگا تھا۔ وہ واقعی وہی نمبر تھا جو انہوں نے ملایا تھا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی نمبر ملائے اور پھر سالار سے وہی نمبر ملانے کے لئے کہا۔ وہ کوئی غلطی کئے بغیر وہی نمبر ملا تا رہا۔ وہ یقیناً فونو گر الٹ ریسیور رکھتا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو بلایا۔

”میں نے اسے گنتی نہیں سکھائی، میں نے تو بس کچھ دن پہلے اسے چند کتابیں لاکر دی تھیں اور کل ایک بار ایسے ہی اس کے سامنے سو تک گنتی پڑھی تھی۔“ انہوں نے سکندر عثمان کے استفسار پر کہا۔ سکندر عثمان نے سالار کو ایک بار پھر گنتی سنانے کے لئے کہا، وہ سنا تا گیا۔ ان کی بیوی کا ہکا بکا سے دیکھتی رہیں۔ دونوں میاں بیوی کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا بچہ ذہنی اعتبار سے غیر معمولی صلاحیتیں رکھتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ ان دونوں نے اپنے باقی بچوں کی نسبت اسے بہت جلدی اسکول میں داخل کروا دیا تھا اور اسکول میں بھی وہ اپنی ان غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد ہی دوسروں کی نظر وں میں آ گیا تھا۔

”اس بچے کو آپ کی خاص توجہ کی ضرورت ہے، عام بچوں کی نسبت ایسے بچے زیادہ حساس ہوتے ہیں، اگر آپ اس کی اچھی تربیت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ بچہ آپ کے اور آپ کے خاندان کے لئے ایک سرمایہ ہو گا نہ صرف خاندان کے لئے بلکہ آپ کے ملک کے لئے بھی۔“ سکندر عثمان اور ان کی بیوی اس غیر ملکی سائیکالوجسٹ کی باتیں بڑے فخریہ انداز میں سنتے رہے۔

اپنے دوسرے بچوں کے مقابلے میں وہ سالار کو زیادہ اہمیت دیتے گئے تھے۔ وہ ان کی سب سے چھٹی اولاد تھا اور انہیں اس کی کامیابیوں پر فخر تھا۔

اسکول میں ایک ٹرم کے بعد اسے اگلی کلاس میں پڑھوٹ کر دیا گیا اور دوسری ٹرم کے بعد اس سے اگلی کلاس میں اور اس وقت پہلی بار سکندر عثمان کو کچھ تشویش ہونے لگی۔ وہ نہیں چاہتے تھے سالار

آٹھ دس سال کی عمر میں جوئیر یا سینئر کیمبرج کر لیتا مگر جس رفتار سے وہ ایک کلاس سے دوسری کلاس میں جا رہا تھا یہی ہوتا تھا۔

”میں چاہتا ہوں آپ میرے بیٹے کو اب پورے ایک سال کے بعد ہی اگلی کلاس میں پڑھوٹیں۔ میں نہیں چاہتا وہ اتنی جلدی اسے اہل مل طریقے سے اپنا ایکڈمک کیریئر ٹرم کر لے۔ آپ اس کے انٹیکس اور ایکٹیویٹیز بڑھادیں، مگر اسے نارمل طریقے سے ہی پڑھوٹ کریں۔“

ان کے اصرار پر سالار کو دو بارہ ایک سال کے اندر ڈبل یا ٹرپل پڑھوٹیں نہیں دیا گیا، اس کے ٹیلنٹ کو اسپورٹس اور دوسری چیزوں کے ذریعے چھٹکارا کیا جانے لگا۔ فٹنگ، ٹینس، گالف اور میوزک۔ وہ چار شے تھے جن میں اسے سب سے زیادہ دلچسپی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ خود کو صرف ان چاروں چیزوں تک ہی محدود رکھتا تھا۔ وہ اسکول میں ہونے والے تقریباً ہر گیم میں شریک ہوتا تھا اگر کسی میں شریک نہیں ہوتا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ ہوتی تھی کہ وہ گیم یا سپورٹ اسے زیادہ دلچسپ نہیں لگتی تھی۔

☆.....☆.....☆

”جویریہ! پروفیسر امتنان کے لیکچر کے نوٹس مجھے دینا۔“ امام نے جویریہ کو مخاطب کیا جو ایک کتاب کھولے بیٹھی ہوئی تھی۔ جویریہ نے ہاتھ بڑھا کر اپنی ایک نوٹ بک اسے حمادی۔ امام نوٹ بک کھول کر مطالعے پر پڑنے لگی۔ جویریہ ایک بار پھر کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اچانک اسے جیسے ایک خیال آیا تھا۔ اس نے مڑ کر اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی امام کو دیکھا۔

”تم نے لیکچر نوٹ کرنا کیوں بند کر دیا ہے؟“ اس نے امام کو مخاطب کیا۔ امام نے نوٹ بک سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مجھے کچھ سمجھ میں آئے تو میں نوٹ کروں۔“

”کیا مطلب؟“ جہیں پروفیسر امتنان کا لیکچر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔“ جویریہ کو جیسے حیرت ہوئی۔

”اکٹا چھ تو پڑھاتے ہیں۔“

”میں نے کب کہا کہ برا پڑھاتے ہیں، بس مجھے.....“

اس نے کچھ اُلجھے ہوئے لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑی نوٹ بک کو دیکھ رہی تھی۔ جویریہ نے غور سے اسے دیکھا۔

”تم آج کل کچھ غائب دماغ نہیں ہوتی جا رہی؟“ اس نے کہا۔

”میں نے آج کل کچھ غائب دماغ نہیں ہوتی جا رہی؟“ اس نے کہا۔

”اسٹرب؟“ وہ بڑبڑائی۔ ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”تہاری آنکھوں کے گرد ملنے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ کل رات کو شاید سلا سے تین کا وقت تھا جب میری آنکھ کھلی اور تم اس وقت بھی جاگ رہی تھیں۔“

”میں پڑھ رہی تھی۔“ اس نے مدافعت لہجے میں کہا۔

”نہیں، صرف کتاب اپنے سامنے رکھے بیٹھی ہوئی تھیں، مگر کتاب پر نظر نہیں تھی تہاری۔“ جویریہ نے اس کا غور رد کرتے ہوئے کہا۔ ”جسبیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟“

”کیا مسئلہ ہو سکتا ہے مجھے؟“

”پھر تم اتنی چپ کیوں رہنے لگی ہو؟“ جویریہ اس کی ٹال منول سے حائر ہوئے بغیر بولی۔

”نہیں، میں کیوں چپ رہوں گی۔“ اما نے مسکراتے کی کوشش کی۔ ”میں تو پہلے ہی کی طرح بولتی ہوں۔“

”صرف میں ہی نہیں، باقی سب بھی تہاری پریشانی کو محسوس کر رہے ہیں۔“ جویریہ سنجیدگی سے بولی۔

”کوئی بات نہیں ہے، صرف اسٹڈیز کی فینش ہے مجھے۔“

”میں یقین نہیں کر سکتی ہم بھی تہارے ساتھ ہیں، جسبیں ہم سے زیادہ فینش تو نہیں ہو سکتی۔“

جویریہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اما نے ایک گہرا سانس لیا، وہ اب رنج ہو رہی تھی۔

”تہارے گھر میں تو خیریت ہے؟“

”ہاں، بالکل خیریت ہے۔“

”اسجد کے ساتھ تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا؟“

”اسجد کے ساتھ جھگڑا کیوں ہوگا؟“ اما نے اسی کے انداز میں پوچھا۔

”پھر بھی اختلافات تو ایک بہت ہی.....“ جویریہ کی بات اس نے درمیان میں ہی کاٹ دی۔

”جب کہہ رہی ہوں کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے تو تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا۔ اتنے سالوں سے کون

سی بات ہے جو میں نے تم سے شیئر نہیں کی یا جو تمہیں چاہی ہے پھر تم اس طرح مجھے حرم سمجھ کر تنقید

کیوں کر رہی ہو۔“ وہ اب غصہ ہو رہی تھی۔

جویریہ گڑبڑا گئی۔ ”یقین کیوں نہیں کروں گی، میں صرف اس لئے اصرار کر رہی تھی کہ شاید تم

مجھے اس لئے اپنا مسئلہ نہیں بتا رہی کہ میں پریشان نہ ہوں اور تو کوئی بات نہیں۔“

جویریہ کچھ نادم سی ہو کر اس کے پاس سے اٹھ کر واپس اپنی اسٹڈی ٹیبل کے سامنے جا بیٹھی۔

اس نے ایک بار پھر وہ کتاب کھول لی جسے وہ پہلے پڑھ رہی تھی۔ کافی دیر تک کتاب پڑھتے رہنے کے

بعد اس نے ایک جماعی لی اور گردن موڑ کر لاشعوری طور پر اما کو دیکھا۔ وہ دیوار سے لٹک گئے

اس کی نوٹ بک کھولے بیٹھی تھی مگر اس کی نظریں نوٹ بک پر نہیں تھیں وہ سامنے والی دیوار پر نظریں

جہانے بیٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس نے گاڑی نہر کے پل سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی پھر ڈی سے ایک بوری اور سی ٹکال لی۔

وہ بوری کو سمجھتے ہوئے اس پل کی طرف بڑھتا رہا۔ پاس سے گزرنے والے کچھ راہگیروں نے اسے دیکھا

مگر وہ ڈکے نہیں، وہ پر پہنچ کر اس نے اپنی شرٹ اُتار کر نہر میں پھینک دی۔ چند لمحوں میں اس کی شرٹ

پہتے پانی کے ساتھ غائب ہو چکی تھی۔ ڈارک بلو کمر کی تنگ جھڑی اس کا لہجہ اور خوب صورت جسم

بہت نمایاں تھا۔

اس وقت اس شخص کی آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر تھا جسے پڑھنا دوسرے کسی بھی شخص کے لئے

ناممکن تھا۔ اس کی عمر انیس بیس سال ہو گی، مگر اس کے قد و قامت اور طبع نے اس کی عمر کو جیسے بڑھا دیا

تھا۔ اس نے سی پل سے نیچے نہر میں لٹکانی شروع کر دی، جب سی کا سر لپانی میں غائب ہو گیا تو اس نے

سی کا دو سرا سر اور سی کے منہ پر لپیٹ کر تختی سے گرہیں لگانی شروع کر دیں اور اس وقت تک لگا تار باجب

تک کو اگل فٹ نہیں ہو گیا پھر پانی میں پڑا سر او اہل سمجھ کر اس نے اندازے سے تین فٹ کے قریب سی

چھوڑی اور اپنے دونوں سر ساتھ جوڑتے ہوئے اس نے اپنے پیروں کے گرد سی کو بہت مضبوطی کے

ساتھ دو تین غل دیئے اور گرہ لگا دی۔ اب اس تین فٹ کے ٹکڑے کے سرے پر بڑی مہارت کے

ساتھ اس نے دو پھندے بنائے پھر ایک کر پل کی منڈ پر پر بیٹھ گیا۔ اپنا دایاں ہاتھ کر کے پیچھے

جاتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کے ساتھ پہلے پھندے میں سے دایاں ہاتھ گزارا اور پھر بائیں ہاتھ

کے ساتھ اس نے وہ پھندا سمجھ کر کس دیا۔ اس کے بعد اس نے کر کے پیچھے دائیں ہاتھ کے ساتھ

دوسرے پھندے میں سے ہایاں ہاتھ گزارا اور دائیں ہاتھ سے اسے کس دیا۔

اس کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ایک گہرا سانس لینے ہوئے اس نے پشت

کے غل خود کو پل کی منڈ پر سے نیچے گرا دیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا سر پانی سے ٹکرایا اور کر تک کا

حصہ پانی میں ڈوب گیا پھر سی ختم ہو گئی۔ اب وہ اس طرح لٹکا ہوا تھا کہ اس کے بازو پشت پر بندھے

ہوئے تھے اور کر تک کا دھڑپانی کے اندر تھا۔ بوری میں موجود وزن یقیناً اس کے وزن سے زیادہ تھا جسکی

وجہ تھی کہ بوری اس کے ساتھ نیچے نہیں آئی اور وہ اس طرح لٹک گیا۔ اس نے اپنا سانس روکا ہوا تھا۔

پانی کے اندر اپنا سر جاتے ہی اس نے آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پانی گدلا تھا اور اس

میں موجود مٹی اس کی آنکھوں میں چسپے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہچکچہ دے اب جیسے

پہننے لگے تھے۔ اس نے یک دم سانس لینے کی کوشش کی اور پانی منہ اور ناک سے اس کے جسم کے اندر

داخل ہونے لگا۔ وہ اب بری طرح پھڑپھڑا رہا تھا مگر نہ وہ اپنے بازوؤں کو استعمال کر کے خود کو سطح پر لا

سکا تھا اور نہ ہی اپنے جسم کو اٹھا سکا تھا۔ اس کے جسم کی ہڈیاں ہلکتی تھیں۔ آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھی۔
چند لوگوں نے اسے ہل سے اٹھانے کی کوشش کی۔ اس طرف بھاگے، دسی ابھی تک ہل
رہی تھی، ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ پانی کے نیچے ہونے والی حرکت اب دم توڑ
گئی تھی۔ اس کی ٹانگیں اب بالکل بے جان نظر آ رہی تھیں۔ ہل پر کمرے لوگ خوف کے عالم میں اس
بے جان وجود کو دیکھ رہے تھے۔ ہل پر موجود ہجوم بڑھ رہا تھا۔ نیچے پانی میں موجود وہ وجود ابھی بھی
ساکت تھا۔ صرف پانی اسے حرکت دے رہا تھا۔ کسی ہڈی کی طرح۔ آگے پیچھے۔ آگے پیچھے۔
آگے پیچھے۔

☆.....☆.....☆

"امام! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" رابعہ نے اپنی الماری سے اپنا ایک سوٹ نکال کر بیڈ پر پھینکے
ہوئے کہا۔
امام نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "کس لئے تیار ہو جاؤں؟"
"بھئی، شاپنگ کے لئے جا رہے ہیں، ساتھ چلو۔" رابعہ نے اسی تجر قاری کے ساتھ استری کا
پگ لٹالنے ہوئے کہا۔
"نہیں، مجھے کہیں نہیں جانا۔" اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں پر اپنا بازو رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے
بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔
"کیا مطلب ہے۔۔۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔ تم سے پوچھ کون رہا ہے۔۔۔ تمہیں بتا رہے ہیں۔"
رابعہ نے اسی لہجے میں کہا۔

"اور میں نے بتا دیا ہے، میں کہیں نہیں جا رہی۔" اس نے آنکھوں سے بازو ہٹائے بغیر کہا۔
"زیبب بھی چل رہی ہے ہمارے ساتھ، پورا گروپ جا رہا ہے، ظم بھی دیکھیں گے واپسی پر۔"
رابعہ نے پورا پروگرام بتاتے ہوئے کہا۔
امام نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔ "زیبب بھی جا رہی ہے؟"
"ہاں، زیبب کو ہم راستے سے پک کریں گے۔" امام کسی سوچ میں ڈوب گئی۔
"تم بہت ڈل ہوئی جا رہی ہو امام!" رابعہ نے قدرے ناراضی کے ساتھ تہرہ کیا۔ "ہمارے
ساتھ کہیں آنا جانا ہی چھوڑ دیا ہے تم نے، آخر ہو تا کیا جا رہا ہے تمہیں۔"
"کچھ نہیں، بس میں آج کچھ تھکی ہوئی ہوں، اس لئے سونا چا رہی ہوں۔" امام نے بازو ہٹا کر
اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
تھوڑی دیر بعد جویریہ بھی اندر آ گئی اور وہ بھی اسے ساتھ چلنے کے لئے مجبور کرتی رہی، مگر امام

کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی۔ "نہیں مجھے سونا ہے، میں بہت تھک گئی ہوں۔" وہ مجبور اسے برا بھلا کہتے
ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔
رستے سے انہوں نے زیبب کو اس کے گھر سے پک کیا اور زیبب کو پک کرتے ہوئے جویریہ کو یاد
آیا کہ اس کے بیک کے اندر اس کا والٹ نہیں ہے، وہ اسے ہاسٹل میں ہی چھوڑ آئی تھی۔
"واپس ہاسٹل چلتے ہیں، وہاں سے والٹ لے کر پھر بازار چلیں گے۔" جویریہ کے کہنے پر وہ لوگ
دوبارہ ہاسٹل چلی آئیں، مگر وہاں آکر انہیں حیرانی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ کمرے کے دروازے پر تالا لگا
ہوا تھا۔

"یہ امام کہاں ہے؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔
"پتا نہیں۔ کمرہ لاک کر کے اس طرح کہاں جا سکتی ہے۔ وہ تو کبہ رہی تھی کہ اسے سونا ہے۔"
جویریہ نے کہا۔
"ہاسٹل میں تو کسی کے روم میں نہیں چلی گئی؟" رابعہ نے خیال ظاہر کیا۔ وہ دونوں اگلے کئی منٹ
ان واقف لڑکیوں کے کمروں میں جاتی رہیں جن سے ان کی پیلو ہائے تھی، مگر امام کا کہیں پتا نہیں تھا۔
"کہیں ہاسٹل سے باہر تو نہیں گئی؟" رابعہ کو اچانک خیال آیا۔
"آؤ دارؤن سے پوچھ لیتے ہیں۔" جویریہ نے کہا۔ وہ دونوں دارؤن کے پاس چلی آئیں۔
"ہاں، امام ابھی کچھ دیر پہلے باہر گئی ہے۔" دارؤن نے ان کی انکوئری پر بتایا۔ جویریہ اور رابعہ
ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔
"وہ کہہ رہی تھی شام کو آئے گی۔" دارؤن نے انہیں مزید بتایا۔ وہ دونوں دارؤن کے کمرے سے
نکل آئیں۔

"مئی گئی کہاں ہے؟ ہمارے ساتھ تو جانے سے انکار کر دیا تھا کہ اسے سونا ہے اور وہ تھکی ہوئی ہے
اور اس کی طبیعت خراب ہے اور اب اس طرح غائب ہو گئی ہے۔" رابعہ نے اٹھتے ہوئے انداز میں کہا۔
رات کو وہ قدرے لیٹ واپس آئیں اور جس وقت وہ واپس آئیں۔ امام کمرے میں موجود تھی۔
اس نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کا استقبال کیا۔
"گلتا ہے۔ خاصی شاپنگ ہوئی ہے آج۔" اس نے ان دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے
شارپز کو دیکھتے ہوئے کہا۔
ان دونوں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا، بس شارپز رکھ کر اسے دیکھنے لگیں۔
"تم کہاں گئی ہوئی تھیں؟" جویریہ نے اس سے پوچھا۔ امام کو جیسے ایک جھٹکا لگا۔
"میں اپنا والٹ لینے واپس آئی تھی تو تم یہاں نہیں تھیں، کمرہ لاک تھا۔" جویریہ نے اسی انداز

میں کہا۔

”میں تم لوگوں کے پیچھے گئی تھی۔“

”کیا مطلب؟“ جو یہ یہ نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

”تمہارے نکلنے کے بعد میرا روادہ بدل گیا تھا۔ میں یہاں سے نعت کی طرف گئی کیونکہ تم لوگوں کو اسے پک کرنا تھا، مگر اس کے چوکیدار نے بتایا کہ تم لوگ پہلے ہی وہاں سے نکل گئے ہو، پھر میں وہاں سے واپس آ گئی۔ بس رستے میں کچھ کتابیں لی تھیں میں نے۔“ امامہ نے کہا۔

”دیکھا۔ تم سے پہلے کہا تھا کہ ہمارے ساتھ چلو مگر اس وقت تم نے فوراً انکار کر دیا، بعد میں بے وقوفوں کی طرح پیچھے چل پڑیں۔ ہم لوگ تو مشکوک ہو گئے تھے تمہارے بارے میں۔“ رابعہ نے کچھ اطمینان سے ایک شاپر کھولتے ہوئے کہا۔

امامہ نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ صرف مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ وہ دونوں اب اپنے شاپر کھولتے ہوئے خریدی ہوئی چیزیں اسے دکھا رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”چا نہیں؟“

”ماں باپ نے کیا رکھا تھا؟“

”یہ ماں باپ سے پوچھیں۔“ خاموشی۔

”لوگ کس نام سے پکارتے ہیں تمہیں؟“

”لڑکے یا لڑکیاں؟“

”لڑکے؟“

”بہت سارے نام لیتے ہیں۔“

”زیادہ تر کون سا نام پکارتے ہیں؟“

”daredevil“..... خاموشی.....

”اور لڑکیاں؟“

”وہ بھی بہت سے نام لیتی ہیں۔“

”زیادہ تر کس نام سے پکارتی ہیں؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“ it's too personal (یہ بالکل ذاتی ہے)۔

گہری خاموشی، طویل سانس پھر خاموشی۔

”میں آپ کو ایک مشورہ دوں؟“

”کیا؟“

”آپ میرے بارے میں وہ جاننے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جو نہ آپ پہلے جانتے ہیں نہ میں۔“

آپ کے دائیں طرف نخیل پر جو سفید فائل پڑی ہے اس میں میرے سارے particulars موجود ہیں پھر آپ وقت ضائع کیوں کر رہے ہیں؟“

سانیکو انالسٹ نے اپنے پاس موجود نخیل لیب کی روشنی میں سامنے کاؤچ پر دروازہ اس نوجوان کو دیکھا جو اپنے ہر مسئلہ ہلارہا تھا، اس کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سانیکو انالسٹ کے ساتھ ہونے والی اس ساری گفتگو کو بے کار سمجھ رہا تھا۔ کمرے میں موجود ٹھنڈک، خاموشی اور نیم تاریکی نے اس کے اعصاب کو بالکل مستان نہیں کیا تھا۔ وہ بات کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ سانیکو انالسٹ کے لئے سامنے لیٹا ہوا نوجوان ایک عجیب کیس تھا، وہ فوٹو گرافک میموری کا مالک تھا۔ اس کا آئی کیو لیول ۱۵۰ کی رینج میں تھا۔ وہ قمر و آؤٹ، آؤٹ اسٹینڈنگ ایکٹنگ ریکارڈ رکھتا تھا وہ گالف میں پریزیڈنٹس گولڈ میڈل تین بار جیت چکا تھا اور وہ..... وہ تیسری بار خودکشی کی ناکام کوشش کرنے کے بعد اس کے پاس آیا تھا۔ اس کے والدین ہی اسے اس کے پاس لے کر آئے تھے اور وہ بے حد پریشان تھے۔

وہ ملک کے چند بہت اچھے خاندانوں میں سے ایک سے تعلق رکھتا تھا۔ ایسا خاندان جس کے پاس پیسے کی بھرمار تھی، چار بھائیوں اور ایک بہن کے بعد وہ چوتھے نمبر پر تھا۔ دو بھائی اور ایک بہن اس سے بڑے تھے۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے وہ اپنے والدین کا بہت زیادہ چہیتا تھا۔ اس کے باوجود وہ چھپلے تین سال میں اس نے تین بار خودکشی کی کوشش کی۔

مکلی دلد اس نے سڑک پر بائیک چلاتے ہوئے دن وے کی خلاف ورزی کی اور بائیک سے ہاتھ اٹھائے، اس کے پیچھے آنے والے ٹریفک کانسٹیبل نے ایسا کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ خوش قسمتی سے گاڑی سے ٹکرانے کے بعد وہ ہوا میں اُچھل کر ایک دوسری گاڑی کی چھت پر گر گیا اور پھر زمین پر گر گیا۔ اس کی کچھ ribs ایک بازو اور ایک ٹانگہ میں فریکچر ہوئے، تب اس کے والدین کانسٹیبل کے اصرار کے باوجود اسے ایک حادثہ ہی سمجھے، کیونکہ اس نے اپنے ماں باپ سے یہی کہا تھا کہ وہ غلطی سے دن وے سے ہٹ گیا تھا۔

دوسری بار پھر اسے ایک سال کے بعد اس نے لاہور میں خود کو باندھ کر پانی میں ڈوبنے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر اسے بچایا گیا۔ ہل پر کھڑے لوگوں نے اسے اس رسی سمیت باہر کھینچ لیا تھا جس کے ساتھ باندھ کر اس نے خود کو نیچے گر لیا تھا۔ اس بار اس بات کی گواہی دینے والوں کی تعداد زیادہ تھی کہ

اس نے خود اپنے آپ کو پانی میں گر دیا تھا مگر اس کے ماں باپ کو ایک بار پھر یقین نہیں آیا۔ سالار کا بیان یہ تھا کہ کچھ لڑکوں نے اس کی گاڑی کو پل کے پاس روکا اور پھر اسے باندھ کر پانی میں پھینک دیا، جس طرح وہ بندھا ہوا تھا اس سے یوں ہی لگتا تھا کہ اسے واقعی ہی باندھ کر گرایا گیا تھا۔ پولیس اگلے کئی ہفتے اس کے بتائے گئے طبقے کے لڑکوں کو پورے شہر میں تلاش کرتی رہی۔ سکندر عثمان نے خاص طور پر ایک گارڈ اس کے ساتھ قیادت کر دیا جو چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتا تھا۔

مگر تیسری بار وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکا۔ خواب آور گولیوں کی ایک بڑی تعداد کو چیس کر اس نے کھالیا تھا۔ گولیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ معدہ واٹش کرنے کے باوجود اگلے کئی دن وہ بیمار رہا تھا۔ اس بار کسی کو بھی کوئی نکتہ فہمی نہیں ہوئی۔ اس نے خانہ سال کے سامنے ان گولیوں کے پاؤڈر کو دودھ میں ڈال کر پیا تھا۔

سکندر عثمان اور طبیب سکندر شا کڈرہ گئے تھے۔ پچھلے دونوں واقعات بھی انہیں پوری طرح یاد آ گئے تھے اور وہ پچھتانے لگے تھے کہ انہوں نے پہلے اس کی بات پر اعتبار کیوں کیا..... پورے گھر اس کی وجہ سے پریشان ہو گیا تھا، اس کے بارے میں اسکول، کالونی اور خاندان ہر جگہ خیریں پھیل رہی تھیں۔ وہ اس بار اس بات سے انکار نہیں کر سکا کہ اس نے خود کشی کی کوشش کی تھی، مگر وہ یہ بتانے پر تیار نہیں تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ بھائی، بہن، ماں یا باپ اس نے کسی کے سوال کا بھی جواب نہیں دیا تھا۔

سکندر اے لیوٹر کے بعد اس کے بڑے دو بھائیوں کی طرح اسے بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھجوا دیا جاتے تھے، وہ جانتے تھے اسے کہیں بھی نہ صرف بڑی آسانی سے ایڈمیشن مل جائے گا بلکہ اسکالرشپ بھی..... لیکن ان کے سارے پلاز جیسے بھک کر کے اڑ گئے تھے۔

اور اب وہ اس سائیکو لاسٹ کے سامنے موجود تھا، جس کے پاس سکندر عثمان نے اسے اپنے ایک دوست کے مشورہ پر بھجوا دیا تھا۔

"لٹیک ہے سالار! بالکل نوڈ اپوائنٹ بات کرتے ہیں۔ مرنا کیوں چاہتے ہو تم؟" سالار نے کندھے اچکائے۔

"آپ سے کس نے کہا کہ میں مرنا چاہتا ہوں؟"

"خود کشی کی تین کوششیں کر چکے ہو تم۔"

"کوشش کرنے اور مرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"تینوں دفعہ تم اتفاقاً بیچے ہو ورنہ تم نے خود کو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"دیکھیں۔ جس کو آپ خود کشی کی کوشش کہہ رہے ہیں اسے خود کشی کی کوشش نہیں سمجھتا۔ میں صرف دیکھنا چاہتا تھا کہ موت کی تکلیف کیسی ہوتی ہے۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا جو بڑے پرسکون انداز میں انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اور موت کی تکلیف تم کیوں محسوس کرنا چاہتے تھے؟"

"بس ایسے ہی، curiosity تجسس سمجھ لیں۔" سائیکو لاسٹ نے ایک گہرا سانس لے کر اس ۱۵۰

آئی کیو لیول والے نوجوان کو دیکھا، جواب سمجھتے ہوئے گھور رہا تھا۔

"تو ایک بار خود کشی کی کوشش سے تمہارا یہ تجسس ختم نہیں ہوا۔"

"اوہ تب..... تب میں بے ہوش ہو گیا تھا اس لئے میں ٹھیک سے کچھ بھی محسوس نہیں کر سکا۔

دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔" وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اور اب تم چوتھی بار کوشش کر دے؟"

"یقیناً" میں محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ درد کی انتہا پر جا کر کیسا لگتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"جیسے Joy کی انتہا ecstasy ہوتی ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خوشی کی اس انتہا کے بعد کیا

ہے، اسی طرح درد کی بھی تو کوئی انتہا ہوتی ہوگی، جس کے بعد آپ کچھ بھی سمجھ نہیں سکتے جیسے ecstasy

میں آپ کچھ بھی سمجھ نہیں سکتے۔"

"میں نہیں سمجھ سکا۔"

"فرض کریں آپ ایک بار میں striptease دیکھ رہے ہیں، بہت تیز میوزک بگ رہا ہے، آپ

ڈرنک کر رہے ہیں، آپ نے کچھ ڈرگز بھی لی ہوئی ہیں، آپ ناچ رہے ہیں پھر آہستہ آہستہ آپ اپنے

ہوش و حواس کھو دیتے ہیں، آپ ecstasy (سرور) میں ہیں، کہاں ہیں؟ کیوں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟

آپ کو کچھ بھی پتا نہیں لیکن آپ کو یہ ضرور پتا ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ آپ کو اچھا

لگ رہا ہے۔ میں جب باہر چھڑیاں گزارنے جاتا ہوں تو اپنے گزرنے کے ساتھ ایسے بارز میں جاتا ہوں۔

میرا پرائیوٹ یہ ہے کہ ان کی طرح میں ecstatic (مد ہوش) نہیں ہوتا ہوں I never get wild with joy

مجھے ان چیزوں سے اتنی خوشی نہیں مل پاتی جتنی باقی لوگوں کو ملتی ہے اور یہی چیز مجھے مایوس کرتی ہے۔

میں نے سوچا کہ اگر سرور کی انتہا پر نہیں پہنچ سکتا تو شاید میں درد کی انتہا پر پہنچ سکوں لیکن وہ بھی نہیں ہو

سکا۔" وہ خاصا مایوس نظر آ رہا تھا۔

"تم اس طرح کی چیزوں میں وقت ضائع کیوں کرتے ہو، اتنا شاندار ایکٹنگ ریکارڈ ہے تمہارا....."

سالار نے اس بار انتہائی بیزاری سے اس سے کہا۔ "پلیز، پلیز اب میری ذہانت کے راک الاپنا

مت شروع کیجئے گا۔ مجھے پتا ہے میں کیا ہوں۔ ٹھگ آ گیا ہوں میں اپنی تعریفیں سنتے سنتے۔" اس کے لہجے

میں سختی تھی۔ سائیکو لاسٹ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

"اپنے لئے کوئی گول کیوں نہیں سین کرتے تم؟"

"میں نے کیا ہے؟"

"کیا؟"

"مجھے خودکشی کی ایک اور کوشش کرنی ہے۔" مکمل اطمینان تھا۔

"کیا تمہیں کوئی پریشن ہے؟"

"ناٹ اینڈ آل۔"

"تو پھر مرنا کیوں چاہتے ہو؟" ایک گہرا سانس۔

"کیا آپ کو ایک بار پھر سے بتانا شروع کروں کہ میں مرنا نہیں چاہتا، میں کچھ اور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ اکتایا۔

بات محکم پھر کر پھر دیں آجی جی۔ سائیکو لاسٹ کچھ دیر سوچتا رہا۔

"کیا تم یہ سب کسی لڑکی کی وجہ سے کر رہے ہو؟"

سالار نے گردن موڑ کر جراتی سے اسے دیکھا۔ "لڑکی کی وجہ سے؟"

"ہاں۔ کوئی ایسی لڑکی جو تمہیں اچھی لگتی ہو جس سے تم شادی کرنا چاہتے ہو؟" اس نے بے اختیار

قبضہ لگایا اور پھر دو ہنستا گیا۔

"مائی گاڈ! آپ کا مطلب ہے کہ کسی لڑکی کی محبت کی وجہ سے میں خودکشی۔" وہ ایک بار پھر

بات اور صوری چھوڑ کر ہنسنے لگا۔ "لڑکی کی محبت..... اور خودکشی..... کیا مذاق ہے۔" وہ اب اپنی فہمی پر

قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سائیکو لاسٹ نے اس طرح کے کئی سیشنز اس کے ساتھ کئے تھے اور ہر بار نتیجہ ڈھاک کے

دی تھیں بات رہا۔

"آپ اس کو تعلیم کے لئے ہرون ملک بھجوانے کے بجائے سینکڑیں رکھی اور اس پر بہت زیادہ توجہ

دیں۔ ہو سکتا ہے یہ توجہ حاصل کرنے کے لئے یہ سب کرتا ہو۔"

اس نے کئی ماہ کے بعد سالار کے ماں باپ کو مشورہ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے باہر بھجوانے کے

بجائے اسلام آباد کے ایک ادارے میں ایڈمیشن دلوا دیا گیا۔ سکندر عثمان کو یہ اطمینان تھا کہ وہ اسے اپنے

پاس رکھیں گے تو شاید وہ دوبارہ ایسی حرکت نہ کرے۔ سالار نے ان کے اس فیصلے پر کسی رد عمل کا اظہار

نہیں کیا بالکل اسی طرح جس طرح اس نے ان کے اس فیصلے پر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اسے

ہرون ملک تعلیم کے لئے بھجوا دیا جائے گا۔

سائیکو لاسٹ کے ساتھ آخری سیشن کے بعد سکندر عثمان اسے گھر لے آئے اور انہوں نے طیبہ

کے ساتھ مل کر اس سے ایک لمبی چوڑی میننگ کی۔ وہ دونوں اپنے بندہ روم میں بٹھا کر اسے ان تمام

آرائشوں کے بارے میں بتاتے رہے جو وہ پچھلے کئی سالوں میں اسے فراہم کرتے رہے تھے۔ انہوں

نے اسے ان توقعات کے بارے میں بھی بتایا جو وہ اس سے رکھتے تھے۔ اسے ان محبت بھرے جذبات

سے بھی آگاہ کیا گیا جو وہ اس کے لئے محسوس کرتے تھے۔ وہ بے حاشہ ہرے کے ساتھ چوگم چہا تا باپ کی

بے چینی اور ماں کے آنسو دیکھتا رہا۔ گھٹگو کے آخر میں سکندر عثمان نے تقریباً چنگ آکر اس سے کہا۔

"تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟ کیا ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے یا جو تمہیں چاہئے۔ مجھے بتاؤ۔" سالار

سوچ میں پڑ گیا۔

"اسپورٹس کار۔" اگلے ہی لمحے اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں اسپورٹس کار باہر سے منگوا دیتا ہوں مگر دوبارہ ایسی کوئی حرکت مت کرنا

جو تم نے کی ہے، واد کے؟" سکندر عثمان کو کچھ اطمینان ہوا۔

سالار نے سر ہلا دیا۔ طیبہ سکندر نے نشہ سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے جیسے سکون کا سانس لیا۔

وہ کمرے سے چلا گیا تو سکندر عثمان نے سگڑ سلگاتے ہوئے ان سے کہا۔

"طیبہ! تمہیں اس پر بہت توجہ دینی پڑے گی۔ اپنی activities کچھ کم کرو اور کوشش کرو کہ اس

کے ساتھ روزانہ کچھ وقت گزار سکو۔" طیبہ نے سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

دیسم نے امامہ کو دور سے ہی لان میں بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ کانوں پر ہینڈ فون لگائے واک مین پر کچھ سن

رہی تھی۔ دیسم دے قدموں اس کی پشت کی جانب سے اس کے عقب میں گیا اور اس کے پاس جا کر اس

نے یک دم امامہ کے کانوں سے ہینڈ فون کے تار کھینچ لئے۔ امامہ نے برقی رفتار سے واک مین کا stop

کاٹن رہا تھا۔

"کیا سنا جا رہا ہے یہاں اکیلے بیٹھے؟" دیسم نے بلند آواز میں کہتے ہوئے ہینڈ فون کو اپنے کانوں

میں ٹھونس لیا مگر تب تک امامہ کیسٹ بند کر چکی تھی۔ کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو کر اس نے ہینڈ فون کو

اپنی طرف کھینچتے ہوئے دیسم سے کہا۔

"بد تمیزی کی کوئی حد ہوتی ہے دیسم ابی بیوی رسیلف۔" اس کا چہرہ دھنسنے سے سرخ ہو رہا تھا۔ دیسم

نے ہینڈ فون کے سرور کو نہیں چھوڑا، امامہ کے ہنسنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"میں سنا چاہتا ہوں، تم کیا سن رہی تھیں۔ اس میں بد تمیزی والی کیا بات ہے، کیسٹ کو آن کرو۔"

امامہ نے کچھ جھنجھلا تے ہوئے ہینڈ فون کو واک مین سے الگ کر دیا۔ "میں تمہارے سننے کے لئے

واک مین لے کر یہاں نہیں بیٹھی، دفع ہو جاؤ یہ ہینڈ فون لے کر۔"

وہ ایک بار پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے واک مین کو بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں جکڑا ہوا تھا۔

وسیم کو لگا جیسے وہ کچھ گھبرائی ہوئی ہے مگر وہ گھبرائے گی کیوں؟ وسیم نے سوچا اور اس خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے سامنے والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ہیڈ فون کو اس نے میز پر رکھ دیا۔

"یہ لو، اپنا فضا ختم کرو۔ واک مین کر رہا ہوں میں، تم سنو، جو بھی سن رہی ہو۔" اس نے بڑے صلح جویانہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، اب مجھے نہیں سنا کچھ، تم ہیڈ فون رکھو اپنے پاس۔" امامہ نے ہیڈ فون کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"ویسے تم سن کیا رہی تھیں؟"

"کیا سنا جا سکتا ہے؟" امامہ نے اسی کے انداز میں کہا۔

"فرخیں سن رہی ہو گی؟" وسیم نے خیال ظاہر کیا۔

"جسہیں پتا ہے وسیم اتم میں بہت ساری عادی عادی بوڑھی عورتوں والی ہیں؟"

"مثلاً"

"مثلاً بال کی کمال اتارنا۔"

"اور۔"

"اور دوسروں کی جاسوسی کرتے پھرنا اور شرمندہ بھی نہ ہونا۔"

"اور جسہیں یہ پتا ہے کہ تم آہستہ آہستہ کتنی خود غرض ہوتی جا رہی ہو۔" وسیم نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ امامہ نے اس کی بات پر برا نہیں ملا۔

"اچھا۔۔۔۔۔ جسہیں پتا چل گیا ہے کہ میں خود غرض ہوں۔" اس بار اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"حالانکہ تم جتنے بے وقوف ہو میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ نتیجہ اخذ کر لو گے۔"

"تم اگر مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو تو مت کرو، میں شرمندہ نہیں ہوں گا۔" وسیم نے

ذہنیاتی کامیاب رہ کر تے ہوئے کہا۔

"پھر بھی ایسے کاموں کی کوشش تو ہر ایک پر فرض ہوتی ہے۔"

"آج تمہاری زبان کچھ زیادہ نہیں چل رہی؟" وسیم نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے نہیں، ایسا ہی ہے۔ چلو اچھا ہے، وہ چپ شاد کار وزہ تو زور دیا ہے تم نے جو اسلام آباد

آنے پر تم رکھ لیتی ہو۔" امامہ نے غور سے وسیم کو دیکھا۔

"کون سا چپ شاد کار وزہ؟"

"تم جب سے لاہور گئی ہو خاصی بدل گئی ہو۔"

"مجھ پر اسٹڈیز کا بہت بوجھ ہے۔"

"سب پر ہوتا ہے امامہ! مگر کوئی بھی اسٹڈیز کو اتنا سر پر سوار نہیں کرتا۔" وسیم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو اس فضول بحث کو، یہ بتاؤ تم آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"میش۔" وہ اسی طرح کرسی جھلاتا رہا۔

"یہ تو تم پر ارسال ہی کرتے ہو، میں آج کل کی خاص مصروفیت کا پوچھ رہی ہوں۔"

"آج کل تو بس دوستوں کے ساتھ بھر رہا ہوں۔ جسہیں پتا ہونا چاہئے کہ ہیچرز کے بعد میری مصروفیات کیا ہوتی ہیں۔ سب کچھ بھولتی جا رہی ہو تم۔" وسیم نے افسوس بھری نظروں سے کہا۔

"میں نے اس امید میں یہ سوال کیا تھا کہ شاید اس سال تم میں کوئی بہتری آجائے مگر نہیں، میں

نے بے کار سوال کیا۔" امامہ نے اس کے تھیرے کے جواب میں کہا۔

"جسہیں پتا ہونا چاہئے کہ میں تم سے ایک سال بڑا ہوں، تم نہیں، اس لئے اب اپنی ملاحتی تقریر

ختم کرو۔" وسیم نے اسے کچھ جتاتے ہوئے کہا۔

"یہ ساتھ والوں کے لڑکے سے تعلقات کا کیا حال ہے؟" امامہ کو اچانک یاد آیا۔

"چنچن چنچن؟" بس کچھ عجیب سے ہی تعلقات ہیں۔" وسیم نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "بڑا

عجیب سا بندہ ہے وہ، موڈ اچھا ہے تو دوسرے کو ساتویں آسمان پر بٹھادے گا، سوڈ خراب ہے تو سیڑھا گھر

میں پیچھا دے گا۔"

"تمہارے زیادہ تر دوست اسی طرح کے ہیں۔" امامہ نے مسکراتے ہوئے کہا "مگر ہم جنس باہم

جنس پرواز۔"

"نہیں، خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ کم از کم میری عادی عادی اور حقیقتیں چنچن جیسی تو نہیں ہیں۔"

"وہ تو باہر جانے والا تھا؟" امامہ کو اچانک یاد آیا۔

"ہاں جانا تو تھا مگر پتا نہیں میرا خیال ہے اس کے پڑنٹس نہیں بھجوا رہے۔"

"علیہ بڑا عجیب سا ہوتا ہے اس کا۔ مجھے بعض دفعہ لگتا ہے بیویوں کے کسی قہیلے سے کسی نہ کسی طرح

اس کا تعلق ہو گا یا آئندہ ہو جائے گا۔"

"تم نے دیکھا ہے اسے؟"

"نکل میں باہر سے آ رہی تھی تو دیکھا تھا۔ وہ بھی اسی وقت باہر نکل رہا تھا، کوئی لڑکی بھی تھی ساتھ۔"

"لڑکی؟ جینو وغیرہ پہنی ہوئی تھی اس نے؟" دوسم نے اچانک دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"مشروم کٹ بالوں والی..... فیکری؟"

"ارے۔۔۔ دوسم چنگی بجاتے ہوئے مسکرایا۔ "اس کی گرل فرینڈ ہے۔"

"بچہلی دفعہ تو تم کسی اور کا نام لے رہے تھے۔" امام نے اُسے مگھروا

"بچہلی دفعہ کب؟" دوسم سوچ میں پڑ گیا۔

"سات آٹھ ماہ پہلے شاید تم سے اس کی گرل فرینڈ کی بات ہوئی تھی۔"

"ہاں جب شیا تھی۔ اب پتا نہیں وہ کہاں ہے۔"

"اس بار تو گاڑی کے پچھلے شیشے پر اس نے اپنے سوباگل کا نمبر بھی پینٹ کر دیا ہوا تھا۔" امام

ایک سوباگل نمبر ڈھراتے ہوئے نہی۔

"تمہیں یاد ہے؟" دوسم بھی ہنسا۔

"میں نے ذرا مگی میں پہلی بار اتنا بڑا سوباگل نمبر نہیں کھادیکھا تھا اور وہ بھی ایک گاڑی کے شیشے

پر اس کے نام کے ساتھ، یاد تو ہونا ہی تھا۔" امام بھر نہی۔

"میں تو خود سوچ رہا ہوں اپنی گاڑی کے شیشے پر سوباگل نمبر کھوانے کا۔" دوسم نے بالوں میں

ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کون سے سوباگل کا۔ دو جو تم نے ابھی خریدے ابھی نہیں۔" امام نے دوسم کا مذاق اڑایا۔

"میں خرید رہا ہوں اس ماہ۔"

"بابا کے جوتے کھانے کے لئے تیار رہنا، اگر تم نے سوباگل کے نمبر کو گاڑی کے شیشے پر کھو دیا

سب سے پہلا فون اُن ہی کا آئے گا۔"

"بس اسی لئے ہر بار میں ڈک جاتا ہوں۔" دوسم نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارے لئے اچھا ہی ہے۔ بابا سے ہڈیاں تروانے سے بہتر ہے کہ بندہ اپنے جذبات پر کچھ

قابو رکھے اور تمہارے لئے تو خطرات دیسے بھی زیادہ ہیں۔ سید کو پتا چلتا اگر اس قسم کے کسی سوباگل

فون کا تو....." دوسم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو کیا کرے گی وہ، میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں۔"

"میں جانتی ہوں تم اس سے ڈرتے نہیں ہو، مگر مجھے بھائیوں کی اگلوٹی بہن سے مٹھتی کرنے سے

پہلے تمہیں تمام نفع نقصان پر غور کر لینا چاہئے تھا جن کا سامنا تمہیں کسی ایسی وحشی حرکت کے بعد ہو سکتا

ہے۔" امام نے ایک بار پھر اس کی معیشت کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

"اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ بس میرے مقدّر میں تھا یہ سب کچھ۔" دوسم نے ایک معنوی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"مجھے کبھی بھی سوباگل فون نہیں خریدا نا چاہئے کیونکہ یہ میرے کسی کام نہیں آسکے گا۔ کم از کم

جہاں تک گرل فرینڈ کی تلاش کا سوال ہے۔" وہ ایک بار بھر کرسی جھلانے لگا۔

"دیر سے کسی مگر بات تمہاری سمجھ میں آئی گئی۔" امام نے ہاتھ بڑھا کر میز سے بیڈ فون اٹھاتے

ہوئے کہا۔

"دیسے تم سن کیا رہی تھیں؟" دوسم کو اسے بیڈ فون اٹھاتے دیکھ کر بھراؤ آیا۔

"دیسے یہ کچھ خاص نہیں تھا۔" امام نے اُٹھتے ہوئے اسے جیسے ڈالا۔

☆.....☆.....☆

"آپ لاہور جا رہے ہیں تو وہاں پر امام کے ہاسٹل چلے جائیں، یہ کچھ کپڑے ہیں اس کے،

درزی سے لے کر آئی ہوں، آپ اسے دے آئیں۔" سہلی نے ہاشم سے کہا۔

"بھئی۔ میں بڑا مصروف ہوں گا لاہور میں، کہاں آتا جاتا پھروں گا اس کے ہاسٹل۔" ہاشم کو

قدرے تامل ہوا۔

"آپ ڈرائیور کو ساتھ لے کر جا رہے ہیں، خود نہیں جاسکتے تو اسے بھیج دیجئے گا، وہ دے آئے گا

یہ پیکٹ۔ سیزن ختم ہو رہا ہے پھر یہ کپڑے اسی طرح پڑے رہیں گے۔ اس کا تو پتا نہیں اب کب آئے۔"

سہلی نے لمبی چوڑی وضاحت کی۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں لے جاتا ہوں۔ فرصت ملی تو خود دے آؤں گا ورنہ ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا

دوں گا۔" ہاشم رضامند ہو گئے۔

لاہور میں انہوں نے خاصا مصروف دن گزارا۔ شام پانچ بجے کے قریب انہیں کچھ فرصت ملی اور

تب انہیں اس پیکٹ کا بھی خیال آگیا۔ ڈرائیور کو پیکٹ لے جانے کا کہنے کے بجائے وہ خود امام کے

ہاسٹل چلے آئے۔ اس کے ایڈمیشن کے بعد آج پہلی بار وہ وہاں آئے تھے۔ گیٹ کپڑے کے ہاتھ انہوں

نے امام کے لئے پیغام بھجوایا اور خود انتظار کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی آجائے گی مگر ایسا نہ

ہوا، دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ..... وہ اب کچھ بیزار ہونے لگے۔ اس سے پہلے کہ دو اندر دو بارہ

پیغام بھجواتے انہیں گیٹ کپڑے ایک لڑکی کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ کچھ قریب آئے پر انہوں نے اس

لڑکی کو پہچان لیا، جو یہ تھی امام کی بچیوں کی دوست اور اس کا تعلق بھی اسلام آباد سے ہی تھا۔

"السلام علیکم انکل!" جو یہی نے پاس آکر کہا۔

"وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہو تم۔"

"میں ٹھیک ہوں۔"

"میں یہ امامہ کے کچھ کپڑے دینے آیا تھا، لاہور آ رہا تھا تو اس کی امی نے یہ پیکٹ دے دیا۔ اب یہاں بیٹھے بیٹھے گھنٹہ ہو گیا ہے مگر انہوں نے اسے نہیں بلایا۔" ہاشم کے لہجے میں شکوہ تھا۔
"انگل! امامہ مارکیٹ گئی ہے کچھ دوستوں کے ساتھ، آپ یہ پیکٹ مجھے دے دیں، میں خود اسے دے دوں گی۔"

"ٹھیک ہے، تم رکھ لو۔" ہاشم نے وہ پیکٹ جویریہ کی طرف بڑھادیا۔

رکھی علیک سلیک کے بعد وہ واپس مڑ گئے۔ جویریہ بھی پیکٹ پکڑ کر ہاسٹل کی طرف چلی گئی مگر اب اس کے چہرے پر موجود مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی، کوئی بھی اس وقت اس کے چہرے پر پریشانی کو واضح طور پر بھانپ سکتا تھا۔

ہاسٹل کے اندر آتے ہی دارؤن سے اس کا سامنا ہو گیا جو سامنے ہی کھڑی تھیں۔ جویریہ کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ آگئی۔

"بات ہوئی تمہاری اس کے والد سے؟" دارؤن نے اسے دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"نئی بات ہوئی، پریشانی والا کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ اسلام آباد میں اپنے گھر پر ہی ہے، اس کے والد یہ پیکٹ لے کر آئے تھے، میرے گھر والوں نے میرے کچھ کپڑے بھجوائے ہیں۔ انگل لاہور آ رہے تھے تو امامہ نے کہا کہ وہ لے جائیں۔ انگل نے لفظی سے یہاں آکر میرا نام لینے کے بجائے امامہ کا نام لے دیا۔" جویریہ نے ایک ہی سانس میں کئی جھوٹ روائی سے بولے۔

دارؤن نے سکون کا سانس لیا۔ "خدا کا شکر ہے ورنہ میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی کہ مجھے تو وہ دیکھ اینڈ پر گھر جانے کا کہہ کر گئی ہے۔۔۔۔۔ تو پھر وہ کہاں ہے۔۔۔۔۔"

دارؤن نے مڑتے ہوئے کہا۔ جویریہ پیکٹ پکڑے اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔ راہبہ اسے دیکھتے ہی تیر کی طرح اس کی طرف آئی۔

"کیا ہوا۔۔۔ اسلام آباد میں ہی ہے وہ؟"

"نہیں۔" جویریہ نے مایوسی سے سر بلایا۔

"مائی گاڈ! راہبہ نے بے یقینی سے اپنے دونوں ہاتھ کر اس کے سینے پر رکھے۔ "تو پھر کہاں گئی ہے وہ؟"

"مجھے کیا پتا مجھ سے تو اس نے یہی کہا تھا کہ گھر جا رہی ہے، مگر وہ گھر نہیں گئی، آخر وہ گئی کہاں ہے؟ امامہ ایسی تو نہیں ہے۔" جویریہ نے پیکٹ بستر پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"دارؤن سے کیا کہا تم نے؟" راہبہ نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

"کیا کہا؟ جھوٹ بولا ہے اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ بتاؤ تو کہ وہ اسلام آباد میں نہیں ہے تو ہاسٹل میں تو ابھی ہنگامہ شروع ہو جاتا، وہ تو پولیس کو بلاواتیں۔" جویریہ نے ناخن کاٹتے ہوئے کہا۔

"اور انگل کو۔۔۔۔۔ ان کو کیا بتایا ہے؟" راہبہ نے پوچھا۔

"ان سے بھی جھوٹ بولا ہے، یہی کہا ہے کہ وہ مارکیٹ گئی ہے۔"

"مگر اب ہو گا کیا؟" راہبہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"مجھے تو یہ فکر ہو رہی ہے کہ اگر وہ واپس نہ آئی تو میں تو بری طرح پکڑی جاؤں گی۔ سب یہی سمجھیں گے کہ مجھے اس کے پروگرام کا پتا تھا، اس لئے میں نے دارؤن اور اس کے گھر والوں سے سب کچھ چھپایا۔" جویریہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"کہیں امامہ کو کوئی حادثہ ہی پیش نہ آ گیا ہو؟ ورنہ وہ ایسی لڑکی تو نہیں ہے کہ اس طرح۔۔۔۔۔"

راہبہ کو اچانک ایک خدشے نے ستایا۔

"مگر اب ہم کیا کریں۔ ہم تو کسی سے اس سارے معاملے کو ڈسکس بھی نہیں کر سکتے۔" جویریہ نے ناخن کھرتے ہوئے کہا۔

"نہنہ سے بات کریں۔" راہبہ نے کہا۔

"فارگاہڑ سیک راہبہ! کبھی تو حصل سے کام لیا کرو، اس سے کیا بات کریں گے ہم۔" جویریہ نے جھنجھلا کر کہا۔

"تو پھر انتظار کرتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ آج رات تک ہاسٹل تک آجائے اگر آگئی تو کوئی مسئلہ نہیں رہے گا اور اگر نہ آئی تو پھر ہم دارؤن کو سب کچھ جھجھکا دیں گے۔" راہبہ نے سنجیدگی سے سارے معاملے پر غور کرتے ہوئے طے کیا۔ جویریہ نے اسے دیکھا مگر اس کے مشورے پر کچھ کہا نہیں۔ پریشانی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جویریہ اور راہبہ رات بھر سو نہیں سکیں۔ وہ مکمل طور پر خوف کی گرفت میں تھیں۔ اگر وہ نہ آئی تو کیا ہو گا، یہ سوال ان کے سامنے بار بار بھیانک شبکیں بدل بدل کر آ رہا تھا۔ انہیں اپنا کیرئیر ڈھونڈنا تو نظر آ رہا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ ان کے گھر والے ایسے معاملے پر کیسا رد عمل ظاہر کریں گے۔ وہ انہیں بری طرح ملامت کرتے، انہیں امامہ کے والد کو سب کچھ صاف صاف نہ بتانے پر تنقید کا نشانہ بناتے اور پھر دارؤن سے سارے معاملے کو چھپانے پر اور بھی ناراض ہوتے۔

انہیں اندازہ نہیں تھا کہ حقیقت سامنے آنے پر خود ہاشم مبین اور ان کی جلی کارو عمل کیا ہو گا، وہ

اس سارے معاملے میں ان دونوں کے رول کو کس طرح دیکھیں گے۔ ہاسٹل میں لڑکیاں ان کے بارے میں کس طرح کی باتیں کریں گی اور پھر اگر یہ سارا معاملہ پولیس کیس بن گیا تو پولیس ان کی اس پردہ پوشی کو کیا سمجھے گی، وہ اندازہ کر سکتی تھیں اور اسی لئے بار بار ان کے روٹھے کھڑے ہو رہے تھے۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ دو مہینے کہاں..... اور کیوں..... وہ دونوں اس کے پچھلے رویوں کا تجربہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کس طرح پچھلے ایک سال سے وہ بالکل بدل گئی تھی، اس نے ان کے ساتھ گھومنا پھرنا بند کر دیا تھا، وہ اب بھی ابھی رہنے لگی تھی، پڑھائی میں اس کا انہماک بھی کم ہو گیا تھا اور اس کی کم کوئی۔

"اور وہ جو ایک بار وہ ہمارے شاپنگ کے لئے جانے پر پیچھے سے غائب تھی، اب بھی یقیناً وہ وہیں مگنی ہوگی جہاں وہ اب بھی ہے اور ہم نے کس طرح ہے وہ تو ان کی طرح اس پر اعتبار کر لیا۔" رابعہ کو جھجھکیاں تھیں یاد آ رہی تھیں۔

"مگر امامہ ایسی نہیں تھی، میں تو اسے بھینٹ سے جانتی ہوں۔ وہ ایسی بالکل بھی نہیں تھی۔" جویریہ کو اب بھی اس پر کوئی شک نہیں ہو رہا تھا۔

"ایسا ہونے میں کوئی ریر تھوڑی لگتی ہے، بس انسان کا کردار کمزور ہوتا چاہئے۔" رابعہ بدگمانی کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی۔

رابعہ اس کی مرضی سے اس کی مٹھی ہوئی تھی، وہ اور اسجد ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے پھر وہ اس طرح کی حرکت کیسے کر سکتی ہے۔" جویریہ نے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

"پھر تم بتاؤ کہ وہ کہاں ہے..... میں نے تو کبھی بتا کر اسے کسی دیوار کے ساتھ نہیں چپکا پایا ہے، اس کے باپ اس سے ملنے یہاں آئے ہیں اور وہ اپنے گھر سے آئے ہیں، تو ظاہر ہے وہ گھر پر نہیں مگنی اور ہم سے وہ یہی کہہ کر مگنی تھی کہ وہ گھر جا رہی ہے۔" رابعہ نے بے چارگی سے کہا۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔" ہو سکتا ہے، وہ اسی لئے گھر نہ پہنچ سکی ہو۔

"وہ ہر بار یہاں سے فون کر کے اسلام آباد اپنے گھروالوں کو اپنے آنے کی اطلاع دے دیتی تھی تاکہ اس کا بھائی اسے کوسٹر کے اسٹینڈ سے پک کر لے۔ اگر اس بار بھی اس نے اسے اطلاع دی تھی تو پھر اس کے وہاں نہ پہنچنے پر دو لوگ اطمینان سے وہاں نہ بیٹھے ہوتے، وہ یہاں ہاسٹل میں فون کرتے اور اس کے والد کے انداز سے تو ایسا ہی محسوس ہوا ہے جیسے اس کا اس ویک اینڈ پر اسلام آباد کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔" رابعہ نے اس کے قیاس کو کھل طور پر رد کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ وہ کبھی بھی ایک ماہ میں دو بار اسلام آباد نہیں جاتی تھی مگر اس بار تو وہ دوسرے ہی ہفتے

اسلام آباد جا رہی تھی اور اس نے وارڈن سے خاص طور پر یہ کہہ کر اجازت لی تھی۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ضرور غلط ہے۔" جویریہ کو پھر غدشات ستانے لگے۔

"اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی بری طرح ڈوبیں گے۔ ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو ہم نے سب کچھ اس طرح کو راپ کیا، ہمیں صاف صاف بات کرنی چاہئے تھی اس کے والد سے کہ وہ یہاں نہیں ہے، پھر وہ جو چاہے کرتے۔ یہ ان کا مسئلہ ہوتا، کم از کم ہم تو اس طرح نہ پھنستے جس طرح اب پھنس گئے ہیں۔" رابعہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"خیر۔ اب کیا ہو سکتا ہے، صبح انتظار کرتے ہیں اگر وہ کل بھی نہیں آئی تو پھر وارڈن کو سب کچھ بتا دیں گے۔" جویریہ نے کمرے کے پتھر لگاتے ہوئے کہا۔

وہ رات ان دونوں نے اسی طرح باتیں کرتے جاتے ہوئے گزار لی۔ اگلے دن وہ دونوں کالج نہیں گئیں۔ اس حالت میں کالج جانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔

امامہ ویک اینڈ پر ہفتہ کو واپسی پر نوبے کے قریب آ جایا کرتی تھی مگر اس دن وہ نہیں آئی، ان کے اعصاب جواب دینے لگے۔ ذہانی بچے کے قریب وہ فنی رنگت اور کاپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اپنے کمرے سے وارڈن کے کمرے میں جانے کے لئے نکل آئیں، ان کے ذہن میں وہ بیٹے گردش کر رہے تھے، جو انہیں وارڈن سے کہنے تھے۔

وہ وارڈن کے کمرے سے ابھی کچھ دور ہی تھیں جب انہوں نے امامہ کو بڑے اطمینان کے ساتھ اندر آتے دیکھا۔ اس کا بیگ اس کے کاندھے پر تھا اور فولڈر ہاتھوں میں، وہ یقیناً سیدھی کالج سے آ رہی تھی۔ جویریہ اور رابعہ کو یوں لگا جیسے ان کے پیروں کے نیچے سے نکلتی ہوئی زمین یک دم ختم ہو گئی تھی۔ ان کی رکی ہوئی سانس ایک بار پھر چلنے لگی تھی۔ کل کے اخبارات میں متوقع وہ ہیڈ لائنز جو بھوت بن کر ان کے گرد ناچ رہی تھیں یک دم غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ اس نئے اور اشتعال نے لی تھی جو انہیں امامہ کی ہل دیکھ کر آیا تھا۔

وہ انہیں دیکھ چکی تھی اور اب ان کی طرف بڑھ رہی تھی، اس کے چہرے پر بڑی خوشگوار سی مسکراہٹ تھی۔

"تم دونوں آج کالج کیوں نہیں آئیں؟" سلام دعا کے بعد اس نے ان سے پوچھا۔

"تمہاری مصیبتوں سے پھر کاروائے گا تو ہم کہیں آنے جانے کا سوچ سکیں گے۔" رابعہ نے تند و تیز لہجہ میں اس سے کہا۔

امامہ کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"کیا ہوا رابعہ! اس طرح نصیحتیں میں کیوں ہوں؟" امامہ نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

”تم ذرا اندر کمرے میں آؤ پھر تمہیں بتائی ہوں کہ میں غصے میں کیوں ہوں۔“ رابعہ نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور تقریباً کھینچے ہوئے کمرے میں لے آئی۔ جویریہ یہ کچھ کہے بغیر ان دونوں کے پیچھے آگئی۔ امامہ بکا بکا تھی وہ رابعہ اور جویریہ کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی رابعہ نے دروازہ بند کر لیا۔

”کہاں سے آ رہی ہو تم؟“ رابعہ نے مڑ کر انتہائی رخ اور درشت لہجے میں اس سے پوچھا۔

”اسلام آباد سے اور کہاں سے۔“ امامہ نے اپنا ٹیکہ نیچے زمین پر رکھ دیا اس کے جواب نے رابعہ کو کچھ اور مشتعل کیا۔

”شرم کرو امامہ..... اس طرح ہمیں دھوکا دے کر، ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر آخر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ یہ کہ ہم ذفر ہیں۔ انیسٹ ہیں۔ پاگل ہیں۔ بھئی ہم ہیں۔ ہم مانتے ہیں..... نہ ہوتے تو یوں تم پر اندھا اعتبار نہ کیا ہوتا تم سے اتنا بڑا دھوکا نہ کھایا ہوتا۔“ رابعہ نے کہا۔

”مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ کون سا دھوکا..... کیسا دھوکا، کیا یہ بہتر نہیں کہ تم آرام سے مجھے اپنی بات سمجھاؤ۔“ امامہ نے بے چارگی سے کہا۔

”تم ویک اینڈ کہاں گزار کر آئی ہو؟“ جویریہ نے پہلی بار گفتگو میں مداخلت کی۔

”تمہیں بتا چکی ہوں اسلام آباد میں، وہاں سے آج سیدھا کالج آئی ہوں اور اب کالج سے.....“ رابعہ نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

”نیکو اس بند کرو..... یہ جھوٹ اب نہیں چل سکتا، تم اسلام آباد نہیں گئی تھیں۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“ اس بار امامہ نے بھی قدرے بلند آواز میں کہا۔

”کیونکہ تمہارے قادر یہاں آئے تھے کل؟“ امامہ کا رنگ اڑ گیا۔ وہ کچھ بول نہیں سکی۔

”اب کیوں منہ بند ہو گیا ہے۔ اب بھی کہو کہ تم اسلام آباد سے آ رہی ہو۔“ رابعہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”بابا یہاں۔ آئے تھے؟“ امامہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

”ہاں آئے تھے، تمہارے کچھ کپڑے دینے کے لئے۔“ جویریہ نے کہا۔

”انہیں یہ پتا چل گیا کہ میں ہاسٹل میں نہیں ہوں۔“

”میں نے جھوٹ بول دیا کہ تم ہاسٹل سے کسی کام کے لئے باہر گئی ہو، وہ کپڑے دے کر چلے گئے۔“ جویریہ نے کہا۔ امامہ نے بے اعتبار اطمینان کا سانس لیا۔

”یعنی انہیں کچھ پتا نہیں چلا؟“ اس نے بستر پر بیٹھ کر اپنے جوتے کے اسٹریپس کھولنے ہوئے کہا۔

”نہیں انہیں کچھ پتا نہیں چلا..... تم منہ اٹھا کر اگلے بیٹے پھر کہیں روانہ ہو جاؤ۔ ماسٹرو امامہ! میں

اب وارڈن سے اس سلسلے میں بات کرنے والی ہوں۔ ہم تمہاری وجہ سے خاصی پریشانی اٹھا چکے ہیں، مزید اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بہتر ہے تمہارے جیٹس کو تمہاری ان حرکتوں کے بارے میں پتا چل جائے۔“ رابعہ نے دو نوک انداز میں اس سے کہا۔ امامہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کون سی حرکتوں کے بارے میں..... میں نے کیا کیا ہے؟“

”کیا کیا ہے.....؟ ہاسٹل سے اس طرح دو دن کے لئے گھر کا کہہ کر غائب ہو جانا تمہارے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے۔“

امامہ جواب دینے کے بجائے دوسرے جوتے کے بھی اسٹریپس کھولنے لگی۔

”مجھے وارڈن کے پاس چلے ہی جانا چاہئے۔“

رابعہ نے غصے کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جویریہ نے آگے بڑھ کر اسے روکا۔ ”وارڈن سے بات کر لیں گے، پہلے اس سے توبات کر لیں۔

تم جلد بازی مت کرو۔“

”مگر تم اس ڈھیت کا اطمینان دیکھو..... مجال ہے ذرہ برابر شرمندگی بھی اس کے چہرے پر جھلک رہی ہو۔“ رابعہ نے غصے میں امامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں تم دونوں کو سب کچھ بتاؤں گی۔ اتنا غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا نہ ہی کسی غلط جگہ پر گئی ہوں اور ہاں بھاگی بھی نہیں ہوں۔“ امامہ نے جوتوں کی قید سے اپنے

جوتوں کو آواز کرتے ہوئے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔

”پھر تم کہاں گئی تھیں؟“ اس بار جویریہ نے پوچھا۔

”اپنی ایک دوست کے پاس۔“

”کون سی دوست؟“

”بے ایک۔“

”اس طرح جھوٹ بول کر کیوں؟“

”میں تم لوگوں کے سوالوں سے بچنا چاہتی تھی اور گھر والوں کو بتائی یا ان سے اجازت لینے کی کوشش کرتی تو وہ بھی اجازت نہ دیتے۔“

”کس کے پاس گئی تھیں؟ اور کس لئے؟“ جویریہ نے اس بار قدرے جتنس آمیز انداز میں پوچھا۔

”میں نے کہا نا، میں بتا دوں گی۔ کچھ وقت دو مجھے۔“ امامہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”کوئی وقت نہیں دے سکتے تمہیں..... تمہیں وقت دیں تاکہ تم ایک بار پھر غائب ہو جاؤ اور اس بار واپس ہی نہ آؤ۔“ رابعہ نے اس بار بھی ناراضی سے کہا مگر پہلے کی نسبت اس بار اس کا لہجہ دھیمہ تھا۔

"جسہیں تو اس بات کا بھی احساس نہیں ہوا کہ تم نے ہماری پوزیشن کتنی آگور ڈیادی تھی، اگر تمہارے اس طرح غائب ہونے کا پتہ چل جاتا تو ہماری کتنی بے عزتی ہوتی۔ اس کا احساس تھا جسہیں؟" رابعہ نے اسی انداز میں کہا۔

"مجھے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ بابا یہاں اس طرح اچانک آجائیں گے۔ اس لئے میں یہ بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تم لوگوں کو کسی ہزک صورت حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے ورنہ میں اس طرح بھی نہ کرتی۔" امامہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"تم کم از کم ہم پر اعتبار کر کے، ہمیں بتا کر جاسکتی تھیں۔" جویریہ نے کہا۔

"میں آئندہ ایسا کبھی نہیں کروں گی۔" امامہ نے کہا۔

"کم از کم میں تمہارے کسی وعدے، کسی بات پر اعتبار نہیں کر سکتی۔" رابعہ نے دو ٹوک انداز

میں کہا۔

"مجھے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے دو رابعہ! تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔" امامہ نے اس بار قدرے کمزور

انداز میں کہا۔

"تم کو احساس ہے کہ تمہاری وجہ سے ہمارا کیریئر اور ہماری زندگی کس طرح داؤ پر لگ گئی تھی۔ یہ

دوستی ہوتی ہے؟ اسے دوستی کہتے ہیں؟"

"نہیک ہے۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کر دو۔" امامہ نے جیسے ہتھیار ڈالنے ہوئے کہا۔

"جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گی کہ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں، میں تمہاری کوئی معذرت قبول نہیں

کروں گی۔" رابعہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

امامہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

"میں صبر کے گھر چلی گئی تھی۔" جویریہ اور رابعہ نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کون.....؟" ان دونوں نے تقریباً ایک وقت پوچھا۔

"تم لوگ جانتی ہو اسے۔" امامہ نے کہا۔

"وہ فورتحہ انیر کی صبیہ؟" جویریہ نے بے اعتبار پوچھا۔

امامہ نے سر ہلایا۔ "مگر اس کے گھر کس لئے گئی تھیں تم؟"

"دوستی ہے اس سے میری۔" امامہ نے کہا۔

"دوستی.....؟ کیسی دوستی.....؟ چار دن کی سلام دعا ہے تمہارے ساتھ اس کی اور میرا خیال ہے تم

تو اسے اچھی طرح جانتی بھی نہیں ہو پھر اس کے گھر رہنے کے لئے کیوں چل پڑیں؟" جویریہ نے اعتراض

کرتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی اس طرح جھوٹ بول کر..... کم از کم اس کے گھر جا کر رہنے کے لئے جسہیں ہم سے یا اپنے گھروالوں سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔" رابعہ نے اسی لہجے میں کہا۔

"تم اسے کال کر کے پوچھ لو کہ میں اس کے گھر پر تھی یا نہیں۔" امامہ نے کہا۔

"چلو یہ مان لیا کہ تم اس کے گھر پر تھیں مگر کیوں تھیں.....؟" جویریہ نے پوچھا۔

امامہ خاموش رہی پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا "مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی۔"

ان دونوں نے حیران ہو کر دیکھا "کس سلسلے میں؟"

امامہ نے سر اٹھایا اور پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ جویریہ نے کچھ بے چینی محسوس کی۔ "کس

سلسلے میں؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو۔" امامہ نے قدرے مدہم انداز میں کہا۔

"میں.....؟" جویریہ نے کچھ گڑبڑا کر رابعہ کو دیکھا جواب بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، تم تو اچھی طرح جانتی ہو۔"

"تم پہیلیاں مت بھجواؤ۔ سیدھی اور صاف بات کر دو۔" جویریہ نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

امامہ سر اٹھا کر خاموشی سے اسے دیکھنے لگی پھر کچھ دیر بعد گھٹست خور دو انداز میں اس نے سر جھکا دیا۔

☆.....☆.....☆

"بتاؤ۔ آخر تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟" اس دن کالج میں امامہ نے

جویریہ سے اصرار کیا۔

جویریہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ "میری خواہش ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔"

امامہ کو جیسے ایک کرنٹ سا لگا۔ اس نے شاک اور بے چینی کے عالم میں جویریہ کو دیکھا۔ وہ جیسے

لہجے میں کہتی جا رہی تھی۔

"تم میری اتنی اچھی اور گہری دوست ہو کہ مجھے یہ سوچ کر تکلیف ہوتی ہے کہ تم مگر ای کے راستے

پر چل رہی ہو اور جسہیں اس کا احساس تک نہیں ہے..... نہ صرف تم بلکہ تمہاری پوری فیملی..... میری

خواہش ہے کہ نیک اعمال پر اگر اللہ مجھے جنت میں بھیجے تو تم میرے ساتھ ہو لیکن اس کے لئے مسلمان

ہونا تو ضروری ہے۔"

امامہ کے چہرے پر ایک کے بعد ایک رنگ آرہا تھا۔ بہت دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہو سکی۔

"میں توقع نہیں کر سکتی تھی جویریہ کہ تم مجھ سے تحریم جیسی باتیں کرو گی۔ جسہیں تو میں اپنا دوست

سمجھتی تھی مگر تم بھی....." جویریہ نے نرمی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"تحریم نے تم سے تب جو کچھ کہا تھا، ٹھیک کہا تھا۔" امامہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتی رہی، اسے

جویریہ کی باتوں سے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

"اور صرف آج ہی نہیں، میں اس وقت بھی تحریم کو صحیح سمجھتی تھی مگر میری تمہارے ساتھ دوستی تھی اور میں چاہنے کے باوجود تم سے یہ نہیں کہہ سکی کہ میں تحریم کو حق بجانب سمجھتی ہوں۔ اگر وہ یہ کہتی تھی کہ تم مسلمان نہیں ہو تو یہ ٹھیک تھا۔ تم مسلمان نہیں ہو۔"

امامہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچھ بھی کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جویریہ بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ امامہ نے کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے جانے کی کوشش کی مگر جویریہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"تم میرا بازو چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو، آئندہ کبھی تم مجھ سے بات تک مت کرنا۔" امامہ نے بھڑکے ہوئے لہجے میں اس سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"امامہ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں....."

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے کتنا ہرٹ کیا ہے مجھے۔ جویریہ مجھے کم از کم تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔"

"میں تمہیں ہرٹ نہیں کر رہی ہوں۔ حقیقت بتا رہی ہوں۔ رونے یا جذبات میں آنے کے بجائے تم ٹھنڈے دل و دماغ سے میری بات پر سوچو..... میں آخر تم کو بے کار کسی بات پر ہرٹ کیوں کروں گی۔" جویریہ نے اس کا بازو نہیں چھوڑا۔

"یہ تو تمہیں پتا ہو گا کہ تم مجھے ہرٹ کیوں کر رہی ہو، مگر مجھے آج یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ تم میں اور تحریم میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ تم نے تو مجھے اس سے بھی زیادہ تکلیف پہنچائی ہے۔ اس سے میری دوستی اتنی پرانی نہیں تھی جتنی تمہارے ساتھ ہے۔" امامہ کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے اور وہ مسلسل اپنا بازو جویریہ کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمہارا اصرار تھا کہ میں تمہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بتاؤں۔ میں اسی لئے تمہیں نہیں بتا رہی تھی اور میں نے تمہیں پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ تم میری بات پر بہت ناراض ہو گی مگر تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" جویریہ نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"مجھے اگر یہ پتا ہو تا کہ تم میرے ساتھ اس طرح کی بات کرو گی تو میں کبھی تم سے تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش جاننے پر اصرار نہ کرتی۔" امامہ نے اس بار قدرے غصے سے کہا۔

"اچھا میں دوبارہ اس معاملے پر تم سے بات نہیں کروں گی۔" جویریہ نے قدرے مدافعت انداز میں کہا۔

"اس سے کیا ہو گا۔ مجھے یہ تو پتا چل گیا ہے کہ تم درحقیقت میرے بارے میں کیا سوچتی ہو....."

تمہاری دوستی اب کبھی بھی پہلے جیسی نہیں ہو سکتی۔ آج تک میں نے کبھی تم پر اس طرح کی تنقید نہیں کی مگر تم مجھے اسلام کا ایک فرقہ سمجھنے کے بجائے غیر مسلم بتا رہی ہو۔" امامہ نے کہا۔

"میں اگر ایسا کر رہی ہوں تو غلط نہیں کر رہی۔ اسلام کے تمام فرقے کم از کم یہ ایمان ضرور رکھتے ہیں کہ حضور ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں اور ان کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔" اس بار جویریہ کو بھی غصہ آ گیا۔

"ماسٹر یور لیکچرنگ۔" امامہ بھی بھڑک اٹھی۔

"میں تمہیں حقیقت بتا رہی ہوں امامہ..... اور میں ہی نہیں یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ تمہاری فیملی نے روپے کے حصول کے لئے مذہب بدلا ہے۔"

"امامہ! میری باتوں پر اتنا ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے۔"

امامہ نے جویریہ کی بات کاٹ دی۔ "مجھے ضرورت نہیں ہے تمہاری کسی بھی بات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی۔ میں جانتی ہوں حقیقت کیا ہے اور کیا نہیں....."

"تم نہیں جانتیں اور یہی افسوس ناک بات ہے۔" جویریہ نے کہا۔ امامہ نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اس بار بہت زور کے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا اور تیز قدموں کے ساتھ وہاں سے چل پڑی۔ اس بار جویریہ نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کچھ افسوس اور پریشانی سے اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ امامہ اس طرح ناراض نہیں ہوتی تھی جس طرح وہ آج ہو گئی تھی اور یہی بات جویریہ کو پریشان کر رہی تھی۔

”تمہاری یہ دونوں فریڈز سید ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر ہمارے فرقہ کو پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے ان دونوں کے والدین انہیں ہمارے گھر آنے نہیں دیتے۔“

ایک بار اس کی امی نے اس کی شکایت پر کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی..... ہمارے فرقے کو کیوں پسند نہیں کرتے.....“ امامہ کو ان کی بات پر غصہ ہوا۔

”اب یہ تو وہی لوگ بتا سکتے ہیں کہ وہ ہمارے فرقے کو کیوں پسند نہیں کرتے..... یہ تو ہمیں

غیر مسلم بھی کہتے ہیں۔“ اس کی امی نے کہا۔

”کیوں غیر مسلم کہتے ہیں۔ ہم تو غیر مسلم نہیں ہیں۔“ امامہ نے کچھ الجھ کر کہا۔

”ہاں بالکل۔ ہم مسلمان ہیں..... مگر یہ لوگ ہمارے نبی پر یقین نہیں رکھتے۔“ اس کی امی نے کہا۔

”کیوں.....؟“

”اب اس کیوں کا میں کیا جواب دے سکتی ہوں۔ بس یہ لوگ یقین نہیں رکھتے۔ کمز ہیں بڑے، یہ

تو انہیں قیامت کے دن ہی پتا چلے گا کہ کون سیدھے رستے پر تھا۔ ہم یا یہ.....“

”مگر امی! مجھ سے تو انہوں نے کبھی مذہب پر بات نہیں کی۔ پھر مذہب مسئلہ کیسے بن گیا..... اس

سے کیا فرق پڑتا ہے پھر دوسرے کے گھر آنے جانے سے کیا ہوتا ہے۔“ امامہ ابھی ابھی ہوتی تھی۔

”یہ بات انہیں کون سمجھائے..... یہ لوگ ہمیں جھوٹا کہتے ہیں، حالانکہ خود انہیں ہمارے بارے

میں کچھ پتا نہیں..... بس مولویوں کے کہنے میں آکر ہم پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ انہیں ہمارے بارے میں

اور ہمارے نبی کی تعلیمات کے بارے میں کچھ پتا تو یہ لوگ اس طرح نہ کریں۔ شاید پھر انہیں کچھ

شعور آجائے..... اور یہ لوگ بھی ہماری طرح راہِ ہدایت پر آجائیں۔ تمہاری فریڈز اگر تمہارے گھر

نہیں آتیں تو جیتیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم بھی ان کے گھر مت جایا کرو۔“

”مگر امی! ان کی غلط فہمیاں تو دور ہو نا چاہئیں میرے بارے میں۔“ امامہ نے ایک بار پھر کہا۔

”یہ کام تم نہیں کر سکتیں۔ ان لوگوں کے ماں باپ مسلسل اپنے بچوں کی ہمارے خلاف بریں و اٹھک

کرتے رہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ہمارے خلاف زہر بھرتے رہتے ہیں۔“

”نہیں امی! وہ میری جیٹ فریڈز ہیں۔ ان کو میرے بارے میں اس طرح نہیں سوچنا چاہئے۔

میں ان لوگوں کو اپنی کتابیں پڑھنے کے لئے دوں گی، تاکہ ان کے دل سے میرے بارے میں یہ غلط فہمیاں

دور ہو سکیں، پھر ہو سکتا ہے یہ ہمارے نبی کو بھی مان جائیں۔“ امامہ نے کہا۔ اس کی امی کچھ سوچ میں

پڑ گئیں۔

”آپ کو میری جو بڑ پسند نہیں آتی؟“

”ایسا نہیں ہے..... تم ضرور انہیں اپنی کتابیں دو..... مگر اس طریقے سے نہیں کہ انہیں یہ لگے کہ

باب ۲

پھر سب کچھ اسکول میں ہونے والے ایک واقعے سے شروع ہوا تھا۔ امامہ اس وقت میزک کی اسٹوڈنٹ تھی اور تحریم اس کی اچھی دوستوں میں سے ایک تھی۔ وہ لوگ کئی سال سے اکٹھے تھے اور نہ صرف ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے بلکہ ان کی فیملیز بھی ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔ اپنی فریڈز میں سے امامہ کی سب سے زیادہ دوستی تحریم اور جویریہ سے تھی مگر اسے حیرت ہوتی تھی کہ اتنی گہری دوستی ہونے کے باوجود وہ بھی جویریہ پر اور تحریم اس کے گھر آنے سے کتراتے تھیں۔ امامہ ہر سال اپنی ساگر پور انہیں انوائس کرتی اور اکثر وہ اپنے گھر پر ہونے والی دوسری تقریبات میں بھی انہیں مدعو کرتی، وہ گھر سے اجازت نہ ملنے کا بہانہ بنا دیتیں۔ چند بار امامہ نے خود ان دونوں کے والدین سے اجازت لینے کے لئے بات کی، لیکن اس کے بے تحاشا اصرار کے باوجود ان دونوں کے والدین انہیں اس کے گھر آنے کی اجازت نہ دیتے۔ ان کے اس رویے پر کچھ شاکي ہو کر اس نے اپنے والدین سے شکایت کی۔

تم اپنے فرقہ کی ترویج کے لئے انہیں یہ کتابیں دے رہی ہو۔ تم انہیں یہ کہہ کر کتابیں دینا کہ تم چاہتی ہو وہ ہمارے بارے میں جانیں۔ ہم کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکیں اور ان سے یہ بھی کہنا کہ ان کتابوں کا ذکر وہ اپنے گھروالوں سے نہ کریں۔ ورنہ دو لوگ زیادہ ناراض ہو جائیں گے۔" امام نے ان کی بات پر سر ہلادیا۔

☆.....☆.....☆

اس کے چند دنوں بعد امام اسکول میں کچھ کتابیں لے گئی تھیں۔ بریک کے دوران وہ جب گراؤڈ میں آکر بیٹھیں تو امام اپنے ساتھ وہ کتابیں بھی لے آئی۔
 "میں تمہارے اور جویریہ کے لئے کچھ لے کر آئی ہوں۔"
 "کیا لائی وہ کھانا؟" امام نے شاپ سے وہ کتابیں نکال لیں اور انہیں دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ان دونوں کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دونوں ان کتابوں پر ایک نظر ڈالتے ہی کچھ چپ سی ہو گئیں۔ جویریہ نے امام سے کچھ نہیں کہا مگر قریم کیم دم کچھ اگڑی گئی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے سردہری سے پوچھا۔

"یہ کتابیں ہیں تمہارے لئے لائے گئی ہیں۔" امام نے کہا۔

"کیوں.....؟"

"تاکہ تم لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔"

"کس طرح کی غلط فہمیاں؟"

"وہی غلط فہمیاں جو تمہارے دل میں، ہمارے مذہب کے بارے میں ہیں۔" امام نے کہا۔

"تم سے کس نے کہا کہ ہمیں تمہارے مذہب یا تمہارے نبی کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں؟"

قریم نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں خود اذکار کر سکتی ہوں۔ صرف اسی وجہ سے تم لوگ ہمارے گھر نہیں آتے۔ تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ مسلمان نہیں ہیں یا ہم لوگ قرآن نہیں پڑھتے یا ہم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر نہیں مانتے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ ان سب چیزوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہمارا بھی ایک نبی ہے اور وہ بھی اسی طرح کا علیٰ احترام ہے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔" امام نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

قریم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں اسے واپس چھادیں۔ "ہمیں تمہارے اور تمہارے مذہب کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ ہم تمہارے مذہب کے بارے میں ضرورت سے زیادہ

جانتے ہیں۔ اس لئے تم کو کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بڑے روکے بچے میں امام سے کہا۔ "اور جہاں تک ان کتابوں کا تعلق ہے تو میرے اور جویریہ کے پاس اتنا بے کار وقت نہیں ہے کہ ان اعتقاد و دعویٰ، خوش فہمیوں اور گمراہی کے اس پلندے پر ضائع کریں جسے تم اپنی کتابیں کہہ رہی ہو۔" قریم نے ایک جھجکے کے ساتھ رابعہ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں سمجھ کر انہیں بھی امام کے ہاتھ میں چھادیں۔ امام کا چہرہ خفت اور شرمندگی سے سرخ پڑ گیا۔ اسے قریم نے اس طرح کے تبصرے کی توقع نہیں تھی مگر وہ ہوتی تو وہ کبھی اسے وہ کتابیں دینے کی عاقبت ہی نہ کرتی۔

"اور جہاں تک اس احترام کا تعلق ہے تو اس میں جس پر نبوت کا نزول ہوتا ہے اور اس میں جو خود بخود نمود ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو اگر قرآن پر واقعی یقین ہوتا تو تمہیں اس کے ایک ایک حرف پر یقین ہوتا۔ نبی ہونے میں اور نبی بننے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"قریم اقم میری اور میرے فرقہ کی بے عزتی کر رہی ہو۔" امام نے آنکھوں میں اٹھتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ کہا۔

"میں کسی کی بے عزتی نہیں کر رہی۔ میں صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں، دو اگر تمہیں بے عزتی لگتی ہے تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتی۔" قریم نے دو نوک انداز میں کہا۔

"رہ زور رکھنے میں اور بھوکے رہنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ قرآن پڑھنے اور اس پر ایمان لانے میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ بہت سارے عیسائی اور ہندو بھی اسلام کے بارے میں جانتے کے لئے قرآن پاک پڑھتے ہیں تو کیا انہیں مسلمان مان لیا جاتا ہے اور بہت سے مسلمان بھی دوسرے مذہب کے بارے میں جانتے کے لئے دوسری الہامی کتابیں پڑھتے ہیں تو کیا وہ غیر مسلم ہو جاتے ہیں اور تم لوگ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر مانتے ہو تو کوئی احسان نہیں کرتے۔ تم ان کی نبوت کو جھٹاؤ گے تو اور کیا کیا جھٹاؤ گے، پھر تو انجیل کو بھی جھٹاؤ پڑے گا، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی خوش خبری دی گئی ہے، پھر تو تورات کو بھی جھٹاؤ پڑے گا جس میں ان کی نبوت کی بات کی گئی ہے، پھر قرآن پاک کو بھی جھٹاؤ پڑے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی قرار دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر تمہارا نبی، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو جھٹلاتا تو وہ ان مناظروں کی کیا وجہ پیش کرنا جو وہ نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے کئی سال عیسائی پادروں سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور اسلام کے آخری دین ہونے پر کرتا رہا تھا۔ اس لئے امام ہاشم! تم ان چیزوں کے بارے میں بحث کرنے کی کوشش مت کرو جن کے بارے میں تمہیں سرے سے کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ جنہیں نہ اس مذہب کے بارے میں پتا ہے جس پر تم قیام رکھ رہی ہو اور نہ اس کے بارے میں جس پر تم بات کر رہی ہو۔"

تحریم نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”اور میں ایک چیز بتا دوں تجھیں..... دین میں کوئی جرح نہیں ہوتا..... تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے حقیقی ہونے کا انکار کرتے ہو تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“
”مگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر یقین رکھتے ہیں۔“ امام نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”تو پھر ہم بھی انجیل پر یقین رکھتے ہیں، اسے الہامی کتاب مانتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر یقین رکھتے ہیں تو کیا ہم کرنا نہیں ہیں.....؟ اور ہم تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت پر بھی یقین رکھتے ہیں تو کیا پھر ہم یہودی ہیں؟“ تحریم نے کچھ تشویش سے کہا۔ ”لیکن ہمارا دین اسلام ہے، کیونکہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار ہیں اور ہم ان پیغمبروں پر یقین رکھتے ہیں جو دوسری عیسائیت کا حصہ ہیں نہ یہودیت کا، بالکل اسی طرح تم لوگوں کا نبی ہے کیونکہ تم اس کے پیروکار ہو۔ ویسے تم لوگ تو ہمیں بھی مسلمان نہیں سمجھتے۔ ابھی تم اصرار کر رہی ہو کہ تم اسلام کا ایک فرقہ ہو۔ جب کہ تمہارے نبی اور اس کے بعد آنے والے تمہاری جماعت کے تمام لیڈرز کا دعویٰ ہے کہ جو مرزا کی نبوت پر یقین نہیں رکھتا وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ تو اسلام سے تو تم لوگ تمام مسلمانوں کو پہلے ہی خارج کر چکے ہو۔“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے ایسا کب کہا ہے؟“ امام نے قدرے لڑکھڑائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو پھر تم اپنے والد صاحب سے ذرا اس معاملے کو ڈسکس کرنا۔“ وہ جہیں خاصی اپ ٹوڈیٹ انفارمیشن دیں گے اس بارے میں۔ تمہارے مذہب کے خاصے سرکردہ رہنما ہیں۔“ تحریم نے کہا۔
”اور یہ جو کتابیں تم ہمیں پیش کر رہی ہو..... انجیل خود پڑھا ہے تم نے..... جنہیں پڑھا ہو گا۔ ورنہ تمہیں پتا ہوتا ان سرکردہ رہنماؤں کے بارے میں۔“

جو یہ تحریم کی اس ساری گفتگو کے دوران خاموش رہی تھی، وہ صرف کئی اکھیوں سے امام کو دیکھتی رہی تھی۔ ”اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے آخری نبی ہیں اور میرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ کے آخری نبی ہیں اور میری کتاب مجھ تک یہ دونوں باتیں بہت صاف واضح اور دو ٹوک انداز میں پہنچاؤ رہی ہے تو پھر مجھے کبھی اس اور شخص کے نبوت اور اعلان کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھیں۔“

تحریم نے اپنے ایک ایک الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
”بہتر ہے تم اپنے مذہب کو یا میرے مذہب کو زیر بحث لانے کی کوشش نہ کرو۔ اسنے سالوں سے

دوستی چل رہی ہے، چلے دو۔“

”جہاں تک تمہارے گھر نہ آنے کا تعلق ہے تو ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے کہ میرے والدین کو تمہارے گھر آنا پسند نہیں ہے۔ یہاں اسکول میں تم سے دوستی اور بات ہے۔ بہت سے لوگوں سے دوستی ہوتی ہے ہماری اور دوستی میں عام طور پر مذہب آڑے نہیں آتا لیکن گھر میں آنا جانا..... کچھ مختلف چیز ہے..... انہیں شاید میری کسی عیسائی یا یہودی یا ہندو دوست کے گھر جانے پر اعتراض نہ ہو لیکن تمہارے گھر جانے پر ہے۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے مذہب کو مانتے ہیں وہ اپنے آپ کو مسلمان نہیں سمجھتے جس مذہب سے تعلق ہوتا ہے وہی بتاتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جتنا تم لوگوں کو نا پسند کیا جاتا ہے اتنا ان لوگوں کو نہیں کیا جاتا کیونکہ تم لوگ صرف پیسے کے حصول اور اچھے مستقبل کے لئے یہ مذہب اختیار کر کے ہمارے دین میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہو، مگر کرنا، ہندو یا یہودی ایسا نہیں کرتے۔“

امام نے بے اختیار اسے ٹوکا۔ ”کس پیسے کی بات کر رہی ہو تم.....؟ تم ہماری چٹلی کو جانتی ہو..... ہم لوگ شروع سے ہی بہت امیر ہیں۔ ہمیں کون سا روپے مل رہا ہے اس مذہب پر چبنے کے لئے۔“
”ہاں تم لوگ اب بڑے خوشحال ہو، مگر شروع سے تو ایسے نہیں تھے۔ تمہارے دادا مسلمان مگر غریب آدمی تھے۔ وہ کاشت کاری کیا کرتے تھے اور ایک چھوٹے سے کاشت کار تھے۔ دیوہ سے کچھ فاصلے پر ان کی تھوڑی بہت زمین تھی پھر تمہارے تایا نے اپنے کسی دوست کے توسط سے وہاں جانا شروع کر دیا اور یہ مذہب اختیار کر لیا اور بے تحاشا امیر ہو گئے کیونکہ انہیں وہاں سے بہت زیادہ پیسہ ملا پھر آہستہ آہستہ تمہارے والد اور تمہارے چچا نے بھی اپنا مذہب بدل لیا پھر تم لوگوں کا خاندان اس ملک کے حوالہ ترین خاندانوں میں شمار ہونے لگا اور یہ کام کرنے والے تم لوگ واحد نہیں ہو زیادہ تر اسی طریقے سے لوگوں کو اس مذہب کا پیروکار بنایا جا رہا ہے۔“

امام نے کچھ بھڑکتے ہوئے اس کی بات کو کاٹا۔ ”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“
”جہیں یقین نہیں آ رہا تو تم اپنے گھروالوں سے پوچھ لیا کہ اس قدر دولت کس طرح آئی ان کے پاس..... اور ابھی بھی کس طرح آ رہی ہے۔ تمہارے والد اس مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہر سال انھوں ڈالر لاتے ہیں، انہیں غیر ملکی مشین اور ایندھن ملتا۔“ تحریم نے کچھ حقیر آمیز انداز میں کہا۔
”یہ جھوٹ ہے، سفید جھوٹ۔“ امام نے بے اختیار کہا۔ ”میرے بابا کسی سے کوئی چیز نہیں لیتے۔ وہ اگر اس فرقہ کے لئے کام کرتے ہیں، تو غلط کیا ہے۔ کیا دوسرے فرقوں کے لئے کام نہیں کیا جاتا۔ دوسرے فرقوں کے بھی تو علماء ہوتے ہیں یا ایسے لوگ جو انہیں سپورٹ کرتے ہیں۔“

”دوسرے فرقوں کو یورپی مشین سے روپیہ نہیں ملتا۔“
”میرے بابا کو کہیں سے کچھ نہیں ملتا۔“ امام نے ایک بار پھر کہا۔ ”تحریم نے اس کی بات کے

جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

امامہ نے اسے چاہتے ہوئے دیکھا پھر گردن موڑ کر اپنے پاس چٹھی جو برے کی طرف دیکھا۔

"کیا تم بھی میرے بارے میں ایسا ہی سوچتی ہو؟"

"تحریم نے غصہ میں آکر تم سے یہ سب کچھ کہا ہے۔ تم اس کی باتوں کا براست مانو۔" جو برے نے

اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"تم ان سب باتوں کو چھوڑو..... آؤ کلاس میں چلتے ہیں، بریک فتم ہونے والی ہے۔" جو برے نے کہا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

اس دن وہ وہاں گھر آکر اپنے کمرے میں بند ہو کر روتی رہی۔ تحریم کی باتوں نے اسے واقعی بہت دل برداشتہ اور مایوس کیا تھا۔

باشم تبین احمد اس دن شام کو ہی آفس سے گھر واپس آگئے تھے۔ واپس آنے پر انہیں سسٹمی سے پتا چلا کہ امامہ کی طبیعت خراب ہے۔ وہ اس کا حال احوال پوچھنے اس کے کمرے میں چلے آئے۔ امامہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ باشم تبین حیران رہ گئے۔

"کیا بات ہے امامہ؟" انہوں نے امامہ کے قریب آکر پوچھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کچھ بہانہ کرنے کے بجائے بے اختیار رونے لگی۔ باشم کچھ پریشان ہو کر اس کے قریب بیٹھ پر بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا۔ امامہ؟"

"تحریم نے آج اسکول میں مجھ سے بہت بد تمیزی کی ہے۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

باشم تبین نے بے اختیار ایک اطمینان بھری سانس لی۔ "پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے تم لوگوں میں؟"

"ہاں آپ کو نہیں پتا اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟" امامہ نے باپ کو مطمئن ہوتے دیکھ کر کہا۔

"ہاں! اس نے....." وہ باپ کو تحریم کے ساتھ ہونے والی تمام گفتگو بتائی گئی۔ باشم تبین کے چہرے کی رنگت بدلتے لگی۔

"تم سے کس نے کہا تھا۔ تم اسکول کتابیں لے کر جاؤ، انہیں پڑھانے کے لئے؟" انہوں نے امامہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"میں ان کی غلط فہمیاں دور کرنا چاہتی تھی۔" امامہ نے قدرے کمزور لہجے میں کہا۔

"تمہیں ضرورت ہی تھی کہ کسی کی غلط فہمیاں دور کرنے کی۔ وہ ہمارے گھر نہیں آئیں تو نہ آئیں۔ ہمیں برا سمجھتی ہیں تو سمجھتی رہیں، ہمیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" باشم تبین نے اسے سمجھاتے

ہوئے کہا۔

"مگر اب تمہاری اس حرکت سے پتا نہیں وہ کیا سمجھے گی۔ کس کس کو بتائے گی کہ تم نے اسے وہ کتابیں دینے کی کوشش کی۔ خود اس کے گھروالے بھی ناراض ہوں گے۔ امامہ! ہر ایک کو یہ بتاتے نہیں بھرتے کہ تم کیا ہو۔ نہ ہی اپنے فرقہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں اگر کوئی بحث کرنے کی کوشش بھی کرے تو باں میں باں ملا دیتے ہیں ورنہ لوگ خودخواہ فضول طرح کی باتیں کرتے ہیں اور فضول طرح کے شبہات میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔" انہوں نے سمجھایا۔

"مگر بابا! آپ بھی تو بہت سارے لوگوں کو تبلیغ کرتے ہیں؟" امامہ نے کچھ اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔ "پھر مجھے کیوں منع کر رہے ہیں؟"

"میری بات اور ہے میں صرف ان ہی لوگوں سے مذہب کی بات کرتا ہوں جن سے میری بہت بے تکلفی ہو چکی ہوتی ہے اور جن کے بارے میں مجھے یہ محسوس ہو کہ ان پر میری تشریب اور تبلیغ کا اثر ہو سکتا ہے۔ میں دو چار دن کی ملاقات کسی کو کتابیں بانٹنا شروع نہیں ہو جاتا۔" باشم تبین نے کہا۔

"بابا! ان سے میری دوستی دو چار دن کی نہیں ہے۔ ہم کئی سالوں سے دوست ہیں۔" امامہ کو اعتراض ہوا۔

"ہاں مگر وہ دو دنوں سید ہیں اور دونوں کے گھرانے بہت مذہبی ہیں۔ جنہیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے تھی۔"

"میں نے تو صرف انہیں اپنے فرقے کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ ہمیں غیر مسلم تو نہ سمجھیں۔" امامہ نے کہا۔

"اگر وہ ہمیں غیر مسلم سمجھتے ہیں تو بھی ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ خود غیر مسلم ہیں۔" باشم تبین نے بڑی عقیدت سے کہا۔ "وہ تو خود دگرہائی کے راستے پر ہیں۔"

"بابا وہ کہہ رہی تھی کہ آپ کو غیر ملکی مشین سے روپیہ ملتا ہے۔ این بی اوڈ سے روپیہ ملتا ہے تاکہ آپ لوگوں کو ہمارے فرقہ کا پتہ دکھاتا میں۔"

باشم تبین نے تحفہ سے گردن کو جھٹکا۔ "مجھے صرف اپنی جماعت سے روپیہ ملتا ہے اور وہ بھی وہ روپیہ ہوتا ہے جو ہماری اپنی کینوٹی، اندرون ملک اور بیرون ملک اکٹھا کرتی ہے۔ ہمارے پاس اپنے روپے کی کیا کمی ہے۔ ہماری اپنی ٹیکسٹ نہیں ہیں کیا اور اگر مجھے غیر ملکی مشین اور این بی اوڈ سے روپیہ ملے بھی تو میں بڑی خوشی سے لوں گا، آغراس میں برائی کیا ہے۔ دن کی خدمت کر رہا ہوں اور جہاں تک اپنے مذہب کی ترویج و تبلیغ کی بات ہے تو اس میں بھی کیا برائی ہے۔ اگر اس ملک میں جیسا سائیک کی تبلیغ ہو سکتی ہے تو ہمارے فرقے کی کیوں نہیں۔ ہم تو ویسے بھی اسلام کا ایک فرقہ ہیں۔ لوگوں کو راہ ہدایت پر

لانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔" ہاشم مبین نے بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا۔

"مگر تم لوگوں سے اس معاملے پر بات مت کیا کرو۔ اس بحث مباحثے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ابھی ہم لوگ اقلیت میں ہیں جب اکثریت میں ہو جائیں گے تو پھر اس طرح کے لوگ اتنی بے خوفی کے ساتھ اس طرح بڑھ بڑھ کر بات نہیں کر سکیں گے پھر وہ اس طرح ہماری تدبیریں کرتے ہوئے ڈریں گے مگر فی الحال ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہئے۔"

"بابا! آئین میں ہمیں اقلیت اور غیر مسلم کیوں قرار دیا گیا ہے۔ جب ہم اسلام کا ایک فرقہ ہیں تو پھر انہوں نے ہمیں غیر مسلم کیوں ٹھہرایا ہے؟" امامہ کو تحریم کی کسی ہونیک اور بات یاد آئی۔
"یہ سب مولویوں کی کارستانی تھی۔ اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے وہ سب ہمارے خلاف اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہماری تعداد بھی زیادہ ہو جائے گی تو ہمیں اپنی مرضی کے قوانین بنوائیں گے اور اس طرح کی تمام ترمیمات کو آئین میں سے ہٹا دیں گے۔" ہاشم مبین نے پر جوش انداز میں کہا۔ "اور تمہیں اس طرح بے وقوفوں کی طرح نکرے میں بند ہو کر روکنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ہاشم مبین نے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا، امامہ انہیں وہاں سے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔
تحریم کے ساتھ وہ اس کی دوستی کا آخری دن تھا اور اس میں تحریم سے زیادہ خود اس کا رویہ وجہ تھا۔ وہ تحریم کی باتوں سے اس حد تک دل برداشتہ ہوئی تھی کہ اب تحریم کے ساتھ دوبارہ پہلے سے تعلقات قائم رکھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔ خود تحریم نے بھی اس کی اس خاموشی کو پچھلائے کیا توڑنے کی کوشش نہیں کی۔

ہاشم مبین احمدی جماعت کے سرکردہ رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ ان کے بڑے بھائی اعظم مبین احمد بھی جماعت کے اہم رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ ان کے پورے خاندان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر باقی تمام افراد بہت سال پہلے اس وقت قادیانیت اختیار کر گئے تھے جب اعظم مبین احمد نے اس کام کا آغاز کیا تھا جن لوگوں نے قادیانیت اختیار نہیں کی تھی وہ باقی لوگوں سے قطع تعلق کر چکے تھے۔

اپنے بڑے بھائی اعظم مبین کے لائق قدم پر چلتے ہوئے ہاشم مبین نے بھی یہ مذہب اختیار کر لیا۔ اعظم مبین ہی کی طرح انہوں نے اپنے مذہب کے فروغ اور تبلیغ کے لئے کام کرنا بھی شروع کر دیا۔ دس پندرہ سالوں میں وہ دونوں بھائی اس تحریک کے سرکردہ رہنماؤں میں شمار ہوتے گئے۔ اس کی وجہ سے انہوں نے بے تحاشہ پسپائی کرنا اور اس پیسے سے انہوں نے سرمایہ کاری بھی کی مگر ان کی آمدنی کا بیڑا یہ تحریک کی تبلیغ کے لئے میسر ہونے والے فنڈز ہی تھے۔ ان کا شمار اسلام آباد کی اہلیت کلاس میں ہوتا تھا۔ بے تحاشہ دولت ہونے کے باوجود ہاشم اور اعظم مبین کے گھر کا ماحول روایتی تھا۔ ان کی خواتین باقاعدہ پر دو کیا کرتی تھیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ان خواتین پر ناروا پابندیاں یا کسی قسم کا جبر وار کیا گیا

تھا۔ اس مذہب کی خواتین میں تعلیم کا تقابلاً پاکستان میں کسی بھی مذہب کے مقابلے میں ہمیشہ ہی زیادہ رہا ہے۔ ان لوگوں نے اعلیٰ تعلیم بھی معروف اداروں سے حاصل کی۔

امامہ بھی اسی قسم کے ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ وہ یقیناً ان لوگوں میں سے تھی جو منہ سے سونے کا بچہ لے کر پید ا ہوئے ہیں اور اس نے ہاشم مبین کو کبھی کسی قسم کے مالی مسائل سے گزرتے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے لئے تحریم کی بات ناقابل یقین تھی کہ اس کے خاندان نے پیسہ حاصل کرنے کے لئے یہ مذہب اختیار کیا۔ غیر ملکی مشنر اور جہ دن ملک سے ملے والے فنڈز کا الزام بھی اس کے لئے ناقابل قیاس تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ ایک ایسی کلاس سے تعلق رکھتی ہے جس کا لہذا چوڑا کاروبار تھا اور اگرچہ وہ یہ بات بھی جانتی تھی کہ ہاشم مبین اس مذہب کی تبلیغ اور ترویج کرتے ہیں اور تحریک کے سرکردہ رہنماؤں میں سے ایک ہیں مگر یہ کوئی خلاف معمول بات نہیں تھی۔ وہ شروع سے ہی اس سلسلے میں اپنے تایا اور والد کی سرگرمیوں کو دیکھتی آ رہی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ایک ایسا کام تھا جو وہ "اسلام" کی تبلیغ و ترویج کے لئے کر رہے تھے۔

اپنے گھر والوں کے ساتھ وہ کسی بار مذہبی اجتماع میں بھی جا چکی تھی اور سرکردہ رہنماؤں کے لندن سے سیٹلائٹ کے ذریعے ہونے والے خطبات کو بھی یا قادیان سے منقری اور دیکھتی آ رہی تھی۔ تحریم کے ساتھ ہونے والے جھگڑے سے پہلے بھی اس نے اپنے مذہب کے بارے میں غور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے لئے اپنا فرقہ ایسا ہی تھا، جیسے اسلام کا کوئی دوسرا فرقہ۔۔۔۔۔ اس کی برین واشنگ بھی اسی طرح کی تھی کہ وہ دیکھتی تھی کہ صرف وہی سیدھے راستے پر چھے بلکہ وہی جنت میں جائیں گے۔

اگرچہ گھر میں بہت شرواع میں ہی اسے باپنی بھائیوں کے ساتھ یہ نصیحت کر دی تھی مگر اس کی وہ بلا وجہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ وہ دراصل کیا ہیں۔ اسکول میں تعلیم کے دوران ہی وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ ۱۹۷۴ء میں انہیں پارلیمنٹ نے ایک غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا تھا وہ سمجھتی تھی کہ یہ مذہبی داؤ میں آکر کیا جانے والا ایک سیاسی فیصلہ ہے، مگر تحریم کے ساتھ ہونے والے جھگڑے نے اسے اپنے مذہب کے بارے میں غور کرنے اور سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

تحریم سے ہونے والے جھگڑے کے بعد ایک جدیلی جو اس میں آئی وہ اپنے مذہب کا مطالعہ تھا۔ تبلیغی مواد کے علاوہ اور ان کتابوں کے علاوہ جنہیں اس مذہب کے ماننے والے مقدس سمجھتے تھے اس نے اور بھی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور بنیادی طور پر اسی زمانے میں اس کی آنجنوں کا آغاز ہوا مگر کچھ عرصہ مطالعہ کے بعد اس نے ایک بار پھر ان آنجنوں اور اضطراب کو اپنے ذہن سے ہٹک دیا۔ میٹرک کے فوراً بعد امجد سے اس کی منگنی ہو گئی وہ اعظم مبین کا بیٹا تھا۔ یہ اگرچہ کوئی عبت کی منگنی نہیں تھی مگر اس کے باوجود امامہ اور امجد کی پسند اس رشتہ کا باعث بنی تھی۔ نسبت ملے ہونے کے بعد

اجد کے لئے امامہ کے دل میں خاص جگہ بن گئی تھی۔

اپنی پند کے شخص سے نسبت کے بعد اس کا دوسرا نکت میڈیکل میں ایڈمشن تھا اور اسے اس کے بارے میں زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے باپ کی تنقید اتنی ہے کہ اگر وہ میرٹ پڑتے بھی ہوئی تب بھی وہ اس میڈیکل کالج میں داخل کر دیا جیسے تھے اور اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو بھی وہ پیر ملک جا کر میڈیکل کی تعلیم حاصل کر سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

"تم کچھ کچھ دنوں سے بہت پریشان ہو، کوئی پر اطم ہے؟" وہ سنے اس رات امامہ سے پوچھا۔ وہ کچھ کچھ دن سے بہت زیادہ خاموش اور اُبھی اُبھی نظر آ رہی تھی۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارا وہم ہے۔" امامہ نے مسکراتے کی کوشش کی۔

"خیر وہم تو نہیں، کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ تم بتانا نہیں چاہتیں تو اور بات ہے۔" وہ سنے نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ وہ امامہ کے ذہن پر اس سے کچھ قائل پر لیا ہوا تھا اور وہ اپنی فاکل میں رکے ٹوئس آٹ پلٹ رہی تھی۔ وہ سنے کو وہ اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔ "میں نے ٹھیک کہا، تم بتانا نہیں چاہتیں؟"

"ہاں، میں فی الحال بتانا نہیں چاہتی۔" امامہ نے ایک گہرا سانس لے کر اعتراف کیا۔

"بتاؤ، وہ ہو سکتا ہے میں تمہاری مدد کر سکوں۔" وہ سنے نے اس کا۔

"وہم! میں خود جیسا تھا وہوں کی مگر فی الحال نہیں اور اگر مجھے مدد کی ضرورت ہوگی تو میں خود تم سے کہوں گی۔" اس نے اپنی فاکل بند کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، میں تو صرف تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔" وہ سنے نے اٹھ گیا۔

وہم کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ واقعی جو یہ ہے کے ساتھ اس دن ہونے والے مجتزع کے بعد سے پریشان تھی۔ اگرچہ جو یہ ہے نے اگلے دن اس سے معذرت کر لی تھی مگر اس کی اُبھن اور اضطراب میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ جو یہ ہے کی باتوں نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال پہلے تحریم کے ساتھ ہونے والا مجتزع اسے ایک بار پھر یاد آنے لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنے مذہب کے بارے میں اُبھرنے والے سوالات اور اُبھنیں بھی جو اس نے اپنے مذہب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد اپنے ذہن میں محسوس کی تھیں۔ جو یہ ہے نے کہا تھا "میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ کاش تم مسلمان ہو جیں۔"

"مسلمان ہوتی؟" وہ عجیب سی بے یقینی میں جتا ہو گئی تھی۔ "کیا میں مسلمان نہیں ہوں؟ کیا میری

بہترین دوست بھی مسلمان نہیں مانتی؟ کیا یہ سب کچھ صرف اس پر دیکھنے کی وجہ سے ہے جو ہمارے

بارے میں کیا جانتا ہے؟ آخر ہمارے ہی بارے میں یہ سب کچھ کیوں کہا جاتا ہے؟ کیا ہم لوگ واقعی کوئی غلط کام کر رہے ہیں؟ کسی غلط عقیدے کو اختیار کر بیٹھے ہیں؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے، آخر میرے مگر والے ایسا کیوں کریں گے اور پھر ہماری ساری نیکیوں ایسا کیوں کرے گی؟ اور شاید یہ ان سوالوں سے نجات پانے کی ایک کوشش تھی کہ ایک بیٹے کے بعد اس نے ایک بہت بڑے عالم دین کی قرآن پاک کی تفسیر فرمائی۔ وہ جانتا چاہتی تھی کہ ان کے بارے میں دوسرے فریق کا موقف کیا تھا۔ قرآن پاک کا ترجمہ وہ اس سے پہلے بھی پڑھتی رہی تھی مگر وہ تحریف شدہ حالت میں تھا۔ اسے اس سے پہلے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ، جو قرآن وہ پڑھتے ہیں اس میں کچھ جگہوں پر کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں مگر اس مشہور عالم دین کی تفسیر پڑھنے کے دوران اس نے ان تبدیلیوں کے بارے میں معلوم ہو گیا جو ان کے اپنے قرآن میں موجود تھیں۔ اس نے کچھ بعد دیگرے مختلف فرقوں کے اور اس سے شائع ہونے والے قرآن پاک کے نسخوں کو دیکھا۔ ان میں سے کسی میں بھی وہ تبدیلیاں نہیں تھیں جو خود ان کے قرآن میں موجود تھیں جبکہ مختلف فرقوں کی تفسیر میں بہت زیادہ فرق تھا جو ان کے اپنے مذہب اور اسلام کا قبلی مطالعہ کر رہی تھی اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پھر تفسیر میں آخری نبی پیغمبر اسلام ﷺ کو ہی ظہر لایا گیا تھا۔ کہیں بھی کسی غلط یا متضامی نبی کا کوئی ذکر یا پھر اس کا نام نہ تھا۔ سچے موعود کی حقیقت بھی اس کے سامنے آگئی تھی۔ اپنے مذہبی رہنما کی بیویوں میں اور حقیقت میں ہونے والے واقعات کا قصہ اسے اور بھی زیادہ حیرنے لگا تھا۔ اس کے مذہبی رہنما نے نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے جن پیغمبر کے بارے میں سب سے زیادہ غیر مذہب زبان استعمال کی تھی وہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور بعد میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے سے پہلے یہ بھی کہا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کا حلول اس کے اندر ہو گیا ہے اور اگر اس دعوے کی سچائی کو مان بھی لیا جاتا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے دوبارہ نزول کے بعد چالیس سال تک زندہ رہتے اور پھر جب ان کا انتقال ہوا تو اسلام پوری دنیا پر غلبہ پاتا مگر ان رہنما کی وفات کے وقت دنیا میں اسلام کا قلعہ تو ایک طرف، خود ہندوستان میں مسلمان آزادی جیسی نعمت کے لئے ترس رہے تھے۔ امامہ کو اپنے مذہبی رہنما کے گفتگو کے اس انداز پر بھی قہر ہوتا جو اس نے اپنی مختلف کتابوں میں اپنے مخالفین یا دوسرے انبیائے کرام کے لئے اختیار کیا تھا۔ کیا کوئی نبی ایسی طرح کی زبان استعمال کر سکتا تھا جس طرح کی اس نبوت کے دعویٰ کرنے والے نے کی تھی۔

بہت غیر محسوس انداز میں اس کا دل اپنے مذہبی لٹریچر اور مقدس کتابوں سے اچاٹ ہونے لگا تھا۔

پہلے جیسا اعتقاد اور یقین تو ایک طرف اسے سرے سے ان کی صداقت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ اس نے جو یہ ہے سے یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ اب اپنے مذہب سے ہٹ کر دوسری کتابوں کو پڑھنے لگی تھی۔ اس کے گھر میں بھی کسی کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ دس کھم کی کتابیں گھرا کر پڑھ رہی تھی۔ اس نے انہیں اپنے

کمرے میں بہت حفاظت سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ صرف ایک دن ایسا ہوا کہ وہم اس کے کمرے میں آکر اس کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ڈھونڈنے لگا۔ وہم سب سے پہلے قرآن پاک کی وہی تفسیر لگی تھی اور وہ جیسے دم بخود رہ گیا تھا۔

"یہ کیا ہے امام؟" اس نے مڑ کر تعجب سے پوچھا۔ امام نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ قرآن پاک کی تفسیر ہے۔" اس نے یک دم اپنی زبان میں ہونے والی ٹکڑا ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں مگر یہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ کیا تم اسے خرید کر لائی ہو؟" وہم نے بڑی عجیبی کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں، میں اسے خرید کر لائی ہوں، مگر تم اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو؟"

"باپا کو چلے گا تو وہ کتنا غصہ کریں گے، جنہیں اندازہ ہے؟"

"ہاں، مجھے اندازہ ہے، مگر مجھے یہ اتنی کافی قابل اعتراض بات نظر نہیں آتی۔"

"آخر جنہیں اس کتاب کی ضرورت کیوں پڑی؟" وہم نے کتاب دیکھ کر پوچھی۔

"کیونکہ میں جانتا تھا اس کی ضرورت کے لوگ آخر قرآن پاک کی کیا تفسیر کر رہے ہیں۔"

ہمارے بارے میں، قرآن کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔" امام نے سنجیدگی سے کہا۔

وہم جلیکس جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟"

"میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔" امام نے پرسکون انداز میں کہا۔ "کیا برائی ہے، اگر میں دوسرے مذاہب کے بارے میں جانوں اور ان کے قرآن پاک کی تفسیر پڑھوں۔"

"میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہم نے ناراضی سے کہا۔

"جنہیں ضرورت نہیں ہوگی، مجھے ضرورت ہے۔" امام نے دو لوگ انداز میں کہا۔ "میں آنکھیں بند کر کے بھی چیز پر یقین کی قائل نہیں ہوں۔" اس نے واضح الفاظ میں کہا۔

"تو یہ تفسیر پڑھ کر تمہارے شبہات دور ہو گئے ہیں؟" وہم نے طنز سے لہجہ میں پوچھا۔

امام نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "پہلے مجھے اپنے اعتقاد کے بارے میں شبہ نہیں تھا، اب ہے۔"

وہم اس کی بات پر ہلکا کر اٹھا۔ "دیکھا، اس طرح کی کتابیں پڑھنے سے کہی ہوئی ہے۔ میں اس لئے تم سے کہہ رہا ہوں کہ جنہیں اس طرح کی کتابیں پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے ہماری اپنی کتابیں کافی ہیں۔"

"میں نے اتنی تقابیر دیکھی ہیں، قرآن پاک کے اس طرح سے دیکھے ہیں، حیرانی کی بات ہے وہم! کہیں بھی ہمارے نیا کا ذکر نہیں ہے، ہر تفسیر میں احمد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی لیا جاتا ہے، ہمارے نیا کو نہیں اور اگر کہیں ہمارے نیا کا ذکر ہے بھی تو نبوت کے ایک جھوٹے دعوے دار کے طور پر۔" امام نے اچھے ہوئے انداز میں کہا۔

"یہ لوگ ہمارے بارے میں ایسی باتیں نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ ہمارے نیا کی نبوت کو مان لیں گے تو ہمارا اور ان کا تو اختلاف ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ کبھی بھی اپنی تقابیر میں جگہ نہیں شائع کریں گے۔" وہم نے سختی سے کہا۔

"اور جو ہماری تفسیر ہے، کیا ہم نے سچ لکھا ہے اس میں۔"

"کیا مطلب؟" وہم نے پوچھا۔

"ہمارے نیا دوسرے پیغمبروں کے بارے میں غلط زبان کیوں استعمال کرتے ہیں؟"

"وہ ان لوگوں کے بارے میں اپنی بات کرتے ہیں جو ان پر ایمان نہیں لائے۔" وہم نے کہا۔

"جو ایمان نہ لائے کیا اسے گالیاں دینی چاہئیں؟"

"ہاں، غصہ کا اظہار تو کسی نہ کسی صورت میں ہوتا ہے۔" وہم نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"نصیحت کا اظہار یا بے بسی کا؟" امام کے جملے پر وہ بخود اسے دیکھنے لگا۔

"جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لوگ ایمان نہیں لائے تو انہوں نے لوگوں کو گالیاں تو نہیں دیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لوگ ایمان نہیں لائے تھے تو انہوں نے بھی کسی کو گالیاں نہیں دیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ان لوگوں کے لئے بھی دعا کی جنہوں نے انہیں پتھر مارے، جو دنی قرآن پاک کی صورت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہڑل ہوئی ہے اس میں کوئی گالی نہیں ملتی اور جس جگہ سے ہمارے نیا اپنے اوپر نازل شدہ مجید کہتے ہیں وہ گالیوں سے بھرا ہوا ہے۔"

"امام! ہر انسان کا مزاج دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، ہر انسان الگ طرح سے روی ایکٹ کرتا ہے۔" وہم نے تیزی سے کہا۔ امام نے قائل نہ ہونے والے انداز میں سر ہلایا۔

"میں ہر انسان کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ میں نیا کی بات کر رہی ہوں جو شخص اپنے قصے پر قابو نہیں رکھ سکا وہ نبوت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔ جس شخص کی زبان سے گالیاں نکلتی ہوں اس کی زبان سے حق و صداقت کی بات نکل سکتی ہے؟ وہم! مجھے اپنے مذہب اور عقیدے کے بارے میں ابھنیں سی ہے۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رکی۔ "میں نے اتنی تقابیر میں اگر کسی اتنی نیا کا ذکر پایا ہے تو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور میں نہیں سمجھتی کہ ہمارے نیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا مسیح موعود ہیں۔"

نہیں۔۔۔ یہ وہ نہیں ہیں، جن کے آنے کے بارے میں قرآن پاک میں ذکر ہے۔" اس بار اس

نے اپنے الفاظ کی خودی پر زور تردید کی۔

”تم اب اپنی جگہ بند کر لو تو بہتر ہے۔“ وہ سب نے تڑپ لے لی تھی۔ ”کافی فضول باتیں کر چکی ہو تم۔“

”فضول باتیں؟“ امام نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تم کہہ رہے ہو میں فضول باتیں کر رہی ہوں۔ مسجد اقصیٰ اگر ہمارے شہر میں ہے تو پھر جو اسے سینکڑوں سالوں سے فلسطین میں مسجد اقصیٰ ہے وہ کیا ہے۔ ایک نام کی دو مقدس جگہیں دنیا میں بنا کر خدا تو مسلمانوں کو کشتہ زنی نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کو چھوڑو، یہودی، عیسائی ساری دنیا اسی مسجد کو قبلہ اول تسلیم کرتی ہے۔ اگر کوئی نہیں کرتا تو ہم نہیں کرتے، یہ عجیب بات نہیں؟“

”امام! میں ان معاملات پر تم سے بحث نہیں کر سکتا۔ بہتر ہے تم اس مسئلے کو بابا سے دسکس کرو۔“ وہ سب نے آگے کر کہا۔ ”وہی تم غلطی کر رہی ہو، اس طرح کی فضول بحث شروع کر کے۔ میں بابا کو تہداری یہ ساری باتیں بتا دوں گا اور یہ بھی کہ تم آج کل کیا پڑھ رہی ہو۔“ وہ سب نے جاتے جاتے دھکے دے کر انہیں کہا۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھے ہوئے انداز میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ سب دیکھ کر ناراضی کا اظہار کر کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں بیٹھنے لگی۔ وہ ہاشم مبین سے ذرا تکی اور چاتی تھی کہ وہ سب ان سے اس بات کا ذکر ضرور کرے گا۔ وہ ان کے رد عمل سے خوفزدہ تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ سب نے ہاشم مبین کو امام کے ساتھ ہونے والی بحث کے بارے میں بتا دیا تھا مگر اس نے بہت سی ایسی باتوں کو سن کر دیا تھا جس پر ہاشم مبین کے بھڑک اٹھنے کا امکان تھا۔ اس کے باوجود ہاشم مبین دم بخود رہ گئے تھے، یوں جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

یہ سب تم سے امام نے کہا؟“ ایک لمبی خاموشی کے بعد انہوں نے وہ سب سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اسے جا کر لاؤ۔“ وہ سب کچھ جھنجھکتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل گیا۔ امام کو خود دیا کر لانے کے بجائے اس نے ملازم کے ہاتھ بیٹھام بھجو دیا اور خود اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ امام اور ہاشم مبین کی گفتگو کے دور ان موجود رہتا نہیں چاہتا تھا۔

ہاشم مبین کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تو اس وقت ہاشم اور ان کی بیگم بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاشم مبین نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا اس نے اس کے جسم کی لڑش میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔

”بابا۔۔۔۔۔ آپ نے مجھے۔۔۔۔۔ بلوایا تھا۔“ انکوش کے باوجود وہ رانی سے بات نہیں کہہ سکا۔

”ہاں، میں نے بلوایا تھا۔ وہ سب سے کیا کہو اس کی تم نے؟“ ہاشم مبین نے بلا تہدید بلند آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ اپنے بوتلوں پر زبان چسیر کر رہی تھی۔ ”کیا پوچھ رہا ہوں تم سے؟“ وہ ایک بار پھر دھاڑے۔ ”شرم سے ڈوب مرنا چاہئے تمہیں، خود گناہ کرتی ہو اور اپنے ساتھ ہمیں بھی گناہ گار بناتی ہو۔“ امام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”تمہیں اپنی اولاد کہتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے۔ کون سی کتابیں لائی ہو تم؟“ وہ مشتعل ہو گئے تھے۔ ”جہاں سے یہ کتابیں لے کر آئی ہو، کل تک وہیں دے آؤ، ورنہ میں انہیں اٹھا کر پینک دوں گا باہر۔“

”جی بابا!“ اس نے اپنے آنسو پونچھے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔ ”اور آج کے بعد اگر تم نے جو میرے ساتھ میل جول رکھا تو میں تمہارا لالچ جانتی ہوں بند کر دوں گا۔“ بابا۔۔۔۔۔ جو میرے نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اس کو تو کچھ بتانی نہیں ہے۔“ اس بار امام نے قدرے مضبوط آواز میں احتجاج کیا۔

”تو پھر اور کون ہے جو تمہارے دماغ میں یہ خنثاس بھر رہا ہے؟“ وہ بری طرح چلائے۔ ”میں۔۔۔۔۔ خود۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔“ امام نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”ہو کیا تم، اپنی عمر دیکھو اور چلی ہو تم عقیدے جاچنے، اپنے نبی کی نبوت کو پرکھنے۔“ ہاشم مبین کا پارہ پھر بانی ہو گیا۔ ”اپنے باپ کی شکل دیکھو جس نے ساری عمر تبلیغ میں گزار دی۔ کیا میں اصل کا اندھا ہوں یا پھر تم مجھ سے زیادہ عقل رکھتی ہو۔ جہ جہ چار دن ہوئے ہیں تمہیں پیدا ہوئے اور تم چل پڑی ہو اپنے نبی کی نبوت کو ثابت کرنے۔“ ہاشم مبین اب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”تم من میں سونے کا بیج لے کر اسی نبی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، جس کی نبوت کو آج تم جاچنے بیٹھ گئی ہو۔ وہ نہ ہوتا تو مسک پر دھکے لکھا ہوتا تھا۔ امارا خاندان اور تم اس قدر احسان فرماؤ اور بے خبر ہو جکی ہو کہ جس قتالی میں کھاتی ہو اسی میں چمید کر رہی ہو۔“

ہاشم مبین کی آواز پٹ رہی تھی۔ امام کی آنکھوں سے پہنے والے آنسوؤں کی رفتار میں اور اضافہ ہو گیا۔

”بند کرو یہ لکھنا پڑھنا اور گھر بیٹھو تم! یہ تعلیم حاصل کر رہی ہو جو تمہیں گمراہی کی طرف لے جا رہی ہے۔“

ان کے اگلے جھلے پر امام کی نئی گم ہو گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اسے گھر اٹھانے کی بات کریں گے۔

”بابا۔۔۔۔۔ آئی امی سو رہی۔“ ان کے ایک جھلے نے اسے گھٹنے جھکے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”مجھے تمہارے کسی ایک کھیل کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کہہ دیا ہے کہ گھر بیٹھو، تو گھر بیٹھو۔“

”ہا۔۔۔ میں۔۔۔ میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ پنا نہیں وہم۔۔۔ اس نے آپ سے کس طرح بات کی ہے۔“ اس کے آنسو اور تیزی سے پہنے لگے۔ ”بھریجی میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ میں آئندہ ایسا کچھ نہیں پڑھوں گی، نہ ہی ایسی کوئی بات کروں گی۔ پلیز ہا۔۔۔ اس نے مت کی۔

ان معذرتوں کا سلسلہ وہیں ختم نہیں ہوا تھا، اگلے کی دن تک وہ ہاشم مبین سے معافی مانگتی رہی اور پھر تقریباً ایک ہفتے کے بعد وہ نرم پڑ گئے اور انہوں نے اسے کانٹا جانے کی اجازت دے دی تھی مگر اس ایک ہفتے میں وہ اپنے پورے گھر کی لعنت ملامت کا شکار رہی تھی۔ ہاشم مبین نے اسے سخت قسم کی تنبیہ کے بعد کانٹا جانے کی اجازت دی تھی مگر اس ایک ہفتے کے دوران ان لوگوں کے رویے نے اسے اپنے عقیدے سے حریف بن کر دیا تھا۔ اس نے ان کتابوں کو پڑھنے کا سلسلہ روکا نہیں تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ پہلے وہ انہیں گھر لے آتی تھی اور اب وہ انہیں کانٹا لے کر لایا کرتی تھی۔

ایف ایس سی میں میرٹ لسٹ پر آنے کے بعد اس نے میڈیکل کانٹا میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ جویریہ کو بھی ایس میڈیکل کانٹا میں ایڈمیشن مل گیا تھا، ان کی دوستی میں اب پہلے سے زیادہ مضبوطی آگئی تھی اور اس کی بنیادی وجہ امامہ کے ذہن میں آنے والی تہذیبی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبیحہ سے امامہ کی جلیلی ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی۔ جویریہ کی ایک کزن صبیحہ کی کلاس فیلو تھی اور اسی کے توسط سے امامہ کی اس سے شناسائی ہوئی۔ وہ ایک مذہبی جماعت کے اسٹوڈنٹ ورک سے منسلک تھی اور پختہ میں ایک بار وہ کلاس روم میں اسلام سے متعلق کسی مذہبی ایک موضوع پر لکچر دیا کرتی تھی۔ چالیس پچاس کے لگ بھگ لڑکیاں اس لکچر کو انشید کیا کرتی تھیں۔

صبیحہ نے اس دن ان سے متعارف ہونے کے بعد انہیں بھی اس لکچر کے لئے انوائٹ کیا تھا۔ وہ چاروں ہی وہاں موجود تھیں۔

”میں تو ضرور آؤں گی، کم از کم میری شرکت کے بارے میں آپ تسلی رکھیں۔“ جویریہ نے صبیحہ کی دعوت کے جواب میں کہا۔

”میں کوکوش کروں گی، وعدہ نہیں کر سکتی۔“ راہبہ نے کچھ جھپٹی ہوئی مکرہت کے ساتھ کہا۔

”میرا آنا ذرا مشکل ہے کیونکہ میں اس دن کچھ مصروف رہوں گی۔“ ذہیب نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

صبیحہ مسکراتے ہوئے امامہ کو دیکھنے لگی جواب تک خاموش تھی۔ امامہ کا رنگ کچھ فنی ہو گیا۔

”اور آپ؟ آپ آئیں گی؟“ امامہ کی نظر جویریہ سے ملی جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”ویسے اس پارکس موضوع پر بات کریں گی آپ؟“ اس سے پہلے کہ امامہ کچھ کہتی، جویریہ نے

صبیحہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ شاید ایسا اس نے دانش طور پر کیا تھا۔

”اس بار اسراف کے بارے میں بات ہوگی۔ اس ایک عادت کی وجہ سے ہمارا معاشرہ کتنی تیزی سے زوال پذیر ہو رہا ہے اور اس کے سدباب کے لئے کیا کیا جاسکتا ہے۔ اسی موضوع پر گفتگو ہوگی۔“ صبیحہ نے جویریہ کو تفصیل سے بتایا۔

”آپ نے بتایا نہیں امامہ آپ آ رہی ہیں؟“ جویریہ سے بات کرتے کرتے صبیحہ ایک بار پھر امامہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ امامہ کانٹا ایک بار پھر بدلا۔ ”میں۔۔۔ میں۔۔۔ دیکھوں گی۔“ اس نے جھپکتے ہوئے کہا۔

”مجھے بہت خوشی ہوگی اگر جویریہ کے ساتھ آپ تینوں بھی آئیں۔ اپنے دین کی بنیادی تعلیمات کے بارے میں ہمیں روز نہیں تو کبھی کبھار کچھ علم حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ صرف میں ہی لکچر نہیں دیتی ہوں ہم جتنے لوگ بھی آئیں گے وہ ہیں ان میں سے کوئی بھی اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے جسے ہم نے منتخب کیا ہوتا ہے اور اگر آپ میں سے بھی کوئی کسی خاص موضوع کے حوالے سے بات کرتا کچھ بتانا چاہے تو ہم لوگ اسے بھی ارجح کر سکتے ہیں۔“ صبیحہ بڑی سہولت سے بات کر رہی تھی پھر کچھ دیر بعد جویریہ اور اس کی کزن کے حراہان کے کمرے سے باہر چلی گئی۔

کوریڈور میں صبیحہ نے جویریہ سے کہا: ”آپ کم از کم امامہ کو ساتھ لے آئیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ آنا چاہ رہی ہیں۔“

”اس کا عقیدہ بالکل الگ ہے، وہ کبھی بھی ایسی محفلوں میں شرکت نہیں کرے گی۔“ جویریہ نے سنجیدگی سے اسے بتایا۔ صبیحہ کچھ حیران ہوئی۔

”آپ کو چاہئے کہ آپ انہیں اسلام کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیں۔ ہو سکتا ہے اس طرح وہ صحیح اور فلاح فریق کر سکیں۔“ صبیحہ نے چلتے ہوئے کہا۔

”میں ایک بار ایسی کوشش کر چکی ہوں۔ وہ بہت ناراض ہو گئی تھی اور میں نہیں چاہتی کہ ہم دونوں کی اتنی لمبی دوستی اس طرح ختم ہو۔“ جویریہ نے کہا۔

”اچھے دوست وہی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو گمراہی سے بچائیں اور آپ پر بھی فرض ہے کہ آپ ایسا ہی کریں۔“ صبیحہ نے کہا۔

”وہ ٹھیک ہے مگر کوئی بات سننے پر بھی تیار نہ ہو تو؟“

”تب بھی صحیح بات کہنے پر بنا فرض ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی دوسرا آپ کی بات پر غور کرنے پر مجبور ہو جائے۔“ صبیحہ اپنی جگہ درست تھی۔ اس لئے وہ صرف مسکراتی رہی گئی۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ کسی مرد کی آواز اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے۔ اس قدر خوب صورت کہ پوری دنیا اس آواز کی قید میں لگے۔ امام نے اپنا سانس روک لیا شاید وہ سانس لینا بھول گئی۔

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ تیرے بیکر کا نہ تھا

میں کہتا ہوں جہاں مجھ پر ہے سایہ تیرا

انسان کی زندگی میں کچھ ساتھیوں سعد ہوتی ہیں۔ شب قدر کی رات میں آنے والی اس سعد ساعت کی طرح جسے بہت سے لوگ گزر جانے دیتے ہیں، صرف چند اس ساعت کے انتظار میں ہاتھ اٹھاتے اور جموئی پھیلائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس ساعت کے انتظار میں جو پہلے پانی کو روک دے اور لڑکے ہوئے پانی کو رواں کر دے، جو دل سے نکلنے والی دعا کو یوں تک آنے سے پہلے مقدر بنادے۔

امام ہاشم کی زندگی میں وہ سعد ساعت شب قدر کی کسی رات کو نہیں آئی تھی۔ نہ اس نے اس سعد ساعت کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے نہ جموئی پھیلائی تھی پھر بھی اس نے زمین و آسمان کی گردش کو کچھ دیر کے لئے جھمتے دیکھا تھا۔ پوری کائنات کو ایک گنبد پر درمیں بدلتے دیکھا تھا جس کے اندر بس ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

دست گیری میری تنہائی کی تو نے ہی تو کی

میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا

وہ اندھیروں سے بھی دژاندہ گزر جاتے ہیں

جن کے ماتھے پہ چمکتا ہے ستارا تیرا

آواز بہت صاف اور واضح تھی۔ امام بہت کی طرح بیسود ہاتھ میں لے بیٹھی رہی۔

”بیلا امام؟“ دوسری طرف زینب کی آواز گونجی وہ آواز کم ہو گئی۔ چند لمحوں کے لئے زمین کی

لڑکی ہوئی گردش و پار و بحال ہو گئی۔

”بیلا امام! آواز سن رہی ہو میری؟“ وہ ایک جھمکے سے ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔

”ہاں، میں سن رہی ہوں۔“

”میں نے سوچا لائن کٹ گئی۔“ دوسری طرف سے زینب نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ امام

انگلے چٹو منٹ اس سے بات کرتی رہی مگر اس کا دل و دماغ نہیں اور تھا۔

☆☆☆☆☆☆

جلال انصر زینب کا بڑا بھائی تھا اور امام کا تائبہ طور پر اس سے واقف تھی۔ زینب اس کی کلاس ٹیوٹر

تھی اور اس سے امام کا تعارف وہیں میٹلنگ کا کالج میں ہوا تھا۔ چند ماہ میں ہی یہ تعارف اچھی خاصی دوستی

میں بدل گیا۔ اس تعارف میں اسے یہ پتا چلا کہ وہ لوگ چار بھائی بہن تھے۔ جلال سب سے بڑا تھا اور

باؤس جاب کر رہا تھا۔ زینب کے والد واپس آئیں انجینئر تھے اور ان کا گھر نہ خاصا مذہبی تھا۔

اسلام آباد سے واپسی پر اس نے زینب سے نعت پڑھنے والے اس شخص کے بارے میں پوچھا تھا۔

”زینب! اس رات میں تمہیں فون کیا تو کوئی نعت پڑھ رہا تھا، وہ کون تھا؟“ اس نے اپنے لیے

کو حق الامکان ناراض رکھتے ہوئے کہا۔

”ووہ..... ووہ..... جلال بھائی تھے۔ ایک مقابلہ میں حصہ لینے کے لئے وہ نعت پڑھ کر رہے تھے۔

فون کو ریڈور میں ہے اور ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لئے آواز تم تک پہنچ گئی۔“ زینب نے

تفصیل سے بتایا۔

”بہت اچھی آواز ہے ان کی۔“

”ہاں، آواز تو بہت اچھی ہے ان کی۔ قرأت تو نعت سے بھی زیادہ خوب صورت کرتے ہیں۔

بہت سے مقابلوں میں انعام بھی لے چکے ہیں۔ ابھی بھی کالج میں ایک مقابلہ ہونے والا ہے تم اس میں

اٹھیں سننا۔“

زینب تب یہ نہیں جانتی تھی کہ امام کس مذہب کی تھی، وہ جس طرح پڑے کا خیال رکھتی تھی

زینب کا خیال تھا کہ وہ کسی مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ خود زینب بھی عامے مذہبی گھرانے سے

تعلق رکھتی تھی اور چادر اوڑھا کر تھی۔

دو تین دن کے بعد امام، جلال انصر کی نعت سننے کے لئے اپنی فریڈز کو بتائے بغیر کلاسز تک

کر کے نعتوں کے اس مقابلے میں پہنچی تھی۔

جلال انصر کو اس دن پہلی بار اس نے دیکھا تھا۔ کپیٹر نے جلال انصر کا نام نکارا اور امام نے حیر

ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ زینب سے مشابہت رکھنے والے عامی شکل و صورت اور ڈاڑھی والے

ایک چہرے عجیب سا لڑکے کو اسٹیج پر چڑھنے دیکھا۔ اسٹیج پر سبز میاں چڑھنے کے لئے کروڑوں سبز کے

چپچپے آکر کھڑے ہوئے تک امام نے ایک بار بھی اپنی نظر جلال انصر کے چہرے سے نہیں ہٹائی۔ اس

نے اسے سینے پر ہاتھ باندھتے اور آنکھیں بند کرتے دیکھا۔

کچھ نہیں مانگا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

اس کی دولت ہے فقط قلبی کتب پا تیرا

امام کو اپنے پورے وجود میں ایک لمبی دوڑتی محسوس ہوئی۔ ہال میں عمل خاموشی تھی اور صرف

اس کی خوب صورت آواز گونج رہی تھی۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح بیٹھی اسے سنتی رہی۔ اس نے

کب نعت ختم کی، کب وہ اسٹیج سے اتر کر واپس ہوا، مقابلے کا نتیجہ کیا نکلا، اس کے بعد کس نے نعت

پڑھی، کس وقت سارے اسٹوڈنٹ وہاں سے گئے اور کس وقت ہال خالی ہو گیا امام کو پتا نہیں چلا۔

”تم جاؤ گی اس کا پیکر بننے؟“ صبیحہ کے نکلنے کے بعد زینب نے رابعہ سے پوچھا۔
 ”نہیں، میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں ایسے پیکر بہم نہیں کر سکتی۔“ رابعہ نے اپنی کتابیں اٹھاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔ امامہ، زینب اور جویریہ کے برعکس وہ قدرے آزاد خیال تھی اور زیادہ مذہبی رجحان بھی نہیں رکھتی تھی۔

”ویسے میں نے صبیحہ کی خاصی تعریف سنی ہے۔“ زینب نے رابعہ کی بات کے جواب میں کہا۔
 ”ضرور سنی ہوگی، بولتی تو واقعی اچھا ہے اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اس کے والد بھی کسی مذہبی جماعت سے منسلک ہیں۔ ظاہر ہے پھر اثر تو ہوگا۔“ رابعہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
 امامہ ان سے کچھ دور ایک کونے میں اپنی کتابیں لئے بیٹھی بظاہر ان کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھی مگر ان دونوں کی گفتگو بھی ان تک پہنچ رہی تھی۔ اس نے شکر کیا تھا کہ ان دونوں نے اسے اس گفتگو میں کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔

نہیں دن کے بعد امامہ مقررہ وقت پر ان لوگوں سے کوئی بھانڈا نہ کر صبیحہ کا پیکر اینڈز کرنے چلی گئی تھی۔ رابعہ، جویریہ اور زینب جتنی اس ہی پیکر میں نہیں لگیں پھر اس کا ارادہ بدل گیا۔ امامہ نے ان لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ وہ صبیحہ کا پیکر اینڈز کرنے جا رہی تھی۔
 صبیحہ، امامہ کو دیکھ کر کچھ حیران ہوئی تھی۔

”مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے آپ کو یہاں دیکھ کر۔ مجھے آپ کے آنے کی توقع نہیں تھی۔“ صبیحہ نے اس سے گرم جوش سے ملنے ہوئے کہا۔

یہ پہلا قدم تھا اسلام کی جانب جو امامہ نے اٹھایا تھا۔ اس سارے عرصے میں اسلام کے بارے میں اتنی کتابیں نظائر اور تراجم پڑھ چکی تھی کہ کم از کم وہ کسی بھی چیز سے ناواقف اور انہیان نہیں تھی۔ اسراف کے بارے میں اسلامی اور قرآنی تعلیمات اور احکامات سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی مگر اس کے باوجود صبیحہ کی دعوت کو رد کرنے کے بجائے قبول کر لینے میں اس کے پیش نظر صرف ایک ہی چیز تھی۔ وہ اپنے مذہب سے اسلام تک کا وہ فاصلہ طے کرنا چاہتی تھی، جو اسے بہت مشکل لگتا تھا۔

اور پھر وہ صرف پہلا اور آخری پیکر نہیں تھا۔ یکے بعد دیگرے وہ اس کا ہر پیکر اینڈز کرتی رہی۔ وہی چیزیں جنہیں وہ کتابوں میں پڑھتی رہی تھی اس کے منہ سے سن کر پراثر ہو جاتی تھیں۔ اس کی صبیحہ سے عقیدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ صبیحہ نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کے عقیدے کے بارے میں جانتی تھی مگر امامہ کو اس کے پاس آتے ہوئے دوماہ ہوئے تھے جب صبیحہ نے ختم نبوت پر ایک پیکر دیا۔
 ”قرآن پاک وہ کتاب ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔“ صبیحہ نے اپنے پیکر کا آغاز کیا۔ ”اور قرآن پاک میں ہی اللہ نبوت کا سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کر

دیتے ہیں۔ وہ کسی دوسرے نبی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھتے۔ اگر کسی نبی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ نزول کا ذکر ہے بھی تو وہی ایک نئے نبی کی شکل میں نہیں ہے بلکہ ایک ایسے نبی کا دوبارہ نزول ہے جن پر نبوت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت پہلے نازل کر دی گئی تھی اور جن کا دوبارہ نزول ان کی اپنی امت کے لئے نہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لئے ہی ہو گا اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی رہیں گے۔ کسی بھی آنے والے دور میں یا کسی بھی گزر جانے والے دور میں یہ رتبہ اور فضیلت کسی اور کو نہیں دی گئی تھی۔ ممکن ہے کہ اللہ ایک پیغمبر کو یہ رتبہ اور درجہ عطا کرے اور پھر اسے اس سے چھین کر کسی دوسرے شخص کو دے دیتا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”بات میں اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہے۔“

”تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی بات کو خود ہی رد کر دیتا اور پھر اگر اللہ کی اس بات کی گواہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود دیتے ہیں کہ ہاں وہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور ان کے بعد دوبارہ کوئی نبی نہیں آئے گا تو پھر کیا ہمارے لئے کسی بھی طور پر یہ جائز اور مناسب ہے کہ ہم کسی دوسرے شخص کے نبوت کے دعوے پر غور تک کریں؟ انسان اللہ کی مخلوقات میں سے وہ واحد مخلوق ہے جسے عقل جمعی نعمت سے نوازا گیا اور یہ ایسی مخلوق ہے جو اسی عقل کو استعمال کر کے سوچنے پر آئے تو خود اللہ کے وجود کے لئے ثبوت کی تلاش شروع کر دیتی ہے پھر اس سلسلے کو یہیں پر محدود نہیں رکھتی، بلکہ اسے پیغمبروں کی ذات تک دراز کر دیتی ہے۔ پہلے سے موجود پیغمبروں کی نبوت کے بارے میں سوال کرتی ہے پھر انہیں پیغمبر مان لیتی ہے اور اس کے بعد قرآن کے واضح احکامات کے باوجود زمین پر مزید پیغمبروں کی تلاش شروع کر دیتی ہے اور اس تلاش میں یہ بات فراموش کر دیتی ہے کہ نبی بننا نہیں تھا، بنانا چاہتا تھا، اسے مبعوث کیا جاتا تھا اور ہم انسانی evolution کی ان آخری دہائیوں میں کھڑے ہیں جہاں مزید نبیوں کی آمد کا سلسلہ اس لئے ختم کر دیا گیا کیونکہ انسان کے لئے ایک دین اور ایک نبی کا انتخاب کر لیا گیا۔

اب کسی نئے عقیدے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف تھلید کی ہے، صرف تھلید یعنی پریکٹس..... اس ایک، آخری اور مکمل دین کی جسے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کر دیا گیا۔ اب ہر وہ شخص خسارے میں رہے گا، جو دین کی روشنی کو مضبوطی سے تھامنے کے بجائے قرآن کی راہ اختیار کرے گا۔ اگر ہماری اعلیٰ تعلیم اور ہمارا شعور ہمیں دین کے بارے میں صحیح اور لفظ کی تفسیر تک نہیں دے سکتے تو پھر ہمیں تم اور اس جانور میں کوئی فرق نہیں، جو سبز چارہ کھاس کے ایک گھسے کے پیچھے کہیں بھی جا سکتا ہے، اس بات کی پروا کہ بغیر کے اس کارپوڈ کھاس ہے۔“

چالیس منٹ کے اس لپچر میں مسیو نے کسی اور غلط عقیدے یا فرقے کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا بالواسطہ کہا تھا۔ صرف ایک چیز بلا واسطہ کی تھی اور وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کا اقرار تھا۔ "اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جنہوں نے چودہ سو سال پہلے مدینہ میں وفات پائی۔ چودہ سو سال سے پہلے مسلمان ایک امت کے طور پر اس کی ایک شخص کے سامنے میں کھڑے ہیں۔ چودہ سو سال بعد بھی ہمارے لئے وہ ایک آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن کے بعد کوئی دوسرا نبی بھیجا گیا نہ بھیجا جائے گا اور ہر وہ شخص جو کسی دوسرے شخص میں کسی دوسرے نبی کا عکس تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اسے ایک بار اپنے ایمان کا زور تو گناہوں سے لیتا چاہئے۔ شاید یہ کوشش اسے اس عذاب سے بچا دے جس میں وہ اپنے آپ کو جلا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

امام ہر لپچر کے بعد مسیو سے مل کر چلایا کرتی تھی۔ اس لپچر کے بعد وہ مسیو سے نہیں ملی۔ ایک لمحہ بھی وہاں کے بغیر وہ وہاں سے چلی آئی۔ عجیب سے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو کر وہ کانچے سے باہر نکل کر بیڈ مل چلی رہی۔ کئی دیر فٹ پاتھ پر چلتی رہی اور اس نے کتنی سڑکیں عبور کیں، اسے اندازہ نہیں ہوا۔ کسی معمول کی طرح چلتے ہوئے وہ فٹ پاتھ سے پیچھے نہر کے کنارے بنی ہوئی ایک بچہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ سورج غروب ہوئے والا تھا اور اوپر سڑک پر گاڑیوں کے شور میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ نہر کے پتے ہوئے پانی کو دیکھتی رہی۔

ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے بڑبڑاتے ہوئے خود سے پوچھا۔

"آخر میں کر کیا رہی ہوں اپنے ساتھ۔ کیوں اپنے آپ کو ابھار رہی ہوں، آخر کس یقین کی کھون میں سرگرداں ہوں اور کیوں؟ میں اس سب کے لئے تو یہاں لاہور نہیں آئی۔ میں تو یہاں ڈاکٹر بننے آئی ہوں۔ مجھے آئی اسپیشلسٹ بنانا ہے۔ پیغمبر..... پیغمبر..... پیغمبر..... میرے لئے ہر چیز وہاں کیوں ختم ہو جاتی ہے۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

"مجھے اس سب سے نجات حاصل کرنی ہے، میں اس طرح اپنی اسٹڈیز پر کبھی توجہ نہیں دے سکتی۔ مذہب اور عقیدہ میرا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے۔ سچ کا غلط ہو میرے بڑوں نے دیا وہی ٹھیک ہے۔ میں اب مسیو کے پاس نہیں جاؤں گی۔ میں مذہب یا پیغمبر کے بارے میں کبھی سوچوں گی بھی نہیں۔" وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے طے کیا تھا۔

رات کو آٹھ بجے وہ وہاں آئی تو جویریہ اور ابراہیم کچھ فکر مند ہی تھے۔

"بس ایسے ہی مارکیٹ چلی گئی تھی۔" اس نے تے ہوئے چہرے کے ساتھ انہیں بتایا۔

☆.....☆.....☆

"اے امام! تم تو بہت عرصے بعد آئی ہو، آخر آنا کیوں چھوڑ دیا تم نے۔" بہت دنوں کے بعد

ایک بار پھر مسیو کے پاس پہنچ گئی تھی۔ مسیو کا لپچر شروع ہونے ہی والا تھا۔

"مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں، آپ اپنا لپچر ختم کر لیں، میں باہر بیٹھ کر آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔" امام نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔

ٹھیک پینتالیس منٹ کے بعد جب مسیو اپنا لپچر ختم کر کے باہر نکلی تو اس نے امام کو باہر کو ریڈ میں کھینچے ہوئے پایا۔ وہ مسیو کے ساتھ دو بارہ اوپر کی گریس میں آن بیٹھی جواب خالی تھا۔ مسیو خاموشی سے اس کی طرف سے بات شروع کرنے کا انتظار کرتی رہی۔

امام چند لمحے کسی سوچا میں ڈوب رہی اور پھر اس نے مسیو سے کہا۔

"آپ کو بتانے میں کس مذہب سے ہوں؟"

"ہاں، میں جانتی ہوں۔ جویریہ نے مجھے بتایا تھا۔" مسیو نے پرسکون انداز میں کہا۔

"میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ میں کس حد تک فرسٹ نیڈ ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے میں دنیا چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں۔" اس نے کچھ دیر کے بعد مسیو سے کہا شروع کیا۔ "میں..... میں..... اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ "مجھے بتانے کے....." اس نے ایک بار پھر اپنی بات اور دہرائی چھوڑ دی پھر خاموشی۔ "مگر میں اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتی۔ میں تیار ہو جاؤں گی، میرے ماں باپ مجھے مار ڈالیں گے۔ میرا کیریئر، میرے خواب، سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میں نے قوسرے سے عبادت کرنا تک چھوڑ دی ہے مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے سکون نہیں مل رہا ہے۔ آپ میری صورت حال کو سمجھیں۔ مجھے لگ رہا ہے یہ سب کچھ غلط ہے اور سچ کیا ہے، مجھے نہیں معلوم۔"

"امام! تم اسلام قبول کر لو۔" مسیو نے اس کی بات کے جواب میں صرف ایک جملہ کہا۔

"یہ میں نہیں کر سکتی، میں آپ کو بتا رہی ہوں، میں کتنے مسائل کا شکار ہو جاؤں گی۔"

"تو پھر تم میرے پاس کس لئے آئی ہو؟" مسیو نے اسی پرسکون انداز میں کہا۔ وہ اس کا منہ دیکھنے لگی پھر اس نے بے بسی سے کہا۔

"پتا نہیں میں آپ کے پاس کس لئے آئی ہوں؟"

"تم صرف یہی ایک جملہ سننے کے لئے آئی ہو جو میں نے تم سے کہا ہے۔ میں تمہیں کوئی دلیل نہیں دوں گی، کیونکہ تمہیں کسی سوال کے جواب کی تلاش نہیں ہے۔ ہر سوال کا جواب تمہارے اندر موجود ہے۔ تم سب جانتی ہو، بس تمہیں اقرار کرنا ہے۔ ایسا ہی ہے نا۔"

امام کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "مجھے لگ رہا ہے میرے پاؤں زمین سے اُٹھ چکے ہیں۔"

میں جیسے غلامیں سفر کر رہی ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

مسیو نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ دم اللہ پڑھ رہی تھی۔ امام بھی آنکھوں کے ساتھ

اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کیوں کچھ بھی نظر نہیں آتا سمیرا کچھ بھی نہیں۔“ اس نے اپنے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا۔

”والہ اللہ اللہ“ سمیرہ کے لب آہستہ آہستہ بولنے لگے۔ امامہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور دھڑکتے ہوئے سمیرہ کے پیچھے کچے کے الفاظ ڈھرا رہی تھی۔ ”محمد رسول اللہ۔“ امامہ نے کچے الفاظ ڈھرائے۔ اُس کی آواز بھرا گئی۔

امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسے اتار دنا کیوں آ رہا تھا۔ اسے کوئی پچھتاوا، کوئی افسوس نہیں تھا مگر پھر بھی اسے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ بہت دیر تک روتے رہنے کے بعد اس نے جب سر اٹھایا تھا تو سمیرہ اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ امامہ کیلئے چہرے کے ساتھ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

☆☆☆☆

رابعہ اور جویریہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہی تھیں اور امامہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ فرش کو رگڑتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”جہیں سے سب کچھ ہمیں پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا۔“ جویریہ نے ایک طویل وقفے کے بعد اس خاموشی کو توڑا۔ امامہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پرسکون انداز میں کہا۔

”اس سے کیا ہوتا؟“

”کم از کم ہم تمہارے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار تو نہ ہوتے اور تمہاری مدد کر سکتے تھے ہم دونوں۔“

امامہ سر جھٹکتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ ”اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔“
”مجھے تو بہت خوشی ہے امامہ اگر تم نے ایک صحیح راستے کا انتخاب کیا ہے۔ دیر سے کسی مگر تم غلط راستے سے بہت گئی ہو۔“ جویریہ نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں اس وقت تمہارے لئے اپنے دل میں کیا محسوس کر رہی ہوں۔“ امامہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔
”تمہیں اگر کم دونوں کی طرف سے کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو ہنگاماً مات، تمہاری مدد کر کے ہمیں خوشی ہوگی۔“

”مجھے واقعی تم لوگوں کی مدد کی بہت ضرورت ہے، بہت زیادہ ضرورت ہے۔“ امامہ نے کہا۔
”سمیرا وہ سب سے اگر تم نے اپنے مذہب کی اصلیت جانچ کر اسے چھوڑ دیا ہے تو۔۔۔۔۔“ جویریہ یہ کہہ رہی تھی۔

امامہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”تمہاری وجہ سے؟“ اس نے جویریہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس

کا ذکر بن اسے کہیں اور لے جا رہا تھا۔

دُھند میں اب ایک اور چہرہ ابھر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی، وہ چہرہ آہستہ آہستہ واضح ہو رہا تھا، زیرِ آب ابھرنے والے کسی نقش کی طرح۔۔۔۔۔ چہرہ اب واضح ہو گیا تھا۔ امامہ مسکرائی، وہ اس چہرے کو پہچان سکتی تھی۔ اس نے اس چہرے کے ہونٹوں کو ہلنے دیکھا۔ آہستہ آہستہ وہ آواز سن سکتی تھی۔ وہ آواز سن رہی تھی۔

قطرہ مانگے جو تو اُسے دے دے دے

مجھ کو کچھ اور نہ دے اپنا تمنا دے دے

”میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم لوگ کسی کو کچھ نہ بتاؤ، زینب کو بھی نہیں۔“ اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے اس نے جویریہ اور رابعہ سے کہا تھا۔ ان دونوں نے انتہات میں سر ہلا دیا۔

کچھ نہیں مانگنا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

اس کی دولت ہے فقط نقشِ کف پا تیرا

پارے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم

مجھ کو جھٹکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ تیرے دیکر کا نہ تھا

میں تو کہتا ہوں جہاں بھر ہے سایہ تیرا

وہ اس آواز کو پہچانتی تھی۔ یہ جلالِ انصاری کی آواز تھی۔

☆☆☆☆

امامہ کو میٹیکل کالج میں چند روز ہوئے تھے جب ایک ویک اینڈ پر اسلام آباد آنے کے بعد اس نے رات کو زینب کو گھر لایا اور فون کیا۔

”بیٹا میں زینب کو بلاتی ہوں، تم ہو لڈر کھو۔“ زینب کی امی فون رکھ کر چلی گئیں۔ وہ ریسیور کان سے لگائے انتظار کرنے لگی۔

کچھ نہیں مانگنا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

اس کی دولت ہے فقط نقشِ کف پا تیرا

مردانہ آواز میں فون پر سنائی دینے والی وہ نعت امامہ نے پہلے ہی سمجھی تھی مگر اس وقت جو کوئی بھی اسے پڑھ رہا تھا وہ کمالِ کمالِ جذب سے اسے پڑھ رہا تھا۔

پارے قد سے کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم

مجھ کو جھٹکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

اسے اندازہ نہیں تھا کہ کسی مرد کی آواز اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے۔ اس قدر خوب صورت کہ پوری دنیا اس آواز کی قید میں لگے۔ امام نے اپنا سانس روک لیا شاید وہ سانس لینا بھول گئی۔

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ حیرے بیکر کا نہ تھا

میں کہتا ہوں جہاں بھر ہے سایہ حیرا

انسان کی زندگی میں کچھ ساتھیں سعد ہوتی ہیں۔ شب قدر کی رات میں آنے والی اس سعد ساعت کی طرح جسے بہت سے لوگ گزر جانے دیتے ہیں، صرف چند اس ساعت کے انتظار میں ہاتھ اٹھاتے اور بھولی پھیلائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس ساعت کے انتظار میں جو چلتے پانی کو روک دے اور ٹکے ہوئے پانی کو رواں کر دے، جو دل سے نکلے والی دعا کو لبوں تک آنے سے پہلے مقررہ کر دے۔

امام کا شمع کی زندگی میں وہ سعد ساعت شب قدر کی کسی رات کو نہیں آئی تھی۔ نہ اس نے اس سعد ساعت کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے نہ بھولی پھیلائی تھی پھر بھی اس نے زمین و آسمان کی گردش کو کچھ دیر کے لئے جھٹکے دیکھا تھا۔ پوری کائنات کو ایک گنبد بے درمیں بدلنے دیکھا تھا جس کے اندر بس ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

دست گیری میری بھائی کی تو نے ہی تو کی

میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا حیرا

وہ اندھیروں سے بھی دکانہ گزر جاتے ہیں

جن کے ماتھے پہ چمکتا ہے ستارا حیرا

آواز بہت صاف اور واضح تھی۔ امام بہت کی طرح رہیبوں ہاتھ میں لے بیٹھی رہی۔

”بیوہ امام؟“ دوسری طرف زینب کی آواز گونجی اور وہ آواز گم ہو گئی۔ چند لمحوں کے لئے زمین کی لڑکی ہوئی گردش و پار و پناہ ہو گئی۔

”بیوہ امام! آواز سن رہی ہو میری؟“ وہ ایک جھٹکے سے ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔

”ہاں، میں سن رہی ہوں۔“

”میں نے سوچا لائن کٹ گئی۔“ دوسری طرف سے زینب نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ امام اگلے چند منٹ اس سے بات کرتی رہی مگر اس کا دل دماغ نہیں اور تھا۔

☆☆☆☆

جلال انصر زینب کا بڑا بھائی تھا اور امام کا نائبہ طور پر اس سے واقف تھی۔ زینب اس کی کلاس فیو تھی اور اس سے امام کا تحارف و ہیں میڈیکل کالج میں ہوا تھا۔ چند دہائیوں سے یہ تعارف ابھی خاموشی و سستی میں بدل گیا۔ اس تحارف میں اسے یہ پتا چلا کہ وہ لوگ چار بھائی بہن تھے۔ جلال سب سے بڑا تھا اور

باداس جاب کر رہا تھا۔ زینب کے والد واپس اٹلی گئے تھے اور ان کا گھر ان خاصہ مذہبی تھا۔

اسلام آباد سے واپسی پر اس نے زینب سے نعت پڑھنے والے اس شخص کے بارے میں پوچھا تھا۔

”زینب! اس رات میں نے جنہیں فون کیا تو کوئی نعت پڑھ رہا تھا، وہ کون تھا؟“ اس نے اپنے لیے کوئی امکان نازل رکھتے ہوئے کہا۔

”وہ..... وہ..... جلال بھائی تھے۔ ایک مقابلہ میں حصہ لینے کے لئے وہ نعت پڑھ رہے تھے۔ فون کو ریڈو میں سے اور ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لئے آواز تم تک پہنچ گئی۔“ زینب نے تفصیل سے بتایا۔

”بہت اچھی آواز ہے ان کی۔“

”ہاں، آواز تو بہت اچھی ہے ان کی۔ قرأت تو نعت سے بھی زیادہ خوب صورت کرتے ہیں۔

بہت سے مقابلوں میں انعام بھی لے چکے ہیں۔ ابھی بھی کالج میں ایک مقابلہ ہونے والا ہے تم اس میں انہیں منٹنا۔“

زینب یہ سب نہیں جانتی تھی کہ امام کس مذہب کی تھی، وہ جس طرح پڑے کا خیال رکھتی تھی زینب کا خیال تھا کہ وہ کسی مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ خود زینب بھی غامض مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور چار اوڑھا کرتی تھی۔

دو تین دن کے بعد امام، جلال انصر کی نعت سننے کے لئے اپنی فرینڈز کو بتائے بغیر کلاسز بنک کر کے نعتوں کے اس مقابلے میں چلی گئی تھی۔

جلال انصر کو اس دن پہلی بار اس نے دیکھا تھا۔ کپتین نے جلال انصر کا نام پکارا اور امام نے حیر ہوئی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ زینب سے مشابہت رکھنے والے عامی شکل و صورت اور ڈرامائی والے ایک چہرے میں کچیس سالہ لڑکے کو اسٹج پر چڑھتے دیکھا۔ اسٹج پر بیڑیاں چڑھنے کے لئے کروڑوں کے پیسے آکر کھڑے ہونے تک امام نے ایک بار بھی اپنی نظر جلال انصر کے چہرے سے نہیں ہٹائی۔ اس نے اسے پہنے پر ہاتھ باندھے اور آنکھیں بند کرتے دیکھا۔

کچھ نہیں مانگا شاہوں سے یہ شیدا حیرا

اس کی دولت ہے فقط نقش کلب پا حیرا

امام کو اپنے پورے وجود میں ایک لہری دوڑتی محسوس ہوئی۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی اور صرف اس کی خوب صورت آواز گونج رہی تھی۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح میٹھی سے سنتی رہی۔ اس نے کب نعت ختم کی، کب دوا اسٹج سے اتر کر واپس ہوا، مقابلے کا نتیجہ کیا نکلا، اس کے بعد کس کس نے نعت پڑھی، کس وقت سارے اسٹوڈنٹس وہاں سے گئے اور کس وقت ہال خالی ہو گیا امام کو پتا نہیں چلا۔

بہت دیر کے بعد اسے ایک دم ہوش آیا تھا۔ اس وقت اپنے ارد گرد دیکھنے پر اسے احساس ہوا کہ وہ بال میں ایک بیٹی تھی۔

”میں نے کل تمہارے بھائی کو نعت پڑھتے سنا۔“ امام نے اگلے دن زینب کو بتایا۔

”اچھا..... انہیں پہلا انعام ملا ہے۔“ زینب نے اس کی بات پر مسکرا کر اسے دیکھا۔

”بہت خوب صورت نعت پڑھی تھی انہوں نے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد امام نے پھر اس موضوع پر آگئی۔

”ہاں! وہ بچپن سے نصیحتیں پڑھتے آرہے ہیں۔ اتنے قرأت اور نعت کے مقابلے جیت چکے ہیں کہ اب تو انہیں خود بھی ان کی تعداد یاد نہیں ہوگی۔“ زینب نے قفاخر سے کہا۔

”ان کی آواز بہت خوب صورت ہے۔“ امام نے پھر کہا۔ ”ہاں خوب صورت تو ہے مگر ساری بات اس محبت اور عقیدت کی ہے، جس کے ساتھ وہ نعت پڑھتے ہیں۔ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق ہے۔ اتنی محبت کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ قرأت اور نعت کے علاوہ انہوں نے کبھی کوئی اور چیز نہیں پڑھی، حالانکہ اسکول اور کالج میں انہیں بہت مجبور کیا جاتا رہا مگر ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ میں جس زبان سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قصیدہ پڑھتا ہوں اس زبان سے کسی اور شخص کا قصیدہ نہیں پڑھ سکتا۔ محبت تو ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کرتے ہیں مگر جیسی محبت بھائی کرتے ہیں دیکھی محبت تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ پچھلے دس سالوں میں ایک بار بھی انہوں نے نماز تھننا نہیں کی۔ ہر ماہ ایک قرآن پاک پڑھتے ہیں۔ تم تو نعت کی تعریف کر رہی ہو اگر ان سے سخاوت سن لو تو.....“

وہ بڑے فخر سے بتا رہی تھی۔ امام چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے زینب سے اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا۔

اگلے دن دو صبح کالج جانے کے لئے تیار ہونے کے بجائے اپنے بستر میں گھسی رہی۔ جو یہ نے خاص دیر کے بعد بھی اسے بستر سے برآمد نہ ہوتے دیکھ کر سمجھوڑا۔

”خدا جہاں امام کالج نہیں جاتا کیا۔ وہ میری ہے۔“

”نہیں، آج مجھے کالج نہیں جانا۔“ امام نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

”کیوں؟“ جو یہ نے کچھ حیران ہوئی۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ امام نے کہا۔

”آنکھیں تو بہت سرخ ہو رہی ہیں تمہاری، کیا رات کو سوئیں نہیں تم؟“

”نہیں، نیند نہیں آئی اور پلیز اب مجھے سونے دو۔“ امام نے اس کے کسی اور سوال سے بچنے کے

لے کہا۔ جو یہ نے کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد اپنا ٹیک اور فولڈر اٹھا کر باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد امام نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ بات ٹھیک تھی کہ وہ ساری رات سوئیں سکی تھی اور اس کی وجہ جلال الصبر کی آواز تھی۔ وہ اپنے ذہن کو اس آواز کے علاوہ اور کچھ بھی فوکس نہیں کر پاری تھی۔

”جلال الصبر!“ اس نے زیر لب اس کا نام دہرایا۔ ”آخر اس کی آواز کیوں مجھے اس قدر اچھی لگ رہی ہے کہ میں..... میں اسے اپنے ذہن سے نکال نہیں پا رہی؟“ اس نے اٹھتے ہوئے ذہن کے ساتھ

بستر سے نکلے ہوئے سوچا۔ وہ اپنے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔

”میرے بھائی کی آواز میں ساری تاثیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق کی وجہ سے ہے۔“ اس کے کانوں میں زینب کی آواز گونجی۔

”آواز میں تاثیر اور عشق؟“ اس نے بے چینی سے پہلو ہلا۔ ”سوز، گداز، لوج، مٹھاس.....“

آخر تھا کیا اس آواز میں؟ ”وہ آواز کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔“ دنیا عشق اللہ سے شروع ہوتی ہے اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو جاتی ہے۔“ اسے ایک اور جملہ یاد آیا۔

”عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم؟“ اس نے حیرانی سے سوچا۔ ”عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم؟“ یہ قدم اسے اپنے اندر ایک عجیب سا سناٹا آواز محسوس ہوا۔ اس نے اس سناٹے

اور تاریکی کو کھوجنا شروع کیا، اپنے اندر سیر میز و سیر میز آواز شروع کیا۔ اسے کہیں کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ ”آخر وہ کیا چیز ہوتی ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سننے پر لوگوں کی آنکھوں میں آنسو

اور لبوں پر درد دلے آتی ہے۔ عقیدت، عشق، محبت..... ان میں سے کیا ہے؟ مجھے کچھ کیوں محسوس نہیں ہوتا۔ میری آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں آتے؟ میرے ہونٹوں پر درد کیوں نہیں آتا؟ میری

آواز میں تاثیر.....“ وہ لمحہ بھر کے لئے رُک، اس نے زیر لب پڑھا۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

اس کی دولت ہے فقط نقش کعب پا تیرا

اسے اپنی آواز بھرنی ہوئی لگی۔ ”شاید ابھی جاگی ہوں، اس لئے آواز ایسی ہے۔“ اس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے سوچا۔ اس نے ایک بار پھر پڑھنا شروع کیا۔

”کچھ نہیں مانگتا.....“ وہ ایک بار پھر رُک گئی۔ اس بار اس کی آواز میں لرزش تھی۔ اس نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ ”کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا“ کھڑکی سے باہر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے اس

نے لرزتی، بھرنی آواز اور کانپتے ہونٹوں کے ساتھ پہلا مصرع پڑھا پھر دوسرا مصرع پڑھنا شروع کیا اور رُک گئی۔ کھڑکی سے باہر غلامی کھرتے ہوئے وہ ایک بار پھر جلال الصبر کی آواز اپنے کانوں میں آتی

محسوس کر رہی تھی۔

بلند، صاف، واضح اور لڑکانہ کی طرح دل میں اتر جانے والی مقدس آواز..... اسے اپنے گالوں پر نمی محسوس ہوئی۔

ایک دم وہ اپنے ہوش و حواس میں آئی اور پتا چلا کہ وہ دروری تھی۔ کچھ دیر جیسے بے چینی کے عالم میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں دونوں آنکھوں پر رکھے مگر بخود کھڑی رہی۔ اس نے اپنے آپ کو بے بسی کی انتہا پر پہنچا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

انسان کے لئے سب سے مشکل مرحلہ وہ ہوتا ہے جب اس کا دل کسی چیز کی گواہی دے رہا ہو مگر اس کی زبان خاموش ہو جب اس کا دل بڑھ چلا کر کسی چیز کی صداقت کا اقرار کر رہا ہو مگر اس کے ہونٹ ساکت ہوں۔ امامہ ہاشم کی بھی اپنی زندگی اسی مرحلے پر آن پہنچی تھی، جو فیصلہ دو پچھلے دو تین سالوں سے نہیں کر پا رہی تھی وہ فیصلہ ایک آواز سے چند دنوں میں کر دیا تھا۔ یہ جانتے یہ کھو بے، یہ بے گھر، یہ بے گھر کہ آخر لوگ کیوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی عقیدت رکھتے ہیں۔ آخر کیوں محسن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کی جاتی ہے۔ اس نے اسے سالہا سال اپنے غم کی قید سے نکلنے سے، اس پر کبھی رقت طاری نہیں ہوئی تھی، کبھی اس کا وجود موم بن کر نہیں پھٹتا تھا، کبھی اسے کسی پر رشک نہیں آیا تھا مگر ہر بار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام پڑھتے، دیکھتے اور سنتے ہوئے وہ عجیب کی کیفیات کا شکار ہوتی تھی۔ ہر بار، ہر دفعہ اس کا دل اس نام کی طرف کھینچتا چلا جاتا تھا اور صمیمہ کے پاس نہ جاننے کے اس کے سارے ارادے بھاپ بن کر اڑ گئے تھے۔ جلال الشریک آواز تاریکی میں نظر آنے والے جگنو کی طرح تھی جس کے تعاقب میں وہ ہوتا سوچے سمجھے بغیر بڑی تھی۔

میں تجھے عالم اشیا میں بھی پا لیتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ ہے عالم بالا تیرا

☆.....☆.....☆

امامہ کے لئے وہ ایک نئے سڑک کا آغاز تھا۔ وہ پہلے کی طرح باقاعدگی سے صمیمہ کے پاس جاتے لگی۔ ان اجتماعات میں شرکت نے اسے اگر ایک طرف اپنے فیصلے پر استقامت بخشی تو دوسری طرف اس کے باقی ماندہ شہادت کو بھی دور کر دیا۔

مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ امامہ کے لئے کوئی چھوٹا یا معمولی فیصلہ نہیں تھا، اس کا ایک فیصلے نے اس کی زندگی کے ہر معاملے کو متاثر کیا تھا۔ وہ اب احمد سے شادی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ غیر مسلم تھا۔ اسے جلد یا بدیر اپنے گھر والوں سے علیحدگی بھی اختیار کرنی تھی کیونکہ وہ اب ایسے کسی ماحول میں رہنا نہیں چاہتی

تھی جہاں اسلامی شعائر اور عقائد میں اسنے دھڑلے سے تحریکات کی جاتی تھیں۔ وہ اس پیسے کے بارے میں بھی گھٹک کا شکار ہوئے تھی جی جی جو اسے اپنی تعلیم اور دوسرے اخراجات کے لئے ہاشمین کی طرف سے ملتے تھے۔ چند سال پہلے تک یہ یوں کی کہانی نظر آنے والی زندگی یک دم ہی ایک ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہو گئی تھی اور زندگی کے اس مشکل راستے کا انتخاب اس نے خود کیا تھا۔ اسے بعض دفعہ حیرت ہوتی کہ اس نے اتنا بڑا فیصلہ کس طرح کر لیا۔ اس نے اللہ سے استقامت ہی مانگی تھی اور اسے استقامت سے نوازا گیا تھا مگر وہ ابھی اتنی کم عمر تھی کہ غدشات اور اندیشوں سے کھل طور پر بچنا چھڑا لیا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

”امامہ! تم فی الحال اپنے والدین کو مذہب کی تبدیلی کے بارے میں نہ بتاؤ۔ اپنے جیروں پر کھڑی ہو جاؤ۔ اس وقت نہ صرف تم آسانی سے احمد سے شادی سے انکار کر سکتی ہو بلکہ تم انہیں اپنے مذہب کی تبدیلی کے بارے میں بھی بتا سکتی ہو۔“

صمیمہ نے ایک بار اس کے غدشات سننے کے بعد اسے مشورہ دیا تھا۔

”میں اس پیسے کو اپنے اوپر خرچ کر نہیں چاہتی جو میرے باپا مجھے دیتے ہیں، اب جبکہ میں جانتی ہوں کہ میرے والد ایک مجھوتے مذہب کی تبلیغ کر رہے ہیں یہ جائز تو نہیں ہے کہ میں ایسے شخص سے اپنے اخراجات کے لئے رقم لوں؟“

”تم ٹھیک کہتی ہو مگر تمہارے پاس فی الحال کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ بہتر ہے تم اپنی تعلیم مکمل کر لو اس کے بعد تمہیں اپنے والد سے کچھ بھی نہیں لینا پڑے گا۔“ صمیمہ نے اسے سمجھایا۔ صمیمہ اگر اسے یہ راہ نہ دکھاتی جب بھی امامہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس میں فی الحال اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش چھوڑ دیتی۔

☆.....☆.....☆

اس وقت رات کے دس بجے تھے جب وہ سنیٹا سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی پاپ کارن کا پکٹ تھا اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پاپ کارن کھاتے ہوئے سڑک پر چل رہا تھا۔ آدھ گھنٹہ تک سرکس میں ناچتے رہنے کے بعد اس نے ایک بہت بڑے پچھلے کی گھنٹی بجائی تھی۔ ”صاحب کھانا لگایا؟“ لاؤنج میں داخل ہونے پر ملازم نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ”نہیں۔“ اس نے لنگی میں سر جلاتے ہوئے کہا۔

”دودھ؟“

”نہیں۔“ وہ ڈرے بغیر وہاں سے گزر چلا گیا۔ اپنے کپڑے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ کمرے کی لائٹ آن کر کے وہ کچھ دیر بے مقصد اُدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر راتھ روم کی طرف بڑھ

گیا۔ شیونگ کٹ نکال کر اس کے اندر سے ایک در بزر نکال لیا اور اسے لے کر بیڈ روم میں آگیا۔ اپنے بیڈ پر بیٹھ کر اس نے سائیز ٹیبل پر پڑا ہوا لیپ جلا لیا اور بیڈ روم کی ٹیوب لائٹ بند کر دی۔ ریزر بلڈ کے اوپر موجود چہرہ کو اتار کر وہ کچھ دیر لیپ کی روشنی میں اس کی تیز دھار کو دیکھتا رہا پھر اس نے بلڈ کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ کی کلائی کی رگ کو ایک تیز جھٹکے سے کاٹ دیا۔ اس کے منہ سے ایک سسکی سی نکلی اور پھر اس نے ہونٹ سمجھنے لے۔ وہ اپنی آنکھوں کو کھلا کر کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی کلائی بیڈ سے نیچے لٹک رہی تھی اور خون کی دھار اب سیدھا کارپٹ پر گر کر کر اس میں جذب ہو رہی تھی۔

اس کا ذہن جیسے کسی گہری کمائی میں جا رہا تھا پھر اس نے کچھ دھماکے سنے۔ تاریکی میں جاتا ہوا ذہن ایک بار بھر جھماکے کے ساتھ روشنی میں آگیا۔ شور اب بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ فوری طور پر شور کی وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں کھول دیں مگر وہ کسی چیز کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ سو رہی تھی جب بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کوئی اس کا دروازہ نہ جارتھا۔

"امام! امام!" وہ دم دروازہ بجاتے ہوئے بلند آواز میں اس کا نام پکار رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟ کیوں چلا رہے ہو؟" دروازہ کھولتے ہی اس نے کچھ حواس ناچنگی کے عالم میں وہم سے پوچھا جس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔

"فرسٹ ایڈ باکس ہے تمہارے پاس؟" وہم نے اسے دیکھتے ہی فوراً پوچھا۔

"ہاں، کیوں؟" وہ مزید پریشان ہوئی۔

"بس اسے لے کر میرے ساتھ آجاء۔" وہم نے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا؟" اس کے بیڈ کے نیچے سے جیسے زمین ہلنے لگی۔

"چوچو نے پھر خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اپنی کلائی کاٹ لی ہے اس نے۔ ملازم آیا ہوا ہے نیچے اس کا، تم میرے ساتھ چلو۔" امام نے بے اختیار ایک اطمینان بھر اس کی۔

"تمہارے اس دوست کو ہسپتال میں ہونا چاہیے جس طرح کی حرکتیں یہ کرتا پھرتا ہے۔"

امام نے ناگواری سے اپنے بیڈ پر پڑا ہوا دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہا۔

"میں تو اسے دیکھتی ہی بھاگ آیا ہوں، ابھی وہ ہوش میں تھا۔" اس نے مڑ کر امام کو بتایا۔ وہ دونوں اب آگے پیچھے بیڑ حیاں اُتر رہے تھے۔

"تم اسے ہسپتال لے جاتے۔" امام نے آخری بیڑھی پر پہنچ کر کہا۔

"وہ بھی لے جاؤ گا، پہلے تم اس کی کلائی وغیرہ تو باندھو، خون تو بند ہو۔"

"وہم! میں اسے کوئی بات بھی قسم کی فرسٹ ایڈ نہیں دے سکتی۔ چاہیں اس نے کس چیز سے کلائی

کاٹی ہے اور زخم کتنا گہرا ہے۔ اس کے اپنے گھروالے کہاں ہیں؟" بات کرتے کرتے امام کو خیال آیا۔ "اس کے گھر میں کوئی بھی نہیں ہے، صرف ملازم ہیں۔ وہ کوئی فون کال آئی تھی جس پر ملازم اسے بلانے کے لئے آیا اور جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو پریشان ہو کر دوسرے ملازموں کے ساتھ مل کر اس نے دروازہ توڑ دیا۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اب اسے کچھ سے باہر نکل آئے تھے۔

"تمہارا یہ دوست جو ہے؟" امام نے کچھ تنازعہ کی حالت میں وہم کے ساتھ چلتے ہوئے سالار کے بارے میں کچھ کہنا چاہا مگر وہم نے غصے میں پلٹ کر اس کو جھڑک دیا۔

"خار کاڑ سب۔ اپنی لغت ملامت بند نہیں کر سکتیں تم۔ اس کی حالت سیریس ہے اور تم اس کی برائیوں میں مصروف ہو۔"

"اُمی حرکتیں کرنے والوں کے لئے میرے پاس کوئی تھوڑی نہیں ہے۔" وہ دونوں اب سالار کے لاؤنج میں پہنچ چکے تھے۔

چند قدم چلتے کے بعد وہم ایک موٹر گاڑی کے اندر داخل ہو گیا۔ امام اس کے پیچھے ہی تھی مگر پھر جیسے گرفت کھا کر رک گئی۔ کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے قد آدم کھڑکیوں پر کچھ باڈاز اور ایکٹریسز کی بڑی بڑی عریاں تصویریں اس طرح لٹکی گئی تھیں کہ ایک لمبے کے لئے امام کو یوں لگے جیسے وہ تمام لڑکیاں حقیقی طور پر اس کمرے میں موجود ہوں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

ایک طرف بیڈ پر پڑے ہوئے زخمی کے بارے میں اس کی رائے کچھ اور خراب ہو گئی۔ وہ تصویریں اس کے کردار کی ہتھی کا ایک اور ثبوت تھیں اور کمرے میں تین چار لوگوں کی موجودگی میں اس کے لئے وہ تصویریں خاصی غلط اور شرمندگی کا باعث بن رہی تھیں۔ ان تصویروں سے نظریں چراتے ہوئے وہ

تیز رفتاری سے ڈبل بیڈ کی طرف آگئی جہاں سالار سنبھر لپٹا ہوا تھا۔ وہم اس کے پاس بیڈ پر بیٹھا فرسٹ ایڈ باکس کھول رہا تھا جبکہ امام کا بڑا بھائی سالار کی اس کلائی کو بیڈ ٹیبل کے ایک کونے کے

ساتھ دبا کر خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ خود سالار نقشے میں ڈوبے ہوئے کسی انسان کی طرح اپنا ہاتھ چمڑوائے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہم اور وہاں موجود ملازموں سے کچھ کہہ بھی رہا تھا۔

امام کے آگے بیٹھتے ہی اس کے بڑے بھائی نے اس کرسی کو چھوڑ دیا، جس پر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔

"اس کے زخم کو دیکھو، میں نے چادر سے خون روکنے کی کوشش کی ہے مگر میں کامیاب نہیں ہوا۔"

انہوں نے اس کی کلائی امام کو کھماتے ہوئے کہا۔ امام نے کرسی پر بیٹھے ہی اس کی کلائی کے گرد لپٹا ہوا چادر کا کونہ پٹایا۔ زخم گہرا اور لمبا تھا۔ ایک نظر ڈالنے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا۔

سالار نے پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چمڑنے کی کوشش کی مگر امام مضبوطی سے کلائی کے کچھ نیچے سے اس کا بازو پکڑے رہی۔

ہمارے سمجھانے کا اثر کیوں نہیں ہوا؟ سکندر مجھن نے دوران سفر کہا۔ "میرا تو دماغ بچنے لگتا ہے جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔ کیا نہیں کیا میں نے اس کے لئے۔ ہر سہولت، بہترین تعلیم حتیٰ کہ بڑے سے بڑے سائیکالرسٹ تک کو دکھا چکا ہوں مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین بات..... میری جوتیہ میں نہیں آتا کہ مجھ سے کیا غلطی ہو گئی ہے، جو مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ جانے والوں کے درمیان مذاق بن گیا ہوں میں اس کی وجہ سے۔" سکندر مجھن بہت پریشان تھے۔ "ہر وقت میرا دم حلق میں لٹکا رہتا ہے کہ پتا نہیں وہ کس وقت کیا کر کرے۔ اتنی احتیاط رہنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایک بار دم غافل ہوئے اور دھڑکی وہی حرکت کر کر رہا ہے۔" طیبہ نے اپنی آنکھوں میں المتے ہوئے آنسوؤں کو خشکے ساتھ صاف کیا۔ وہ دونوں اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے مگر اپنی سے اسلام آباد آئے تھے مگر سالار کے سامنے آکر دونوں کو چپ لگ گئی تھی۔ ان دونوں ہی کی بجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس حالت میں اس سے کیا کہیں۔

سالار کو ان کی ولی اور ذاتی کیفیات کا اچھی طرح اندازہ تھا اور ان کی خاموشی کو وہ قیمت جان رہا تھا۔ انہوں نے اس دن اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اگلے دن بھی وہ دونوں خاموش ہی رہے تھے۔ مگر تیسرے دن ان دونوں نے اپنی خاموشی توڑ دی تھی۔

"مجھے صرف یہ بتاؤ کہ آخر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟" سکندر نے اس رات بڑی جمل حواری سے اس کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ "آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اپنی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔ میں نے اسی وعدہ پر تمہیں اسپورٹس کلب بھی لے کر دی۔ ہر بات مان رہے ہیں ہم لوگ تمہاری، پھر بھی تمہیں قطعاً احساس نہیں ہے ہم لوگوں کا، نہ خاندان کی عزت کا۔" سالار اسی طرح چپ بیٹھا رہا۔

"کی اور کا نہیں تو تم ہم دونوں کا خیال کرو، تمہاری وجہ سے ہماری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔" طیبہ نے کہا۔ "تمہیں کوئی پریشانی، کوئی پر اہم ہے تو ہم سے ڈسکس کرو، ہم سے کہو۔ مگر اس طرح مرنے کی کوشش کرو؟" تم نے بھی سوچا ہے کہ اگر تم ان کو خشوں میں کامیاب ہو جاؤ تو ہمارا کیا ہوتا۔" سالار خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کی باتوں میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ خود کشی کی ہر کوشش کے بعد وہ ان سے اسی طرح کی باتیں سنتا تھا۔

"کچھ بولو، چپ کیوں ہو؟ کچھ کچھ میں آ رہا ہے جس میں؟" طیبہ نے جھنجھلا کر کہا۔ وہ انہیں دیکھنے لگا۔ "اں باب کو اس طرح ذلیل کر کے بڑی خوشی ملتی ہے تمہیں۔"

"اس قدر شاندار ششقی ہے تمہارا اور تم اپنی اتقانہ حرکات سے اپنی زندگی شمع کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ لوگ ترستے ہیں اس طرح کے اکیزہ پر کارڈ کے لئے۔" سکندر مٹھن نے اسے اس کا ایک لک

رکارڈ یاد دلانے کی کوشش کی۔ سالار نے بے اختیار ایک جمائی لی۔ وہ جانتا تھا اب وہ اس کے بچپن سے لے کر اس کی اب تک کی کامیابیوں کو ذرا اثر دے کر دیں گے۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ اگلے چارہ منٹ اس موضوع پر بولنے کے بعد انہوں نے تھک کر پوچھا۔

"آخر تم کچھ بول کیوں نہیں رہے، بولو؟"

"میں کیا بولوں، سب کچھ تو آپ دونوں نے کہہ دیا ہے۔" سالار نے کچھ اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ "میری زندگی میرا پر عمل معاملہ ہے پھر بھی میں نے آپ کو بتایا ہے کہ دراصل میں مرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔" سکندر نے اس کی بات کاٹ لی۔

"تم پوچھی کر رہے تھے، وہ مدت کرو، ہم پر کچھ رحم کھاؤ۔" سالار نے ناراضی سے باپ کو دیکھا۔ "تم آخر یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم آئندہ ہماری کوئی حرکت نہیں کرو گے۔ فضول میں بحث کیوں کرتے جا رہے ہو؟" اس بار طیبہ نے اس سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، نہیں کروں گا، ایسی کوئی بھی حرکت۔" سالار نے بے زاری سے جیسے ان دونوں سے جان چھڑانے کے لئے کہا۔ سکندر نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اس کے وعدے پر مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ نہ وہ۔ نہ ان کی بیوی۔ مگر ایسے وعدے لینے کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ بچپن سے اپنے اس بیٹے پر فخر کرتے آ رہے تھے، مگر جھپٹے کچھ سالوں سے ان کا وہ فخر ختم ہو گیا تھا۔ جتنا پریشان انہیں سالار نے کیا تھا ان کا ان کے باقی بچوں نے مل کر بھی نہیں کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اب کیسا ہے تمہارا دوست؟" مجھے تھے تمہاری کس خبریت دریافت کرنے؟" امامہ وسم کے ساتھ مارکیٹ جا رہی تھی کہ اچانک اسے سالار کا خیال آیا۔

"پہلے سے تو حالت کافی بہتر ہے اس کی۔ شاید کل پرسوں تک ڈسپارچ ہو جائے۔" وسم نے اسے سالار کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا۔ "تم چلو گی وہ ابھی پرس کو دیکھنے؟" وسم کو اچانک خیال آیا۔ "میں؟" امامہ حیران ہوئی۔ "میں کیا کروں گی جا کر....."

"خیریت دریافت کرنا اور کیا کرنا ہے تمہیں۔" وسم نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا۔" امامہ نے کچھ حائل سے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے، چلیں گے۔ حالانکہ اس طرح کے مریض کی عیادت کرنا فضول ہے۔" اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکا رہے ہوئے کہا۔

"وہی مجھے توقع تھی کہ اس کے پیرش ہمارے گھر آئیں گے، شہر یہ وغیرہ اور کرنے کے ہم نے ان کے بیٹے کی جان بچالی۔ کس قدر بروقت مدد کی تھی ہم نے، مگر انہوں نے تو بھولے سے ہمارے گھر

کارخ نہیں کیا۔" امامہ نے تھرو کیا۔

"تم ان بے چاروں کی کنٹینٹنگ کا انداز ہی نہیں کر سکتیں۔ کس منہ سے وہ شکر یہ لدا کر نے انہیں اور پھر اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ آپ کے بیٹے نے ایسی حرکت کیوں کی ہے تو وہ دونوں کیا جواب دیں گے۔ کیا یہ کہیں گے کہ شوق کے ہاتھوں..... وہ بے چارے عجیب مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

وسیم نے قدر سے انہیں اس کے بارے میں والے انداز میں کہا۔ "وہیے اس کے بچپن میں میرا بہت شکر یہ لدا کیا ہے اور ای اور بیا جب برسوں پہل میں اس کی خیریت دریافت کرنے گئے تھے تو انہوں نے وہاں بھی ان دونوں کا بہت شکر یہ لدا کیا ہے۔ یہ قزاقی اور پاپا کچھ داری تھی کہ انہوں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا اسلار کے بارے میں، ورنہ تو ہر طرح کی خاصی گفت کا سامنا کرنا پڑتا انہیں۔" وسیم نے گاڑی موڑتے ہوئے کہا۔

"مگر آخر تمہارے اس دوست کا مسئلہ کیا ہے، کیوں بیٹھے بٹھائے اس طرح کی احمقانہ حرکتیں کرنے لگتا ہے؟" امامہ نے پوچھا۔

"تم مجھ سے اس طرح پوچھ رہی ہو جیسے وہ مجھے سب کچھ بتا کر یہ سب کرتا ہو گا۔ مجھے کیا پتا، وہ کس لئے یہ سب کرتا ہے یا کیوں کرتا ہے۔"

"تمہارا اتنا گھر ادوست ہے، تم پہ جھنجھکیوں نہیں اس سے؟"

"اتنا گھر ادوست بھی نہیں ہے کہ ایسی باتوں کے بارے میں مجھے بتانے لگے اور ویسے بھی میں کیوں اتنا کریدوں، ہو گا کوئی مسئلہ اس کا۔"

"تو پھر بھرت نہیں ہے کہ تم ایسے دوستوں سے کچھ غافلے پر ہو، ایسے لوگوں سے دوستی اچھی نہیں ہوتی۔ اگر کل کو تم نے بھی اس طرح کی حرکتیں شروع کر دیں تو؟۔"

"وہیے تم نے اس دن جو حرکت کی تھی وہ اگر اسے یاد رہی تو ہماری دوستی میں خود ہی غامض فرق آ جائے گا۔" وسیم نے کچھ جتانے والے انداز میں کہا۔

"میں نہیں سمجھتی کہ اسے وہ تھیرا ہو گا۔ وہ صحیح طور پر ہوش میں تو نہیں تھا۔ تم سے ذکر کیا اس لئے اس بارے میں؟" امامہ نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی سے کہا تو نہیں مگر ہو سکتا ہے کہ اسے یاد ہو۔ تم نے اچھا نہیں کیا تھا۔"

"اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ ایک تو اپنا ہاتھ سمجھنا ہوا تھا دوسرے کا گالیاں دے رہا تھا اور اوپر سے میرا دینہ بھی سمجھنا تھا۔"

"اس نے دوبند نہیں کیا تھا، اس کا ہاتھ لگا تھا۔" وسیم نے سالار کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"جو بھی تھا، اس وقت تو مجھے بہت غصہ آیا تھا کہ بعد میں مجھے بھی انہیں دے دیا تھا اور میں نے تو اللہ

کا بہت شکر لدا کیا کہ وہ بچ گیا۔ اگر کہیں وہ مر جاتا تو مجھے تو بہت ہی کچھ بتا دیتا اپنے اس تھیرا کا۔" امامہ نے قدر سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"چلو تم آج چار ہی ہو تو معذرت کر لینا۔" وسیم نے مشورہ دیا۔

"نہیں ان کیسے ذکر کروں، ہو سکتا ہے اسے کچھ یاد ہی نہ ہو پھر میں خود بخود گڑے مردے اکھاڑوں۔"

اسے یاد دلاؤں کہ میں نے اس کے ساتھ ایسا کیا تھا۔" امامہ نے فوراً کہا۔

"اور فرض کرو اسے سب کچھ یاد ہو اتو۔؟"

"تو..... تو کیا ہو گا۔ وہ تو کون سا ہمارا دشمن ہے دار ہے کہ اس سے تعلقات خراب ہو جائیں گے یا مکمل چول میں فرق پڑے گا۔" امامہ نے لاپرواہی سے کہا۔

ٹھانچک کرنے کے بعد وہ وسیم سے ٹھیک لگے آیا جہاں سالار زیرِ علاج تھا۔

وہ دونوں جس وقت اس کے کمرے میں داخل ہوئے اس وقت وہ سوپ پینے میں مصروف تھا۔ سالار نے وسیم کے ساتھ آنے والی لڑکی کو دیکھا اور فوراً پہچان لیا تھا کہ اگرچہ اس رات اس حالت میں وہ اسے شناخت نہیں کر سکا تھا مگر اس وقت اسے دیکھتے ہی وہ اسے پہچان گیا تھا۔ اپنی می سے یہ بات وہ پہلے ہی جان چکا تھا کہ وسیم کی بین نے اسے فرسٹ ایڈز کی تھی مگر اسے وہ فرسٹ ایڈز نہیں تھی، بس وہ زانے دار تھیرا تھا جو اس رات اسے پڑا تھا، اس لئے امامہ کو دیکھتے ہی وہ سوپ پینے پڑے رک گیا۔

اس کی جھنجھکی ہوئی نظروں سے امامہ کو اندازہ ہو گیا کہ اسے یقیناً اس رات ہونے والے واقعات کسی نہ کسی حد تک یاد تھے۔

وکی ٹیک سلیک کے بعد اس کی بھی امامہ کا شکر یہ لدا کرنے لگیں، جبکہ سالار نے سوپ پینے ہوئے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ وسیم سے اس کی دوستی کو کئی سال گزر چکے تھے اور اس نے وسیم کے گھر میں امامہ کو بھی کئی بار دیکھا تھا مگر اس نے پہلے کبھی توچہ نہیں دی تھی۔ اس دن پہلی بار وہ اس پر قدر سے تحقیقی انداز میں غور کر رہا تھا۔ اس کے دل میں امامہ کے لئے تنگدیا یا احسان مندی کے کوئی چند بات نہیں تھی۔

اس کی وجہ سے اس کے سارے پلان کا بیزار غرق ہو گیا تھا۔

امامہ اس کی می سے گفتگو میں مصروف تھی مگر وہ وقتاً فوقتاً اپنے اوپر پڑنے والی اس کی نظروں سے بھی واقف تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی کی نظریں اتنی بری لگی تھیں۔

ایک لمحہ کے لئے اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ جائے۔ سالار کے بارے میں اس کی رائے اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ وہ اپنے اس تھیرا کے لئے معذرت کے ارادے کے ساتھ وہاں آتی تھی مگر اس وقت اس کا دل چاہا تھا کہ وہ پکار اور تھیرا لگا دے۔

تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر پڑی ہوئی اور وہاں سے جاتے

ہوئے اس نے سالار کے ساتھ علیک ملیک کا تلف بھی نہیں کیا تھا۔ وہ صرف اس کی کمی کے ساتھ سلام دعا کے بعد سالار کی طرف دیکھ کر باہر نکل آئی تھی اور باہر آکر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔
”اس طرح کے دوست ہٹانے ہوئے ہیں تم نے؟“ اس نے باہر نکلتے ہی وسیم سے کہا جس نے ہنسنے لائی تھی۔

”کیوں اب کیا ہو ہے؟“

”اسے دیکھنے تک کی چیز نہیں ہے۔ اس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ میں اس کے دوست کی بہن ہوں اور اس کے دوست کے ساتھ اس کے کمرے میں موجود ہوں۔“

وسیم اس کی بات پر کچھ خفیف سا ہو گیا۔

”یہ آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اس کی عیادت کے لئے چلایا جائے اور تم اس کے ساتھ میل جول بند کرو۔“

”چھانٹ لیا ہے، میں محتاط رہوں گا۔ تم بار بار اس بات کو نہ دہراؤ۔“ وسیم نے موضوع مکتفہ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ امامہ دانستہ طور پر خاموشی ہو گئی مگر سالار کے اس ناپسندیدہ واقفادی لست میں شامل ہو چکا تھا۔

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ وہاں دونوں کچھ چٹاں گزارنے اسلام آباد آئی ہوئی تھی ورنہ شاید سالار سے اس کا اتنا قریبی اور انتہائی پسندیدہ واقفادی اور قریبی ہی پیدا نہ ہوتا۔

☆ ☆ ☆

اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے پہلی بار جلال اضر کی قرب سے دیکھا جب ایک دن وہ چاروں کالج کے لان میں بیٹھی مکتفہ میں مصروف تھیں۔ وہ وہاں کسی کام سے آیا تھا۔ رومی علیک ملیک کے بعد وہ زینب کے ساتھ چند قدم دور جا کر آہوا تھا۔ امامہ اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکتی۔ ایک عجیب سی مسرت اور سرخوشی کا احساس اسے گھیرے میں لے رہا تھا۔

وہ چند منٹ زینب سے بات کرنے کے بعد واپس سے چلا گیا۔ امامہ اس کی پشت پر نظریں نہاٹے اس وقت تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ اس کے ارد گرد بیٹھی اس کی فریڈ ز کیا باتیں کر رہی تھیں۔ اسے اس وقت اس کا کوئی احساس نہیں تھا جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو تو یکدم جیسے دوبارہ اپنے ماحول میں واپس آگئی۔

جلال اضر سے اس کی دوسری ملاقات زینب کے گھر پر ہوئی تھی۔ اس دن وہ کالج سے واپسی پر زینب کے ساتھ اس کے گھر آئی تھی۔ زینب کچھ دھڑکنے سے ان سب کو اپنے ہاں آنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ باقی سب نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیا تھا۔ مگر امامہ اس دن اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچی آئی تھی۔

اس نے گھر آکر اسے عجیب سے سکون کا احساس ہوا تھا۔ شاید اس احساس کی وجہ جلال اضر کی اس گھر سے بہت تھی۔

وہ درانگہ روم میں بیٹھی ہوئی تھی اور زینب چائے تیار کرنے کے لئے کچن میں گئی تھی۔ جب جلال درانگہ روم میں داخل ہوا۔ امامہ کو وہاں دیکھ کر کچھ چونک گیا۔ شاید اسے امامہ کو وہاں دیکھنے کی توقع نہیں تھی۔

”السلام علیکم۔ کیا حال ہے آپ کا؟“ جلال نے شاید اس طرح بے وضو رک اندر داخل ہونے پر اپنی ہیبت مٹانے کے لئے کہا۔ امامہ نے رنگ بدلتے چہرے کے ساتھ اس کا جواب دیا۔

”زینب کے ساتھ آئی ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”جی۔“

”زینب کہاں ہے، میں دراصل اس کو ماحوطہ سے بے یہاں آگیا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ اس کی کوئی دوست یہاں موجود ہے۔“ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے وہ پلٹ گیا۔

”آپ بہت اچھی نصرت پر مبنی ہیں۔“ امامہ نے بے ساختہ کہا۔ وہ ٹھک گیا۔

”شکریہ۔“ وہ کچھ حیران نظر آیا۔ ”آپ نے کہاں سنی ہے؟“

”ایک دن میں نے زینب کو فون کیا تھا جب تک فون ہوا۔ دیکھا ہے آپ کی آواز آتی رہی، پھر زینب سے آپ کے بارے میں پتا چلا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ میں بھی گئی تھی جہاں آپ نے وہ نصرت پر مبنی تھی۔“ وہ بے اختیار کہتی چلی گئی۔ جلال اضر کی کچھ میں نہیں آیا وہ حیران ہو گیا۔

”بہت اچھی تو نہیں، بس پڑھ لیتا ہوں۔ اللہ کا کرم ہے۔“ اس نے حیرت کے اس جھٹکے سے سننے لگے ہوئے سفید چادر میں لپیٹا اس دلی لہجے کی دراز قامت لڑکی کو دیکھا جس کی گہری سیاہ آنکھیں کوئی بہت عجیب سا تاثر لے کر بٹھکتی تھیں۔ اپنی آواز کی تعریف وہ بہت سوں سے سن چکا تھا مگر اس وقت اس لڑکی کی تعریف اس کے لئے قدر سے غیر معمولی تھی اور جس انداز میں اس نے یہ کہا تھا وہ اس سے بھی زیادہ عجیب۔

وہ پلٹ کر درانگہ روم سے باہر نکل گیا۔ وہ جیسے ہی لڑکیوں سے مکتفہ میں مہارت نہیں رکھتا تھا اور ہر ایک لڑکی سے مکتفہ جس سے وہ صرف چہرے کی حد تک واقف تھا۔

امامہ ایک عجیب سی مسرت کے عالم میں وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے جلال اضر سے بات کی تھی۔ اپنے سامنے۔ خود سے اتنے قریب۔ وہ درانگہ روم کے دروازے سے کچھ آگے کا رنٹ پر اس جگہ کو دیکھتی رہی جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھڑا تھا۔ تصویر کی آنکھ سے وہ اسے ابھی بھی دیکھ رہی تھی۔

ان کی دلچسپی ملاقات باطل میں ہوئی۔ پچھلے وفد اگر امام داندہ طور پر نسب کے گھر کی تھی تو اس بار یہ ایک اتفاق تھا۔ امام درابہ کے ساتھ وہاں آئی تھی جسے وہاں اپنی کسی دوست سے ملنا تھا۔ باطل کے ایک کوریڈور میں فائلس ایئر کے اسٹوڈنٹس کے ایک گروپ میں اس نے جلال اصر کو دیکھا۔ اس کی ایک ہارٹ بیٹس ہوئی۔ کوریڈور میں انکارش تھا کہ وہ اس کے پاس نہیں جاسکتی تھی اور اس وقت پہلی بار امام کو احساس ہوا کہ اسے سامنے دیکھ کر اس کے لئے رگ چٹکتا مشکل کام تھا۔ درابہ کی دوست کے ساتھ بیٹھے ہوئے بھی اس کا حیران مکمل طور پر باہر تھا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ درابہ کے ساتھ اس کی دوست کے کمرے سے باہر آئی تھی۔ اب وہاں فائلس ایئر کے اسٹوڈنٹس کا وہ گروپ نہیں تھا۔ امام کو بے اختیار دیکھا کہ وہاں اس کے ساتھ باقیں کرتے ہوئے باہر نکلتی رہی تھی جب بیڑیوں پر ان دونوں کا سامنا جلال سے ہو گیا۔ امام کے جسم سے جیسے ایک کرنٹ سا گزر گیا تھا۔

"السلام علیکم۔ جلال بھائی! کیسے ہیں آپ؟" درابہ نے ہلکی کی تھی۔
"اللہ کا شکر ہے۔"

اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ یہاں کیسے آ گئے؟" اس بار جلال نے امام کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں اپنی ایک فرینڈ سے ملنے آئی تھی اور امام میرے ساتھ آئی تھی۔" درابہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی جبکہ امام خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں بھرتے ہوئے تھی۔

دیکھ کر میری تنہائی کی تو نے ہی تو کی

میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا میرا

اس کی آواز سننے ہوئے وہ ایک بار پھر کسی ٹرانس میں آ رہی تھی۔ اس نے بہت کم لوگوں کو اسے شہسہ لگے میں اردو بولتے ہوئے سنا تھا۔ جس لگے میں وہ بات کر رہا تھا۔ چنانچہ کیوں ہر بار اس کی آواز سننے ہی اس کے کانوں میں اس کی پڑی ہوئی وہ نعت کو غنچے لگتی تھی۔ اسے عجیب سا رنگ آ رہا تھا اسے دیکھتے ہوئے۔

جلال نے درابہ سے بات کرتے ہوئے شاید اس کی غور کو محسوس کیا تھا، اسی لئے بات کرتے کرتے اس نے امام کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ امام نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔ بے اختیار اس کا دل چاہتا تھا وہ اس شخص کے اور قریب چلی جائے۔ جلال سے نظریں ہٹا کر ارد گرد گزرتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے اس نے تین بار لا حول پڑھی۔ "شاید اس وقت شیطان میرے دل میں آکر مجھے اس کی طرف راغب کر رہا ہے۔" اس نے سوچا مگر لا حول پڑھنے کے بعد بھی اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں

آئی۔ وہ اب بھی جلال کے لئے ویسی ہی کشش محسوس کر رہی تھی۔

اجد سے اسنے سالوں کی محنت کے بعد بھی کبھی اس نے اپنے آپ کو اس کے لئے اس طرح بے اختیار ہونے نہیں دیکھا تھا جس طرح وہ اس وقت ہو رہی تھی۔ وہاں کمرے اسے پہلی بار جلال سے بہت زیادہ خوف آیا۔ میں کیا کروں گی اگر میرا دل اس آدمی کو دیکھ کر اسی طرح بے اختیار ہوتا رہا، آخر اسے دیکھ کر مجھے۔ اس نے جیسے بے بسی کے عالم میں سوچا۔ میں اتنی کمزور تو بھی نہیں تھی کہ اس جیسے آدمی کو دیکھ کر اس طرح۔ اس نے اپنے وجود کو موم کا پلا۔

☆.....☆.....☆

"بھائی! آپ قانع ہیں۔" اس رات نسب دروازے پر دھک دے کر جلال کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ہاں، آجائو۔" اس نے اسٹوڈی ٹیبل پر بیٹھے گروں موز کو نسب کو دیکھا۔

"آپ سے ایک کام ہے۔" نسب اس کے پاس آتے ہوئے بولی۔

"کیا کام ہے؟"

"آپ ایک کیمٹ میں اپنی آواز میں کچھ نقیصے دیکھا کر دیں۔" نسب نے کہا۔ جلال نے حیرت سے اس کی فرمائش سنی۔

"کس لئے؟"

"وہ میری دوست ہے۔ امام اس کو آپ کی آواز بہت پسند ہے، اس لئے۔" اس نے مجھ سے فرمائش کی اور میں نے ہائی بھری۔ "نسب نے تفصیل بتائی۔"

جلال اس فرمائش پر مسکرایا۔ امام سے کچھ دن پہلے ہونے والی ملاقات اسے یاد آئی۔

"یہ وہی لڑکی ہے جو اس دن یہاں آئی تھی؟" جلال نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"ہاں، وہی لڑکی ہے۔" امام آہستہ سے یہاں آئی ہے۔

"اسلام آباد سے؟" باطل میں رہ رہی ہے؟" جلال نے کچھ دلچسپی لینے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں باطل میں رہ رہی ہے۔" کافی اچھا خاندان ہے اس کا، بہت بڑے اسٹریٹسٹ ہیں اس کے قادر۔ مگر امام سے مل کر ڈرامہ محسوس نہیں ہوتا۔ "نسب نے بے اختیار امام کی تعریف کی۔

"کافی ذہنی لگتی ہے۔ میں نے اسے ایک دو بار تمہارے ساتھ کالج میں بھی دیکھا ہے۔ کالج میں بھی چارواڑھی ہوتی ہے اس نے۔ یہاں کالج کی "آب و ہوا" کا بھی انکسار نہیں ہوا اس پر۔" جلال نے کہا۔

"بھائی! اس کی قبلی بھی خاصی ذہنی ہے کیونکہ وہ جب سے یہاں آئی ہے اسی طرح ہی ہے۔ میرا

خیال ہے کہ خاستہ کز روینہ لوگ ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی قبلی غاصی تعلیم یافتہ ہے۔ نہ صرف بھائی بلکہ بیٹیں بھی۔ یہ گھر میں سب سے چھوٹی ہے۔" نجب نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "تو پھر آپ کب ریکارڈ کر کے دیں گے؟" نجب نے پوچھا۔
"تم کل لے لینا۔ میں ریکارڈ کرو دوں گا۔" جلال نے کہا۔ دوسرا ہاتھ ہونے کرے سے نکل گئی۔
جلال یکدم دیکھ کر کسی سوچ میں ڈوبا رہا پھر وہ بارہا اس کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا جسے وہ پہلے چڑھ رہا تھا۔
☆.....☆.....☆

ان کی اگلی ملاقات لاہور کی میٹروپولیٹن میں ہوئی تھی۔ اس بار امامہ اسے وہاں موجود دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف چلی گئی۔ رمی مالک سلیک کے بعد امامہ نے کہا۔
"میں آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہتی تھی۔"
جلال نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "کس لئے؟"
"اس کیسٹ کے لئے جو آپ نے ریکارڈ کر کے بھجوائی تھی۔" جلال مسکرایا۔
"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کبھی کوئی مجھ سے ایسی فرمائش کر سکتا ہے۔"
"آپ بہت خوش قسمت ہیں۔" امامہ نے دم آواز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں..... کس حوالے سے؟" جلال نے ایک بار پھر حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
"ہر حوالے سے۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے۔"
"آپ کے پاس بھی تو بہت کچھ ہے۔"

وہ جلال کی بات پر عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ جلال کو شبہ ہوا کہ اس کی آنکھوں میں کچھ نمی نمودار ہو رہی تھی مگر وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ اب نظریں جھکا لے ہوئے تھی۔
"پہلے کچھ بھی نہیں تھا اب واقعی سب کچھ ہے۔" جلال نے دم آواز میں اسے کہتے سنا وہ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"آپ اتنی محبت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لیتے ہیں تو میں سوچتی ہوں کہ....."
اس نے اپنی بات ادھر ہی چھوڑ دی۔ جلال خاموشی سے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔
"مجھے آپ پر رخصت آتا ہے۔" چند لمبے بعد وہ آہستہ سے بولی۔

"سب لوگوں کو تو اس طرح کی محبت نہیں ہوتی جیسی محبت آپ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔ وہ بھی جانتے تو ہر کوئی اس طرح اس محبت کا اظہار نہیں کر سکتا کہ دوسرے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں گرفتار ہونے لگیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی آپ سے بڑی محبت ہوگی۔" اس نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں کوئی نمی نہیں تھی۔

"شاید مجھے وہم ہوا تھا۔" جلال نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔
"یہ میں نہیں جانتا، اگر ایسا ہو تو میں واقعی بہت خوش قسمت انسان ہوں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے واقعی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑی محبت ہے۔ مجھ جیسے لوگوں کے لئے اتنی کافی ہے۔ ہر ایک کو اللہ اس محبت سے نہیں نوازتا۔"
وہ بڑی رسانیت سے کہہ رہا تھا۔ امامہ اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ اسے کبھی کسی شخص کے سامنے اس طرح کا احساس کمتری نہیں ہوا تھا، جس طرح کا احساس کمتری وہ جلال انصر کے سامنے محسوس کرتی تھی۔

"شاید میں بھی تحت پرچہ لوں۔ شاید میں بھی بہت اچھی طرح اسے پرچہ لوں مگر میں..... میں جلال انصر کی نہیں ہو سکتی، کبھی بن ہی نہیں سکتی، کبھی میری آواز سن کر کسی کا وہ حال نہیں ہو سکتا جو جلال انصر کی آواز سن کر ہوتا ہے۔" وہ لاہور کی سڑکوں سے لے کر عالم میں سوچ رہی تھی۔
☆.....☆.....☆

جلال انصر کے ساتھ ہونے والی چند ملاقاتوں کے بعد امامہ نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ بارہا کبھی اس کا سامان نہ کرے، نہ اس کے بارے میں سوچے، نہ نجب کے گھر جائے۔ حتیٰ کہ اس نے نجب کے ساتھ اپنے تعلقات کو بھی اپنی طرف سے بہت حد تک محدود کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ہر خفاقی تدبیر برے طریقے سے ناکام ہوتی گئی۔
ہر گزرتے دن کے ساتھ امامہ کی بے بسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور پھر اس نے کھٹے کھٹے دیئے تھے۔

"اس آدمی میں کوئی چیز ایسی ہے، جس کے سامنے میری ہر مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔" اور شاید اس کا یہ اعتراف ہی تھا جس نے اسے ایک بار پھر جلال کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ پہلے اس کے لئے اس کی بے اختیار لا شعوری تھی پھر اس نے شعوری طور پر جلال کو اسجد کی جگہ دے دی۔
"آخر کیا رہائی ہے اگر میں اس شخص کا ساتھ چاہوں جس کی آواز مجھے بار بار اپنے مقبرہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹنے پر مجبور کرتی رہی۔ میں کیوں اس شخص کے حصول کی خواہش نہ کروں جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجھ سے بھی زیادہ محبت رکھتا ہے۔ کیا مضائقہ ہے اگر میں اس شخص کو اپنا قند رکھتا رہتا ہوں، جس کے لئے میں اُس رہتی ہوں اور جس کے کردار سے میں واقف ہوں۔ کیا برا ہے اگر میں یہ چاہوں کہ میں جلال انصر کے نام سے شناخت پاؤں۔ اس واحد آدمی کے نام سے جسے سنتے، دیکھتے مجھے اس پر رخصت آتا ہے۔" اس کے پاس ہر دلیل، ہر توجیہ موجود تھی۔
بہت غیر محسوس طور پر وہ ہر اس جگہ جانے لگی جہاں جلال کے پائے جانے کا امکان ہوتا اور وہ اکثر

وہاں پایا جاتا۔ وہ زینب کو اس وقت فون کرتی، جب جلال گھر پر ہو تاکہ گھر پر موجود ہوتے ہوئے فون ہمیشہ وہی ریسورکٹ تھا۔ دونوں کے درمیان چھوٹی موٹی گفتگو رفتہ رفتہ طویل ہونے لگی پھر وہ ملنے لگے۔ جویریہ، رابعہ یا زینب ختیوں کو امام اور جلال کے درمیان بڑھتے ہوئے ان تعلقات کے بارے میں پتا نہیں تھا۔ جلال اب پاؤں جاب کر رہا تھا اور امام اکثر اس کے پاخانہ مل جانے لگی۔ باقاعدہ اظہار محبت نہ کرنے کے باوجود دونوں اپنے لئے ایک دوسرے کے جذبات سے واقف تھے۔ جلال جانتا تھا کہ امام اسے پسند کرتی تھی اور یہ پسندیدگی عام قومیت کی نہیں تھی۔ خود امام بھی یہ جان چکی تھی کہ جلال اس کے لئے کچھ خاص قسم کے جذبات محسوس کرنے لگا ہے۔

جلال اس قدر مذہبی تھا کہ اس نے کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ دو لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائے گا، نہ صرف یہ کہ وہ محبت کرے گا بلکہ اس طرح اس سے ملا کرے گا۔ مگر یہ سب کچھ بہت غیر محسوس انداز میں ہو گیا تھا۔ اس نے زینب سے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ اس کے اور امام کے درمیان کسی خاص نوعیت کا تعلق تھا۔ اگر وہ یہ انکشاف کر دیتا تو زینب اسے یقیناً امام کی اسجد کے ساتھ ملے شدہ نسبت سے آگاہ کر دیتی۔ بہت شروع میں ہی وہ امام کی لڑکی کسی نسبت کے بارے میں جان لیتا تو وہ امام کے بارے میں بہت حتماً ہو جاتا پھر کم از کم امام کے لئے اس حد تک افراتو ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس حد تک وہ چکا تھا۔

ان کے درمیان ہونے والی ایسی ہی ایک ملاقات میں امام نے اسے پر پوز کیا تھا۔ اسے امام کی جرأت پر کچھ حیرانی ہوئی تھی کیونکہ کم از کم وہ خود بہت چاہنے کے باوجود اب بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ "آپ کا پاؤں جاب کچھ عرصے میں عمل ہو جائے گا، اس کے بعد آپ کیا کریں گے؟" امام نے اس دن اس سے پوچھا تھا۔

"اس کے بعد میں اسٹوڈنٹ نیشن کے لئے باہر جاؤں گا۔" جلال نے بڑی سہولت سے کہا۔

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد وہاں آؤں گا اور اپنا پتا پتلا بناؤں گا۔"

"آپ نے اپنی شادی کے بارے میں سوچا ہے؟" اس نے اگلا سوال کیا تھا۔ جلال نے حیران منکرابت کے ساتھ اسے دیکھا۔

"امام! شادی کے بارے میں ہر ایک ہی سوچتا ہے۔"

"آپ کس سے کریں گے؟"

"یہ ملے کرنا ابھی باقی ہے۔"

امام چند لمبے خاموشی رہی۔ "مجھ سے شادی کریں گے؟"

جلال دم بخود اسے دیکھنے لگا۔ اسے امام سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ "آپ کو میری بات بری لگی ہے؟"

جلال دم بخود اسے دیکھنے لگا۔ اسے امام سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ "آپ کو میری بات بری لگی ہے؟"

امام نے اسے گم سم دیکھ کر پوچھا۔ وہ دیک دم جیسے ہوش میں آیا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہے۔" اس نے بے اختیار کہا۔ "یہ سوال مجھے تم سے کرنا چاہئے تھا۔ تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"ہاں۔" امام نے بڑی سہولت سے کہا۔

"اور آپ؟"

"میں..... ہاں، آف کورس۔ تمہارے علاوہ میں اور کس سے شادی کر سکتا ہوں۔" اس نے اپنے ہاتھ پر امام کے چہرے پر ایک چمک آتے دیکھی۔

"میں پاؤں جاب قسم ہونے کے بعد اپنے والدین کو تمہارے ہاں بھجواؤں گا۔" وہ اس بار جواب میں کچھ کہنے کے بجائے چپ سی ہو گئی۔ "جلال! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں آپ سے اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر شادی کر لوں؟"

جلال اس کی بات پر ہلکا ہلکا دیا۔ "کیا مطلب؟"

"ہو سکتا ہے میرے بچے میں اس شادی پر تیار نہ ہوں۔"

"کیا تم نے اپنے بچے میں شادی سے بات کی ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"کیوں میں اپنے بچے میں اس کو اچھی طرح جانتی ہوں۔" اس نے رسائی سے کہا۔

جلال دیکھ کر کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ "امام! میں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ تمہارے بچے میں کو ہم دونوں کی شادی پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا۔"

"مگر ایسا ہو سکتا ہے۔ آپ مجھے صرف یہ بتائیں کہ کیا آپ اس صورت میں مجھ سے شادی کر لیں گے؟"

جلال کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ امام اضطراب کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد جلال نے اپنی خاموشی کو توڑا۔

"ہاں، میں جب بھی تم سے شادی کر دوں گا۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اب کسی دوسری

"تو؟" امام نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ سے بات کرنے آئے ہیں۔"

"مگر میں تو آپ کو نہیں جانتی پھر آپ مجھ سے کیا بات کرنے آئے ہیں؟"

امام نے سر دھیمی سے کہا۔ اسے سالار کی آنکھوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔ کاش یہ کسی سے نظر چمکا کہ بات کرنا سیکھ لیتا، خاص طور پر کسی لڑکی سے۔ اس نے میگزین دوبارہ کھول لیا۔

"آپ مجھے نہیں جانتیں؟" سالار مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ "آپ کے گھر کے ساتھ ہی میرا گھر ہے۔"

"یقیناً ہے مگر میں آپ کو "ذاتی" طور پر نہیں جانتی۔" اس نے اسی رکھائی کے ساتھ میگزین پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

"چند ماہ پہلے آپ نے ایک رات میری جان بچائی تھی۔" سالار نے مذاق اڑانے والے انداز میں اسے یاد دلایا۔

"میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض تھا۔ میرے سامنے کوئی بھی مر رہا ہوتا، میں یہی کرتی۔ اب مجھے ایکسیج زکریں میں کچھ معروف ہوں۔"

سالار اس کے کہنے کے باوجود دس سے کم نہیں ہوا۔ جو رنے اس کے بازو کو ہولے سے کھینچ کر اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ اسے شاید وہیم کے حوالے سے امام کا لحاظ تھا مگر سالار نے اپنا بازو چھڑا لیا۔

"میں اس رات آپ کی مدد کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا، حالانکہ آپ نے مجھے پرہیزش طریقے سے ٹریٹ نہیں دیا تھا۔"

اس بار سالار نے سنجیدگی سے کہا۔ امام نے اس کی بات پر میگزین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"آپ کا اشارہ اگر اس پتھر کی طرف ہے تو ہاں وہ بالکل پرہیزش نہیں تھا اور میں اس کے لئے معذرت کرتی ہوں۔"

"میں نے اسے مانگا نہیں کیا۔ میرا اشارہ اس طرف نہیں تھا۔" سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

"مجھے توقع تھی کہ آپ چھپر کو مانگا نہیں کریں گے۔" (کیونکہ اسی کے مستحق تھے اور ایک نہیں دس) اس نے تیل کا آدھا حصہ ضبط کر لیا۔

"دو پیسے آپ کا اشارہ کس طرف تھا؟"

"بے حد قرد زکاس طریقے سے میڈیٹا کی تھی آپ نے میری اور آپ کو ہر اہر طریقے سے ملنے پر بیٹھ

لڑکی سے شادی کر سکوں۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے بھرتس اس شادی پر ضامن ہو جائیں لیکن اگر وہ نہیں ہوتے تو پھر ہمیں اس کی مرضی کے بغیر شادی کرنی ہوگی۔"

"کیا آپ کے بھرتس اس بات پر ضامن ہو جائیں گے؟"

"ہاں، میں انہیں ماناؤں گا۔ وہ میری بات نہیں مانتے۔" جلال نے فخریہ انداز سے کہا۔

☆ ☆ ☆

وہ چیلو کی آواز پر بٹنی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر سالار کھڑا تھا۔ وہ اپنے اسی بے ڈھنگے طبع میں تھا۔ فی ثرٹ کے سارے بدن کھلے ہوئے تھے اور وہ خود بخود کی بیسوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھا۔ ایک لمحہ کے لئے امام کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح کے رد عمل کا اظہار کرے۔

سالار کے ساتھ بیور بھی تھا۔

"آہ، اس لڑکی سے ملتا ہوں جنہیں۔" سالار نے امام کو کتابوں کی دکان پر دیکھا تو قریب چلا آیا۔

بیور نے گردن موڑ کر دیکھا اور جبرانی سے کہا۔ "اس چادر والی ہے؟"

"ہاں۔" سالار نے قدم بڑھائے۔

"یہ کون ہے؟" بیور نے پوچھا۔

"وہیم کی بہن ہے۔" سالار نے کہا۔

"وہیم کی؟ مگر تم اس سے کیوں مل رہے ہو؟ وہیم اور اس کی فیملی تو خاصی کمزور ہیں۔ اس سے مل کر کیا کرو گے؟" بیور نے امام پر دور سے ایک نظر ڈالنے ہوئے کہا۔

"پہلی بار نہیں مل رہا ہوں، پہلے بھی مل چکا ہوں۔ بات کرنے میں کیا حرج ہے؟" سالار نے اس کی بات سنی اس کی کرتے ہوئے کہا۔

امام نے میگزین ہاتھ میں پکڑے پکڑے ایک نظر سالار اور ایک نظر اس کے ساتھ کھڑے لڑکے کو دیکھا جو تقریباً سالار جیسے ہی طبعی تھا۔

"ہاؤ ریو؟" سالار نے اسے اپنی طرف متوجہ کرکے کہا۔

"فائن۔" امام نے میگزین بند کر کے اسے دیکھا۔

"یہ بیور ہے۔ وہ وہیم سے اس کی بھی خاصی دوستی ہے۔" سالار نے تعارف کر لیا۔

امام نے ایک نظر بیور کو دیکھا پھر ہاتھ کے اشارے سے شاہک سینئر کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہیم وہاں ہے۔"

سالار نے گردن موڑ کر اس طرف دیکھا جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا اور پھر کہا۔

"مگر وہیم سے ملنے تو نہیں آئے۔"

"افسوس ناک بات ہے کہ ایک ڈاکٹر کو ایسے معمولی کام نہ آتے ہوں جو کسی بھی عام آدمی کو آتے ہیں۔"

اس بار اس کا انداز پھر نہ بقی اڑانے والا تھا۔

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں، میڈیکل کے ابتدائی سالوں میں ہوں، پہلی بات اور جہاں تک unprofessional ہونے کا تعلق ہے تو اگلی بات، آپ نے تو ابھی اس طرح کی کئی کوششیں کرنی ہیں۔ میں آہستہ آہستہ آپ پر پریکٹس کر کے اپنا ہاتھ صاف کر لوں گی۔"

ایک لمحہ کے لئے وہ کچھ نہیں بول سکا پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔ یوں جیسے وہ اس کی بات پر ہلکھول ہوا تھا مگر شرمندہ نہیں اور اس نے اس کا ہاتھ ابھی کر دیا۔

"اگر آپ مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش....."

"کوشش کر رہی ہیں تو آپ اس میں ناکام ہوں گی۔ میں جانتی ہوں، آپ شرمندہ نہیں ہوتے، یہ صفت صرف انسانوں میں ہوتی ہے۔" امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ کے خیال میں وہ میں کیا ہوں؟" سالار نے اسی انداز میں کہا۔

"پتا نہیں، ایک veal بار سے میں آپ کو زیادہ بہتر گائیڈ کر سکے گا۔" وہ اس بار اس کی بات پر ہنسا۔
 "دو بیروں پر چلنے والے جانور کو ہر میڈیکل ڈسٹری انسان کہتی ہے اور میں دو بیروں پر چلتا ہوں۔"
 "نیچے سے لے کر کتے تک ہر چار بیروں والا جانور دو بیروں پر چل سکتا ہے۔ اگر اسے ضرورت پڑے یا اس کا دل چاہے تو۔"

"مگر میرے چار بیروں ہیں اور میں صرف ضرورت کے وقت نہیں، ہر وقت ہی دو بیروں پر چلتا ہوں۔" سالار نے عجیب سے انداز میں اپنے نظروں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کے چار بیروں نہیں ہیں، اسی لئے میں نے آپ کو veal سے ملنے کو کہا ہے۔ وہ آپ کو آپ کی خصوصیات کے بارے میں صحیح طرح بتائے گا۔"

امامہ نے سر آواز میں کہا۔ وہ اسے زنج کرنے میں واقعی کامیاب ہو چکا تھا۔

"وہ چھٹی اچھی طرح سے آپ جانوروں کے بارے میں جانتی ہیں، آپ ایک بہت اچھی veal ثابت ہو سکتی ہیں۔ آپ کے علم سے خاصا متاثر ہوا ہوں میں۔" امامہ کے چہرے کی سرخی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

"اگر آپ میری veal بن جاتی ہیں تو میں آپ کے بتائے ہوئے مفودے کے مطابق آپ ہی کے پاس آیا کروں گا تاکہ آپ میرے بارے میں ریسرچ کر کے مجھے بتائیں۔"

سالار نے بڑی عجیبی سے کہا۔ وہ اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی، صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سٹ پرست تھا اور ایسے شخص کے ساتھ لمبی گفتگو کرنا آئیل مجھے مار

کے مترادف تھا اور وہ یہ حماقت کر چکی تھی۔

"وہیے آپ کیا فیصلہ چار بج کر رہیں گی؟" وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ وہم آپ کو بتا رہا ہے گا۔" امامہ نے اس بار اسے دھمکانے کی کوشش کی۔

"چلیں ٹھیک ہے، یہ میں وہم سے پوچھ لوں گا۔ اس طرح تو خاصا آسانی ہو جائے گی۔"

وہ اس کی دھمکی کو سمجھنے کے باوجود مرعوب نہیں ہوا اور اس نے امامہ کو یہ جتا بھی دیا۔ تیمور نے ایک بار پھر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"آؤ سالار! چلے ہیں، مجھے ایک ضروری کام یاد آرہا ہے۔" اس نے غلٹ کے عالم میں سالار کو اپنے ساتھ تقریباً پھینکنے کی کوشش کی مگر سالار نے توجہ نہیں دی۔

"چلے ہیں یا اس طرح کچھ تو مت۔" وہ اس سے کہتے ہوئے ایک بار پھر امامہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بہر حال یہ سب مذاق تھا۔ میں واقعی آپ کا شکر یہ ادا کرنے آیا تھا۔ آپ نے اور وہم نے کافی مدد کی میری، گڈ بائے۔"

وہ کہتے ہوئے واپس مڑ گیا۔ امامہ نے بے اختیار ایک سکون کا سانس لیا۔ وہ شخص واقعی کریک تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہم جیسا شخص کیسے اس آدمی کے ساتھ دوستی رکھ سکتا ہے۔

وہ ایک بار پھر میگزین کے ورق اٹھنے لگی۔ "سالار! آیا تھا تمہارے پاس؟" وہم نے اس کے پاس آکر پوچھا۔ دور سے سالار اور تیمور کو دیکھ لیا تھا۔

"ہاں۔" امامہ نے ایک نظر اٹا دیکھا اور ایک بار پھر میگزین دیکھنے لگی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" وہم نے کچھ تجسس سے پوچھا۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تم نے اس ایسے شخص کے ساتھ دوستی کس طرح کر لی ہے۔ میں نے زندگی میں اس سے زیادہ بے ہودہ اور بدترین لڑکا نہیں دیکھا۔" امامہ نے اکڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرا شکریہ ادا کر رہا تھا اور ساتھ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے بیوقوف تک ٹھیک طرح سے کرنی نہیں آتی، نہ میں بلند پیر پیک کر سکتی ہوں۔"

وہم کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ "اس کو فروغ کرو، یہ عقل سے پیدل ہے۔"

"میرا دل تو چاہا، رہا تھا کہ میں اسے دو تھا اور لگاؤں، اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ نہ اٹھا کر اپنے دوست کو لے کر نکلتی گیا ہے یہاں۔" بھئی اس نے کہا ہے تم سے شکر یہ ادا کرنے کو اور مجھے تو وہ

دوسرا لڑکا بھی خاصا برا لگا اور وہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری اس کے ساتھ بھی دوستی ہے۔" امامہ کو اپنا کب یاد آیا۔

"دوستی تو نہیں، بس جان پہچان ہے۔" وہم نے وضاحت پیش کی۔ "تمہیں ایسے لڑکوں کے

ساتھ جان پہچان رکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جلد دیکھا تم نے ان دونوں کا۔ نہ انہیں بات کرنے کی تہیز تھی۔ نہ لباس پہننے کا سلیقہ اور نہ اٹھا کر شکر یہ ادا کرنے آگئے ہیں۔ بہر حال تم اس سے عمل طور پر قطع تعلق کر لو، کوئی ضرورت نہیں ہے اس طرح کے لڑکوں سے جان پہچان کی بھی نہیں۔"

امام نے نیکرین رکھتے ہوئے ایک بار پھر اسے صبیہ کی اور پھر باہر جانے کے لئے قدم بڑھا دیے۔ وہ سیم بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

مگر میں ایک بات پر حیران ہوں یہ جس حالت میں تھا اسے یہ کیسے یاد ہے کہ میں نے اس کی بیڈنچ اچھی نہیں کی تھی یا بلڈ پر بیٹر لینے میں مجھے وقت ہو رہی تھی۔" امام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میں نے سمجھ رہی تھی کہ یہ ایسے ہی تھا پاؤں جھک رہا ہے۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ارد گرد ہونے والی چیزوں کو بھی observe کر رہا ہے۔"

"ویسے بیڈنچ واقعی خراب کی تھی تم نے اور اگر میں تمہاری مدد نہ کرتا تو۔ بلڈ پر بیٹر کی ریڈنگ بھی تمہیں لینا نہیں آئی۔ کم از کم اس بارے میں وہ جو بھی کہہ رہا تھا ٹھیک کہہ رہا تھا۔" وہ سیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مجھے پتا ہے۔" امام نے اعتراف کرنے والے انداز میں کہا۔ "مگر میں اس وقت بہت نروس تھی۔ میں پہلی بار اس طرح کی صورت حال کا شکار ہوئی تھی پھر اس کے ہاتھ سے نکلے والے اخون مجھے اور خوف زدہ کر رہا تھا اور اوپر سے اس کا رویہ۔ کسی خود کشی کرنے والے انسان کو اس طرح کی حرکتیں کرتے نہیں دیکھا تھا میں نے۔"

"اور تم ڈاکٹر بننے جا رہی ہو، وہ بھی ایک قابل اور نامور ڈاکٹر، ناقابل یقین۔" وہ سیم نے تہرہ کیا۔

"اب کم از کم تم اس طرح کی باتیں مت کرو۔" امام نے احتجاج کیا۔ "میں نے اس لئے تمہیں یہ سب نہیں بتایا کہ تم مذاقی آؤ۔ وہ لوگ پارکنگ ایریا میں کھینچ گئے تھے۔"

☆ ☆ ☆

کچھ دنوں سے وہ جلال اور زینب کے رویے میں عجیب سی تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں اس سے بہت آکھڑے آکھڑے رہنے لگے تھے۔ ایک عجیب سا تناؤ تھا، جو وہ اپنے اور ان کے درمیان محسوس کر رہی تھی۔

اس نے ایک دو بار جلال کو ہاسٹل فون کیا، مگر ہر بار اسے یہی جواب ملا کہ وہ مصروف ہے۔ وہ زینب کو اگر کالج سے لینے بھی آتا تو پہلے کی طرح اس سے نہیں ملا تھا اور اگر ملا بھی تو صرف رسمی سی ملک سلیک کے بعد واپس چلا جاتا۔ وہ شروع میں اس تبدیلی کو اپنا وہم سمجھتی رہی مگر پھر یاد پریشان ہونے پر وہ ایک دن جلال کے ہاسٹل چلی آئی۔

جلال کا رویہ بے حد سرد تھا۔ امام کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہیں آئی تھی۔

"کافی دن ہو گئے تھے ہمیں ملے ہوئے، اس لئے میں خود چلی آئی۔" امام نے اپنے سارے اندیشوں کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میری تو شفت شروع ہو رہی ہے۔"

امام نے زینب سے اسے دیکھا۔ "زیب بتا رہی تھی کہ اس وقت آپ کی شفت ختم ہوتی ہے، میں اسی لئے اس وقت آئی ہوں۔"

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "ہاں صحیح ہے مگر آج میری کوئی اور مصروفیت ہے۔" وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ "جلال آپ کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں؟" ایک لمحہ کے لئے اسے کوفت کے بعد اس نے کہا۔

"نہیں، میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔" جلال نے اسی زکائی سے کہا۔

"کیا آپ دس منٹ باہر آکر میری بات سن سکتے ہیں؟"

جلال کچھ دیر سے دیکھا رہا پھر اس نے اپنا اور آل اپنے بازو پر ڈال لیا اور کچھ کبے بغیر کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر آتی ہی جلال نے اپنی دست و پاؤں پر ایک نظر دوڑائی۔ یہ شاید اس کے لئے بات شروع کرنے کا اشارہ تھا۔ "آپ میرے ساتھ اس طرح مس بی بیو کیوں کر رہے ہیں؟"

"کیا میں بی بیو کر رہا ہوں؟" جلال نے آکھڑا انداز میں کہا۔

"آپ بہت دنوں سے مجھے آنکھوں پر رہے ہیں۔"

"ہاں، کر رہا ہوں۔"

امام کو توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی صفائی سے اس بات کا اعتراف کر لے گا۔

"کیونکہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔" وہ کچھ لمحوں کے لئے کچھ نہیں بول سکی۔ "کیوں؟"

"یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔" اس نے اسی طرح آکھڑا انداز میں کہا۔

"میں جانتا جا رہی ہوں کہ آپ کا رویہ یک دم کیوں تبدیل ہو گیا ہے۔" کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی اس کی۔ "امام نے کہا۔

"ہاں وجہ ہے مگر میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح تم بہت سی باتیں مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھتیں۔"

"ہیں؟" وہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔ "میں نے تو سن لی کہ آپ کو نہیں بتائیں؟"

"یہ کہ تم مسلمان نہیں ہو۔" جلال نے بڑے سنجیدگی سے کہا۔ امام سانس تک نہیں لے سکی۔

"کیا آپ اپنے جراثیم کی مرضی کے بغیر مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟" کچھ دیر بعد امام نے کہا۔
 "یہ بہت بڑا قدم ہو گا۔" جلال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور بالفرض میں یہ کام کرنے کا
 سوچ لوں تو مجھے نہیں ہو سکتا۔ تمہاری طرح میں بھی اپنے جراثیم پر ڈیپنڈنٹ ہوں۔" جلال نے اپنی
 مجبوری بتائی۔

"مگر آپ ہاؤس چاہ کر رہے ہیں اور چند سالوں میں اسٹبلشمنٹ ہو جائیں گے۔" امام نے کہا۔
 "میں ہاؤس چاہ کے بعد اسٹبلشمنٹ نہیں کے لئے جاؤں گا چاہتا ہوں اور یہ میرے پیشہ کی مالی
 مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسٹبلشمنٹ نہیں کے بعد ہی میں واپس آکر اپنی پرنٹس اسٹبلشمنٹ کر سکتا ہوں اور
 تین چار سال اپنی انڈر پرنٹنگ میں بھی لگ جائیں گے۔"
 جلال نے سے یاد دلایا۔

"پھر؟" امام نے اسے مایوسی سے دیکھا۔

"پھر یہ کہ مجھے سوچنے کا وقت دو۔ شاید میں کوئی رستہ نکال سکوں، میں تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتا
 مگر میں اپنا تیر میر بھی خراب نہیں کر سکتا۔ میرا پر اہم صرف یہ ہے کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو کچھ
 ہے ماں باپ کا ہے اور وہ اپنی ساری جمع پونجی مجھ پر خرچ کر رہے ہیں یہ سوچ کر کہ میں کل کو ان کے لئے
 کچھ کروں گا۔"

وہ بات کرتے کرتے رکا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمہارے والدین اپنی مرضی سے تمہاری شادی
 مجھ سے کر دیں۔ اس صورت میں کم از کم میرے والدین کو یہ اعتراض تو نہیں ہو گا کہ تم نے اپنے والدین
 کی مرضی کے خلاف انہیں تائے بغیر مجھ سے شادی کی ہے؟"
 وہ جلال کا چہرہ دیکھنے لگی۔ "میں نہیں جانتی۔۔۔ ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔
 وہ میری بات مانیں گے یا نہیں۔ میں۔۔۔ امام نے کچھ مایوسی کے عالم میں بات اور حوری چھوڑ دی۔
 جلال بات مکمل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

"میری فیملی میں آج تک کسی لڑکی نے اپنی مرضی سے باہر کسی لڑکے سے شادی نہیں کی۔ اس لئے
 میں یہ نہیں بتا سکتی کہ ان کا رد عمل کیا ہو گا مگر میں یہ ضرور بتا سکتی ہوں کہ ان کا رد عمل بہت برا ہو گا۔
 بہت برا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن مجھے یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ میں اتنا بڑا قدم اٹھاؤں۔
 آپ کو اتنا اذہ ہو نا چاہیے کہ میرے باپا کو کتنی شرمندگی اور بے عزتی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صرف میرے
 لئے تو وہ سب کچھ نہیں بدل دیا گے۔
 "اگر مجھے اپنی فیملی سے مدد کی توقع ہوتی تو میں گھر سے باہر سہاراؤں کی تلاش میں ہوتی۔ نہ ہی
 آپ سے اس طرح مدد مانگ رہی ہوتی۔"

مجھے لیجئے میں اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے اس نے جلال سے کہا۔

"امام! میں تمہاری مدد کروں گا۔۔۔ میرے جراثیم میری بات نہیں ٹالیں گے۔ سمجھاتے ہیں
 کچھ وقت گئے گا مگر میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں انہیں مٹاؤں گا۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ مجھے تمہاری مدد
 کرنی چاہئے۔"

وہ پھر سوچ مگر کچھ اُلجھے ہوئے انداز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ امام کو عجیب سی ڈھارس ہوئی۔ اسے
 جلال سے یہی توقع تھی۔

امام نے سوچا۔ "میرا انتخاب غلط نہیں ہے۔"

☆.....☆.....☆

”لھیک ہے میں تمہاری بات ان تک پہنچا دوں گی مگر بھر ہے تم اس سلسلے میں خود بابا سے بات کرو۔“ بھابھی نے اسے مشورہ دیا۔

بھابھی کے کمرے سے جانے کے بعد بھی وہ کچھ پریشانی سے وہیں بیٹھی رہی۔ یہ اطلاع اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ اس کے جیروں کے نیچے سے محاورے ناخوش حقیقتاً زمین کھل گئی تھی۔ وہ مطمئن تھی کہ اس کی ہاؤس جاب تک اس کی شادی کا مسئلہ زیر بحث نہیں آئے گا اور ہاؤس جاب کرنے کے بعد وہ اس قافلہ ہو جائے گی کہ خود کو سپرد کر سکے یا اپنی جہال سے شادی کے بارے میں فیصلہ کر سکے۔ جب تک جہال بھی اپنی ہاؤس جاب مکمل کر کے سیٹ ہو جاتا اور ان دونوں کے لئے کسی قسم کا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہو تا مگر اب اچانک اس کے گھر والے اس کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ آخر کیوں؟

”نہیں اسجد اور اس کے گھر والوں نے مجھ سے اس طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ میں نے خود ان سے بات کی ہے۔“

اس رات وہ ہاشم مبین کے کمرے میں موجود تھی۔ اس کے انتظار پر ہاشم مبین نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔

”بات بھی کرتی ہے؟ بابا! آپ مجھ سے پوچھتے بغیر کس طرح میری شادی ارچ کر سکتے ہیں۔“ امام نے بے یقینی سے کہا۔

ہاشم مبین نے کچھ سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”یہ نسبت تمہاری مرضی سے ہی ملے ہوئی تھی۔ تم سے پوچھا گیا تھا۔“ انہوں نے جیسے اسے یاد دلائی کروائی۔

”مفتی کی بات اور تھی۔ شادی کی بات اور ہے۔۔۔۔۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ہاؤس جاب سے پہلے آپ میری شادی نہیں کریں گے۔“ امام نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔

”جہیں اس شادی پر اعتراض کیوں ہے۔ کیا تم اسجد کو پسند نہیں کرتیں؟“

”بات پسند یا پسند کی نہیں ہے۔ اپنی تعلیم کے دوران میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ ابھی طرح جانتے ہیں کہ میں آئی اے سیٹلسٹ بننا چاہتی ہوں۔ اس طرح آپ میری شادی کر دیں گے تو میرے تو سارے خواب ادھر سے رہ جائیں گے۔“

”بہت سی لڑکیاں شادی کے بعد تعلیم مکمل کرتی ہیں۔ تم اپنی فیملی میں دیکھو۔۔۔ سستی۔“ ہاشم مبین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

امام نے ان کی بات کاٹی۔ ”وہ لڑکیاں بہت ذہین اور قائل ہوئی ہوں گی۔ میں نہیں ہوں۔ میں ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتی ہوں۔“

”میں اعظم بھائی سے بات کر چکا ہوں، وہ تو تاریخ طے کرنے کے لئے آنے والے ہیں۔“ ہاشم

باب ۳

”بیر امتحانہ تجویز اسجد کے علاوہ کسی دوسرے کی ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے احساس نہیں ہے کہ ابھی میں پڑھ رہی ہوں۔“ امام نے اپنی بھابھی سے کہا۔

”نہیں اسجد نے یا اس کے گھر والوں نے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ بابا خود تمہاری شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔“ امام کی بھابھی نے رسانیت سے جواب دیا۔

”بابا نے کہا ہے؟“ مجھے یقین نہیں آرہا۔ جب میں نے میڈیکل میں ایڈمیشن لیا تھا اب ان کا دور دور تک ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ تو اگلے اعظم سے بھی یہی کہتے تھے کہ وہ میرے ہاؤس جاب کے بعد ہی میری شادی کریں گے۔ پھر اب اچانک کیا ہوا؟“ امام نے بے یقینی سے کہا۔

”کوئی دباؤ ہو گا مگر مجھے تو امی نے سب بتایا تھا کہ یہ خود بابا کی خواہش ہے۔“ بھابھی نے کہا۔

”آپ انہیں بتادیں کہ مجھے ہاؤس جاب سے پہلے شادی نہیں کرنی۔“

ان کے دماغ میں جو واحد صل آیا تھا وہ اس کی شادی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی شادی کر دینے سے کم از کم وہ خود امام کی ذمہ داری سے مکمل طور پر آزاد ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس طرح اچانک اس کی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”جلال! میرے چیرٹس امجد سے میری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔“ لاہور آنے کے بعد امام نے سب سے پہلے جلال سے ملاقات کی تھی۔

”مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہ تمہاری باؤس جاب تک تمہاری شادی نہیں کریں گے۔“ جلال نے کہا۔
”وہ ایسا ہی کہتے تھے، مگر اب وہ کہتے ہیں کہ میں اپنی تعلیم شادی کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہوں۔“
امجد لاہور میں گھر لے گا تو میں زیادہ آسانی سے اپنی تعلیم مکمل کر سوں گی۔“

جلال اس کے چہرے سے اس کی پریشانی کا اندازہ کر سکتا تھا۔ جلال بھی ایک دم فکر مند ہو گیا۔
”جلال! میں امجد سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں کسی صورت امجد سے شادی نہیں کر سکتی۔“ وہ بڑبڑائی۔
”پھر تم اپنے چیرٹس کو صاف صاف بتا دو۔“ جلال نے ایک دم کسی فیصلے پر پہنچنے ہوئے کہا۔

”کیا بتاؤں؟“

”یہی کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ وہ کس طرح راز ایکٹ کریں گے۔۔۔۔۔ مجھے انہیں بھر سب کچھ ہی بتانا پڑے گا۔“ وہ بات کرتے کرتے کچھ سوچنے لگی۔

”جلال! آپ اپنے چیرٹس سے میرے سلسلے میں بات کریں۔ آپ انہیں میرے بارے میں بتائیں۔ اگر میرے چیرٹس نے مجھ پر اور دباؤ ڈالا تو پھر مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا، پھر مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔“

”امام! میں اپنے چیرٹس سے بات کروں گا۔ دور ضامنہ ہو جائیں گے۔ میں جانتا ہوں میں انہیں مناسکتا ہوں۔“ جلال نے اسے یقین دلایا چوری گفتگو کے دوران پہلی بار امام کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

اگلے چند ہفتے دو اپنے پیچھے رکے سلسلے میں مصروف رہی، جلال سے بات نہ ہو سکی۔ آخری ہیچہ والے دن وہ سہ ماہی لے کر لاہور آیا تھا۔ وہ اسے وہاں بول دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”وسیم! میں ابھی تو نہیں جا سکتی۔ آج تو میں پیچھے سے فارغ ہوئی ہوں مجھے ابھی یہاں کچھ کام ہیں۔“
”میں کل تک یہیں ہوں۔ اپنے دوست کے ہاں ٹھہر جاتا ہوں جب تک کہ اپنے کام نہ خالو پھر آکھٹے چلیں گے۔“ وسیم نے اس کے لئے عافیت کا آخری راستہ بھی بند کر دیا۔

”میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ امام نے کچھ بے دلی سے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ وسیم اسے ساتھ لے کر ہی جائے گا۔

”تم اپنی چیزیں پیک کر لو۔ اب تم ساری چٹیاں وہاں گزار کر ہی آنا۔“ اسے واپس مڑتے دیکھ کر وسیم نے کہا۔

اس نے سر ہلادیا مگر اس کا اپنی تمام چیزیں پیک کرنے یا اسلام آباد میں ساری چٹیاں گزارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے یہ کیا تھا کہ وہ چند دن وہاں گزار کر کسی نہ کسی بہانے سے واپس لاہور آ جائے گی اور یہی اس کی غلط فہمی تھی۔

رات کے کھانے پر وہ سب گھر والوں کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی اور سب خوش گیہوں میں مصروف تھے۔

”بیچہ کیسے ہوئے تمہارے؟“ ہاشم مبین نے کھانا کھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”بہت اچھے ہوئے۔ بیٹھی کی طرح۔“ اس نے چاول کا گچھ منہ سے ڈالتے ہوئے کہا۔

”ویری گنڈ۔ چلو کم از کم بیچہ کی فلیشن تو ختم ہوئی۔ اب تم کل سے اپنی ٹاپنگ شروع کر دو۔“

امام نے حیراتی سے انہیں دیکھا۔ ”ٹاپنگ؟“ ”کیسی ٹاپنگ؟“

”فرنیچر کی اور جیولری کے پاس پہلے چلے جانا تم لوگ۔ باقی چیزیں تو آہستہ آہستہ ہوتی رہیں گی۔“

ہاشم مبین نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس بار اپنی بیوی سے کہا۔

”بابا! مکرس لے؟“ ”امام نے ایک بار پھر پوچھا۔ ”تمہاری امی نے بتایا نہیں تھیں کہ ہم نے

تمہاری شادی کی تاریخ طے کر دی ہے۔“

امام کے ہاتھ سے گچھ چھوٹ کر پلیٹ میں جاگرا۔ ایک لمحہ میں اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔
”میری شادی کی تاریخ؟“ اس نے بے یقینی سے باری باری سسلی اور ہاشم کو دیکھا جو اس کے

تاثرات پر حیران نظر آ رہے تھے۔

”ہاں تمہاری شادی کی تاریخ۔۔۔۔۔“ ہاشم مبین نے کہا۔

”یہ آپ کیسے کر سکتے ہیں؟ مجھ سے پوچھنا بغیر۔ مجھے بتائے بغیر۔“ ہوش چہرے کے ساتھ انہیں

دیکھ رہی تھی۔

”تم سے کبھی دفعہ بات ہوئی تھی، اس سلسلے میں۔“ ہاشم مبین ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

”اور میں نے انکار کر دیا تھا۔ میں۔“

ہاشم مبین نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ ”میں نے تمہیں بتادیا تھا کہ مجھے تمہارے انکار کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں امجد کے گھر والوں سے بات کر چکا ہوں۔“ ہاشم مبین نے حیر آواز میں کہا۔

ڈانٹنگ ٹینل پر ایک دم گہری خاموشی چھا گئی تھی کوئی بھی کلمہ نہیں کھا رہا تھا۔

امام یک دم اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ ”آئی ایم سوری بابا، مگر میں امجد سے ابھی شادی نہیں کر

سکتی۔ آپ نے یہ شادی ٹھکے کی ہے۔ آپ ان سے بات کر کے اسے ملتی کر دیں۔ ورنہ میں خود ان سے بات کر لوں گی۔" ہاشم مبین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تم اس حد سے شادی کر دو گی اور اسی طرح جو جو میں نے ٹھکے کی ہے۔ تم نے سنا؟" وہ بے اختیار چلائے۔
 "It's not fair" امامہ نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔
 "تم اب مجھے یہ بتاؤ گی کیا فیصلہ ہے اور کیا نہیں۔ تم بتاؤ گی مجھے؟" ہاشم مبین کو اس کی بات پر اور غصہ آیا۔

"ہا! اب میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی تو آپ زبردستی کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ۔" امامہ بے اختیار رو رہے تھی۔

"گر رہا ہوں زبردستی پھر میں حق رکھتا ہوں۔" وہ چلائے۔ امامہ اس بار کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ پیچھے ہوتے سرخ چہرے کے ساتھ تیزی سے ڈانٹک روم سے نکل گئی۔

"میں اس سے بات کرتی ہوں، آپ پلیز کھانا کھائیں۔" اننا غصہ نہ کریں۔ وہ چننا بی ہے اور کچھ نہیں۔" مطلق نے ہاشم مبین سے کہا اور خود وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے کمرے سے نکلے ہی وہم کو کچھ کر امامہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔
 "تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ نکل جاؤ۔" اس نے تیزی سے وہم کے پاس جا کر اسے دھکا دینے کی

کوشش کی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"جھوٹ بول کر اور دھوکا دے کر تم مجھے یہاں لے کر آئے ہو۔ مجھے اگر لہو ر میں پتہ چل جاتا کہ تم اس لئے مجھے اسلام آباد لا رہے ہو تو میں کبھی یہاں نہ آتی۔" وہ حارثی۔

"میں نے وہی کیا جو مجھ سے پاپا نے کہا۔ پاپا نے کہا تھا میں تمہیں نہ بتاؤں۔" وہم نے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی۔

"پھر تم یہاں میرے پاس کیوں آئے ہو۔ پاپا کے پاس جاؤ۔ ان کے پاس بیٹھو۔ بس یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" وہم ہونٹ پیچھے اسے دیکھتا ہوا کچھ کہنے لگا۔

امامہ اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے بیروں کے بیچے سے صبح معنوں میں زمین لٹل چلی تھی۔ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر والے اس کے ساتھ اس طرح

کر سکتے ہیں۔ وہ اسے قدامت پرست یا کمزور نہیں سمجھتے تھے وہ اس وقت ہو گئے تھے۔ اسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اس صورت حال کا سامنا کرنا ہے۔ مجھے ہمت نہیں رہانی۔ مجھے کسی نہ کسی طرح فوری طور پر حلال سے کام لیت کرنا ہے۔ وہ یقیناً اب تک

اپنے جیٹس سے بات کر چکا ہو گا۔ اس سے بات کر کے کوئی راز نہ نکل آئے گا۔
 وہ بے پٹائی سے کمرے میں بیٹھنے ہوئے سوچتی رہی۔ اس کے کمرے میں دوبارہ کوئی نہیں آیا۔

رات بارہ بجے کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلے۔ وہ جانتی تھی۔ اس وقت تک سب سونے کے لئے جا چکے ہوں گے۔ اس نے حلال کے گھر کا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ فون کسی نے نہیں اٹھایا۔ اس نے

بیکے بعد دیکھ کر کئی بار نمبر ملا۔ آدھ گھنٹہ تک اسی طرح کال کر دے رہے کہ بعد اس نے مایوسی کے ساتھ فون رکھ دیا۔ وہ جیڑیہ یاد رہے کہ فون نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دونوں اس وقت ہاسٹل میں تھیں۔ کچھ

دیر سوچنے رہنے کے بعد اس نے صیغہ کا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے والد نے فون اٹھایا تھا۔
 "بیٹا! صیغہ تو پشاور کی ہے اپنی امانی کے ساتھ۔" صیغہ کے والد نے امامہ کو بتایا۔

"پشاور؟" امامہ کے دل کی دھڑکن رک گئی۔
 "اس کے کزن کی شادی ہے، وہ لوگ ڈرا پیبل جیلے گئے ہیں۔ میں بھی کھل چلا جاؤں گا۔" اس کے

والد نے بتایا۔ "کوئی پیغام ہو تو آپ مجھے دے دیں میں صیغہ کو پتہ چلاؤں گا۔"
 "نہیں شکریہ اٹھیں!" وہ ان کے ساتھ اس سارے معاملے کے بارے میں کیا بات کر سکتی تھی۔

اس نے فون رکھ دیا۔ اس کے ذہن میں اسلاف ہونے لگا تھا۔ اگر میرا حلال سے کام لیتا نہ ہو تو اس کا دل ایک بار پھر ڈوبنے لگا۔

ایک بار پھر اس نے حلال کا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا اور کب ہی کسی نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ وہ سن ہو گئی ہاشم مبین اس کے پیچھے کھڑے تھے۔

"کس کو فون کر رہی ہو؟" ان کے لہجے میں بے حد غصہ تھا۔
 "دوست کو کر رہی تھی۔" امامہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ ان سے نظریں ملا کر جھوٹ

نہیں بول سکتی تھی۔
 "میں ملا دیتا ہوں۔" انہوں نے سرد آواز میں کہتے ہوئے ری ڈائل کا بٹن دبا دیا اور ریسیور کان

سے لگا لیا۔ امامہ زبردچرے کے ساتھ انہیں دیکھنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک اسی طرح ریسیور کان سے لگائے کھڑے رہے پھر انہوں نے ریسیور کر بیڈ پر رکھ دیا۔ یقیناً دوسری طرف سے کال ریسیور نہیں کی گئی تھی۔

"کون سی دوست ہے یہ تمہاری جس کو تم اس وقت فون کر رہی ہو۔" انہوں نے درشت لہجے میں امامہ سے پوچھا۔

"زنسب۔۔۔۔۔۔" فون کی اسکرین پر زنسب کا نمبر تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ ہاشم مبین کو زنسب پر کسی قسم کا شک ہو اور وہ حلال تک جا پہنچیں، اس لئے اس نے ان کے استدلال پر جلدی سے اس کا نام بتا دیا۔

"کس لئے کر رہی ہو؟"

"میں اس کے ذریعے جویر تک ایک پیغام پہنچانا چاہتی ہوں۔" اس نے قہقہے سے کہا۔
 "تم مجھے وہ پیغام دے دو، میں جویر تک پہنچا دوں گا، بلکہ ذاتی طور پر خود لاہور دے کر آؤں گا۔"
 امام! مجھے صاف صاف بتاؤ کسی اور لڑکے میں انٹرنل ہو تم؟" انہوں نے کسی حثیت کے بغیر
 اچانک اس سے پوچھا۔ وہ انہیں کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔
 "ہاں!"

باشم تبین دم بخود رہ گئے۔ "کسی اور لڑکے میں انٹرنل ہو؟" انہوں نے بے یقینی سے اپنا جملہ
 دہرایا۔ امام نے پھر اذیت میں سر ہلا دیا۔ باشم تبین نے سبہ اختیار اس کے چہرے پر تجھیر کھینچ مارا۔
 "مجھے اسی بات کا اندیشہ تھا تم سے، مجھے اسی بات کا اندیشہ تھا۔" وہ غصے میں تنکے سے گئے۔ امام
 گھم گھم اپنے گال پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ پہلا تجھیر تھا جو باشم تبین نے اس کی زندگی میں اسے
 مارا تھا اور امام کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ تجھیر اسے مارا گیا تھا۔ وہ باشم تبین کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی پھر
 بھی انہوں نے اس کے گالوں پر آنسو بہا دیے تھے۔

"اسجد کے علاوہ میں تمہاری شادی نہیں اور نہیں ہونے دوں گا۔ تم اگر کسی اور لڑکے میں انٹرنل
 ہو بھی تو اسے ابھی اور اسی وقت بھول جاؤ۔ میں کسی..... کبھی..... کبھی تمہاری نہیں اور شادی نہیں ہونے
 دوں گا۔ اپنے کمرے میں چل جاؤ۔ اور دوبارہ اگر میں نے تمہیں فون کے پاس بھی دیکھا تو میں
 تمہاری ناخنیں توڑ دوں گا۔"

وہ اسی طرح گال پر ہاتھ رکھے، بیانیگی انداز میں چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنے کمرے
 میں آ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "میا بھائی مجھے..... مجھے اس طرح مار سکتے ہیں؟"
 اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہت دیر تک اسی طرح روتے رہنے کے بعد اس کے آنسو خود بخود ٹنک ہونے
 لگے۔ وہ اٹھ کر اضطراب کے عالم میں اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف آ گئی اور غالی الذہنی کے عالم میں بند
 کھڑکیوں کے پیشوں سے باہر دیکھنے لگی۔

بیٹھے اس کے گھر کا لان نظر آ رہا تھا جو نیم چاندی کے قہاور پھر لا شعوری طور پر اس کی نظر دوسرے
 گھر پر پڑی۔ وہ سالار کا گھر تھا۔ اس کا گھر چوٹی منزل پر تھا۔ دور سے کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے
 باوجود وہ اس گھر میں ایک دفعہ جانے کے بعد اس کی لوکیشن اور کمرے میں پھرنے والے کے طبع اور
 جسامت سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ سالار کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک جھلمکا ہوا۔

"ہاں! ایسے شخص میری مدد کر سکتا ہے۔ اگر میں اسے ساری صورت حال بتاؤں اور اس سے کہوں کہ
 لاہور جا کر جلال سے رابطہ کرے تو..... تو میرا مسئلہ حل ہو سکتا ہے مگر اس سے رابطہ کیسے؟.....؟"

اس کے ذہن میں یک دم اس کی گاڑی کے پچھلے حصے پر لکھا ہوا اس کا موبائل نمبر اور نام یاد آیا۔
 اس نے ذہن میں موبائل نمبر کو دہرایا، اسے کوئی وقت نہیں ہوئی۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا کھولنے کے بعد اس نے احتیاط
 کے طور پر اس نمبر کو لکھ لیا۔ تین بجے کے قریب وہ آہستہ آہستہ ایک بار پھر لاؤنج میں آ گئی اور اس نے
 وہ نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔

☆.....☆.....☆

سالار نے تیند میں اپنے موبائل کی صیغہ سنی تھی۔ جب لگا جا رہا تھا موبائل بچتا رہا تو اس نے آنکھیں
 کھول دیں اور قدرے ناگوار کی کے عالم میں بیڈ سائیڈ ٹیبل کو ٹوٹنے سے موبائل اٹھایا۔
 "ہیلو! امام! سالار کی آواز پہچان لی تھی وہ فوری طور پر کچھ نہیں بول سکی۔
 "ہیلو۔" اس کی خواہیدہ آواز دوبارہ سنائی دی۔ "سالار! اس نے اس کا نام لیا۔
 "بول رہا ہوں۔" اس نے اسی خواہیدہ آواز میں کہا۔

"میں امام بول رہی ہوں۔" وہ کہنے والا تھا۔ "کون امام..... میں کسی امام کو نہیں جانتی۔" مگر اس
 کے دماغ نے کرنت کی طرح اسے سنگل دیا تھا اس نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ وہ نام کے ساتھ
 اس آواز کو بھی پہچان چکا تھا۔

"میں وہم کی بہن بول رہی ہوں۔" اس کی خاموشی پر امام نے اپنا تعارف کرایا۔
 "میں پہچان چکا ہوں۔" سالار نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ سائیڈ لپ کو آن کر دیا۔ اس کی تیند غائب ہو
 چکی تھی۔ ٹیبل پر پڑی ہوئی اپنی رست واپس آٹھا کر وقت دیکھا۔ گھڑی تین بج کر دس منٹ بھا رہی تھی۔
 اس نے قدرے بے یقینی سے ہونٹ سکڑتے ہوئے گھڑی کو دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ دوسری طرف اپ
 خاموشی تھی۔

"ہیلو! سالار نے اسے مخاطب کیا۔

"سالار! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" سالار کے ماتھے پر کچھ بل آئے۔ "میں نے ایک بار
 تمہاری زندگی بچائی تھی، میں اب چاہتی ہوں تم میری زندگی بچاؤ۔" وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی
 بات سن رہا تھا۔ "میں لاہور میں کسی سے رابطہ کرنا چاہتی ہوں مگر کہ نہیں پائی۔"

"کیوں؟"

"وہاں سے کوئی فون نہیں آٹھا رہا۔"

"تمہارے اس وقت....."

امام نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پلیز! اس وقت صرف میری بات سنو، میں دن کے وقت فون
 نہیں کر سکتی اور شاید کل رات کو بھی نہ کر سکوں۔ میرے گھر والے مجھے فون نہیں کرنے دیں گے، میں

چاہتی ہوں کہ تم ایک ایڈریس اور فون نمبر نوٹ کر لو اور اس پر ایک آدمی سے کاٹیکٹ کرو، اس کا نام جلال اصر ہے، تم اس سے صرف یہ پوچھ کر بتادو کہ کیا اس نے اپنے پرنس سے بات کی ہے اور اگر کی ہے تو ان کا کیا راسخاں ہے، اسے یہ بھی بتادو کہ میرے پرنس نے یہاں میری شادی طے کر دی ہے اور وہ مجھے اب شادی کے بغیر بلا ہو کر آنے نہیں دیں گے۔

سالار کو اچانک اس سارے معاملے سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ کبیل کو اپنے گھٹوں سے اوپر تک کھینچے ہوئے وہ امام کی بات سن رہا تھا۔ وہ ایک ایڈریس اور فون نمبر دہرا رہی تھی۔ سالار نے اس نمبر اور ایڈریس کو نوٹ نہیں کیا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس نے پوچھا۔
"اور اگر میرے فون کرنے پر ابھی کسی نے فون نہیں اٹھایا تو؟" جب وہ خاموش ہو گئی تو اس نے پوچھا۔

دوسری طرف لمبی خاموشی رہی پھر امام نے کہا۔ "تم لاہور جا کر اس آدمی سے مل سکتے ہو۔"
پلیز۔ یہ میرے لئے بہت ضروری ہے۔" اس بار امام کی آواز ملجائی تھی۔

"اور اگر اس نے پوچھا کہ میں کون ہوں تو؟"
"تم جو چاہے اسے بتا دینا۔ مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف اس مصیبت سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم اس آدمی سے خود بات کرو۔" سالار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ شاید مجھے وہ بارہ فون کا موقع ملے اور فی الحال تو آدمی فون ریسرو نہیں کر رہا۔"

سالار نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اس نے مایوسی کے عالم میں مزید کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا۔

سالار سو بائبل بند کرنے کے بعد کچھ دیر اسے ہاتھ میں لے کر بیٹھا رہا۔ جلال اصر۔ امام ہاشم۔ ایڈریس۔ پرنس سے بات۔ زبردستی کی شادی۔ "اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے اس جگہ پزل کے ٹکڑوں کو جوڑنا شروع کر دیا۔ اس نے امام سے جلال کے بارے میں پوچھا نہیں تھا مگر وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے امام کا تعلق کس طرح کا ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی ذاتی ٹانگ جانتے ہوئے ان دونوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے یہ صورت حال غامض دلچسپ محسوس ہو رہی تھی کہ امام بھی لڑکی اس طرح کے کسی انفرمیشن انواؤ ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے لئے اس کی ٹاپنڈی کی ہے بھی واقف تھا اور اسے یہ بات بھی تھی کہ ان کر رہی تھی کہ اس کے باوجود وہ اس سے مدد مانگ رہی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہیں خاتون؟ مجھے استعمال کرنے کی کوشش۔ یا پھانسی کی کوشش۔؟"

اس نے دلچسپی سے سوچا۔

کبیل اپنے بیٹے تک کھینچے ہوئے آکھیں بند کر لیں، مگر نیند اس کی آنکھوں سے کھلے طور پر دور تھی۔ وہ کھینچے گئی سالوں سے دسم اور اس کے سارے گھروالوں کو جانتا تھا۔ وہ امام کو بھی سرسری طور پر دیکھ چکا تھا۔ مگر ان ملاقاتوں میں اس نے امام پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کے اپنے گھروالوں کے برعکس دسم کا گھرانہ خاصا روایت پرست تھا اور وہ کبھی بھی اس طرح کھلے عام ان کے گھر نہیں جاتا تھا۔ جس طرح وہ اپنے دوسرے دوستوں کے گھروں میں جاتا تھا۔ مگر اس نے اس بات پر بھی کبھی زیادہ غور و خوض نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر خاندان کا اپنا ماحول اور روایات ہوتی ہیں، اسی طرح دسم کے خاندان کی بھی اپنی روایات تھیں۔ اسے امام کے موڈ اور نمبر دسم کا تھوڑا اندازہ تھا۔

مگر اس طرح اچانک امام کی کال وصول کر کے وہ اس حیرت کے جھٹکے سے سنبھل نہیں پا رہا تھا جو اسے لگا تھا۔

جب وہ کافی دیر تک سوئے میں کامیاب نہیں ہوا تو وہ کچھ جھنجھکا گیا۔

To hell with Imama and all the rest (بھڑا بیٹا جانے امام اور یہ سارا قصہ) وہ بڑبڑایا اور کرٹ لے کر اس نے تکیے اپنے چہرے کے اوپر رکھ لیا۔

☆.....☆.....☆

امام اپنے کمرے میں آکر بھی اسی طرح غمگین رہی، اسے اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ صرف چند گھنٹوں میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ پوری رات سو نہیں سکی۔ صبح دو تھک کے لئے باہر آئی، اس کی بوبک یک دم جیسے غائب ہو گئی تھی۔

دس سال سے دسم کے قریب اس نے پورے دن کچھ گاڑیوں کے اشارت ہوئے اور جانے کی آوازیں سنیں۔ وہ جانتی تھی اس وقت ہاشم تین اور اس کے بڑے بھائی آفس چلے جاتے تھے اور اسے ان کے آفس جانے کا انتظار تھا۔ ان کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر آئی۔ لاؤنج میں اس کی ادنی ادنی بھابھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے فون کے پاس چلی گئی۔ اس نے فون کارڈیو پر اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا تھا کہ اسے اپنی ہی کی آواز سنائی دی۔

"تمہارے بابا کہہ کرے ہیں کہ تم کہیں فون نہیں کر گئی۔" اس نے گردن موڑ کر اپنی ہی کو دیکھا۔

"میں اسجد کو فون کر رہی ہوں۔"

"کس لئے؟"

"میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہی فضول باتیں جو تم رات کو کر رہی تھیں۔" سلمیٰ نے تیز لہجے میں کہا۔

"میں آپ کے سامنے بات کر رہی ہوں، آپ مجھے بات کرنے دیں۔" اگر میں نے کوئی غلط بات کی تو آپ فون بند کر سکتی ہیں۔" اس نے پرسکون انداز میں کہا اور شاید یہ اس کا انداز ہی تھا جس نے سلمیٰ کو کچھ مطمئن کر دیا۔

امامہ نے فہرہ اکل کیا مگر وہ اسجد کو فون نہیں کر رہی تھی۔ چند پارٹیل بیچنے کے بعد دوسری طرف فون اٹھا لیا گیا۔ فون اٹھانے والا جلال ہی تھا۔ خوشی کی ایک لہر امامہ کے اندر سے گزرتی۔

"ہیلو، میں امامہ یوں کر رہی ہوں۔" اس نے جلال کا نام لے کر بغیر احاطہ سے کہا۔

"تم بتائے بغیر اسلام آباد کیوں چلی گئیں میں کل تم سے ملے ہاٹل گیا تھا۔" جلال نے کہا۔

"میں کل اسلام آباد آئی ہوں اسجد! امامہ نے کہا۔

"اسجد! دوسری طرف سے جلال کی آواز آئی۔" تم کس سے کہہ رہی ہو؟"

"مجھے بابائے رات ہی بتایا کہ میری شادی کی تاریخ ملے ہو گئی ہے۔"

"امامہ؟" جلال کو پیسے ایک کرنت لگا۔ "شادی کی تاریخ۔" امامہ اس کی بات سننے بغیر اسی پرسکون انداز میں بولتی رہی۔

"میں جانتا جاچتی ہوں کہ تم نے اپنے بیس برس سے بات کی ہے؟"

"امامہ! میں ابھی بات نہیں کر سکا۔"

"تو پھر تم بات کرو، میں تمہارے علاوہ کس دوسرے سے شادی نہیں کر سکتی یہ تم جانتے ہو۔" مگر

میں اس طرح کی شادی نہیں کروں گی۔ تم اپنے بیس برس سے بات کرو اور پھر مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کہتے ہیں۔"

"امامہ! کیا تمہارے پاس کوئی ہے؟" جلال کے ذہن میں اچانک ایک جھماکا ہوا۔

"ہاں۔"

"اس لئے تم مجھے اسجد کہہ رہی ہو؟"

"ہاں۔"

"میں اپنے بیس برس سے بات کرتا ہوں، تم مجھے دوبارہ تک کب کر دو گی؟"

"تم مجھے بتاؤ کہ میں تمہیں کب رنگ کروں؟"

"کل فون کرو، تمہاری شادی کی تاریخ تب ملے گی مگر۔" جلال کی آواز میں پریشانی تھی۔

"یہ مجھے نہیں پتا۔" امامہ نے کہا۔

"لہجے کے امامہ! میں آج ہی اپنے بیس برس سے بات کرتا ہوں۔ اور تم پریشان مت ہونا۔

سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے امامہ کو تسلی دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔

امامہ نے شکر ادا کیا تھا کہ اس کی بھابی یادی کو یہ شک نہیں ہو سکا کہ وہ اسجد سے نہیں کسی اور سے

بات کر رہی تھی۔

"یہ شادی تمہارے بابا اور اعظم بھائی نے طے کر لے کی ہے۔ تمہارے یا اسجد کے کہنے پر وہ اسے ملوثی نہیں کریں گے۔" سلمیٰ نے اس بار قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"امی! میں مارکیٹ تک جا رہی ہوں، مجھے کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں۔" امامہ نے ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

"فون کی بات دوسری ہے مگر میں تمہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تمہارے بابائے صرف مجھے بلکہ چوکیدار کو بھی ہدایت کر گئے ہیں کہ تمہیں باہر جانے نہ دے۔"

"امی! آپ لوگ میرے ساتھ آخر اس طرح کیوں کر رہے ہیں؟" امامہ نے کچھ بے بسی کے عالم میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو اپنی شادی سے متوجہ نہیں کیا۔ میری ہاؤس چاب تک انتظار کر لیں، اس کے بعد میری شادی کر دیں۔"

"میری کچھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تم شادی سے انکار کیوں کر رہی ہو، تمہاری شادی جلد ہی ہو رہی ہے مگر تمہاری مرضی کے خلاف تو نہیں ہو رہی۔" اس بار اس کی بھابی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"خدا انوار کو کل رات سے پورا گھر ٹینشن کا فکار ہے اور میں تو تمہیں دیکھ کر حیران ہوں تم تو کبھی بھی اس طرح ضد نہیں کرتی تھیں پھر اب کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔۔۔ جب سے تم لاہور گئی ہو بہت عجیب ہو گئی ہو تم۔"

"اور تمہارے چاہنے سے ویسے بھی کچھ نہیں ہو گا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے، تمہارے بابائے ملے کیا ہے یہ سب کچھ۔"

"آپ انہیں سمجھا تو سکتی تھیں۔" امامہ نے سلمیٰ کی بات پر احتجاج کیا۔

"کس بات پر؟" سمجھائی تو اب کچھ کوئی بات قابل اعتراض لگتی اور مجھے کوئی بات قابل اعتراض نہیں لگی۔" سلمیٰ نے بڑے آرام سے کہا۔ امامہ ہنسنے کے عالم میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆.....☆.....☆

سالار صبح خلاف معمول دیر سے اٹھا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے اس نے کانچ نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ سکندر اور حلیہ پر کراچی گئے ہوئے تھے اور دو گھر پر اکیلا ہی تھا۔ ملازم جس وقت ناشتہ لے کر آیا وہ تو وی ان کے بیٹھا تھا۔

"دور انصاف کو اندر بھیجتا۔" اسے ملازم کو کچھ کچھ یاد آیا۔ اس کے جانے کے چند منٹ بعد انصرہ اندر داخل ہوئی۔

"صاحب جی! آپ نے بتایا ہے؟" ادھیڑ عمر ملازم نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔
 "ہاں، میں نے بتا دیا ہے۔ تم سے ایک کام کروانا ہے۔" سالار نے ٹی وی کا چینل بدلتے ہوئے کہا۔
 "ناصرہ! اجہاری بیٹی وسم کے گھر کام کرتی ہے نا؟" سالار اب ریوٹ دکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 "ہاں صاحب کے گھر؟" ناصرہ نے کہا۔

"ہاں، ان ہی کے گھر۔"
 "ہاں جی کرتی ہے۔" وہ کچھ حیران ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگی۔
 "کس وقت جاتی ہے وہ ان کے گھر؟"

"اس وقت ان کے گھر پر ہی ہے۔ کیا ہوا ہے۔" سالار صاحب؟ "ناصرہ اب کچھ پریشان نظر آنے لگی۔

"کچھ نہیں..... میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس کے پاس جاؤ، یہ موبائل اسے دو اور اس سے کہو کہ یہ امام کو دے۔" سالار نے بڑے لاپرواہانہ انداز میں اپنا موبائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

ناصرہ ہکا بکار ہو گئی۔ میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔
 "یہ موبائل اپنی بیٹی کو دو اور اس سے کہو کسی کو بتائے بغیر یہ امام تک پہنچا دے۔"
 "گھر کیوں؟"

"یہ جانتا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے، جنہیں جو کہا ہے وہی کرو۔" سالار نے نگواری کے عالم میں اسے جھڑکا۔

"لیکن اگر کسی کو وہاں پتا چل گیا تو....." ناصرہ کی بات کو اس نے دھشتی سے کاٹ دیا۔
 "کسی کو پتا تب چلے گا جب تم اپنا منہ کھولو گی۔ اور تم اپنا منہ کھولو گی تو صرف جنہیں اور تہناری بیٹی کو نقصان ہو گا اور کسی کو نہیں۔ لیکن اگر تم اپنا منہ بند رکھو گی تو صرف کسی کو پتا نہیں چلے گا بلکہ جنہیں بھی خاصا فائدہ ہو گا۔"

ناصرہ نے اس بار کچھ کہے بغیر خاموشی سے وہ موبائل چکڑ لیا۔ "میں پھر کہہ رہا ہوں۔ کسی کو اس موبائل کے بارے میں پتا نہیں چلنا چاہئے۔" وہ اپنا ڈالٹ نکال رہا تھا۔

ناصرہ صرہلاتے ہوئے جاتے ہوئے۔ "ایک منٹ ٹھہرو۔" سالار نے اسے روکا۔ وہ اب اپنے والٹ سے کچھ کڑی نوٹ نکال رہا تھا۔

"یہ لے لو۔" اس نے انہیں ناصرہ کی طرف بڑھا دیے۔ ناصرہ نے ایک بجلی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ نوٹ بکڑ لئے۔ وہ جن گھروں میں کام کرتی رہی وہاں کے بچوں کے ایسے بہت سے رازوں سے واقف تھی۔ اسے بھی پیسے کمانے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے فوری اندازہ لگایا تھا کہ امام اور سالار

کا پتھر چل رہا تھا اور یہ موبائل وہ تنہا تھا جو اسے امام کو دینا تھا، مگر اسے جبرائی اس بات پر ہو رہی تھی کہ اس سب کا اسے پہلے پتا کیوں نہیں چلا۔ اور پھر امام۔ اس کی تو شادی ہو رہی تھی..... پھر وہ کیوں اس طرح کی کرشمیں کر رہی تھی۔

"اور دیکھو دراجھے، میں امام بی بی کو کتنا سیدھا سمجھتی رہی۔" ناصرہ کو اب اپنا سبے خبری پر افسوس ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

"ابو! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔" جمال رات کو اپنے والد کے کمرے میں چلا آیا۔
 اس کے والد اس وقت اپنی ایک فائل دیکھنے میں مصروف تھے۔

"ہاں آؤ، کیا بات ہے۔" انہوں نے جمال کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ ایسی طرح خاموش بیٹھا رہا، اس کے والد نے فوراً اسے اس کا پتھر دیکھا، انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ "کیا بات ہے جمال؟" انہیں یک دم تشویش ہونے لگی۔

"ابو! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" جمال نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔
 "کیا؟" ناصرہ جاوید کو اس کے منہ سے اس جملے کی توقع نہیں تھی۔ "تم کیا کرنا چاہتے ہو۔"

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
 "یہ فیصلہ تم نے یک دم کیسے کر لیا، کل تک تو تم باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور اب آج تم شادی کا ذکر لے بیٹھے ہو۔" ناصرہ جاوید مسکرائے۔

"ہاں..... معاملہ ایسا کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ مجھے آپ سے بات کرنی پڑ رہی ہے۔"

ناصرہ جاوید سمجیدہ ہو گئے۔
 "آپ نے نہ ہی کسی دوست امام کو دیکھا ہے۔" اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

"ہاں! تم اس میں اعتراض نہ ہو۔" ناصرہ جاوید نے فوراً اندازہ لگا لیا۔
 جمال نے اثبات میں سر ہلادیا۔ "مگر وہ لوگ تو بہت امیر ہیں..... اس کا باب بڑا صنعت کار ہے اور وہ مسلمان بھی نہیں ہے۔"

ناصرہ جاوید کا لبیدہ بدل چکا تھا۔
 "ابو! وہ اسلام قبول کر چکی ہے، اس کی جعلی قادیانی ہے۔" جمال نے وضاحت کی۔

"اس کے گھر والوں کو پتا ہے؟"
 "نہیں۔"

"جہاں انہیں ہے وہ یہ پوچھ لیں گے؟" ناصرہ جاوید نے جیسے ہوتے لبیدہ میں پوچھا۔
 "ابو! اس کی جعلی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ ان لوگوں کی اجازت کے بغیر ہم شادی کرنا

چاہتے ہیں۔"

"تمہارا دامخ ٹھیک ہے؟" اس بار انصر جاوید نے بلند آواز میں کہا۔ "میں تمہیں کسی حالت میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

جلال کا چہرہ اتر گیا۔ "ابو! میری اس کے ساتھ کنٹنٹ ہے۔" اس نے دم آواز میں کہا۔

"مجھ سے پوچھ کر کنٹنٹ نہیں کی تھی تم نے۔ اور اس عرصہ میں بہت ساری کمشنس ہوتی رہتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ بندہ اپنی زندگی خراب کر لے۔ مجھے اس کے خاندان کے اکثر سوچ کا پتا ہے۔ انہیں اپنے پیچھے لگا کر ہم سب پر باد ہو جائیں گے۔"

"ابو! میں خفیہ طور پر شادی کر لیتا ہوں۔ کسی کو پتا نہیں ہے نہیں تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"اور اگر پتہ چل گیا تو۔۔۔ میں ویسے بھی تمہاری تعلیم کے کھل ہونے تک تمہاری شادی کرنا نہیں چاہتا۔ ابھی تجھیں بہت کچھ کرنا ہے۔"

ابو! چلیز۔۔۔ میں اس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کر سکتا۔" جلال نے دم آواز میں اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔ ایسا ہے تو تم اس سے کہو کہ وہ اپنے والدین سے اس مسئلے میں بات کرے۔ اگر اس کے والدین مان جائے ہیں تو میں تم دونوں کی شادی کر دوں گا۔" انہوں نے تیز محرم حسی لہجے میں کہا۔ "مگر میں تمہاری شادی کسی ایسی لڑکی سے قطعی نہیں کروں گا جو اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف تم سے شادی کرنا چاہے۔"

"ابو! آپ اس کا مسئلہ سمجھیں، وہ بری لڑکی نہیں ہے۔۔۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بس وہ کسی مسلمان سے شادی کرنا چاہتی ہے جس پر اس کے گھر والے راضی نہیں ہوں گے۔ جلال نے دانتوں پر اسجد اور اس کی منگنی کا ذکر کر کر دیا۔

"مجھے کسی دوسرے کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جنہیں بھی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ امام کا مسئلہ ہے، وہ جانے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔" انصر جاوید نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"ابو! چلیز۔۔۔ میری بات سمجھیں۔ اس کو مدد کی ضرورت ہے۔"

"بہت سے لوگوں کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے تم کسی کی مدد کرو گے۔ اور ویسے بھی ہمارے اور ان کے ایشیئ میں اتنا فرق ہے کہ ان سے کوئی دلچسپی یا مخالفت مول لینا ہمارے بس کی بات نہیں، کچھ تم اور پھر میں ایک غیر مسلم لڑکی سے شادی کر کے اپنے خاندان والوں کا سامنا کیسے کروں گا۔"

"ابو! وہ مسلمان ہو چکی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے۔" جلال نے مضبوط کر کہا۔

"چار عطا قاتلوں میں وہ تم سے اتنی متاثر ہو گئی کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔"

"ابو! اس نے مجھے ملنے سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔"

"تم نے اسلام قبول کرتے دیکھا تھا؟"

"میں اس سے مذہب کے بارے میں تفصیلاً بات کر چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اسلام قبول کر چکی ہے۔"

"بالفرض وہ ایسا کر بھی چکی ہے۔۔۔ تو پھر اسے اپنے مسائل سے خود نمٹنا چاہئے۔ جنہیں سچ میں نہیں گھنینا چاہئے۔ اپنے والدین سے دو ٹوک بات کرے، انہیں بتائے کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ پھر میں اور تمہاری امی دیکھیں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ دیکھو جلال اگر اس کا خاندان اپنی مرضی اور خوشی سے اس کی شادی تمہارے ساتھ کرنے پر تیار ہو جائے تو میں اسے خوشی قبول کر لوں گا۔ مگر کسی بے نام و نشان لڑکی سے میں تمہاری شادی نہیں کروں گا۔ مجھے اس معاشرہ میں رہنا ہے۔ لوگوں کو مت دکھانا ہے۔ بہو کے خاندان کے بارے میں کیا کہوں گا میں کسی سے۔ یہ کہ وہ گھر چھوڑ کر آئی ہے اور اس نے اپنی مرضی سے میرے بیٹے سے شادی کر لی ہے۔"

"ابو! یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ ہم اس کی مدد کریں اور۔۔۔" انصر جاوید نے سنی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"مذہب کو سچ میں مت لے کر آؤ، ہر چیز میں مذہب کی حرکات ضروری نہیں ہوتی۔ صرف تم ہی یہ مذہبی فریضہ ادا کرنے والے رہ گئے ہو، باقی سارے مسلمان مر گئے ہیں۔"

"ابو! اس نے مجھ سے مدد مانگی ہے، میں اس لئے کہہ رہا ہوں۔"

"بیٹا! یہاں بات مدد کی یا مذہب کی نہیں ہے، یہاں صرف انسانی حقوق کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ بہت اچھی بات ہے کہ تم میں مدد کا جذبہ ہے اور تمہیں اپنے مذہبی فرائض کا احساس ہے مگر انسان پر کچھ حق اس کے والدین کا بھی ہوتا ہے اور یہ حق بھی مذہب نے ہی فرض کیا ہے اور اس حق کے تحت میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے خاندان کی مرضی کے بغیر اس سے شادی نہ کرو۔ فرض کرو کہ تم اس سے شادی کر بھی لیتے ہو۔ تو کیا ہوگا۔ تم تو چند ماہ میں امریکہ ہو گے۔ اور وہ یہاں گھر بنی ہوئی۔ میرے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ میں تم چاروں کی تعلیم پر بھی خرچ کروں اور اس کی تعلیم پر بھی۔ تم اچھی طرح جاننے ہو کہ تم پر میرا کتنا پیسہ خرچ ہوا رہا ہے۔ تو وہ ڈاکٹر تو نہیں بنے گی۔ یہاں گھر میں کتنے سال تم اسے بٹھا سکتے ہو۔ اور اگر اس کے خاندان نے تم پر یا ہم پر کیس کر دیا تو اس صورت میں تم بھی پابند ہو کر رہنا ہوگا اور میں بھی۔ تم کو اپنی بہن کا احساس ہونا چاہئے، تم یہ چاہتے ہو کہ اس عرصہ میں نیل چلا جاؤں۔ اور شاید تم بھی۔"

جلال کچھ بول نہیں سکا۔

”ان چیزوں کے بارے میں اتنا جذباتی ہو کر نہیں سوچنا چاہئے۔ میں نے قسمیں راستہ بتا دی ہے۔“ اس سے کیو اپنے والدین سے بات کر کے انہیں راضی نہ کرے۔ وہ سو سکا ہے وہ راضی ہو جائیں گے مجھے کیا اعتراض ہو گا تم دونوں کی شادی پر لیکن اگر وہ یہ نہیں کرتی تو پھر اس سے کیو کہ وہ کسی اور سے شادی کر لے اور تم ٹھنڈے دل سے سوچو۔“ انہیں ہونا چاہا جیسے کہ اگر تیار اقبال کتنا نقصان دہ ہے۔“ انصر جاوید نے آخری کیل ٹھوکی۔

☆.....☆.....☆

”بابی! میں آپ کا کمرہ صاف کر دوں؟“ ملازمہ نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے امامہ سے پوچھا۔

”نہیں، تم جاؤ۔“ امامہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لئے کہا۔ ملازمہ باہر جانے کے بجائے دروازہ بند کر کے اس کے پاس آگئی۔

”میں تم سے کہا ہے تاکہ تم۔“ امامہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر پھر اس کی بات مطلق میں ہی رو گئی۔ ملازمہ نے اپنی چادر کے اندر سے ایک موبائل نکالا تھا۔ امامہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”بابی! یہ میری ماں نے دیا ہے، وہ کہہ رہی تھی کہ ساتھ والے سالار صاحب نے آپ کے لئے دیا ہے۔“ اس نے امامہ کی طرف جلتے عالم میں وہ موبائل دکھایا۔ امامہ نے تیزی سے موبائل کو بچھڑا لیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”دیکھو، تم کسی کو بتانا مت کہ تم نے مجھے کوئی موبائل لا کر دیا ہے۔“ امامہ نے اسے تاکید کی۔

”نہیں بابی! آپ بے فکر رہیں، میں نہیں بتاؤں گی۔“ اگر آپ کو بھی کوئی چیز سالار صاحب کے لئے دینی ہو تو مجھے دے دیا۔“

”نہیں، مجھے کچھ نہیں دینا، تم جاؤ۔“ اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

ملازمہ کے کمرے سے نکلنے ہی اس نے کمرے کو لاک کر لیا۔ کاہنے ہاتھوں اور دل کی بے قابو ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ اس نے دراز سے موبائل نکالا اور اس پر جال کا نمبر ڈائل کرنا شروع کیا۔ وہ اسے تفصیل سے ساری بات بتاتا جا رہی تھی۔ فون جلال کی اسی لئے اٹھایا۔

”جینا! جلال تو بارہ گیا ہوا ہے، وہ تو رات کو ہی آئے گا۔ تم رنجب سے بات کر لو۔ اسے بلا دوں؟“

جلال کی اسی لئے کہا۔

”نہیں! آئی! مجھے کچھ جلدی ہے، میں رنجب سے پھر بات کر لوں گی۔ بس میں نے ان سے چند سناؤں کا کہا تھا، مجھے ان ہی کے بارے میں پوچھنا تھا۔ میں دوبارہ فون کر لوں گی۔“ امامہ نے فون بند

کرتے ہوئے کہا۔

امامہ نے اس دن دوپہر کو بھی کھانا نہیں کھایا۔ وہ صرف رات ہونے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ جلال گھر آجائے اور وہ اس سے دوبارہ بات کر سکے۔ شام کے وقت ملازمہ نے اسے امجد کے فون کی اطلاع دی۔

وہ جس وقت نیچے آئی اس وقت لاؤنج میں صرف وسم بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے فون کی طرف چلی گئی۔ فون کارنیسیور اٹھاتے ہی دوسری طرف امجد کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بے اختیار امامہ کا خون کھلنے لگا۔ یہ جاننے کے باوجود اس کی شادی کو طے کرنے میں امجد سے زیادہ خود ہاشم حسین کا ہاتھ تھا۔ امامہ کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔

وہ اس کا حال احوال دریافت کر رہا تھا۔

”امجد! تم نے اس طرح میرے ساتھ دھوکا کیوں کیا ہے؟“

”کیسا دھوکہ امامہ!“

”شادی کی تاریخ طے کرنا۔“ تم نے اس سلسلے میں مجھ سے بات کیوں نہیں کی۔“ وہ کھولنے ہوئے ہوئی۔

”کیا انکل نے تم سے بات نہیں کی۔“

”انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے ان سے کہا تھا کہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔“

”بہر حال اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔“ اور پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ شادی اب ہو یا کچھ سالوں کے بعد۔“ امجد نے قدرے لاہروائی سے کہا۔

”امجد! تمہیں فرق پڑتا ہو یا نہیں، مجھے پڑتا ہے۔ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے تک شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ اور یہ بات تو اچھی طرح جانتے تھے۔“

”ہاں، میں جانتا ہوں مگر اس سارے معاملے میں، میں تو کہیں بھی انوکھا نہیں ہوں۔“ انہیں تیار ہوا ہوا تھا۔

”تمہارے رکوادو۔“

”تم کیسی باتیں کر رہی ہو امامہ! میں اسے کیسے رکوادوں۔“ امجد نے کچھ جراتی سے کہا۔

”امجد! پیرا“

”امامہ! میں ایسا نہیں کر سکتا، تم میری پوزیشن سمجھو۔ اب تو بیسے بھی کارڈ چھپ چکے ہیں، دونوں گھر والے میں تیار ہیں اور ہی ہیں اور۔“

امامہ نے اس کی بات سننے بغیر کارنیسیور کو ڈنگ دیا۔ وسم نے اس پر رنجب میں کوئی مداخلت نہیں کی

تھی۔ وہ خاموشی سے اسجد کے ساتھ ہونے والی اس کی گفتگو سن رہا تھا جب امام نے فون بند کر دیا تو دسم نے اس سے کہا۔

”تم خواہو ایک فضول بات پر اتنا بگاڑ کھڑا کر رہی ہو۔ کل بھی تو تمہیں شادی اسجد کے ساتھ ہی کرنی ہے پھر اس طرح کر کے تم خود اپنے لئے سائل پیدا کر رہی ہو۔ باپا تم سے بہت ناراض ہیں۔“

”میں نے تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی، تم اپنے کام سے کام نہ لگو۔ جو کچھ تم میرے ساتھ کر چکے ہو وہ کافی ہے۔“

امام اس پر غرائی اور پھر واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆ ☆ ☆

دورات کو بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلی تھی مگر ملازم کے کھانا لانے پر اس نے کھانا کھالیا۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب اس نے جلال کو فون کیا۔ فون جلال نے ہی اٹھایا تھا۔ شاید وہ امام کے فون کی توقع کر رہا تھا۔ مختصر سی جھبید کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

”امام! میں نے اب سے کچھ دیر پہلے بات کی ہے۔“ اس نے امام سے کہا۔

”پھر؟“ وہ اس کے استفسار پر چند لمبے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

”ابو! اس شادی پر رضامند نہیں ہیں۔“

امام کا دل ڈوب گیا۔ ”مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ انہیں اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

”ہاں، میرا یہی خیال تھا مگر انہیں بہت ساری باتوں پر اعتراض ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تمہارے اور ہمارے گھرانے کے اشتیاق میں بہت فرق ہے۔ اور وہ تمہارے خاندان کے بارے میں بھی جانتے ہیں اور انہیں سب سے بڑا اعتراض اس بات پر ہے کہ تم اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ انہیں یہ خوف ہے کہ اس صورت میں تمہارے گھر والے ہمیں ٹھک کریں گے۔“

وہ ساکت بیٹھی موبائل کان سے لگائے اس کی آواز سنتی رہی۔ ”آپ نے انہیں رضامند کرنے کی کوشش نہیں کی۔“ ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

”میں نے بہت کوشش کی۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر تمہارے گھر والے اس شادی پر تیار ہو جاتے ہیں تو پھر وہ بھی راضی ہو جائیں گے۔ اس بات کی پروا کے بغیر کہ تمہارا خاندان کیا ہے لیکن تمہارے گھر والوں کی مرضی کے بغیر وہ میری اور تمہاری شادی کو تسلیم نہیں کریں گے۔“ جلال نے اس سے کہا۔

”اور آپ — آپ کیا کہتے ہیں؟“

”امام! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ جلال نے کچھ لمبے لمبی کے عالم میں کہا۔

”جلال! میرے پیر میں کبھی آپ سے میری شادی پر تیار نہیں ہوں گے، بصورت دیگر ہماری پوری کمیوٹی ان کا پانچاٹ کر دے گی اور وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے اور پھر آپ اسجد سے میری گفتگو کو کیوں بھول رہے ہیں۔“

”امام! تم پھر بھی اپنے والدین سے بات نہ کرو، ہو سکتا ہے کوئی راست نکل آئے۔“

”میں کل باپا سے تجھ پر کھانچا ہوں۔ صرف یہ بتا کر کہ میں کسی دوسرے میں اثر ملے ہوں۔“ امام کی آواز بھڑکنے لگی۔ ”اگر انہیں یہ پتا چل گیا کہ میں جسے پسند کرتی ہوں وہ ان کے مذہب کا نہیں ہے تو وہ مجھے مارا ڈالیں گے۔ پلیر آپ انھیں سے بات کریں۔ آپ انہیں میرا پرالم بتائیں۔“ اس نے ملتھیانہ لہجہ میں کہا۔

”میں ابو سے کل وہ دہرہ بات کروں گا اور امی سے بھی — پھر میں جسہیں تمہاں گا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔“ جلال پریشان تھا۔

امام نے جس وقت اس سے بات کرنے کے بعد فون بند کیا وہ بے حد دل گرفتہ تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ جلال کے والدین کو اس شادی پر اعتراض ہو گا۔

موبائل ساتھ میں لئے وہ بہت دیر تک خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی رہی۔

☆ ☆ ☆

”تمہارے ابو مجھ سے پہلے ہی اس مسئلے میں بات کر چکے ہیں اور جو وہ کہہ رہے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم کو اس طرح کے فطروں میں گودنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ جلال کی امی نے غلطی سمجھ میں اس سے کہا۔ وہ امام کے کہنے پر ان سے بات کر رہا تھا۔

”مگر امی! اس میں خطرے والی کیا بات ہے۔ کچھ بھی نہیں ہو گا، آپ خواہو خوف زدہ ہو رہی ہیں۔“ جلال نے کچھ احتجاجی انداز میں کہا۔

”تم حماقت کی حد تک بے وقوف ہو۔“ اس کی امی نے اس کی بات پر اسے جھڑکا۔ ”امام کے خاندان اور اس کے والد کو تمہارے ابو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ شادی ہونے کی صورت میں وہ تمہارا اچھا چھوڑ دیں گے یا نہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“

”امی! ہم اس شادی کو خفیہ رکھیں گے، کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔ میں اسٹوڈنٹیشن کے لئے باہر جانے کے کچھ عرصہ کے بعد اسے بھی وہاں بلوا دوں گا۔ سب کچھ خفیہ ہی رہے گا کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔“

”ہم آخر امام کے لئے کیوں اتنا بڑا خطرہ مول لیں اور جہیں ویسے بھی یہ پتا ہو تا چاہئے کہ ہمارے یہاں اپنی جہلی میں ہی شادی ہوتی ہے۔ ہمیں امام یا کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔“ امی نے موضوع ہٹاتے ہوئے کہا۔

”مجھے اگر یہ اندازہ ہو تاکہ تم اس طرح اس لڑکی میں دلچسپی لینا شروع کر دو گے تو میں اس سے پہلے ہی تمہاری کہیں نسبت لئے کر دیتی۔“ اس کی امی نے قدر سے ناراضی سے کہا۔
 ”ای امی! میں امامہ کو پسند کرتا ہوں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم اسے پسند کرتے ہو یا نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس بارے میں، میں اور تمہارے ابو کیا سوچتے ہیں۔ اور ہم دونوں کو تو وہ پسند ہے اور نہ ہی اس کا خاندان۔“ امی نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”ای اداہ بہت اچھی لڑکی ہے، آپ اسے اچھی طرح جانتی ہیں، وہ یہاں آتی رہی ہے اور جب تو آپ اس کی بہت زیادہ تعریف کرتی تھیں۔“ جلال نے انہیں یاد دلایا۔
 ”تعریف کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں اسے اپنی بہو بنالوں۔“ وہ نفی سے کہیں۔

”ای امی! تم آپ تو ایسا ہیسی باتیں نہ کریں۔“ قصور اسما بدردی سے سوچیں۔ ”اس بار جلال نے لیاہت آخیر انداز میں کہا۔

”جلال! تمہیں احساس ہونا چاہئے کہ تمہاری اس ضد اور فیصلے سے تمہارے پورے خاندان پر کس طرح کے اثرات مرتب ہوں گے۔ تمہارا بھی خواب ہے کہ ہم تمہاری شادی کسی اچھے اور اونچے خاندان میں کریں۔ تمہارے ابو اگر تمہیں اس شادی کی اجازت دے بھی دیں تو بھی میں کبھی نہیں دوں گی۔ نہ ہی میں امامہ کو اپنی بہو کے طور پر قبول کروں گی۔“

”ای امی! آپ اس کی صورت حال کو سمجھیں، وہ کتنا بڑا قدم اٹھا رہی ہے۔ اس وقت اسے عدوی ضرورت ہے۔“

”اگر وہ کتنا بڑا قدم اٹھا رہی ہے تو پھر اسے کم از کم دوسرے کے لئے کوئی پریشانی کھڑی نہیں کرنی چاہئے۔ میں اسے برا نہیں کہہ رہی۔ وہ بہت اچھا فیصلہ کر رہی ہے مگر ہم لوگوں کی اپنی کچھ بیماریاں ہیں۔ تم کچھ متعل سے کام لو۔ تمہیں اسٹوڈنٹس کے لئے باہر جانا ہے۔ اپنا اپنا کال بنانا ہے۔“ اس کی امی نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”جینا! اچھے خاندان میں شادی ہو تو انسان کو آگے بڑھنے کے لئے بہت سے مواقع ملتے ہیں اور تمہارے لئے تو پہلے ہی بہت سے خاندانوں کی طرف سے پیغام آرہے ہیں۔ جب اسٹوڈنٹس کر لو گے تو کتنے اونچے خاندان میں تمہاری شادی ہو سکتی ہے۔ تمہیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہے۔ خود سوچو، صرف امامہ سے شادی کر کے تمہیں کیا ملے گا۔“ خاندان اس کا پانچواں کرچکا ہو گا۔

معاشرے میں جو بدنامی ہوئی، وہ والگ۔ اور تم سے شادی ہو بھی جائے تو کل کو تمہارے بچے تمہارے اور امامہ کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ یہ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہے ساری عمر کی بات ہے۔“ امی اسے تنبیہ دینے میں سمجھار رہی تھیں۔ جلال کسی اعتراض یا احتجاج کے بغیر خاموشی سے ان کی باتیں

سن رہا تھا۔

اس کے چہرے سے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کاکل ہوا ہے یا نہیں۔

☆.....☆.....☆

امامہ نے اگلی رات جلال کو پھر فون کیا۔ فون جلال نے ہی اٹھایا تھا۔

”امامہ! میں نے امی سے بھی بات کی ہے۔ وہ اب تو زیادہ ناراض ہوئی ہیں میری بات پر۔“

امامہ کا دل گویا مکمل ڈوب گیا۔

”دو کہہ رہی ہیں کہ مجھے ایک فضول معاملے میں خود کو انوالو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

جلال نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں نے انہیں تمہارے پرالیم کے بارے میں بھی بتایا ہے مگر ان کا کہنا ہے کہ یہ تمہارا پرالیم ہے، ہمارا نہیں۔“

امامہ کو اس کے لفظوں سے شدید تکلیف ہوئی تھی۔

”میں نے انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ رشتہ مند نہیں ہیں اور نہ ہی ہوں گی۔“ جلال کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے جلال! اس نے ڈسپنل کے ساتھ کسی موبو می امیڈ پر کہا۔

”میں جانتا ہوں امامہ! مگر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے والدین اس پر پزل پر رشتہ مند نہیں ہیں۔“

”کیا تم ان کی مرضی کے بغیر مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟“

”نہیں! یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ مجھے ان سے اتنی محبت ہے کہ میں انہیں ناراض کر کے تم سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”جلیز جلال! وہ گڑباز ہے۔ تمہارے علاوہ میرے پاس اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔“

”میں اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کر سکتا، تم مجھے اس کے لئے مجبور نہ کرو۔“

”میں آپ کو نافرمانی کے لئے نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں تو آپ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہوں۔“

اس کے اعصاب جھج رہے تھے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی کسی سے اتنے اچھے اور مت مجھے امامہ کی بات سن کر ہو۔

”آپ مجھ سے صرف نکاح کر لیں، اپنے والدین کو اس کے بارے میں نہ بتائیں۔ بے شک آپ بعد میں ان کی مرضی سے بھی شادی کر لیں، میں اعتراض نہیں کروں گی۔“

”تم اب بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ خود سوچو کہ اگر ایسے کسی نکاح کے بارے میں ابھی میرے والدین کو پتا چل جاتا ہے تو وہ کیا کریں گے۔ وہ تو مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ اور پھر تم اور میں کیا

کر رہی تھیں۔

"ہم محنت کر لیں گے، کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔"

"تجربہ اس کچھ نہ کچھ سے میں باہر پڑھنے چاہوں گا؟" اس بار جلال کا بید چھتا ہوا تھا، وہ بول نہیں سکی۔

"میں امام! میرے اتنے خواب اور خواہشات ہیں کہ میں انہیں تجھارے لئے پاسی کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے تم سے محبت ہے اس میں کوئی شک نہیں مگر میں اس جذبہ بات کی مظلومہ نہیں کر سکتا جس کا مظاہرہ تم کر رہی ہو۔ تم وہ پارہ مجھے فون مارتے کہ تاکہ میں اب اس سارے معاملے کو نہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں، مجھے تم سے ہمدردی ہے مگر تم اپنے اس مسئلہ کا حل خود نکالو، میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا، خدا حافظ۔"

جلال نے فون بند کر دیا۔

رات سو بج کر چھپاس منٹ پر اسے اپنے ارد گرد کی پوری دنیا وحوشیں میں قہقہے ہوتی نظر آئی۔ کسی چیز کے شعلے میں ہونے اور پھر دور دور تک نہیں نہ ہونے کا فرق کوئی امام سے بہتر نہیں بتا سکتا تھا۔ مافوق ذہن اور شعل ہوتے ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ بہت دیر تک کسی بات کی طرح اپنے بیڈ پر ناگہم لٹکا رہے تھے۔

مجھے بتانا چاہئے اب بابا کو سب کچھ۔ اس کے سوا اب اور کوئی دوسرا مت نہیں ہے۔ شاید وہ خود ہی مجھے اپنے گھر سے نکال دیں۔ کم از کم مجھے اس گھر سے قورہائی مل جائے گی۔

☆ ☆ ☆

"میں اسجد سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تو شایہ کہ تو سوال ہی نہیں ہوتا۔" امام نے محکم لہجے میں ای سے کہا۔ سنی اسے اگلے روز اپنے ساتھ مد کیٹ جانے کا کہنے کے لئے آئی تھیں۔

"بیٹے تمہیں شادی پر اعتراض تھا، اب تمہیں اسجد سے شادی پر اعتراض ہے، آخر تم چاہتی کیا ہو؟" سنی اس کی بات پر مشتعل ہو گئیں۔

"صرف یہ کہ آپ اسجد سے میری شادی نہ کریں۔"

"تو پھر کس سے کرنا چاہتی ہو تم؟" ہاشم بینن اچانک کھلے دروازے سے اندر آ گئے تھے۔ یقیناً انہوں نے باہر گورنر میں امام اور سنی کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی اور وہ اپنے قصہ پر قابو نہیں رکھ پائے تھے۔ امام یک دم چپ ہو گئی۔

"بولو، کس سے کرنا چاہتی ہو۔ اب منہ بند کیوں ہو گیا ہے، آخر تم اسجد سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی۔ کیا تکلیف ہے تمہیں؟" انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

"بابا! شادی ایک بار ہوتی ہے اور وہ میں اپنا پسند سے کروں گی۔" وہ بہت کر کے بولی۔

"کھل تک اسجد تجہاری پسند تھا۔" ہاشم بینن نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"کھل تھا، اب نہیں ہے۔"

"کیوں اب کیوں نہیں ہے؟" امام کچھ کے بغیر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"بولو، اب کیوں پسند نہیں ہے وہ تمہیں۔" ہاشم بینن نے بلند آواز میں پوچھا۔

"بابا! میں کسی مسلمان سے شادی کروں گی۔" ہاشم بینن کو لگا آسمان ان کے سر پر گر پڑا تھا۔

"کیا۔" کہا تم نے۔ "انہوں نے بے یقینی سے کہا۔

"میں کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کروں گی کیونکہ میں اسلام قبول کر چکی ہوں۔"

کمرے میں اگلے کئی منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔ سنی کو چاہیے کہ وہ کیا تھا اور ہاشم بینن۔ وہ ایک چتر کے مجسمے کی طرح اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کا منہ کھلا ہوا تھا وہ جیسے سانس لینا نہیں مگے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی انہیں زندگی میں اپنی اولاد اور وہ بھی اپنی سب سے لاڈلی بیٹی کے سامنے اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کے چالیس سال مکمل طور پر جنور کی زد میں آ گئے تھے۔

"تم کیوں اس کر رہی ہو۔" ہاشم بینن کے اندر اشتعال کی ایک لہر اٹھی تھی۔

"بابا! آپ جانتے ہیں میں کیا کہہ رہی ہوں۔ آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"تم پناہ لے رہی ہو۔" انہوں نے آپ سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔ امام نے کچھ کہنے کے بجائے نفی میں گردن ہلائی۔ وہ ہاشم بینن کی ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتی تھی۔ "میں نے تمہیں پیہ کیا۔ تمہاری پرورش کی تم۔ تم۔" ہاشم بینن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہیں۔ "صرف اسجد سے شادی نہ کرنے کے لئے تم یہ سب کر رہی ہو، صرف اس لئے کہ تجہاری شادی اس آدمی سے کروں جس سے تم چاہتی ہو۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔"

"ایسا ہی ہے۔ تم بے وقوف سمجھتی ہو مجھے۔" ان کے منہ سے جھاگ اُگل رہا تھا۔

"آپ میری شادی کسی بھی آدمی سے کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس وہ آپ کی کیوبی سے نہ ہو۔ پھر آپ کم از کم یہ نہیں کہیں کہ میں کسی خاص آدمی کے لئے یہ سب کر رہی ہوں۔"

ہاشم بینن اس کی بات پر دانت پیستے لگے۔

"تم جہد جہد آندہ دن کی پیہ لو۔" تمہیں پتا کیا ہے۔"

"میں سب جانتی ہوں بابا! میری عمر بیس سال ہے، میں آپ کی اٹھائی پڑ کر پٹنے والی ہوتی نہیں

ہوں۔ میں جانتی ہوں آپ کے اس مذہب کی وجہ سے ہمارے خاندان پر بڑی برکات نازل کی گئی ہیں۔"

وہ بڑے محکم اور ہوار انداز میں کہتی گئی۔ "تم..... تم..... بخشش نہیں ہوگی تمہاری۔ تم....." ہاشم یمنین غصے کے عالم میں اٹھی اٹھا کر بولنے لگے۔ امام گوان پر ترس اٹھ گئے۔ اسے دوزخ میں کھڑے ہو کر دوزخ سے ڈرانے والے شخص پر ترس آیا، اسے آنکھوں پر پانی پاندھ کر پھرنے والے شخص پر ترس آیا، اسے مہر شدہ دل والے آدمی پر ترس آیا، اسے ٹس زدہ آدمی پر ترس آیا، اسے کمرانی کی سب سے اوپر ایئر بیئرنگ پر کھڑے آدمی پر ترس آیا۔

"تم کمرانی کے رستے پر چل پڑی ہو..... چند کتابیں پڑھ کر تم....." امام نے ان کی بات کاٹ دی۔ "آپ اس بارے میں مجھ سے بحث نہیں کر سکیں گے، میں سب کچھ جانتی ہوں، تحقیق کر چکی ہوں، تصدیق کر چکی ہوں۔ آپ مجھے کیا بتائیں گے، کیا سمجھائیں گے۔ آپ نے اپنی مرضی کا راستہ چن لیا ہے میں نے اپنی مرضی کا راستہ چن لیا۔ آپ دوکر رہے ہیں جو آپ صحیح سمجھتے ہیں میں وہ کر رہی ہوں جو میں صحیح سمجھتی ہوں۔" آپ کا عقیدہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میرا عقیدہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ کیا اب یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ میرے اس فیصلے کو قبول کر لیں، جذباتی حماقت کے بجائے بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے والا قدم کچھ کر۔"

اس نے بڑی رسائی اور پیچیدگی کے ساتھ کہا۔ ہاشم یمنین کی ناراضی میں اور اضافہ ہوا۔

"میں..... میں اپنی بیٹی کو مذہب بدلنے والی بنا کر رہی کیونتی میرا بیٹا نکال کر دے۔ میں فٹ پاتھ پر آ جاؤں۔ نہیں امام! یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارا اگر دماغ بھی خراب ہو گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرا دماغ بھی خراب ہو جائے۔ کوئی بھی مذہب اختیار کرو مگر تمہاری شادی میں احمد سے نفی کروں گا، جنہیں اسی کے گھر جانا ہو گا..... اس کے گھر جلی جاکر اور پھر دیا جاکر ملے کر تاکہ جنہیں کیا کرنا ہے کیا نہیں۔ ہو سکتا ہے جنہیں قتل آجائے۔"

وہ غصے کے عالم میں کمرے سے نکل گئے۔

"مجھے پتا ہو تا کہ تمہاری وجہ سے ہمیں اتنی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا تو میں پیدا ہوتے ہی تمہارا انکا وادہ تھی۔" ہاشم یمنین کے جاتے ہی سلطی نے کھڑے ہوتے ہوئے دانت تیز کر کہا۔ "تم نے ہماری عزت خاک میں ملائے کا تہیہ کر لیا ہے۔"

امام کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔ وہ کچھ دیر اسی طرح بولتی رہیں پھر کمرے سے چلی گئیں۔

انہیں اس کے کمرے سے گئے ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا جب دروازے پر دستک دے کر احمد اندر

داخل ہوا۔ امام کو اس کے اس وقت وہاں آنے کی توقع نہیں تھی۔ احمد کے چہرے پر پریشانی بہت نمایاں تھی۔ یقیناً اسے ہاشم یمنین نے بولا تھا اور وہ اسے سب کچھ بتا چکے تھے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے امام؟" اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ وہ اپنے بیٹے پر غصی اسے دیکھتی رہی۔ "تم کیوں کر رہی ہو یہ سب کچھ۔"

"احمد! جنہیں اگر یہ بتا دیا گیا ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں تو پھر یہ بھی بتا دیا گیا ہو گا کہ میں کیوں کر رہی ہوں۔"

"جنہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کیا کر رہی ہو۔" وہ کمری کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"مجھے اندازہ ہے۔"

"اس عمر میں جذبات میں آکر انسان بہت سے غلط فیصلے کر لیتا ہے۔"

امام نے تڑپ سے اس کی بات کاٹ دی۔ "جذبات میں آکر.....؟ کوئی جذبات میں آکر مذہب تبدیل کرنا ہے؟ کبھی نہیں۔ میں چار سال سے اسلام کے بارے میں پڑھ رہی ہوں، چار سال کم نہیں ہوتے۔"

"تم لوگوں کی باتوں میں اگلی ہو۔ تم....."

"نہیں، میں کسی کی باتوں میں نہیں آتی۔ میں نے جس چیز کو غلط سمجھا اسے چھوڑ دیا اور بس۔"

وہ کچھ دیر بے چارگی کے عالم میں اسے دیکھتا ہوا پھر سر جھکے ہوئے اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے ان سب باتوں کو چھوڑ دو، شادی پر کیوں اعتراض ہے جنہیں۔ تمہارے عطا کد میں جو تہ تیجی آئی ہے وہ ایک طرف۔ کم از کم شادی تو ہونے دو۔"

"میری اور تمہاری شادی جائز نہیں۔"

وہ اس کی بات پر ہکا بکا گیا۔ "کیا میں غیر مسلم ہوں؟"

"ہاں، تم ہو۔"

"اگل ٹھیک کہہ رہے تھے کسی نے واقعی تمہارا برہنہ واٹش کر دیا ہے۔" اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پھر تم ایک ایسی لڑکی سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو۔ بھترے تم کسی اور سے شادی کرو۔" اس نے ترکی بے ترکی کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی زندگی برباد کر لو۔" وہ اس کی بات پر عجیب سے انداز میں ہنسی۔

"زندگی برباد..... کون سی زندگی..... زندگی جو میں تم جیسے لوگوں کے ساتھ گزار رہی ہوں۔"

جنہوں نے پیسے کے لئے اپنے مذہب کو چھوڑ دیا۔"

"Bebeve yourself"۔ قہر بات کرنے کے تمام مفروضہ بھول گئی ہو۔ کس کے بارے میں کیا کہنا چاہئے اور کیا نہیں، تم نے اس سے یہ فراموش کر دیا ہے۔ "ابھد اسے ڈانٹ لگے۔

"میں ایسے کسی شخص کا احترام نہیں کر سکتی جو لوگوں کو گمراہ کر رہا ہو۔" امام نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"جس عمر میں تم ہو۔۔۔ اس عمر میں ہر کوئی اسی طرح کنفیوڈ ہو جاتا ہے جس طرح تم کنفیوڈ ہو رہی ہو۔ جب تم اس عمر سے لگھو گی تو جہیں احساس ہو گا کہ ہم لوگ صحیح تھے یا غلط۔" اکبید نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر تم لوگوں کو یہ لگتا ہے کہ میں غلط ہوں، تب بھی تم لوگ مجھے چھوڑ دیکو نہیں دیتے۔ اس طرح مجھے گھر میں قید کر کے کیوں رکھا ہو اب اگر تم لوگوں کو اپنا مذہب کی صداقت پر اتنا یقین ہے تو مجھے اس گھر سے چلے جانے دو۔ حقیقت کا چھوٹے دو۔"

"اگر کوئی اپنا اپنے آپ کو نقصان پہنچانے پر عمل جانے تو اسے اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا اور وہ بھی ایک لڑکی کو۔" امام! تم اس مسئلے کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھو اپنی فیملی کا خیال کرو، تمہاری وجہ سے سب کچھ داؤ پر لگ گیا ہے۔"

"بھری وجہ سے کچھ بھی داؤ پر نہیں لگے۔ کچھ بھی نہیں۔ اور اگر کچھ داؤ پر لگے بھی ہے تو میں اس کی پروا کیوں کروں۔ میں تم لوگوں کے لئے دوڑ رہی ہوں۔ صرف خاندان کے نام کی خاطر اپنا ایمان کیوں نکواؤں۔ نہیں! ابھد! تم لوگوں کے ساتھ گھرائی کے اس راستے پر نہیں چل سکتی۔ مجھے وہ کرنے دو جو میں کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے قلمی لہجے میں کہا۔

"مجھ سے اگر تم نے زبردستی شادی کر بھی لی تو جہی نہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں تمہاری بیوی نہیں بنوں گی، میں تم سے وفا نہیں کروں گی۔ مجھے سب بھی موقع ملے گا، میں بھاگ جاؤں گی۔ تم آخر کتنے سال مجھے اس طرح قید کر کے رکھ سکو گے، کتنے سال مجھ پر ہرے بھڑا گے۔ مجھے صرف چند منے چاہئے ہوں گے تمہارے گھر، تمہاری قید سے بھاگ جانے کے لئے۔ اور میں۔۔۔ میں تمہارے بچوں کو بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ تم ساری عمر انہیں وہاں دیکھ نہیں سکو گے۔"

وہ اسے مستقبل کا نقشہ دکھا کر خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتی تو میں بھی امام یا شرم بھی لڑکی سے شادی نہ کروں۔ یہ سراسر خباثت کا سودا ہوگا۔ منافقت اور بے وفائی کا انتہا ہوگی۔ تم اب بھی سوچو۔۔۔ اب بھی پیچھے ہٹ جاؤ۔ تمہارے سامنے تمہاری ساری زندگی بڑی ہے۔ تم کسی بھی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے پر سکون زندگی گزار سکتے ہو۔ کسی پریشانی۔ کسی بے سکونی کے بغیر کچھ میرے ساتھ نہیں۔ میں تمہارے لئے بدترین بیوی ثابت ہوں گی، تم اس سارے معاملے سے الگ ہو جاؤ، شادی سے انکار کر دو،

انگل اعظم سے کہہ دو کہ تم مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتے کچھ عرصے کے لئے گھر سے غائب ہو جاؤ۔ جب تمام معاملہ ختم ہو جائے تو پھر آ جانا۔"

"تم مجھے اس طرح کے احمقانہ مشورے مت دو، میں کسی بھی قیمت پر تم سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی قیمت پر نہ میں انکار کروں گا نہ اس معاملے سے الگ ہوں گا نہ ہی گھر سے کہیں جاؤں گا۔۔۔ میں تم سے ہی شادی کروں گا امام! اب یہ ہمارے خاندان کی عزت اور ساکھ کا معاملہ ہے۔ یہ شادی نہ ہونے اور تمہارے گھر سے چلے جانے سے ہمارے پورے خاندان کو بھٹا نقصان اٹھانا پڑے گا اس کا نہیں بالکل اندازہ نہیں ورنہ تم مجھے بھی یہ مشورہ دیتیں۔ جہاں تک بری بیوی ثابت ہونے یا گھر سے بھاگ جانے کا تعلق ہے۔ تو یہ سب بعد کا مسئلہ ہے۔ میں جہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، تم اس طرح کے فیروانہ کی مالک نہیں ہو کہ دوسروں کو بے جا پریشان کرتی رہو۔۔۔ اور وہ بھی مجھے، جس سے جہیں محبت ہے۔" ابھد بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"جہیں غلط فہمی ہے، مجھے بھی کسی بھی تم سے محبت نہیں رہی۔ کبھی بھی۔۔۔ میں ذاتی طور پر تمہارے ساتھ اپنے تعلق اور رشتے کو اس وقت سے ذہن سے نکال چکی ہوں جب میں نے اپنا مذہب چھوڑا تھا۔ تم میری زندگی میں اب کہیں نہیں ہو، کہیں بھی نہیں۔ اگر میں اپنے گمراہوں کے لئے مسائل کھڑے کر سکتی ہوں تو کل تمہارے لئے کتنے مسائل کھڑے کروں گی جہیں اس کا احساس ہو نا چاہئے اور اس غلط فہمی سے باہر نکل آنا چاہئے۔ ہم دونوں کسی بھی ایسے نہیں ہو سکتے۔ تم تم لوگوں کے خاندان کا حصہ کبھی نہیں بنو گی۔"

نہیں! ابھد! تمہارے اور میرے درمیان بہت فاصلہ ہے، اتنا فاصلہ کہ میں جہیں دیکھ تک نہیں سکتی اور میں اس فاصلے کو کبھی ختم نہیں ہونے دوں گی۔ میں کبھی بھی تم سے شادی کے لئے تیار نہیں ہوں گی۔"

ابھد بدلتی ہوئی رحمت کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا۔

☆☆☆☆

"کیا تم میرا ایک کام کر سکتے ہو؟"

"تمہارا کیا خیال ہے اب تک میں اس سے علاوہ اور کیا کر رہا ہوں۔" سارا نے پوچھا۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی، پھر اس نے کہا۔ "کیا تم لاہور چا کر جلال سے مل سکتے ہو۔"

سارا نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کیں۔

"کس لئے۔" اسے امام کی آواز بہت بھاری لگ رہی تھی۔ یوں جیسے اسے قہر تھا پھر اچانک اس کو ٹیلیال آیا کہ وہ یقیناً روتی رہی ہو گی۔ یہ اسی کا اثر تھا۔

"تم میری طرف سے اس سے ریکوریٹ کر دو کہ مجھ سے شادی کر لے۔ ہمیشہ کے لئے نہیں

تو کچھ دنوں کے لئے ہی..... میں اس گھر سے نکلتا چاہتی ہوں اور میں کسی کی مدد کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتی..... بس وہ مجھ سے نکاح کر لے۔“

”تمہارا تو فون پر اس سے رابطہ ہے بھر تم یہ سب خود اس سے فون پر کیوں نہیں کہہ دیتیں۔“

سالار نے چپس کھاتے ہوئے بڑے اطمینان سے اسے مشورہ دیا۔

”میں کہہ چکی ہوں۔“ اسے امامہ کی آواز پہلے سے زیادہ بھڑائی ہوئی تھی۔

”پھر؟“

”اس نے انکار کر دیا ہے۔“

”ویری سیڈ۔“ سالار نے افسوس کا اظہار کیا۔

”تو یہ دن سائڈ لو انہیں تھا۔“ اس نے کچھ تجسس کے عالم میں پوچھا۔

”میں۔“

”تو پھر اس نے انکار کیوں کر دیا؟“

”تم یہ جان کر کیا کرو گے۔“ وہ کچھ چڑ کر بولی۔ سالار نے ایک اور چپس اپنے منہ میں ڈالا۔

”میرے ہاں جا کر اس سے بات کرنے سے کیا ہو گا، بہتر ہے تم ہی دو بار وہاں سے بات کر لو۔“

”وہ مجھ سے بات نہیں کر رہا، وہ فون نہیں اٹھا تا۔“ پائل میں بھی کوئی اسے فون پر نہیں بلارہا۔ وہ

جان بوجھ کر کترار ہے۔“ امامہ نے کہا۔

”تو پھر تم اس کے پیچھے کیوں پڑی ہو، جانے دوا۔۔۔ وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔“

”تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتے، تم صرف میری مدد کرو، ایک بار جا کر اسے میری صورت حال کے

بارے میں بتاؤ، وہ مجھ سے اس طرح نہیں کر سکتا۔“

”اور اگر اس نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا تو۔“

”پھر مجھ ہی تم اس سے بات کرنا، شاید۔ شاید کوئی صورت نکل آئے، میرا مسئلہ حل ہو جائے۔“

سالار کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اسے امامہ کے حال پر ہنسی آ رہی تھی۔

فون بند کرنے کے بعد چپس کھاتے ہوئے بھی وہ اس سارے معاملے کے بارے میں سوچتا رہا۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ اس سارے معاملے میں زیادہ سے زیادہ انوکھا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اسے اپنی

زندگی کا سب سے بڑا ایڈ وچر محسوس ہو رہا تھا۔ پہلے امامہ تک فون پیچھتا اور اب جلال سے رابطہ۔

امامہ کا بواوے فریڈ۔ اس نے چپس کھاتے ہوئے زبیر دہرایا۔ امامہ نے اسے اس کے پاس چلے اور

گھر کے تمام کواٹک سے آگاہ کر دیا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے جلال انصر سے مل کر کیا کہنا ہے۔

☆ ☆ ☆

سالار نے اس شخص کو ادھر سے نیچے تک دیکھا اور وہ خاصا مایوس ہوا۔ سامنے کھڑا لڑکا بڑی عام سی شکل و صورت کا تھا۔ سالار کے لئے قد اور خوبصورت جسم نے اسے صنف مخالف کے لئے کسی حد تک پرکشش بنا دیا تھا مگر سامنے کھڑا ہوا وہ شخص ان دونوں چیزوں سے محروم تھا۔ وہ مارشل قد و قامت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر بڑا ڈیڑھی ہوتی تو وہ پھر بھی قد سے بہتر نظر آتا۔ سالار سکندر کو جلال انصر سے مل کر مایوسی ہوئی تھی۔ امامہ اب اسے پہلے سے زیادہ دہلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”میں جلال انصر ہوں، آپ ملنا چاہتے ہیں مجھ سے؟“

”میرا نام سالار سکندر ہے۔“ سالار نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”معاف کیجئے گا گھر میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”ظاہر ہے آپ پہچان بھی کیسے سکتے ہیں۔ میں پہلی بار آپ سے مل رہا ہوں۔“

سالار اس وقت جلال کے پاس میں اسے ڈھونڈتے ہوئے آیا۔ چند لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کرنے پر وہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس وقت وہ بوٹی روم کے باہر کھڑے تھے۔

”کیسے بیٹہ کربات کر سکتے ہیں؟“ جلال اب کچھ حیران نظر آیا۔

”بیٹہ کربات۔۔۔ مگر کس سلسلے میں۔“

”امامہ کے سلسلے میں۔“

جلال کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں اس کا دوست ہوں۔“ جلال کے چہرے کا رنگ ایک بار پھر بدل گیا۔ وہ چپ چاپ ایک

طرف چلے گیا۔ سالار اس کے ساتھ تھا۔

”پارک میں گھس میری گاڑی کھڑی ہے، وہاں چلے ہیں۔“ سالار نے کہا۔

گاڑی تک پہنچنے اور اس کے اندر بیٹھے تک وہ فون کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔

”میں اسلام آباد سے آیا ہوں۔“ سالار نے کہنا شروع کیا۔

”امامہ چاہتی تھی کہ میں آپ سے بات کروں۔“

”امامہ نے بھی مجھ سے آپ کا ذکر نہیں کیا۔“ جلال نے کچھ عجیب سے انداز میں کہا۔

”آپ امامہ کو کب سے جانتے ہیں؟“

”تقریباً بیچین سے۔۔۔ ہم دونوں کے گھر ساتھ ساتھ ہیں۔ بڑی گہری دوستی ہے ہماری۔“

سالار انہیں جانتا اس نے آخری جملہ کیوں کہا۔ شاید یہ جلال کے چہرے کے بدلنے سے ہونے لگا

تھے جس سے وہ کچھ اور محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ وہ جلال کے چہرے پر نمودار ہونے والی ناپسندیدگی کو کچھ چاہتا تھا۔

”امامہ سے میری بہت تفصیلی بات ہو چکی ہے، اتنی تفصیلی بات کے بعد اور کیا بات ہو سکتی ہے۔“

جلال نے ساٹ لہجے میں کہا۔

"امامہ چاہتی ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔" سالار نے جیسے نیند زلیٹن پڑھتے ہوئے کہا۔

"میں اپنا جواب اسے بتا چکا ہوں۔"

"وہ چاہتی ہے آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔"

"وہ اس گھر میں اپنے والدین اور گھر والوں کی قید میں ہے۔ وہ چاہتی ہے آپ اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو وقتی طور پر اس سے نکاح کریں اور پھر جلافت کی مدد سے اسے چھڑا لیں۔"

"یہ ممکن ہی نہیں ہے، وہ ان کی قید میں ہے تو نکاح ہو ہی کیسے سکتا ہے۔"

"خون پر۔"

"نہیں، میں اتنا بزدل نہ رہ سکتا۔ میں ایسے معاملات میں انوالو ہونا ہی نہیں چاہتا۔" جلال نے کہا۔ "میرے والدین مجھے اس شادی کی اجازت نہیں دیں گے اور پھر وہ امامہ کو قبول کرنے پر تیار بھی نہیں ہیں۔"

جلال کی نظریں اب سالار کے بالوں کی پانی پر جمی ہوئی تھیں، یقیناً سالار کی طرح اس نے بھی اسے نا پسندیدہ قرار دیا ہو گا۔

"اس نے کہا کہ آپ وقتی طور پر اس سے صرف نکاح کر لیں تاکہ وہ اپنے گھر سے نکل سکے، بعد میں آپ چاہیں تو اسے طلاق دے دیں۔"

"میں نے کہا تھا میں اس کی مدد نہیں کر سکتا اور پھر اس طرح کے معاملات..... آپ خود اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ اگر وقتی شادی کی بات ہے تو آپ کر لیں۔ آخر آپ اس کے دوست ہیں۔" جلال نے کچھ جیسے ہوئے انداز میں سالار سے کہا۔ "آپ اسلام آباد سے لاہور اس کی مدد کے لئے آ سکتے ہیں تو پھر یہ کام بھی کر سکتے ہیں۔"

"اس نے مجھ سے شادی کا نہیں کہا، اس لئے میں نے اس بارے میں نہیں سوچا۔" سالار نے کندھے جھٹکتے ہوئے ہاتھ لٹکے میں کہا۔ "وہی ہے جو آپ سے محبت کرتی ہے، مجھ سے نہیں۔"

"مگر عارضی شادی یا نکاح میں تو محبت کا ہونا ضروری نہیں۔ بعد میں آپ بھی اسے طلاق دے دیں۔" جلال نے مسئلے کا حل نکال لیا تھا۔

"آپ کا مشورہ میں اسے پہنچا دوں گا۔" سالار نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر امامہ سے کہیں کہ وہ کوئی اور طریقہ اپنائے..... بلکہ آپ کسی نیر زبھی کے آفس میں چلے جائیں اور انہیں امامہ کے بارے میں بتائیں کہ کس طرح اس کے خاندان نے

اسے زیر دستی قید کر رکھا ہے۔ جب میڈیا اس معاملے کو ہائی لائٹ کرے گا تو خود ہی وہ امامہ کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے یا پھر آپ پولیس کو اس معاملے کی اطلاع دیں۔"

سالار کو حیرانی ہوئی۔ جلال کی جو بڑی بڑی نہیں تھی، واقعی امامہ اس بارے میں کیوں نہیں سوچ رہی تھی۔ یہ راست زیادہ محفوظ تھا۔

"میں آپ کا یہ مشورہ بھی اسے پہنچا دوں گا۔"

"آپ دوبارہ میرے پاس نہ آئیں بلکہ امامہ سے بھی یہ کہہ دیں کہ وہ مجھ سے کسی بھی طریقے یا ذریعے سے دوبارہ رابطہ نہ کرے۔ میرے والدین ایسے بھی میری صفائی کرنے والے ہیں۔" جلال نے جیسے انکشاف کیا۔

"تمہیک ہے، میں یہ ساری باتیں اس تک پہنچا دوں گا۔" سالار نے لاپرواہی سے کہا۔ جلال مزید کچھ کہنے کے بغیر گاڑی سے اتر گیا۔

اگر امامہ کو یہ قیاسی حق تھا کہ سالار جلال کو اس سے شادی کرنے کے لئے قائل کرے گا تو یہ اس کی سب سے بڑی بھول تھی۔ وہ امامہ سے کوئی بددلی نہ رکھتا تھا نہ ہی کسی خوف خدا کے تحت اس سارے معاملے میں کودا تھا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ ایک ایڈوکیٹ تھا اور ایڈوکیٹس یقیناً جلال سے امامہ کی شادی شامل نہیں تھی۔ اگر جلال سے اس کی شادی کے لئے دلائل دینے جیسے پڑتے تو وہ کیا دیتا۔ اس کے پاس صرف ایک دلیل کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں تھی کہ جلال امامہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہ وہ دلیل تھی جسے جلال پہلے ہی رد کر چکا تھا۔ وہ مذہبی یا اخلاقی حوالوں سے جلال کو قائل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ خود ان دونوں چیزوں سے نااہل تھا۔ مذہب اور اخلاقیات سے اس کا دور دورہ سے بھی کوئی واسطہ نہیں تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آخر وہ امامہ کے لئے ایک دوسرے آدمی سے ایسی لمبی بحث کرنا کیوں۔ وہ بھی ایسا آدمی جسے دیکھتے ہی اس نے ناپسند کر دیا تھا۔

اور یہ تمام وہ باتیں تھیں جو وہ اسلام آباد سے لاہور آتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ وہ اپنا اس لئے تھا کیونکہ وہ جلال سے ملنا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ امامہ کے پیغام پر اس کا رد عمل کیا رہتا تھا۔ اس نے امامہ کا پیغام اسی کے لفظوں میں کسی اضافے یا ترمیم کے بغیر پہنچا دیا تھا اور اب وہ جلال کا جواب لے کر واپس جا رہا تھا اور خاصا محکوم نظر رہتا تھا۔ آخر اس پیغام کے جواب میں وہ کیا کرے گی، کہے گی۔ احمید سے شادی تو وہ نہیں کرے گی، جلال اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں۔ گھر سے دو گلیں نہیں نکلی، کوئی اور ایسا آدمی نہیں جو اس کی مدد کے لئے آ سکے پھر آخر وہ اب آگے کیا کرے گی۔ عام طور پر لڑکیاں ان حالات میں خود کشی کرتی ہیں۔ اویس..... وہ یقیناً اب مجھ سے زہر یا ریواں اور پانچھانے کی خواہش کرے گی۔

سالار متوقع صورت حال کے بارے میں سوچ کر پر جوش ہو رہا تھا۔ "خودکشی..... میری ایکسانٹک۔"

آخر اس کے علاوہ وہ اور کربھی کیا کہتی ہے۔

☆.....☆.....☆

”تم مجھ سے شادی کرو گے؟“ سالار کو جیسے شک لگا۔ ”کون پر نکاح؟“ وہ کچھ دیر کے لئے بول نہیں سکا۔

لاہور سے واپس آنے کے بعد اس نے امام کو جلال کا جواب بالکل اسی طرح سے پہنچا دیا تھا۔ اس کا انداز تھا کہ وہ اب رونا و صراخ شروع کرے گی اور پھر اس سے کسی بھی چیز کی فرمائش کرے گی، مگر وہ کچھ دیر کے لئے خاموش رہی پھر اس نے سالار سے جو کہا تھا اس نے چند ثانیوں کے لئے سالار کے ہوش گم کر دیئے تھے۔

”مجھے صرف کچھ دیر کے لئے تمہارا سامنا تھا چاہئے تاکہ میرے والدین امجد کے ساتھ میری شادی نہ کر سکیں اور پھر تم ہیجٹ کے ذریعے مجھے یہاں سے نکال لو۔ اس کے بعد مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہے گی اور میں کبھی بھی اپنے والدین کو تمہارا نام نہیں بتاؤں گی۔“ وہ اب کہہ رہی تھی۔

”اوہ کے کر لیتا ہوں۔“ مگر یہ ہیجٹ والا کام تو بڑا مشکل ہے۔ اس میں بہت سی legalities لٹاؤ ہو جاتی ہیں۔ وکیل کو پاؤں کرنا۔ اور۔۔۔ امام نے دوسری طرف سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم اپنے فریڈز سے اس سلسلے میں مدد لے سکتے ہو۔ تمہارے فریڈز تو اس طرح کے کاموں میں ماہر ہوں گے۔“

سالار کے ہاتھ پر کچھ علی غمواد ہوئے۔ ”کس طرح کے کاموں میں۔“

”اسی طرح کے کاموں میں۔“

”تم کیسے جانتی ہو۔“

”وسم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری کچنی اچھی نہیں ہے۔“

امام کے منہ سے بے اختیار انکلا اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔ یہ جملہ مناسب نہیں تھا۔

”میری کچنی بہت اچھی ہے، کم از کم جلال انصر کی کچنی سے بہتر ہے۔“ سالار نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ اس بار بھی خاموش رہی۔

”بہر حال میں دیکھتا ہوں، میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“ سالار کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد بولا۔ ”مگر تمہیں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ یہ کام بہت رنجش ہے۔“

”میں جانتی ہوں مگر ہو سکتا ہے میرے والدین صرف یہ بتا بیٹے پر ہی مجھے گھر سے نکال دیں کہ میں شادی کر چکی ہوں اور مجھے ہیجٹ کی مدد لینی۔ پڑے ہو سکتا ہے وہ میری شادی کو قبول کر لیں اور پھر میں تم سے طلاق لے کر جلال سے شادی کر سکوں۔“

سالار نے سر کو قدرے انھوس کے عالم میں جھکا۔ ”اس نے دنیا میں اس طرح کا اتفاق پہلے کبھی

نہیں دیکھا۔ وہ انھوس کی جنت کی جگہ قحطی یا شاید ہونے والی تھی۔

”چلو دیکھتا ہوں، کیا ہوتا ہے۔“ سالار نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

”میں ایک لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔“ حسن نے سالار کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر بے اختیار ہنسا۔

”یہ اس سال کا نیا ایڈ وچر ہے یا آخری ایڈ وچر؟“

”آخری ایڈ وچر۔“ سالار نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ تبصرہ کیا۔ ”یعنی تم شادی کر رہے ہو۔“

حسن نے ہرگز دکھاتے ہوئے کہا۔

”شادی کا کون کہہ رہا ہے۔“ سالار نے اسے دیکھا۔

”تو پھر؟“

”میں ایک لڑکی سے نکاح کرنا چاہ رہا ہوں۔ اس کو مدد کی ضرورت ہے، میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“ حسن اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”آج تم مذاق کے موڈ میں ہو؟“

”نہیں، بالکل بھی نہیں۔“ میں نے تمہیں یہاں مذاق کرنے کے لئے تو نہیں بلوایا۔“

”پھر کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔۔۔ نکاح۔ لڑکی کی مدد۔ وغیرہ وغیرہ۔“ اس بار حسن نے

قدر سے ناگواری سے کہا۔ ”محبت وغیرہ ہو گئی ہے تمہیں کسی سے؟“

”مائی فٹ۔۔۔ میرا دامخ خراب ہے کہ میں کسی سے محبت کروں گا اور وہ بھی اس عمر میں۔“ سالار نے تجھیر آمیز انداز میں کہا۔

”بہی تو۔۔۔ میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ پھر تم کیا کر رہے ہو۔“

سالار نے اس بار سے تفصیل سے امام اور اس کے مسئلے کے بارے میں بتایا۔ اس نے حسن کو

صرف یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ لڑکی ویکم کی بیٹن ہے کیونکہ حسن ویکم سے بہت اچھی طرح واقف تھا لیکن اس

سے تفصیلات سننے کے بعد حسن نے پہلا سوال ہی یہ کیا تھا۔

”وہ لڑکی کون ہے؟“ سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

”ویکم کی بیٹن۔“

”واٹ۔“ حسن بے اختیار اچھلا۔ ”ویکم کی بیٹن۔۔۔ وہ جو میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔“

”ہاں۔“

”تمہارا دامخ خراب ہو گیا، تم کیوں خواہ مخواہ اس طرح کی حماقت کر رہے ہو۔ ویکم کو تداو اس

سارے معاملے کے بارے میں۔۔۔

"میں تم سے مدد مانگنے آیا ہوں، مشورہ مانگتے نہیں۔" سالار نے گواہی سے کہا۔

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" حسن نے کچھ اٹھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"تم نکاح خواہ اور کچھ گواہوں کا انتظام کرو، تاکہ میں اس سے خون پر نکاح کر سکوں۔" سالار نے فوراً ہی کام کی بات کی۔

"مگر جہیزیں؟ نکاح کر کے فائدہ کیا ہوگا۔"

"کچھ بھی نہیں، مگر کسی فائدے کے بارے میں سوچ بھی کب رہا ہوں۔"

"دفع کرو سالار! اس سب کو۔۔۔ تم کیوں کسی دوسرے کے معاملے میں گور رہے ہو اور وہ بھی دیکھ کی دیکھ کے معاملے میں۔ بہتر۔۔۔"

سالار نے اس بار دہشتی سے اس کی بات کاٹی۔ "تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ میری مدد کرو گے یا نہیں۔ باقی چیزوں کے بارے میں پریشان ہونا تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"لیکھ ہے، میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں مدد کرنے سے انکار نہیں کر رہا ہوں، مگر تم یہ سوچ لو کہ یہ سب بہت خطرناک ہے۔" حسن نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا۔

"میں سوچ چکا ہوں، تم مجھے تحصیلات بتاؤ۔" سالار نے اس بار فریخ فرایز نکالتے ہوئے کچھ مطمئن انداز میں کہا۔

"بس ایک بات۔ اگر انکل اور آئی کو چاہل کیا تو کیا ہوگا۔"

"انہیں پتا نہیں چلے گا وہ یہاں نہیں ہیں، اگر انہیں کچھ ہوئے ہیں اور ابھی کچھ دن وہاں دیکھیں گے۔ وہ یہاں ہوتے پھر میرے لئے یہ سب کچھ کرنا بہت مشکل ہوتا۔" سالار نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دو اپنا بزرگ تقریباً ختم کر چکا تھا۔ حسن اب اپنا بزرگ کھاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا مگر سالار اس کے تاثرات کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حسن اس وقت اپنا لائحہ عمل ختم کرنے میں مصروف ہے۔ اسے حسن سے کسی قسم کا کوئی خوف یا خطرہ نہیں تھا۔ وہ اس کا

بہترین دوست تھا۔

☆ ☆ ☆

حسن نے نکاح کے انتظامات بہت آسانی سے کر لئے تھے۔ سالار نے اسے کچھ رقم دی تھی جس سے اس نے عین گواہوں کا انتظام کر لیا تھا۔ چوتھے گواہ کے طور پر وہ خود موجود تھا۔ نکاح خواہ کو اندازہ

تھا کہ اس نکاح میں کوئی غیر معمولی کہانی تھی۔ مگر اسے ہماری رقم کے ساتھ اتنی دسکیاں بھی دے دی گئی تھیں کہ وہ خاموش ہو گیا۔

حسن۔ پھر کے وقت اس نکاح خواہ اور عینوں گواہوں کو لے آیا تھا۔ وہ سب سالار کے کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہیں جہیز کر نکاح نامہ بھرا گیا تھا۔ سالار امامہ کو پہلے ہی اس بارے میں اطلاع کر چکا تھا۔ مقررہ وقت پر خون پر نکاح خواہ نے ان دونوں کا نکاح چاہا تھا۔ سالار نے ملازمہ کے ذریعے

امامہ کو کچھ زبجووائے تھے۔ امامہ نے بیچہ زینتے ہی برقی رفتار سے ان پر سائن کر کے ملازمہ کو واپس دے دیے تھے۔ ملازمہ ان بیچہ زبجووائے سالار کے پاس لے آئی تھی، مگر وہ بری طرح تجسس کا شکار تھی۔

آخر وہ لوگ کون تھے جو سالار کے کمرے میں تھے اور یہ بیچہ زبجووائے تھے جن پر امامہ نے سائن کیا تھا۔ اس کا ہاتھ لٹک رہا تھا اور اسے شبہ ہو رہا تھا کہ ہونہ ہو دو نوں آپس میں شادی کر رہے تھے۔

سالار کو کچھ زبجووائے دیتے ہوئے پوچھتے ہوئے بغیر وہ نہیں نکلی تھی۔

"کیس چیز کے کاغذ ہیں سالار صاحب؟" اس نے بظاہر بڑی سادگی اور مصومیت سے پوچھا۔

"تمہیں اس سے کیا۔۔۔ بیٹے بھی بیچہ زبجووائے۔۔۔ تمہیں آپس میں کام سے کام رکھو۔" سالار نے دہشتی سے اسے بھڑکایا۔

"اور ایک بات تم کان کھول کر سن لو، اس سارے معاملے کے بارے میں اگر تم اپنا منہ بند رکھو گی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہو گا۔ بہت بہتر ہو گا۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے جی کسی سے سنی اس بارے میں بات کرنے کی۔ میں نے تو ویسے ہی پوچھ لیا۔ آپ اطمینان رکھیں صاحبہ! میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

ملازمہ فوراً گھبرا گئی تھی۔ سالار ویسے بھی اتنا کڑا مزاج تھا کہ اسے اس سے بات کرتے ہوئے خوف آیا کرتا تھا۔ سالار نے کچھ نوت بھرے انداز میں سر کو ہٹا دیا۔ اسے اس بات کا کوئی خوف نہیں تھا کہ ملازمہ یہ سب کسی کو بتا سکتی تھی۔ اگر ہاتھ لگتی تو اسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم ایک بار پھر جلال سے ملو ایک بار پھر پلیز۔" وہ اس دن خون پر اس سے کہہ رہی تھی۔

سالار اس کی بات پر چڑ گیا۔ "وہ تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا امامہ! وہ تمہیں بار کہہ چکا ہے۔ آخر تم کبھی کیوں نہیں ہو کر دوبارہ بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ

اس کی کوئی گتھی دھیرہ کرنا چاہ رہے ہیں۔۔۔"

"وہ جھوٹ بول رہا ہے۔" امامہ نے بے اختیار اس کی بات کاٹ دی۔ "صرف اس لئے کہ میں اس سے دو بارہ دو ٹوکیتا نہ کروں، ورنہ اس کے جیڑ میں اس کی گتھی کبھی کبھی نہیں نکلتے۔"

"تو جب وہ نہیں چاہتا تم سے شادی کرنا اور کالیکٹ کرنا۔۔۔ تو تم کیوں غور ہو رہی ہو اس کے پیچھے۔"

"کیونکہ میری قسمت میں خواری ہے۔" اس نے دوسری طرف سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"اس کا کیا مطلب ہے۔" وہ الجھا۔

"کوئی مطلب نہیں ہے۔ نہ تم سمجھ سکتے ہو۔۔۔ تم بس اس سے جا کر کہو کہ میری مدد کرے۔ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی محبت کرتا ہے۔ اس سے کہو کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہی مجھ سے شادی کر لے۔" وہ بات کرتے کرتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ اس کے آنسوؤں سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "کیا یہ بات کہنے سے وہ تم سے شادی کر لے گا۔"

امامہ نے جواب نہیں دیا، وہ ہنسیوں سے رو رہی تھی۔ وہ بیزار ہو گیا۔

"تم کیا تو رو لو۔۔۔ یا پھر مجھ سے بات کر لو۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ سالار نے فوراً کال کی۔ کال ریسپونڈ نہیں کی گئی۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد امامہ نے اسے دوبارہ کال کی۔ "اگر تم یہ وعدہ کرتی ہو کہ تم روو گی تب میں تو مجھ سے بات کرو، ورنہ فون بند کر دو۔" سالار نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

"پھر تم لاہور جا رہے ہو۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے اس سے پوچھا۔
سالار کو اس کی مستقل مزاجی پر حیرانی ہوئی۔ وہ واقعی ذہیف تھی۔ وہ اب بھی اپنی ہی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔
"اچھا، میں چلا جاؤں گا۔ تم نے اپنے کھر والوں کو شادی کے بارے میں بتایا ہے۔" سالار نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ابھی نہیں بتایا۔" وہ اب خود پر قابو پا چکی تھی۔

"کب بتاؤ گی؟" سالار کو جیسے ڈرامے کے اگلے سین کا انتظار تھا۔

"پتا نہیں۔" وہ کچھ الجھی۔ "تم کب لاہور جاؤ گے؟"

"بس جلد ہی چلا جاؤں گا۔ ابھی یہاں مجھے کچھ کام ہے ورنہ فوراً ہی چلا جاتا۔"

اس بار سالار نے جھوٹ بولا تھا۔ نہ تو اسے کوئی کام تھا اور نہ ہی وہ اس بار لاہور جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"جب تم ہیٹل کے ڈریسے گھر سے نکل آؤ گی تو اس کے بعد تم کیا کرو گی۔۔۔ آئی میں انہیں جاؤ گی؟" سالار نے ایک بار پھر اسے اس موضوع سے بھٹاتے ہوئے کہا۔ "اس صورت میں جب سالار بھی تہبہاری مدد کرنے پر تیار نہ ہوا تو۔۔۔"

"میں ابھی ایسا کچھ فرض نہیں کر رہی، وہ ضرور میری مدد کرے گا۔" امامہ نے اس کی بات کا شیعہ ہوئے پر زور انداز میں کہا۔ سالار نے نکتہ سے اچھے لکائے۔

"تم کچھ بھی فرض کرنے پر تیار نہیں ہو، ورنہ میں تم سے ضرور کہتا کہ شاید وہ نہ ہو جو تم چاہتی ہو پھر تم کیا کرو گی۔۔۔ جنہیں دوبارہ اپنے پیش کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔۔۔ تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ تم ابھی یہاں سے نہ جانے کا سوچو۔ نہ ہی ہیٹل اور گورٹ کی مدد، بعد میں بھی تو جنہیں یہاں ہی آنا پڑے گا۔"

"میں دوبارہ کبھی یہاں نہیں آؤں گی، کسی صورت میں نہیں۔"

"یہ جذباتیت ہے۔" سالار نے تبصرہ کیا۔

"تم ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے۔" امامہ نے ہیٹل کی طرح اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔ سالار کچھ

جز بولا۔

"اوکے۔ کہو جو کرنا چاہتی ہو۔" اس نے لاپرواہی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆☆

"کل شام کو ہم لوگ امجد کے ساتھ تہبہارا نکال کر رہے ہیں۔ تہبہاری مدد نصیب بھی ساتھ ہی کر دیا گئے۔"

ہاشم مبین نے رات کو اس کے کمرے میں آکر اکھڑے ہوئے لیجھ میں کہا۔

"بابا! میں انکار کر دوں گی۔" آپ کے لئے بہتر ہے آپ اس طرح زبردستی میری شادی نہ کریں۔"

"تم انکار کر دو گی تو میں جنہیں اسی وقت شوٹ کر دوں گا۔ یہ بات تم یاد رکھنا۔" وہ سر اٹھائے انہیں

دیکھتی رہی۔

"بابا! میں شادی کر چکی ہوں۔" ہاشم مبین کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ "میں اسی لئے اس شادی سے

انکار کر رہی تھی۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"نہیں، میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ میں جیسے مادہ پہلے شادی کر چکی ہوں۔"

"کس کے ساتھ۔"

"میں یہ آپ کو نہیں بتا سکتی۔"

ہاشم مبین کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس اولاد کے ہاتھوں کا خوار ہوں گے۔ آگ بگول ہو کر وہ امامہ پر لپکے اور انہوں نے نیچے بعد دیکھ کر اس کے پیچھے سے پرتھوڑا مارنے شروع کر دیے۔ وہ پیچھے سے سامنے دونوں کا تھک کر ہوتے ہوئے خود کو پھانسلے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ اس میں بری طرح ناکام رہی۔ کمرے میں ہونے والا شور سن کر وہ ہم سب سے پہلے وہاں آیا تھا اور اس نے ہاشم مبین کو پکڑ کر زبردستی امامہ سے دور کیا۔ دو دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے رو رہی تھی۔

"ہا! آپ کیا کر رہے ہیں، سارا معاملہ آرام سے حل کیا جاسکتا ہے۔" دسیم کے پیچھے گھر کے باقی لوگ بھی اندر چلے آئے تھے۔

"اس نے۔ اس نے شادی کر لی ہے کسی سے۔" ہاشم مبین نے غم و غصہ کے عالم میں کہا۔
 "یہاں جھوٹ بول رہی ہے، شادی کیسے کر سکتی ہے، ایک باہمی گھر سے نہیں نکلی۔" یہ وہیم تھا۔
 "جیسے ماہ پہلے شادی کر لی ہے اس نے۔" امام نے سر نہیں اٹھایا۔
 "نہیں، میں نہیں مانتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسا کر ہی نہیں سکتی۔" وہیم اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ امام نے دھندلائی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا اور کہا۔
 "ایسا ہو چکا ہے۔"

"کیا جوت ہے۔۔۔۔۔ نکاح نامہ ہے تمہارے پاس؟" دسیم نے اکھڑ بچھڑا کر کہا۔
 "یہاں نہیں ہے، لاہور میں ہے، میرے سامان میں۔"
 "ہا! میں کل لاہور سے اس کا سامان لے آتا ہوں۔ دیکھ لیتے ہیں۔" دسیم نے ہاشم مبین سے کہا۔
 امام بے اختیار کچھ پتائی۔ سامان سے کیال مسکتا تھا۔

"شادی کر بھی لی ہے تو کوئی بات نہیں، طلاق دلو اگر تمہاری شادی ابجد سے کرواؤں گا اور اس آدمی نے طلاق نہ دی تو پھر اسے قتل کروادوں گا۔" ہاشم مبین نے سر نہ ہچکے کے ساتھ وہاں سے جاتے ہوئے کہا۔ کمرہ آہستہ آہستہ خالی ہو گیا۔ وہ اپنے بیٹے پر بیٹھ گئی۔ اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ چال میں پھنسنے کے بعد کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ نکاح نامے کی کاپی سالار نے اس کو نہیں بھجوائی تھی۔ اگر اس کے پاس ہوتی بھی تو جب بھی وہ اسے ہاشم مبین کو نہیں دے سکتی تھی وہ نہ سالار مسکندر کا نام نکاح نامے پر لکھنے کے بعد ان کے لئے اس تک پہنچتا اور اس سے پھر حاصل کرنا ممتوں کا کام تھا اور اس کے سامان سے نکاح نامہ نہیں ملے گا تو اس کے اس بیان پر کسی کو یقین نہ آسکتا کہ نکاح کر بھی سکتی۔ اس نے کمرے کے دروازے کو لاک کر دیا اور مومباں پر سالار کو کال کرنے لگی۔ اس نے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

"تم ایک بار پھر لاہور جاؤ اور جہاں کو میرے بارے میں بتاؤ۔۔۔۔۔ میں اب اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے یہاں سے لگانا ہے اور اس کے علاوہ میں کہیں نہیں جاسکتی۔ تم میرے لئے ایک وکیل کو ہاڑ کرو اور اس سے کہو کہ وہ میرے بزنس کو میرے شوہر کی طرف سے مجھے جس بے جا میں رکھنے کے خلاف ایک کورٹ نوٹس بھجوائے۔"

"تمہارے شوہر، یعنی میری طرف سے۔"
 "تم وکیل کو اپنا نام مت بتانا بلکہ یہ بہتر ہے کہ اپنے کسی دوست کے ذریعے وکیل ہاڑ کرو اور

میرے شوہر کا کوئی بھی فرضی نام دے سکتے ہو۔ تمہارا نام وکیل کے ذریعے انہیں پہنچے گا تو وہ تم تک پہنچ جائیں گے اور میں یہ نہیں چاہتی۔"

امام نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اسے کیا خدشہ ہے اور نہ ہی سالار نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اس نے بات کرنے کے بعد امام نے فون بند کر دیا۔ اگلے روز دسویں گیارہ بجے کے قریب وکیل نے فون کر کے ہاشم مبین سے امام کے مسئلے میں بات کی اور انہیں امام کو زبردستی اپنے گھر رکھنے کے بارے میں اس کے شوہر کی طرف سے کئے جانے والے کہیں سے بارے میں بتایا۔ ہاشم مبین کو مزید کسی جوت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ غصے میں پھنسا رہا تھا کہ اس کے کمرے میں گئے اور اسے بری طرح مارا۔

"تم دیکھنا امام! تم کس طرح برا ہو گئی۔۔۔۔۔ ایک ایک شے کے لئے ترسو گئی تم۔ جو لڑکیاں تمہاری طرح اپنے ماں باپ کی عزت کو بیکار کرتی ہیں ان کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ تم ہمیں کورٹ تک لے گئی ہو۔ تم نے وہ سارے احسان فراموش کر دیے، جو ہم نے تم پر کئے۔ تمہارے بھی بیٹھیاں کو واقعی پیدا ہوتے ہی زندہ فون کر دینا چاہئے۔"

وہ بڑی خاموشی سے جتنی رہی۔ اپنے باپ کی کیفیات کو سمجھ سکتی تھی مگر وہ اپنی کیفیات اور اپنے احساسات انہیں نہیں سمجھا سکتی تھی۔

"تم نے ہمیں کسی کو مت دیکھانے کے قابل نہیں چھوڑا، کسی کو نہیں۔ ہمیں زندہ درگودہ کر دیا ہے تم نے۔"

سملی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی جس میں امام نے ہاشم مبین احمد کو رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خود بھی بری طرح مشتعل تھیں، وہ جانتی تھیں کہ امام کا یہ قدم کس طرح ان کے پورے خاندان کو متاثر کرنے والا تھا اور خاص طور پر ان کے شوہر کو۔

"تم نے ہمارے اعتماد کا خون کیا ہے۔ کاش تم میری اولاد نہ ہوتیں۔ کبھی میرے خاندان میں پیدا نہ ہوتی ہوتیں۔ پیدا ہو ہی گئی تھی تو بے ہی مر جاتی۔" پامی سی جیہیں مار دیتا۔ "امام! آج ان کی باتوں اور پانی پر نہیں روئی تھی۔ اس نے ہمارے کسی کو کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ صرف خاموشی کے ساتھ جتنی رہی پھر ہاشم مبین احمد جیسے تھکے گئے اور اسے مارنے مارنے لگ گئے۔ ان کا سامان چھو لیا تھا۔ وہ بالکل خاموشی سے ان کے سامنے دیوار کے ساتھ لی کھڑی تھی۔

"تمہارے پاس ابھی بھی وقت ہے، سب کچھ چھوڑ دو۔ اس لڑکے سے طلاق لے لو اور احمد سے شادی کر لو۔ ہم اس سب کو معاف کر دیں گے، بھلا دیں گے۔" اس بار سملی نے تیز بچھڑا کر کہا۔
 "نہیں، وہاں آنے کے لئے اسام قبول نہیں کیا مجھے وہاں نہیں آنا۔" امام نے مدھم مدھم مگر مطمئن

آواز میں کہا۔ "آپ مجھے اس گھر سے چلے جانے دیں، مجھے آزاد کر دیں۔"

"اس گھر سے نکل جاؤ گی تو دنیا میں بہت شو کریں مارے گی۔" جہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ باہری دنیا میں کیسے کچھ نہیں بڑپ کرنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ جس لڑکے سے شادی کر کے تم نے ہمیں ذلیل کیا ہے وہ جہیں بہت خود کرے گا۔ ہمارے خاندان کو دیکھ کر اس نے تمہارے ساتھ اس طرح چوری چھپے رشتہ جوڑا ہے، جب ہم جہیں اپنے خاندان سے نکال دیں گے اور قربانی پائی کی محتاج ہو جاؤ گی تو وہ بھی تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ تمہیں کیس پناہ نہیں ملے گی، کوئی ٹھکانہ نہیں ملے گا۔" سلیٹی اب اسے ڈرا رہی تھی۔ "ابھی بھی وقت ہے اماں تمہارے پاس ابھی بھی وقت ہے۔"

"نہیں امی! میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے، میں سب کچھ لے کر چلی ہوں۔ میں اپنا فیملی آپ کو بتا چکی ہوں۔ مجھے یہ سب قبول نہیں۔ آپ مجھے جانے دیں، اپنے خاندان سے الگ کرنا چاہتے ہیں، مگر دیں۔ جائیداد سے محروم کرنا چاہتے ہیں، مگر دیں۔ میں کوئی اعتراض نہیں کروں گی مگر میں کروں گی وہی جو میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ میں اپنی زندگی کے راستے کا انتخاب کر چکی ہوں۔ آپ کوئی بھی اسے بدل نہیں سکتا۔"

"ایسی بات ہے تو تم اس گھر سے نکل کر دکھاؤ، میں جہیں جان سے مار دوں گا لیکن اس گھر سے جہیں جانے نہیں دوں گا۔ اور اس وکیل کو تم اپنی طرح دیکھ لوں گا۔" جہیں اگر یہ خوش فہمی ہے کہ کوئی کورٹ یا عدالت جہیں میری تحویل سے نکال سکتی ہے تو یہ تمہاری بھول ہے، میں جہیں کبھی بھی کہیں بھی جانے نہیں دوں گا۔ میں ایلیٹ کے آنے سے پہلے اس گھر سے نہیں اور منتقل کروں گا پھر میں دیکھوں گا کہ تم کس طرح اپنے فیملی کو تبدیل نہیں کر سکتے اور مجھے اگر وہ لڑکا نہ ملا جس سے تم نے شادی کی ہے تو پھر میں اس بات کی پروا کئے بغیر کہ تمہارا نکاح ہو چکا ہے ابجد سے تمہاری شادی کر دوں گا۔ میں اس شادی کو سرے سے نہ سنے سے انکار کرتا ہوں۔ تمہاری شادی صرف وہی جو میری مرضی سے ہوگی، اس کے علاوہ نہیں۔" وہ مشتعل انداز میں کہتے ہوئے سلیٹی کے ساتھ باہر نکل گئے۔ وہ وہیں دیوار کے ساتھ کھڑی تو فزودہ اور پریشان نظروں سے دروازے کو دیکھتی رہی۔ اس نے جس مقصد کے لئے شادی کی تھی اس کا کوئی فائدہ ہو گا نظر نہیں آ رہا تھا۔ باہم بین امراء ہی بات پر چنن کی طرح اڑے ہوئے تھے۔

☆☆☆☆

"بہ چاری اماں بی بی! انا ناصر نے سالار کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے ایک پلٹہ آواز میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ سالار نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر پڑی ہوئی کتبوں کو سمیٹ رہا تھا۔ صبراً اسے سوجھ دیکھ کر تیزی سے بولی۔

"بڑی مار پڑی ہے جی کل رات کو۔"

"کس کو مار پڑی ہے؟" سالار نے کتابیں ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

"اماں بی بی کو! اور کس۔" وہ کتابیں ایک طرف کرتے کرتے ڈگ گیا اور ناصر کو دیکھا جو

کمرے میں موجود ایک شیلٹ کی جھانپوچھ کر رہی تھی۔

"باہم بین نے کل بہت مارا ہے۔"

سالار نے حد محفوظ ہو کر "واقعی؟"

"جی ہاں، بہت زیادہ پٹائی کی ہے، میری بیٹی بھاری تھی۔" ناصر نے کہا۔

"وہ بی بی کس۔" سالار نے بے اختیار تبصرہ کیا۔

"جی۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ناصر نے اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ مارا کس نے؟" سالار نے پوچھا۔

اس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ ناصر کو عجیب لگی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اس خبر پر مسکرائے

گا۔ اس کے ذاتی "قیافوں" اور "اندر آؤں" کے مطابق ان دونوں کے درمیان جیسے تعلقات تھے اس پر

سالار کو بہت زیادہ افسردہ ہو نا چاہئے تھا مگر یہاں صورت حال بالکل برعکس تھی۔

"بے چاری اماں بی بی کو پتلا چل جانے کا سالار صاحب اس خبر پر مسکرا رہے تھے تو وہ قصد سے

سے ہی مر جائیں۔" ناصر نے دل میں سوچا۔

"کس بات پر مارتا ہے جی!؟" شاہجہاد صاحب سے شادی پر تیار نہیں ہیں کسی اور "لڑکے"

سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔" ناصر نے لڑکے پر زور دیتے ہوئے معنی خیز انداز میں سالار کو دیکھا۔

"بس اس بات پر۔" سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

"یہ کوئی چھوٹی بات تو فزوی ہے جی، ان کے پورے گھر میں طوفان مچا ہوا ہے۔ شادی کی تاریخ

ٹلے ہو چکی ہے، گاڑا آچکے ہیں اور اب اماں بی بی لی بھند ہیں کہ وہ ابجد صاحب سے شادی نہیں کریں گی۔

بس اسی بات پر باہم صاحب نے ان کی پٹائی کی۔"

"یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اس پر کسی کو مارا جائے۔" وہ اپنی کتابوں میں مصروف تھا۔

"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں نا۔۔۔۔۔ ان لوگوں کے لئے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔" ناصر نے اس کی

طرح صفائی کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔ "میں تو بڑی دیکھی ہوں اماں بی بی کے لئے۔ بڑی اچھی ہیں، ادب

ملاؤ والی۔ اور اب دیکھیں۔ کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے ان پر۔ باہم صاحب نے گھر سے نکلنے پر

پابندی لگا دی ہے۔ میری بیٹی روزانہ کا کمرہ صاف کرتی ہے۔ اور وہ جانتی ہے کہ ان کا تو چہرہ ہی اتر کر رہ

گیا ہے۔"

ناصر وہی طرح بول رہی تھی۔ شاید وہ شعوری طور پر یہ کوشش کر رہی تھی کہ سالار اسے اپنا اور

امامہ کا صحابی اور طرفدار سمجھتے ہوئے کوئی راز نہ کہہ دے مگر سالار اصرار نہیں تھا اور اسے ناصر کو اس نام نہاد بھروسے سے کوئی دلچسپی بھی نہیں۔ اگر امامہ کی پٹائی ہو رہی تھی اور اسے کچھ تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا تو اس سے اس کا کیا تعلق تھا، مگر اسے اس صورت حال پر ہلکی ضرور آ رہی تھی۔ کیا اس دور میں بھی کوئی اس عمر کی اولاد پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے اور وہ بھی ہاشم بنین احمد جیسے امیر طبع کا آدمی۔ جراتی کی بات تھی۔

سوئی کی ایک ہی ریش میں بہت سے متضاد خیالات پہ رہے تھے۔

ناصر کو کچھ پر اسی طرح بولتی اپنا کام کرتی رہی مگر پھر جب اس نے دیکھا کہ سالار اس کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا اور اپنے کام میں مصروف ہو چکا ہے تو وہ قدرے غامض ہو گئی۔ "یہ پہلے محبت کرنے والے تھے، جن کا رویہ بے حد عجیب تھا۔ کوئی اضطراب۔ بے پٹائی اور پریشانی تو ان دونوں کے درمیان نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ ایک دوسرے کی تکلیف کا بھی سن کر۔ شاید امامہ بی بی بھی ان کے بارے میں اس طرح کی کوئی بات سن کر اسی طرح مسکرائیں، مگر ان چاہتا ہے۔"

ناصر نے غیبت پر پڑی ایک تصویر اٹھا کر صاف کی۔

☆ ☆ ☆

گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ اس کی زندگی کے سب سے مشکل اور تکلیف دہ فیصلوں میں سے ایک تھا مگر اس کے علاوہ اس کے پاس اب دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہاشم بنین احمد اسے کہاں لے جاتے اور پھر کس طرح اسے طلاق دلا کر اس کی شادی مجدد سے کرتے، وہ نہیں جانتی تھی۔ واحد چیز جو وہ جانتی تھی وہ یہ حقیقت تھی کہ ایک بار وہ اسے کہیں اور لے گئے تو پھر اس کے پاس رہائی اور فرار کا کوئی راستہ نہیں بچے گا۔ وہ بات ابھی طرح جانتی تھی کہ وہ اسے جان سے کبھی نہیں ماریں گے مگر زندہ رہ کر اس طرح کی زندگی گزارنا زیادہ مشکل ہو جاتا، جیسی زندگی کی وہ اس وقت توقع اور تصور کر رہی تھی۔

ہاشم بنین احمد کے چلے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک بیٹھ کر رو رہی اور پھر اس نے پہلی بار اپنے حالات پر غور کرنا شروع کیا۔ اسے گھر سے نکلنے سے پہلے پہلے لگنا تھا اور نکل کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچنا تھا۔ محفوظ جگہ۔ اس کے ذہن میں ایک بار پھر جہاں انصر کا خیال آیا، اس وقت صرف وہی شخص تھا جو اسے صحیح معنوں میں تحفظ دے سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کا فیصلہ اور رویہ بدل جائے، وہ اپنے فیصلے پر غور کرنے پر مجبور ہو جائے، ہو سکتا ہے وہ مجھے سہارا اور تحفظ دینے پر تیار ہو جائے، اس کے والدین کو مجھ پر ترس آجائے۔

ایک مہینہ سو مہینے امید اس کے دل میں ابھر رہی تھی۔ وہ دھڑکنیں بھی کرتے تھے جب تک از کم میں آزاد تو ہوں گی۔ اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے گزارا تو سکون کی مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں یہاں سے

کے نگاہوں کی اور جاؤں گی کہاں؟

وہ بہت دیر تک پریشانی کے عالم میں بیٹھی رہی، اسے ایک بار پھر سالار کا خیال آیا۔

"اگر میں کسی طرح اس کے گھر پہنچ جاؤں تو وہ میری مدد کر سکتا ہے۔"

اس نے سالار کے موبائل پر اس کا نمبر ملا۔ موبائل آف تھا، یہی کار کا مالک لیکن اس سے رابطہ نہ ہو سکا۔ امامہ نے موبائل بند کر دیا۔ اس نے ایک بجے میں اپنے چند جوڑے، کپڑے اور دوسری چیزیں رکھ لیں۔ اس کے پاس کچھ زیور رات اور تم بھی تھی، اس نے انہیں بھی اپنے بیگ میں رکھ لیا پھر بجتی بھی چینی چیزیں اس کے پاس تھیں۔ نہیں وہ آسانی سے ساتھ لے جاسکتی تھی اور بعد میں کچھ پیسے حاصل کر سکتی تھی وہ انہیں اپنے بیگ میں رکھتی تھی۔ بیگ بند کرنے کے بعد اس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور پھر دو نکل ادا کئے۔

اس کا دل بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔ بے سکونی اور اضطراب نے اس کے چہرے وجود کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ آنسو بہا کر بھی اس کے دل کا بوجھ کم نہیں ہوا تھا۔ نوافل ادا کرنے کے بعد بجتی آیات اور سورتمیں اسے زبانی پڑھیں اس نے وہ ساری پڑھ لیں۔

بیک لے کر اپنے کمرے کی لائٹ بند کر کے وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ لائٹ کی ایک لائٹ کے علاوہ ساری لائٹیں آف تھیں، وہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ وہ عتلا انداز میں چلتے ہوئے سیر حیاں آؤ کر نیچے آگئی اور پھر چکن کی طرف پہنچی گئی۔ کچن جارہی تھی وہاں ہوا بوا تھا۔ وہ عتلا انداز میں چیزوں کو ٹھونٹے ہوئے چکن کے اس دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی باہر لان میں کھلتا تھا۔ جتنی لان کے اس حصے میں کچھ سبزیاں لگائی تھیں اور اس گھر میں چکن کا وہ دروازہ احمد دروازہ تھا جسے لاک نہیں کیا جاتا تھا، صرف چٹکی لگادی جاتی تھی۔ دروازہ اس راستہ بھی لاک نہیں تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کچھ فاصلے پر سر نہ کوا ٹر رہتے، وہ بے حد عتلا انداز میں چلتے ہوئے لان عبور کر کے اپنے اور سالار کے گھر کی درمیانی دیوار تک پہنچی گئی۔ دیوار بہت زیادہ بلند نہیں تھی، اس نے آہستگی سے بیک دوسری طرف پھینک دیا اور پھر کچھ دھجکے بعد خود بھی دیوار پھلانگنے میں کامیاب ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

گہری نیند کے عالم میں سالار نے کھٹکے کی آواز سنی تھی پھر وہ آواز کھٹک کی آواز میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ڈک ڈک کر۔ مگر مسلسل کی جانے والی کھٹک کی آواز۔ وہ اوندھے منہ پیٹ کے بل سو رہا تھا۔ کھٹک کی اس آواز نے اس کی نیند توڑ دی تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیڈ پر بیٹھ بیٹھ اس نے تاریکی میں اپنے چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ خوف کی ایک لہر اس کے اندر سرایت کر گئی۔ وہ آواز کھٹکیوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی

ان کھڑکیوں کو ہمارا ہاتھ گر بہت آہستہ آہستہ۔ یا پھر شاید کوئی ان کھڑکیوں کو ٹٹولتے ہوئے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سالار کے ذہن میں پہلا خیال کسی چور کا آیا تھا، وہ سلائیڈنگ وڈوز تھیں اور بد قسمتی سے وہاں کوئی کرل نہیں تھی۔ اس کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں کی گئی تھی کیونکہ وہ اچھوڑا گیا اس کی بنی ہوئی تھیں جنہیں آسانی سے توڑا یا کاٹا نہیں جاسکتا تھا اور انہیں صرف اندر سے کھولا جاسکتا تھا۔ گھر کے چاروں طرف موجود لان میں وہ بے بھی رات کو کتنے کھیلے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ تین گاڑا بھی ہوتے تھے۔ مگر ان تمام حفاظتی اقدامات کے باوجود اس وقت اس کھڑکی کے دوسری طرف موجود چھوٹے سے پردے کے اندر سے کوئی موجود تھا جو اس کھڑکی کو کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

اپنے بیڈ سے بے قدموں اٹھ کر وہ تاریکی میں ہی کھڑکی کی طرف آیا جس طرف سے آواز آ رہی تھی۔ وہ اس کے بالکل مخالف سمت گیا اور بہت احتیاط کے ساتھ اس نے پردے کے ایک سرے کو تھوڑا سا اٹھاتے ہوئے کھڑکی سے باہر بھاٹکا۔ لان میں گی روشنیوں میں اس نے اپنی کھڑکی کے سامنے جسے کھڑا دیکھا تھا اس نے اسے بے پناہ کراہ کر دیا تھا۔

”یہ پاگل ہے۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اس وقت اگر لان میں بھرتے چار غیر ملکی نسل کے کتے اسے دیکھ لیتے تو سالار یا کسی بھی دوسرے کے پیچھے سے پہلے وہ اسے چر پھاڑ چکے ہوتے اور اگر کہیں گاڑا نہیں سے کسی نے اسے وہاں دیکھا ہوتا تو بھی وہ کھینچ یا تھپتھپ کر وقت ضائع کرنے سے پہلے اسے شٹ کر چکے ہوتے مگر وہ اس وقت بالکل محفوظ وہاں کھڑی تھی اور یقیناً اپنے گھر کی دیوار بھلائی کر یہاں آئی تھی۔

ہوٹ پیچھے اس نے کمرے کی لائٹ آن کی۔ لائٹ آن ہوتے ہی دستک کی آواز رگ گئی۔ کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ پردے پیچھے ہی اس نے سلائیڈنگ وڈوز کو بٹا دیا۔

”اندر آؤ جلدی۔“ سالار نے تیزی سے امداد سے کہا۔ وہ کچھ نروس ہو کر کھڑکی سے اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا۔

پردے برابر کرتے ہی سالار نے مڑ کر اس سے کہا۔
”گاڑا سیک امامہ! تم پاگل ہو۔“ امامہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنا بیگ اپنے پیروں میں رکھ رہی تھی۔

”تم دوبارہ اس کر کے آئی ہو؟“

”ہاں۔“

”تمہیں گاڑا زینا توں میں سے کوئی دیکھ لیتا تو۔۔۔۔۔ اس وقت باہر تھوڑی لاش پڑی ہوتی۔“
”میں نے تمہیں بہت دفعہ دنگ کیا، تھوڑا سا کھل آف تھا، کوئی دوسرا دست نہیں تھا میرے پاس۔“

سالار نے پہلی بار اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی اور چہرہ دستا ہوا تھا۔ وہ بڑی سی سفید چادر پہنے ہوئے تھی مگر اس چادر اور اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ گلے کے دانے تھے۔
”تم مجھے لاہور چھوڑ کر آ سکتے ہو؟“ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی اس سے پوچھ رہی تھی۔
”اس وقت؟“ اس نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں، ابھی اسی وقت۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“
سالار نے تعجب کے عالم میں دال کا ٹاپ پر ایک نظر ڈالا۔ ”وکیل نے تمہارے گھر فون کیا تھا، تمہارا مسئلہ حل نہیں ہوا؟“

امامہ نے غمی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، وہ لوگ مجھے صبح تکیں بھجوا رہے ہیں۔ میں تمہیں اسی لئے سارا دن فون کرتی رہی مگر تم نے جواب نہیں دیا۔ میں چاہتی تھی تم وکیل کو کہو کہ وہ بیٹل کے ساتھ آ کر مجھے وہاں سے آزاد کرانے کے لئے آئے۔“
”وکیل نے کہا کہ تم سے رابطہ نہیں ہو سکا۔“
”وکیل نے کہا کہ تم سے رابطہ نہیں ہو سکا۔“
”وکیل نے کہا کہ تم سے رابطہ نہیں ہو سکا۔“

سالار نے ہنسی لی۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ ”تم بیٹل جاؤ۔“ اس نے امامہ سے کہا۔ وہ ابھی تک کھڑی تھی۔

”تم اگر مجھے لاہور نہیں پہنچا سکتے تو کم از کم اس اسٹینڈنگ پنچاؤ میں وہاں سے خود لاہور چلی جاؤ گی۔“ اس نے سالار کو نیند میں دیکھ کر کہا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ اس وقت تو کوئی گاڑی لاہور نہیں جا رہی ہو گی۔“

”میں تمہیں صبح۔۔۔۔۔ امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔
”نہیں، صبح نہیں۔ صبح تک میراں سے نکل جانا باقی ہوں۔ اگر لاہور کی گاڑی نہیں ملی تو میں کسی اور شہر کی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گی پھر وہاں سے لاہور چلی جاؤں گی۔“

”تم جھو تو کہیں۔“ سالار نے اس سے ایک بار پھر کہا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے چٹکائی پھر صوف پر جا کر بیٹھ گئی۔ سالار خود بھی اپنے بیڈ کی پینٹھی پر بیٹھ گیا۔
”لاہور تم کہاں جاؤ گی؟“ اس نے پوچھا۔

”جال کے پاس۔“

”مگر وہ تو تم سے شادی سے انکار کر چکا ہے۔“

”میں پھر بھی اس کے پاس جاؤں گی، اسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ مجھ کو اس طرح بے پناہ دھار دے گا کہ میں چھوڑ سکتا۔ میں اس سے اور اس کے گھر والوں سے ریکویسٹ کروں گی۔ میں باقی ہوں وہ میری نہیں چھوڑ سکتا۔“

بات مان لیں گے، وہ میری صورت حال کو سمجھ لیں گے۔"

"مگر تم تو مجھ سے شادی کر چکی ہو۔" امامہ چونک کر سالار کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"بھیجے میرے یہ وہ..... میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں مجبوراً نکاح کر رہی ہوں، شادی تو نہیں ہے یہ۔"

وہ اسے چٹکیں چپکے لئے بغیر گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ "تم جانتی ہو، میں آج لاہور گیا تھا جلال کے پاس۔"

امامہ کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ "تم نے اسے میری پریشانی اور صورت حال کے بارے میں بتایا؟"

"نہیں۔" سالار نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟"

"جلال نے شادی کر لی ہے۔" سالار نے لا پرواہی سے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ وہ سانس لینا بھول گئی۔ چٹکیں چپکے لئے بغیر وہ کسی بات کی طرح اسے دیکھنے لگی۔

"تین دن ہو گئے ہیں اس کی شادی کو، کھل پر سو تک وہ میرا تفریح کے لئے نادون ایرمیا کی طرف جا رہا ہے۔ اس نے میری کوئی بات سننے سے پہلے ہی مجھے یہ سب کچھ بتانا شروع کر دیا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ میں اب تمہارے بارے میں بات نہ کروں۔ اس کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے۔" سالار بات کرتے کرتے رک گیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کے گھر والوں نے تمہارے مسئلے کی وجہ سے ہی اس کی اس طرح اچانک شادی کی ہے۔" وہ یکے بعد دیگرے جھوٹ پر جھوٹ بولتا جا رہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔" جیسے کسی غماصے آواز آئی تھی۔

"ہاں، مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا اور مجھے توقع تھی کہ تمہیں بھی یقین نہیں آئے گا مگر یہ سچ ہے۔ تم فون کر کے اس سے بات کر سکتی ہو اس بارے میں۔" سالار نے کندھے جھٹکتے ہوئے لا پرواہی سے کہا۔

امامہ کو لگا وہ پہلی بار صبح معنوں میں گھپ اندھیرے میں اکھڑی ہوئی ہے۔ روشنی کی دو کرن جس کے تقاب میں وہ اتنا عرصہ چلتی آئی ہے، ایک دم گل ہو گئی ہے۔ راستہ تو ایک طرف، وہ اپنے وجود کو بھی نہیں دیکھ پارہی تھی۔

"اب تم خود سوچ لو کہ لاہور جا کر تم کیا کرو گی۔ وہ تو اب تم سے شادی کر سکتا ہے، نہ اس کے گھر والے تمہیں بنادو سکتے ہیں۔ بہتر ہے تم وہاں پہلی جاؤ، ابھی تمہارے گھر والوں کو پتا نہیں چلا ہو گا۔"

امامہ نے کہیں بہت دور سے سالار کی آواز آتی سنی۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"مجھے لاہور چھوڑ آؤ۔" وہ بڑبڑائی۔

"جلال کے پاس جاؤ گی؟"

"نہیں۔ اس کے پاس نہیں جاؤں گی مگر میں اپنے گھر نہیں رہ سکتی۔"

وہ ایک دم صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سالار نے ایک سانس لے کر ابھرنے لگی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پیارے مجھے گیٹ تک چھوڑ آؤ، میں خود چلی جاتی ہوں۔ تم چونکدار سے کہو، وہ مجھے باہر جانے دے۔" اس نے بیک اٹھایا۔

"تمہیں اندازہ ہے کہ یہاں سے بس اسٹینڈ کتنی دور ہے۔ اتنی دُھند اور سردی میں تم پیہل وہاں تک جا سکو گی۔"

"بب اور کچھ نہیں رہا میرے پاس تو دُھند اور سردی سے مجھے کیا ہو گا۔" سالار نے اسے گہلی آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں کو دگر رہی تھی۔ سالار اس کے ساتھ کہیں جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لاہور تو بہت دور کی بات تھی، ایسے ابھی بھی خیر آ رہی تھی اور وہ سامنے کھڑی لڑکی کو ناپسند کرتا تھا۔

"ختم ہو، میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" وہ نہیں جانتا اس کی زبان سے یہ جملہ کیوں اور کیسے نکلا۔ امامہ نے اسے ڈرینگ روم کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ کچھ دیر بعد باہر نکلا تو شب خرابی کے لباس کے بجائے ایک جیزو اور سوئٹرز میں لپوس تھا۔ اپنے بیٹے کی سائڈ فیکل سے اس نے کی چین اور کھڑی کے ساتھ ساتھ اپنا ڈالٹ بھی اٹھایا۔ امامہ کے قریب آ کر اس نے بیک لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں، میں خود اٹھاؤں گی۔"

"اٹھائیں ہوں۔" اس نے بیک لے کر کندھے پر ڈال لیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پورچ میں آ گئے۔ سالار نے اس کے لئے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا تھا اور بیک کو بچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ گاڑی گیٹ کی طرف آتے دیکھ کر چونکدار نے خود ہی گیٹ کھول دیا تھا مگر اس کے قریب سے گزرتے ہوئے سالار نے اس کی آنکھوں میں اس حیرت کو دیکھ لیا تھا جو اس کی نظروں میں رات کے اس وقت فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی امامہ کو دیکھ کر آئی تھی۔ یقیناً وہ حیران ہوا ہو گا کہ وہ لڑکی اس وقت اس گھر میں کہاں سے آئی تھی۔

"تم مجھے بس اسٹینڈ پر چھوڑ گے؟" تین روڈ پر آتے ہی امامہ نے اس سے پوچھا۔ سالار نے ایک نظر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"نہیں، میں تمہیں لاہور لے جا رہا ہوں۔" اس کی نظریں سڑک پر مرکوز تھیں۔

گازی اس بڑی سرک پر دوڑ رہی تھی جو تقریباً سنان تھی۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اسٹریٹ پر دایاں بائیں بائیں ہاتھ کوٹ کے سامنے کمر بٹھا رکھی اور نیند کے نیچے کو بھگانے کی کوشش کی۔ اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی امامہ بے آواز دوری تھی اور سالار اس بات سے باخبر تھا۔ وہ دو تھکا ہوا چہرے پر کھڑے سے رومال سے اپنی آنکھیں پرچھتی اور تاک رہ کر بلتی اور پھر سامنے وڈا سکرین سے باہر سرک پر نظریں بتا کر دوڑ شروع کر دیتی۔ سالار دو تھکے دو تھکے سے اس پر اپنی نظر ڈالتا رہا۔ اس نے امامہ کو کوئی تیلی دینے یا چپ کروانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خود ہی کچھ دیر آسو یا کچھ خاموش ہو جائے گی، مگر جب آدھ گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی وہ اسی رفتار سے روٹی رہی تو وہ کچھ آگے آنے لگا۔

"اگر تمہیں گھر سے اس طرح ہمارا گھر آنے پر اتنا بچتا دباؤ تھا تو پھر تمہیں گھر سے بھاگنا ہی نہیں چاہئے تھا۔"

سالار نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ امامہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"ابھی بھی کچھ نہیں بھڑا، ابھی تو شاید تمہارے گھر میں کسی کو تمہاری غیر موجودگی کا پتا بھی نہیں چلا ہو گا۔" اس نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد اسے مشورہ دیا۔

"مجھے کوئی بچھتا دانیس ہے۔" اس بار اس نے چند لمبے خاموش رہنے کے بعد قدرے بھڑائی ہوئی مگر محتکم آواز میں کہا۔

"تو پھر تم یہ کیوں رہی ہو؟" سالار نے فوراً پوچھا۔

"تمہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" وہ ایک بار پھر آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ سالار نے گردن موڑ کر اسے غور سے دیکھا اور پھر گردن سیدھی کر لی۔

"لاہور میں کس کے پاس جاؤ گی؟"

"پتا نہیں۔" امامہ کے جواب پر سالار نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب۔ تمہیں پتا نہیں ہے کہ تم کہاں جا رہی ہو؟"

"فی الحال تو نہیں۔"

"تو پھر تم آخر لاہور جا ہی کیوں رہی ہو؟"

"تو پھر اور کہاں جاؤ؟"

"تم اسام آباد میں ہی رہ سکتی تھیں۔"

"کس کے پاس؟"

"لاہور میں بھی تو کوئی نہیں ہے جس کے پاس تم رہ سکو۔ اور وہ بھی مشتعل۔ جلال کے

علاوہ۔" سالار نے آخری تین لفظوں پر زور دیتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"اس کے پاس جا رہی ہو تم۔" کچھ دیر بعد اس نے قدرے پیچھے ہٹے ہوئے انداز میں کہا۔

"نہیں، جلال میری زندگی سے نکل چکا ہے۔" سالار اٹھ اڑھ نہیں کر سکا کہ اس کی آواز میں مایوسی زیادہ تھی یا سرزدگی۔ "اس کے پاس کیسے جا سکتی ہوں میں۔"

"تو پھر اور کہاں جاؤ گی؟" سالار نے ایک بار پھر جس کے عالم میں پوچھا۔

"یہ تو میں لاہور جانے پر ہی طے کروں گی کہ مجھے کہاں جانا ہے، کس کے پاس جانا ہے۔" امامہ نے کہا۔

سالار نے کچھ سے بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھا۔ کیا واقعی وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں جانا چاہیے پھر وہ اسے بتا نہیں جانتی تھی۔ گازی میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

"تمہارا فی بی۔ کیا تم ہے اس کا۔" ہاں اسید۔ کافی اچھا، ونڈم آدمی ہے۔" ایک بار پھر سالار نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ "اور یہ جو دوسرا آدمی تھا۔ جلال۔ اس کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ زیادتی نہیں کر دیتی تم نے اسید کے ساتھ؟"

امامہ نے اس کے سوال کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ صرف سامنے سرک کو دیکھتی رہی۔ سالار کچھ دیر گردن موڑ کر اس کے جواب کے انتظار میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا مگر پھر اسے احساس ہو گیا کہ وہ جواب دینا نہیں چاہتی۔

"میں تمہیں کچھ نہیں پایا۔ جو کچھ تم کر رہی ہو اسے بھی نہیں۔ تمہیں حرکتیں بہت۔ بہت عجیب ہیں۔ اور تم اپنی حرکتوں سے زیادہ عجیب ہو۔" سالار نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

اس بار امامہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا تمہاری حرکتوں سے زیادہ عجیب ہیں میری حرکتیں۔ اور کیا میں تم سے زیادہ عجیب ہوں۔"

بڑے دھچکے مگر محتکم لہجے میں پوچھتے گئے اس سوال نے چند لمحوں کے لئے سالار کو لا جواب کر دیا تھا۔

"میری کون سی حرکتیں عجیب ہیں۔ اور میں کس طرح عجیب ہوں؟" چند لمبے خاموش رہنے کے بعد سالار نے کہا۔

"تم چاہتے ہو، تمہاری کون سی حرکتیں عجیب ہیں۔" امامہ نے وہاں وڈا سکرین کی طرف گردن موڑتے ہوئے کہا۔

"یقیناً میری خود کشی کی ہی بات کر رہی ہو تم۔" سالار نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ میں خود کشی نہیں کرنا چاہتا۔ ہی میں خود کشی کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں تو صرف ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔"

"کیسا تجربہ۔"

"میں ہمیشہ لوگوں سے ایک سوال پوچھتا ہوں، مگر کوئی بھی مجھے اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔ اس لئے میں اس سوال کا جواب خود وضوح ملنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ بولتا رہا۔

"کیا پوچھتے ہو تم لوگوں سے؟"

"بہت آسان سا سوال ہے مگر ہر ایک کو مشکل لگتا ہے۔" "What is next to ecstasy?" اس لئے گردن موڑ کر امامہ سے پوچھا۔

"وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔" "Pain"

"And what is next to pain?" سالار نے بلا توقف ایک اور سوال کیا۔

"Nothingness"

"What is next to nothingness?" سالار نے اسی انداز میں ایک اور سوال کیا۔

"Hell"

"And what is next to hell?" اس بار امامہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"What is next to hell?" سالار نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"تمہیں خوف نہیں آتا۔" سالار نے امامہ کو قدرے عجیب سے انداز میں پوچھتے سنا۔

"کسی چیز سے۔" سالار حیران ہوا۔

"Hell" سے اس جگہ سے جس کے آگے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سب کچھ اس کے پیچھے ہی

رہ جاتا ہے۔ "عقب اور مغضوب ہو جانے کے بعد باقی بچتا کیا ہے جسے جاننے کا نہیں جتنس ہے۔"

امامہ نے قدرے آنکھوں سے کہا۔

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔ سب کچھ میرے سر کے اوپر سے گزرا ہے۔" سالار نے

جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

"فخر مت کرو۔۔۔ آجائے گی۔ ایک وقت آنے کا۔ جب تمہیں ہر چیز کی سمجھ آجائے گی

پھر تمہاری فہمی ختم ہو جائے گی۔ جب تمہیں خوف آنے لگے گا۔ موت سے بھی اور دوزخ سے

بھی۔ اللہ تمہیں سب کچھ دکھائے گا اور بتا دے گا۔ پھر تم کسی سے یہ کبھی نہیں پوچھا کرو گے۔

"What is next to ecstasy?" امامہ نے بہت رسائی سے کہا۔

"یہ تمہاری پیش گوئی ہے؟" سالار نے اس کی بات کے جواب میں کچھ چپچپے ہوئے لیے میں کہا۔

"نہیں۔" امامہ نے اسی انداز میں کہا۔

"تجربہ؟" سالار نے گردن سیدھی کر لی۔

"ہاں، یہ تمہارا تجربہ ہی ہو سکتا ہے۔ کی تو تم نے بھی خود کشی ہی ہے۔ میرا مطلب ہے کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اپنے طریقے سے یہ کوشش کی تھی۔ تم نے اپنے طریقے سے کی ہے۔" سالار نے سرد مہرئی سے کہا۔

امامہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ گردن موڑ کر اس نے سالار کو دیکھا۔

"میں نے کوئی خود کشی نہیں کی ہے۔"

"کسی لڑکے کے لئے گھر سے بھاگنا ایک لڑکی کے لئے خود کشی ہی ہوتی ہے۔ وہ بھی اس

صورت میں جب وہ لڑکا شادی پر تیار ہی نہ ہو۔۔۔ دیکھو، میں خود ایک لڑکا ہوں۔۔۔ بہت بڑا ڈاکٹر ڈاکٹر

لیبل ہوں اور میں بالکل برا نہیں سمجھتا۔ لڑکی لڑکے سے بھاگ کر کسی لڑکے کے ساتھ کورٹ میرج

یا شادی کر لے۔ مگر وہ لڑکا اس کا ساتھ تو دے، ایک ایسے لڑکے کے لئے گھر سے بھاگ جانا شادی

کر چکا ہو۔۔۔ چیخ چیخ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اور پھر تمہاری عمر میں بھاگنا۔ بالکل حماقت ہے۔

"میں کسی لڑکے کے لئے نہیں بھاگی ہوں۔"

"جال افعرا" سالار نے اس کی بات کاٹ کر اسے یاد دلایا۔

"میں اس کے لئے نہیں بھاگی ہوں۔" وہ بے اختیار بلند آواز میں چلائی۔ سالار کا پاؤں بے اختیار

بریک پر جا پڑا۔ اس نے جبرانی سے امامہ کو دیکھا۔

"تو مجھ پر کیوں چلا رہی ہو، مجھ پر چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" سالار نے ناراضی سے کہا۔ وہ

کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"یہ جو تمہاری مذہب والی تصویروں کی بنیاد پر لکھا گیا جو بھی I don't get it کیا فرق پڑتا ہے۔

اگر کوئی کسی اور عقیدہ کو ماننا شروع ہو گیا ہے۔ زندگی ان فضول بحثوں سے علاوہ کچھ بھی سمجھ

مذہب عقیدے یا فرقے پر لڑنا۔" "What rubbish"

امامہ نے گردن موڑ کر ناراضی کے عالم میں اسے دیکھا۔ "جو چیزیں تمہارے لئے فضول ہیں،

ضروری نہیں ہو ہر ایک کے لئے فضول ہوں۔ میں اپنے مذہب پر قائم رہتا نہیں جانتی اور نہ ہی اس

مذہب کے کسی شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تو یہ میرا حق ہے کہ میں ایسا کروں، میں تم سے انہی

چیزوں کے بارے میں بحث نہیں کرنا چاہتی جسے تم نہیں سمجھتے۔ اس لئے تم ان معلومات کے بارے

میں اس طرح کے تبصرے مت کرو۔"

"حق ہے کہ میں جو چاہا ہے Freedom of expression (اظہار کی آزادی)۔" سالار

نے کدھ سے اچکاتے ہوئے کہا۔ امامہ نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ کھڑکی سے باہر

دیکھنے لگی۔ سالار بھی خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا لگا۔

”یہ جلال انصر..... میں اس کی بات کر رہا تھا۔“ وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایک بار پھر اپنے اسی موضوع کی طرف آگیا۔

”اس میں کیا خاص بات ہے؟“ اس نے گردن موڑ کر امامہ کو دیکھا۔ وہ اب وڈا سکرین سے باہر سڑک کو دیکھ رہی تھی۔

”جلال انصر اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ وہ بالکل بھی منہدم نہیں ہے۔ تم ایک خوب صورت لڑکی ہو۔ میں حیران ہوں تم اس میں کیسے دلچسپی لینے لگیں۔ کیا وہ بہت زیادہ..... intelligent ہے؟“ اس نے امامہ سے پوچھا۔

امامہ نے حیرائی سے اسے دیکھا۔ ”intelligent“ کیا مطلب؟“
 ”دیکھو وہ تو کسی کی شکل اچھی لگتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا تمہیں جلال کی شکل اچھی لگی ہوگی یا پھر کسی کا فیملی بیک گراؤنڈ۔ پیرہ وغیرہ کسی میں دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ اب جلال کا فیملی بیک گراؤنڈ نامی حالت کے بارے میں، میں نہیں جانتا مگر خود تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ جتنا سادہ ہے، یہ بھی تمہارے لئے اس میں دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتا۔ واحد فح جانے والی وجہ کسی کی ذہانت، قابلیت وغیرہ ہے۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ کیا وہ بہت intelligent ہے۔ کیا بہت آڈٹ اسٹینڈنگ اور brilliant ہے؟“
 ”نہیں۔“ امامہ نے دم آواز میں کہا۔

سالار کو مایوسی ہوئی۔ ”تو پھر..... تم اس کی طرف متوجہ کیسے ہو گئیں امامہ وڈا سکرین سے باہر ہیٹ لائسنس کی روشنی میں نظر آنے والی سڑک دیکھتی رہی۔ سالار نے اپنا سوال دوبارہ نہیں دہرایا۔ صرف کندھے اچکاتے ہوئے وہ دوبارہ ڈرائیونگ پر توجہ دینے لگا۔ گاڑی میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔
 ”وہ نعمت بہت اچھی پڑھتا ہے۔“ تقریباً چھ منٹ بعد خاموشی ٹوٹی۔ وڈا سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے دم آواز میں امامہ یوں بڑبڑاتی تھی جیسے خود گلابی کر رہی ہو۔ سالار نے اس کا جملہ سن لیا تھا مگر اسے دونا قابل یقین لگا۔

”کیا؟“ اس نے جیسے تصدیق چاہی۔
 ”جلال نعمت بہت اچھی پڑھتا ہے۔“ اسی طرح وڈا سکرین سے باہر جھانکتے ہوئے کہا مگر اس بار اس کی آواز کچھ بلند تھی۔

”بس آواز کی وجہ سے۔“ سکر ہے؟“ سالار نے تہمید کیا۔
 امامہ نے غصے میں سر ہلایا۔

”پھر؟“
 ”بس وہ نعمت ہی پڑھتا ہے۔ اور بہت خوب صورت پڑھتا ہے۔“

سالار ہنسنا۔ تم صرف اس کے نعمت پڑھنے کی وجہ سے اس کی محبت میں گرفتار ہو گئیں۔ میں کم از کم اس پر یقین نہیں کر سکتا۔“

امامہ نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ”نعمت کرو..... تمہارے یقین کی کس کو ضرورت ہے۔“ اس کی آواز میں سرد مہرہی تھی۔ گاڑی میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

”فرض کرو یہ مان لیا جائے کہ تم واقعی اس کے نعمت پڑھنے سے کچھ متاثر ہو کر انا آگے بڑھ گئیں۔ تو یہ تو کوئی زیادہ پرنیکٹل بات نہیں ہے۔ بار بار کارٹ لینڈ کے ناؤ ٹروالار وائس ہی ہو گیا یہ تو۔ اور تم ایک میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہو کر انا پچھو رڈ بن رہی تھی ہو۔“ سالار نے بے رحمی سے تہمید کیا۔

امامہ نے ایک بار پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”میں بہت منچور ہوں۔ بہت زیادہ..... پچھلے دو چار سالوں میں مجھ سے زیادہ پرنیکٹل ہو کر کسی نے چیزوں کو نہیں دیکھا ہو گا۔“

”میری رائے محفوظ ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارا پرنیکٹل ہو نا میرے پرنیکٹل ہونے سے مختلف ہو۔ اچنی دے میں جلال کی بات کر رہا تھا۔ وہ جو تم نعمت وغیرہ کا ذکر کر رہی تھیں اس کی بات۔“

”بعض چیزوں پر اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ میرا بھی نہیں ہے۔“ اس بار امامہ کی آواز میں غصے کی تھی۔

”میں پھر تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ ہر چیز اپنے اختیار میں ہوتی ہے۔ کم از کم اپنی فیکٹوری اور ایکشن پر انسان کو کنٹرول ہوتا ہے۔ ہمیں پتا ہوتا ہے کہ ہم کس شخص کے لئے کس طرح کی فیکٹوری

ڈویپ کر رہے ہیں۔ کیوں کر رہے ہیں، اس کا بھی پتا ہوتا ہے۔ اور جب تک ہم باقاعدہ ہوش و حواس میں رہتے ہوئے ان فیکٹوری کو ڈویپ نہیں ہونے دیتے۔ وہ نہیں ہوتیں۔ اس لئے یہ نہیں مان سکتا کہ ایسی چیزوں پر اپنا کنٹرول نہ رہے۔“

اس نے بات کرتے ہوئے دوسری بار امامہ کو دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ وہ اس کی بات نہیں سن رہی تھی۔ وہ دیکھیں چپکے بغیر وڈا سکرین کو دیکھ رہی تھی شاید وڈا سکرین سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں اور اس وقت بھی ان میں غمی نظر آ رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر کہیں دور تھی۔

کہاں یہ وہ نہیں جان سکتا تھا۔ اسے وہ ایک بار پھر بتا رہی تھی۔

بہت دیر تک خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے رہنے کے بعد سالار نے قدرے آگے ایک بار پھر امامہ سے مخاطب کیا۔

”نعمت پڑھنے کے علاوہ اس میں اور کون سی کوالٹی ہے؟“ اس کی آواز بلند تھی۔ امامہ بے اختیار چپک گئی۔

”نعمت پڑھنے کے علاوہ اس میں اور کیا کوالٹی ہے؟“ سالار نے اپنے سوال کو دوبارہ۔
 ”ہر وہ کوالٹی جو ایک اچھے انسان..... اچھے مسلمان میں ہوتی ہے۔“ امامہ نے کہا۔

"مثلاً" سالار نے بھنویں اچکا تے ہوئے کہا۔
 "اور اگر نہ بھی ہو تیں تو بھی وہ شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی محبت کرتا ہے کہ
 میں اسے اسی ایک کوالٹی کی خاطر کسی بھی دوسرے شخص پر ترجیح دیتی۔"
 سالار عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "what a logic ایسی باتوں کو میں واقعی ہی نہیں سمجھ سکتا۔"
 اس نے گردن کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔
 "تم اپنی پسند سے شادی کرو گے یا اپنے پیر تیش کی پسند سے؟" امام نے اچانک اس سے پوچھا۔ وہ
 حیران ہوا۔
 "آف کورس اپنی پسند سے۔ پیر تیش کی پسند سے شادی والا زمانہ تو نہیں ہے یہ۔" اس نے
 کندھے اچکا تے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔
 "تم بھی تو کسی کوالٹی کی وجہ سے ہی کوئی لڑکی پسند کرو گے۔ شکل و صورت کی وجہ سے۔ یا
 پھر جس سے تمہاری اندراستینڈنگ ہو جائے گی اس سے۔ ایسا ہی ہو گا۔" وہ پوچھ رہی تھی۔
 "یقیناً۔" سالار نے کہا۔
 "میں بھی تو یہی کر رہی ہوں۔ اپنی اپنی ترجیحات کی بات ہوتی ہے۔ تم ان چیزوں کی بنا پر کسی سے
 شادی کرو گے، میں بھی ایسی ہی ایک وجہ کی بنا پر شادی کرنا چاہتی تھی جلال انصر سے۔" وہ ٹکی۔
 "میری خواہش ہے، میری شادی اس سے ہو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجھ سے زیادہ محبت
 رکھتا ہو۔ جلال انصر! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجھ سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ مجھے لگا، مجھے اسی
 شخص سے شادی کرنی چاہیے۔ میں نے تم سے کہا بعض چیزوں پر اختیار نہیں ہوتا۔ بعض
 خواہشات۔ بس ان سے چھٹکارا لپانا ممکن نہیں ہوتا۔" اس نے افسردگی سے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔
 "اور اب جب وہ شادی کر چکا ہے تو اب تم کیا کرو گی؟"
 "پتا نہیں۔"
 "تم ایسا کرو۔ کہ تم کسی اور نعمت پڑھنے والے کو ڈھونڈ لو، تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" وہ
 مذاق اڑاتے والے انداز میں ہنسا۔
 امامہ کلکلیں پیچکائے بغیر اسے دیکھتی رہی۔ وہ سٹای کی حد تک بے حس تھا۔ "اس طرح کیوں دیکھ
 رہی ہو تم۔ میں مذاق کر رہا ہوں۔" وہ اب اپنی ہنسی پر قابو پا چکا تھا۔ امامہ نے کچھ کہنے کے بجائے
 گردن موڑ لی۔
 "جہیں تمہارے قادر نے مارا ہے۔" سالار نے پہلے کی طرح کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولنے
 کا معمول جاری رکھا۔

"جہیں کس نے بتایا۔" امامہ نے اسے دیکھے بغیر کہا۔
 "ملازمہ نے۔" سالار نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بے چارہ یہ سمجھ رہی ہے کہ تم جو شادی سے
 انکار کر رہی ہو وہ میری وجہ سے کر رہی ہو۔ اس لئے اس نے مجھ تک تمہاری "حالت زار" بڑے
 دردناک انداز میں پہنچائی تھی۔ مارا ہے قادر نے؟"
 "ہاں۔" اس نے بے تاثر انداز میں کہا۔
 "کیوں؟"
 "میں نے پوچھا نہیں۔ شاید وہ ناراض تھے اس لئے۔"
 "تم نے کیوں مارنے دیا۔"
 امامہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ "وہ میرے بابا ہیں، انہیں حق ہے، وہ مار سکتے ہیں مجھے۔"
 سالار نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "ان کی جگہ کی جگہ کی بھی ہوتا، وہ اس صورت حال میں یہی کرتا۔
 مجھے یہ قابل اعتراض نہیں لگا۔" وہ بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔
 "اگر مارنے کا حق ہے انہیں تو پھر تمہاری شادی کرنے کا بھی حق ہے۔ اس پر اتنا بنگام کیوں
 کھڑا کر رہی ہو تم۔" سالار نے جیسے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
 "کسی مسلمان سے کرتے۔ اور چاہے جہاں مرضی کر دیتے۔ میں کروالیتی۔"
 "چاہے وہ جلال انصر ہوتا۔" استہزائے انداز میں کہا۔
 "ہاں۔ اب بھی آخر کون سا ہو گئی ہے اس سے۔" اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نرمی جھللا
 رہی تھی۔
 "تو تم ان سے یہ کہہ دیتی۔"
 "کہا تھا۔ تم سمجھتے ہو میں نے نہیں کہا ہو گا۔"
 "مجھے ایک بات پر بہت حیرانی ہے۔" سالار نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ "آخر تم نے مجھ سے مدد
 لینے کا فیصلہ کیوں کیا۔ بلکہ کیسے کر لیا، تم مجھے خاصاً پسند کرتی تھیں۔" اس نے امامہ کے جواب کا انتظار
 کئے بغیر بات جاری رکھی۔
 "میرے پاس تمہارے علاوہ دوسرا کوئی آپشن تھا ہی نہیں۔" امامہ نے مدھم آواز میں کہا۔ "میری
 اپنی کوئی فریڈا اس طرح میری مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی جس طرح کوئی لڑکا کر سکتا تھا۔ اسجہ کے
 علاوہ میں صرف جلال اور تم سے واقف تھی۔ اور سب سے قریب ترین تم تھے جس سے میں
 فوری رابطہ کر سکتی تھی، اس لئے میں نے تم سے رابطہ کیا۔" وہ مدھم آواز میں زک زک کر بولتی رہی۔
 "جہیں یقین تھا کہ میں تمہاری مدد کروں گا؟"

نہیں..... میں نے صرف ایک رسک لیا تھا۔ یقین کیسے ہو سکتا تھا مجھے کہ تم میری مدد کرو گے۔
میں نے جہیں بتایا، میرے پاس تمہارے علاوہ اور کوئی آپشن تھا ہی نہیں۔"
"یعنی تم نے ضرورت کے وقت مجھے کو پابنا لیا ہے۔" اس کے بے حد عجیب لہجے میں کسے
لگے تبصرے نے امام کو یک دم خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ بات منہ پر مارنے میں باہر تھا مگر اس
نے غلط بھی نہیں کہا تھا۔
"دیری اسٹرٹنگ۔" اس نے امام کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا وہ جیسے اپنے تبصرے پر خود ہی
مخفوق ہو ا تھا۔

☆.....☆.....☆

"میں گاڑی کچھ دیر کے لئے یہاں روکنا چاہ رہا ہوں۔ سالار نے سڑک کے کنارے بیٹے ہوئے
ایک سستے قسم کے ہوٹل اور سروس اسٹیشن کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں ذرا تازہ چیک کروانا چاہ رہا ہوں۔" گاڑی میں دوسرا تازہ نہیں ہے، رستے میں اگر کہیں جائز
فلینٹ ہو گیا تو بہت مسئلہ ہو گا۔"

امام نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ گاڑی موڑ کر اندر لے گیا۔ اس وقت دو گیس جنری اذان
ہو رہی تھی۔ ہوٹل میں کام کرنے والے دو چار لوگوں کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اسے گاڑی اندر
لائے دیکھ کر ایک آدمی باہر نکل آیا۔ شاید وہ گاڑی کی آواز سن کر آیا تھا۔ سالار گاڑی کا دروازہ کھول کر
نیچے اتر گیا۔

وہ کچھ دیر سیٹ کی پشت سے سر نکالے آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔ اذان کی آواز کچھ زیادہ بلند ہو
گئی تھی۔ امام نے آنکھیں کھول دیں۔ کار کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل آئی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر
سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"یہاں کئی دیر رکتا ہے۔" وہ سالار سے پوچھ رہی تھی۔

"دس چندرہ منٹ۔" میں انجین بھی ایک وفد چیک کروانا چاہتا ہوں۔"

"میں نماز پڑھنا چاہتی ہوں، مجھے وضو کرنا ہے۔" اس نے سالار سے کہا۔ اس سے پہلے کہ سالار

کچھ کہتا۔

اس آدمی نے بلند آواز میں اسے پکارا ہے تو نے کہا۔

"پانی کا وضو کرنا ہے تو اس ڈرم سے پانی لے لیں۔"

"اور وہ نماز کہاں پڑھے گی؟" سالار نے اس آدمی سے پوچھا۔

"یہ سامنے والے کمرے میں..... میں جائے نماز دے دیتا ہوں۔" وہ اب پاپ آتار رہا تھا۔

"پہلے جائے نماز دے دوں پھر انجین آکر چیک کرتا ہوں۔" اس آدمی نے اس کمرے کی طرف
جاتے ہوئے کہا۔

سالار نے دور سے امام کو اس ڈرم کے پاس کچھ تذبذب کی حالت میں کھڑے دیکھا۔ وہ لا شعوری
طور پر آگے چلا آیا۔ وہ تارکول کا ایک بہت بڑا خانہ ڈرم تھا جسے ایک ڈسکن سے گور کیا گیا تھا۔
"اس میں سے پانی کیسے لوں؟" امام نے قدموں کی چابپ پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سالار نے ادھر
اُدھر نظر دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر ایک پائلی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس پائلی کو اٹھا لیا۔
"میرا خیال ہے یہ اسی پائلی کو پانی نکالنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔" اس نے امام سے کہتے

ہوئے ڈرم کا ڈسکن اٹھا کر اس میں سے پانی پائلی میں بھر لیا۔

"میں کروا دیتا ہوں وضو۔" سالار کو اس کے چہرے پر بے حد تذبذب نظر آیا مگر پھر کچھ کہنے کے بجائے
وہ اپنے سونپٹری آسٹین اوپر کرنے لگی۔ اپنی گھڑی اتار کر اس نے سالار کی طرف بڑھا دی اور بچوں کے
بل زینٹ پر بیٹھ گئی۔ سالار نے اس کے بازو سے ہوتے ہاتھوں پر کچھ پانی ڈالا۔ امام کو بے اختیار جیسے
کرنٹ لگا۔ اس نے ٹیک دم اپنے ہاتھ پیچھے کر لئے۔

"کیا ہوا؟" سالار نے کچھ حیرانی سے کہا۔

"کچھ نہیں مانی بہت غلطی ہے۔" قربانی ڈالو۔" وہ ایک بار پھر ہاتھ پھیلا رہی تھی۔

سالار نے پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ وضو کرنے لگی۔ ٹیبل بار سالار نے اس کے ہاتھوں کو کھینچ
تک دیکھا۔ کچھ دیر کے لئے وہ اس کی کلائیوں سے نظر نہیں ہٹا سکا۔ پھر اس کی نظر اس کی کلائیوں سے اس
کے چہرے پر چلی گئی۔ وہ اپنی چادر کو ہٹا کر بغیر بڑی احتیاط کے ساتھ سر، کانوں اور گردن کا مسح کر رہی
تھی اور سالار کی نظر اس کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ مسخر کر رہی تھی۔ اس کی گردن میں
موجود سونے کی چین اور اس میں لٹکنے والے موتی کو بھی اس نے ٹیبل بار پر یافت کیا تھا۔ سالار نے اسے
بجٹی بار دیکھا تھا اسی طرح کی چادر میں دیکھا تھا۔ چادر کا رنگ مختلف ہوتا مگر وہ ہمیشہ اسے ایک ہی انداز
میں لپیٹے ہوتی۔ وہ بھی اس کے خدو خال پر غور نہیں کر سکا۔

"پاؤں پر پانی ہی خود ڈال لیتی ہوں۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے سالار کے ہاتھ سے اس پائلی

کو پکڑ لیا جواب تقریباً ثانی ہونے والی تھی۔ سالار چند قدم پیچھے ہٹ کر ٹھہر گیا۔

وہ وضو کر چکی تو سالار کی ٹھہرت ختم ہوئی۔ اس نے گھڑی اس کی طرف بڑھا دی۔

آگے پیچھے چلتے ہوئے وہ اس کمرے تک آئے جہاں وہ آدمی گیا تھا۔ وہ آدمی اب تک کمرے میں

ایک طرف مصطفیٰ بیٹھا تھا۔ امام خاموشی سے جائے نماز کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے میں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی پتلی بھی پڑی ہوئی تھی۔ سالار فوری طور پر اس کمرے

باب ۴

لاہور کی حدود میں داخل ہوتے ہی امامہ نے اس سے کہا۔ ”اب تم مجھے کسی بھی اسٹاپ پر اتار دو..... میں چلی جاؤں گی۔“

”تم جہاں جانا چاہتی ہو، میں تمہیں وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ اتنی دھند میں کسی ٹرانسپورٹ کا انتظار کرتے تمہیں بہت وقت لگے گا۔“ سڑکیں اس وقت تقریباً ویران تھیں، حالانکہ صبح ہو چکی تھی مگر دھند نے ہر چیز کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

”مجھے نہیں پتا، مجھے کہاں جانا ہے پھر تمہیں میں کس جگہ کا پتا بتاؤں۔ ابھی تو شاید میں ہاسٹل جاؤں اور پھر وہاں.....“ سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تو پھر میں تمہیں ہوسٹل چھوڑ دیتا ہوں۔“ کچھ فاصلہ اسی طرح خاموشی سے طے ہوا پھر ہاسٹل سے کچھ فاصلے پر امامہ نے اس سے کہا۔

"بس تم یہاں گاڑی روک دو، میں یہاں سے خود چلی جاؤں گی۔ میں تمہارے ساتھ بائبل نہیں چاہتی۔" سالار نے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی۔

"کچھ کچھ ہفتوں میں تم میری بہت مدد کی ہے، میں اس کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ تم میری مدد کرتے تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رُکے۔ "تمہارا موبائل ابھی میرے پاس ہے، مگر مجھے ابھی اس کی ضرورت ہے، میں کچھ عرصہ بعد اسے واپس بجھا دوں گی۔" "اس کی ضرورت نہیں، تم اسے رکھ سکتی ہو۔"

"میں کچھ دنوں بعد تم سے دوبارہ رابطہ کروں گی پھر تم مجھے طلاق کے بچے زنجبوا دینا۔" وہ رُکے۔ "میں امید کرتی ہوں کہ تم میرے بچے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"یہ کہنے کی ضرورت تھی؟" سالار نے جیٹوں سے اچانک سے بولے۔ "مجھے کچھ بتانا ہوتا تو میں بہت پہلے چکا ہوتا۔" سالار نے قدرے سرد مہری سے کہا۔ "تم مجھے بہت برا لگا جھگڑتی تھیں، کیا ابھی بھی تمہاری میرے بارے میں وہی رائے ہے یا تم نے اپنی رائے میں کچھ تبدیلی کی ہے۔" سالار نے اچانک جھکی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے پوچھا۔

"جھپٹیں نہیں لگنا کہ میں دراصل بہت اچھا لڑکا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔" امامہ نے دم آواز میں کہا۔ سالار کو اس کی بات پر جیسے شاک لگا۔ "ہو سکتا ہے۔" وہ بے یقینی سے مسکرایا۔ "ابھی بھی ہو سکتا ہے۔ تم بہت ناشکری ہو امامہ، میں نے تمہارے لئے کتاب کچھ کیا ہے جو اس زمانے میں کوئی لڑکا نہیں کرے گا اور تم پھر بھی مجھے اچھا ماننے پر تیار نہیں۔"

"میں ناشکری نہیں ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم نے مجھ پر بہت احسان کئے ہیں اور شاید تمہاری جگہ کوئی دوسرا بھی نہ کرتا۔"

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تو میں اچھا ہوا۔"

وہ کچھ نہیں بولی، صرف اسے دھکیلتی رہی۔

"نہیں، مجھے پتا ہے تم یہی کہنا چاہتی ہو، مالا مال شادی کی خاموشی اس کا اقرار ہوتی ہے مگر تمہاری خاموشی تمہارا انکار ہوتی ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

"ہم ایک فضول بحث کر رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔" سالار نے کندھے سے اچانک سے۔ "مگر مجھے حیرانی ہے کہ تم۔"

اس بار امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے میرے لئے یقیناً بہت کچھ کیا ہے۔ اور اگر میں تمہیں جانتی نہ ہوتی تو یقیناً میں تمہیں ایک بہت اچھا انسان سمجھتی اور کہہ بھی دیتی۔ مگر میں تمہیں اتنی

ابھی طرح جانتی ہوں کہ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ تم ایک اچھے انسان ہو۔" وہ رُکے۔ سالار ٹکلیں بچکانے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

"جو آبی خود کشی کی کوشش کرتا ہو، شراب پیو ہو جس نے اپنا کمرو عورتوں کی رہن تصویروں سے بھر رکھا ہو۔" وہ اچھا آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ امامہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"تم کسی ایسے آدمی کے پاس جاتیں جو یہ چیزیں کام نہ کرنا مگر تمہاری مدد بھی نہ کرنا تو کیا تمہارے لئے وہ اچھا آدمی ہو تا؟" سالار نے تیز آواز میں کہا۔ "جیسے جلال العصر؟"

امامہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "ہاں، اس نے میری مدد نہیں کی، مجھ سے شادی نہیں کی مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ برا ہو گیا ہے۔ وہ اچھا آدمی ہے۔ ابھی بھی میرے نزدیک اچھا آدمی ہے۔"

"اور میں نے تمہاری مدد کی۔" تم سے شادی کی مگر یقیناً اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اچھا ہو گیا ہوں، میں برا آدمی ہوں۔" وہ جب سے انداز میں کہتے ہوئے مسکرایا۔ "تمہارا خود اپنے بارے میں کیا خیال ہے امامہ۔ کیا تم ابھی لڑکی ہو؟"

اس نے اچانک جیسے ہوئے انداز میں پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا۔

"میرے نزدیک تم بھی اچھی لڑکی نہیں ہو، تم بھی ایک لڑکے کے لئے اپنے گھر سے بھاگی ہو۔ اپنے منگیتر کو دھوکا دیا ہے تم نے۔ اپنی فیملی کی عزت کو خراب کیا ہے تم نے۔" سالار نے ہر لحاظ

بالائے طاقت رکھتے ہوئے صاف کوئی سے کہا۔

امامہ کی آنکھوں میں ہلکی سی ٹہنی آئی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، میں واقعی اچھی لڑکی نہیں ہوں۔ ابھی مجھے یہ جملہ بہت سے لوگوں سے سنا ہے۔"

"میں تمہیں بہت لمبی چوڑی وضاحت دے سکتی ہوں مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں، تم ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے۔"

"فرض کرو، میں تمہیں لاہور نہ لے کر آتا کہیں اور لے جاتا پھر۔۔۔ مگر میں تمہیں بھلائی یہاں لے آیا۔ یہ میرا تم پر کتنا بڑا احسان ہے، تمہیں انداز ہے اس کا۔"

امامہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے یقین تھا تم مجھے کہیں اور نہیں لے جاؤ گے۔"

وہ اس کی بات پر ہنسا۔ "مجھ پر یقین تھا۔ کیوں؟ میں تو ایک برا لڑکا ہوں۔"

"مجھے تم پر یقین نہیں تھا۔ اللہ پر یقین تھا۔" سالار کے ہاتھ پر کچھ بل پڑ گئے۔

"میں نے اللہ اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کچھ سمجھ چھوڑ دیا ہے، یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ دو مجھے تمہارے جیسے آدمی کے ہاتھوں زمرہ کرے، یہ ممکن ہی نہیں تھا۔"

”فرض کرو ایسا ہو جائے۔“ سالار مصر ہوا۔ ”میں ایسی بات کیوں فرض کروں جو نہیں ہوتی۔“ وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

”یعنی تم مجھے کسی قسم کا کوئی کرینٹ نہیں دو گی۔“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں مسکرایا۔
 ”مجھ فرض کرو میں اب تمہیں جانے نہیں دیتا تو تم کیا کرو گی۔ گاڑی کا دروازہ جب تک میں نہیں نکلوں گا، نہیں کھلے گا۔ یہ تم جانتی ہو۔ اب بتاؤ تم کیا کرو گی۔“

وہ بیک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ ”پائیس یہ کرتا ہوں۔“ سالار نے فیش بورڈ پر پڑا ہوا پائیس موبائل اٹھایا اور اس پر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ”کہ تمہارے گھر فون کر دیتا ہوں۔“ اس نے موبائل کی اسکرین کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس پر امامہ کے گھر کا نمبر تھا۔

”میں انہیں تمہارے بارے میں بتاتا ہوں کہ تم کہاں ہو، کس کے ساتھ ہو۔ پھر یہاں سے تمہیں سیل فون یا پس اسٹیشن لے جا کر ان کی تحویل میں دے دیتا ہوں۔“ تو پھر تمہارے اعتقاد اور اعتبار کا کیا ہوا۔“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

امامہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ سالار کو بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ سالار نے موبائل آف کرتے ہوئے ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

”تھنا بڑا احسان کر رہا ہوں میں تم پر کہ ایسا نہیں کر رہا۔“ اس نے موبائل کو دروازہ فیش بورڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ تم بے بس ہو، کچھ بھی نہیں کر سکتیں، اسی طرح رات کو میں تمہیں نہیں اور لے جاتا تو تم کیا کر لیتیں۔“

”میں تمہیں شوٹ کر دیتی۔“ سالار نے جبرانی سے اسے دیکھا پھر قہقہہ مار کر ہنسا۔
 ”کیا کر رہتی۔۔۔ میں۔۔۔ تمہیں۔۔۔ شوٹ۔۔۔ کر دیتی۔“

اس نے اسی انداز میں ڈک ڈک کر اس سے کہا۔ وہ اسٹیرنگ پر دو دھڑکنے لگا کر ہنسا۔
 ”ابھی زندگی میں بھلا دیکھا بھی ہے تم نے۔“ اس نے امامہ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

سالار نے اسے سمجھتے اور اپنے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھا دیے دیکھا۔ جب وہ سیدھی ہوئی تو اس نے سالار سے کہا۔ ”شاید اسے کہتے ہیں۔“

سالار ہنسا بھول گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چھوٹے سا زک ایک بہت خوب صورت اور قیمتی لیڈر ہینڈ بٹول تھا۔ سالار ہینڈ بٹول پر اس کے ہاتھ کی گرفت دیکھ کر جان گیا تھا کہ وہ کسی انمازی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اس نے بے چینی سے امامہ کو دیکھا۔

”تم مجھے شوٹ کر سکتی تھیں؟“
 ”ہاں، میں تمہیں شوٹ کر سکتی تھی مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ تم مجھے کوئی دھوکا نہیں دیا۔“

اس نے مستحکم آواز میں کہا۔ اس نے ہینڈ بٹول سالار کی طرف نہیں کیا تھا، صرف اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔
 ”گاڑی کا لاک۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے سالار سے کہا۔ سالار نے فیر ارادوی طور پر اپنی طرف موجود بینک پارک لاک کھول دیا۔ امامہ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اب ہینڈ بٹول اپنی گود میں موجود بیک میں رکھ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ امامہ نے گاڑی سے باہر نکل کر اس کا دروازہ بند کر دیا۔ سالار نے اسے تیز قدموں کے ساتھ ایک قریب آتی ہوئی دین کی طرف چلتے اور پھر اس میں سوار ہوتے دیکھا۔

اس کی قوت مشاہدہ بہت تیز تھی۔ وہ کسی بھی شخص کے چہرے کو پڑھ سکتا تھا۔ اور اسے اس چیز پر براہِ زعم تھا۔ مگر وہاں اس دھند آلود سڑک پر گاڑی پر بیٹھے ہوئے اس نے اعتراض کیا۔ وہ امامہ ہاتھ کو نہیں جان سکا تھا۔ وہ اگلے کئی منٹ اسٹیرنگ پر دو دھڑکنے کے عالم میں وہیں بیٹھا رہا تھا۔ امامہ ہاتھ سے اس کی اس پانچویں کی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ ابھی پر دھند کی پردا کے بغیر پوری رفتار سے گاڑی چلا کر آیا تھا۔ پھر راستہ اس کا ذہن اسی آویز بن گیا کہ ابو القاکر اس نے ہینڈ بٹول آخر کہاں سے لگایا تھا۔ وہ پورے وقتوں سے کہہ سکتا تھا کہ جس وقت وہ دھوکے لگے پاؤں ادھوری تھی اس وقت وہ ہینڈ بٹول اس کی ہینڈ کے ساتھ نہیں تھا اور وہ ضرور اسے دیکھ لیتا۔ بعد میں غماز پڑھنے کے دوران بھی وہ بغور اس سے پوچھتا تھا، ہینڈ بٹول تب بھی اس کی ہینڈ کے ساتھ بندھا ہوا نہیں تھا۔ وہ ہر گز گمانے اور چاہنے پینے کے بعد گاڑی میں آکر بیٹھ گئی تھی اور وہ کچھ دیر بعد گاڑی میں آیا تھا۔ یہ یقیناً گاڑی میں موجود اس کے بیک میں ہی ہو گا۔ وہ اندازے لگا رہا تھا۔

وہ جس وقت اپنے گھر پہنچا اس کا مونا آف تھا۔ گیٹ سے گاڑی اندر لے جاتے ہوئے اس نے چمکیدار کو اپنی طرف بلایا۔ ”رات کو میں جس لڑکی کے ساتھ یہاں سے گیا تھا تم اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گے بلکہ میں رات کو کہیں نہیں آئی۔“ اس نے گماندار انداز میں کہا۔

”جی۔۔۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“ چمکیدار نے فرما کر وارسی سے سر ہلایا۔ وہ صبح نہیں تھا کہ ایسی چیزوں کے بارے میں کسی کو بتانا پھرے۔

اپنے کمرے میں آکر وہ اطمینان کے ساتھ سو گیا۔ اس کا اس دن کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا۔
 ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وہ اس وقت گہری نیند میں تھا، جب اس نے اچانک کسی کو اپنے کمرے کے دروازے کو زور زور سے بجاتے سنا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ واقعی بجا رہا تھا۔ اس نے مندی ہوئی نظروں سے وال کھاک کو دیکھا جب چار بھاری ہاتھ۔ اپنی آنکھوں کو دگڑتے ہوئے وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے دروازہ

بجائے والے پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اسی غصے کے عالم میں اس نے بڑبڑاتے ہوئے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ باہر ملازم کھڑا تھا۔

”کیا تکلیف ہے جنہیں؟“ کیوں اس طرح دروازہ کھلا رہا ہے ہو؟ دروازہ تو لڑنا چاہیے ہو تم؟“ وہ دروازہ کھولتے ہی ملازم پر چلا آیا۔

”سالار صاحب باہر پولیس کھڑی ہے۔“ ملازم نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ سالار کا غصہ اور تیز ایک منٹ میں غائب ہو گئے۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں وہ پولیس کے وہاں آنے کی وجہ جان گیا تھا اور اسے ان کی اور اماند کے گھر والوں کی اس مستعدی پر حیرت ہوئی تھی۔ آخر وہ چند لمحوں میں سیدھے اس تک کیسے پہنچ گئے تھے۔

”کس لئے آئی ہے پولیس؟“ اس نے اپنی آواز کو پرسکون رکھتے ہوئے بے تاثر چہرے کے ساتھ پوچھا۔

”یہ تو جی بٹا نہیں، وہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ آپ سے ملنا ہے، مگر یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے گینٹ نہیں کھولا۔ اس نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ گھر پر نہیں ہیں مگر ان کے پاس آپ کے وارنٹ ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر انہیں اندر نہیں آئے دیگیا تو وہ زبردستی اندر آ جائیں گے اور تمام لوگوں کو گرفتار کر کے لے جائیں گے۔“

سالار نے بے اختیار اطمینان بھرا سانس لیا۔ چونکہ اندر واقعہ بڑی عقل مند کی مظاہر کیا تھا۔ اسے یقیناً یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس رات والی لڑکی کے معاملے میں ہی تفتیش کے لئے وہاں آئی تھی اس لئے اس نے نہ تو پولیس کو اندر آنے دیا نہ ہی انہیں یہ بتایا کہ سالار گھر پر موجود تھا۔

”تم فکرمست کرو۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔“ سالار نے ملازم سے کہا اور واپس اپنے بیڈ روم میں آ گیا، وہ کسی عام شہری کا گھر ہوتا تو پولیس شاید وہاں پر پہلاٹک کر بھی اندر موجود ہوتی مگر اس وقت وارنٹ ہونے کے باوجود اس گھر کا سائز اور جس علاقے میں وہ واقع تھا انہیں خوف میں مبتلا کر رہے تھے۔ اگر اماند کا خاندان بھی اثر و سوغ والا نہیں ہوتا تو شاید اس وقت پولیس اس سیکٹر میں آنے اور خاص طور پر وارنٹ کے ساتھ آنے کی جرأت نہ ہی نہ کرتی مگر اس وقت پولیس کے سامنے آگے کتوں پیچھے کٹائی والی صورت تھی۔

سالار نے بیڈ روم کے اندر آتے ہی فون اٹھا کر کراچی سکندر عثمان کو فون کیا۔

”پاپا! ایک چھوٹا سا پیراٹم ہو گیا ہے۔“ اس نے چھوہتے ہی کہا۔

”یہاں ہمارے گھر کے باہر پولیس کھڑی ہے اور ادارے کے پاس میرے گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔“

سکندر عثمان کے ہاتھ سے موہاں گرتے گرتے چلا۔

”کیوں؟“

”یہ تو جی نہیں پاپا۔۔۔۔۔ میں سو رہا تھا، ملازم نے چکا کر مجھے بتایا، کیا میں جا کر پولیس والوں سے پوچھوں کہ وہ کس سلسلے میں مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں؟“ سالار نے بڑی فرمانبرداری اور معصومیت کے ساتھ سکندر عثمان سے پوچھا۔

”جنہیں باہر نکلے پولیس کو اندر بلوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے کمرے میں بیٹھ رہو۔ میں تھوڑی دیر بعد جنہیں رنگ کرتا ہوں۔“ سکندر عثمان نے جلت کے عالم میں موہاں بند کر دیا۔ سالار نے مطمئن ہو کر فون رکھ دیا وہ جانتا تھا کہ اب کچھ دیر بعد پولیس وہاں نہیں ہوگی اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ملازم نے آکر اسے پولیس کے جانے کے بارے میں بتایا۔ ملازم اب بھی اس سے بات کر رہی رہا تھا جب سکندر نے وہ دروازہ کال کی تھی۔

”پولیس چلی گئی ہے؟“ سکندر نے اس کی آواز سننے ہی کہا۔

”ہاں چلی گئی ہے۔“ سالار نے بے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

”اب تم میری بات ٹھیک طرح سنو۔ میں اور تمہاری بیوی رات کو کراچی سے اسلام آباد پہنچ رہے ہیں۔ تم جب تک گھر سے کہیں نہیں نکلو گے۔“ سالار نے اس کے بات کرنے کا انداز بہت عجیب سا کیا۔ انہوں نے بہت اگلا انداز اور سرد مہری سے اس سے بات کی تھی۔

”من لیا۔“ وہ دوسری طرف سے فون بند کر چکے تھے۔

سالار ابھی فون بند کر رہا تھا جب اس کی نظر اپنے کمرے کے کارپٹ پر پڑی۔ وہاں جوتے کے نشانات تھے اور اس نے دیکھا کہ ملازم بھی قدرے حیرانی کے عالم میں ان نشانات کو دیکھ رہا تھا جو کھڑکی سے قطار کی صورت میں بڑھ رہے تھے۔

”جوتے کے ان نشانات کو صاف کرو۔“ سالار نے حکیمانہ انداز میں کہا۔

ملازم کمرے سے باہر نکلا، سالار آٹھ کر کھڑکی کی طرف آ گیا اور اس نے وہ سلائیٹنگ ونڈو پوری طرح کھول دی۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا، جوتے کے دو مٹی والے نشانات باہر برآمدے میں بھی موجود تھے۔ اماند اپنی کپڑیوں سے گرد کر دیا اور پھلاٹک کر ان کی کپڑیوں میں کودی تھی اور مٹی وچ تھی کہ اس کے جوتے کے تھم مٹی سے بھر گئے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ مٹی کم اور کچھ زیادہ تھی اور اس کے برآمدے کے سفید ماربل پر وہ نشانات بالکل ایک قطار کی صورت میں آ رہے تھے۔ وہ ایک گہری سانس لیتا ہوا اندر آ گیا، ملازم کمرے میں ان نشانات کو صاف کرنے میں مصروف تھا۔

”باہر برآمدے میں بھی بیروں کے کچھ نشانات ہیں انہیں بھی صاف کر دینا۔“ سالار نے اس سے کہا۔

"یہ کس کے نشان ہیں۔" ملازم زیادہ دیر اپنے تجسس پر قابو نہیں رکھ سکا۔
"میرے۔" سالار نے اکثر لہجے میں کہا۔

☆ ☆ ☆

دو رات کو کھانا کھانے میں مصروف تھا جب سکندر عثمان اور طیبہ آگئے تھے۔ ان دونوں کے چہرے سستے ہوئے تھے۔ سالار اطمینان سے کھانا کھا رہا تھا۔ وہ دونوں اسے مخاطب کے بغیر اس کے پاس سے گزر کر چلے گئے تھے۔
"کھانا ختم کر کے میرے کمرے میں آؤ۔" سکندر عثمان نے جاتے جاتے اس سے کہا تھا۔ سالار نے جواب دینے کے بجائے فروٹ اپنی پلیٹ میں نکال لی۔
پندرہ منٹ بعد وہ جب ان کے کمرے میں گیا تو اس نے سکندر کو کمرے میں بیٹھے ہوئے پایا جب کہ طیبہ فکر مند کی حالت میں سونے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔
"پاپا! آپ نے بلوایا تھا؟" سالار نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔
"ظہور پھر تھیں تانا تو ہوں کیوں بلایا ہے۔" سکندر عثمان نے اسے دیکھتے ہی جھلنا بند کر دیا۔ وہ بڑے اطمینان سے طیبہ کے برابر بیٹھ گیا۔

"امام کہاں ہے؟" سکندر نے لمحہ ضائع کے بغیر پوچھا۔
"کون امام؟" اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے چہرے پر تھوڑی بہت گھبراہٹ ضرور ہوتی، مگر وہ اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

سکندر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تمہاری بہن۔" وہ فرماتے۔
"میری بہن کا نام امیتا ہے پاپا۔" سالار کے اطمینان میں کوئی کمی نہیں آئی۔
"مجھے تم صرف ایک بات بتاؤ۔ آخر تم مجھے اور کتنی بار اور کتنے طریقوں سے ذلیل کر دو گے۔"

اس بار سکندر عثمان دوسرے صوف پر بیٹھ گئے۔
"آپ کیا کہہ رہے ہیں، پاپا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔" سالار نے حیرانی سے کہا۔ "حالانکہ تمہاری سمجھ میں بہت کچھ آ رہا ہے۔" انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "دیکھو، مجھے آرام سے بتا دو کہ امام کہاں ہے۔ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا کہ تم سمجھ لیا ہے۔"
"پاپا! آپ کس امام کی بات کر رہے ہیں۔ میں کسی امام کو نہیں جانتا۔"
"میں دسویں بہن کی بات کر رہا ہوں۔" سکندر عثمان اس بار فرماتے۔
"دسویں بہن؟" وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ "اچھا۔ یاد آیا۔ وہ جس نے مجھے ٹریسٹ دیا تھا

"ہاں وہی۔۔۔۔۔ اب چونکہ تمہاری یادداشت واپس آگئی ہے اس لئے مجھے یہ بھی بتا دو کہ وہ کہاں ہے۔"

"پاپا! وہ اپنے گھر میں ہوگی یا میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں۔ میرا اس سے کیا تعلق؟" اس نے حیرانی سے سکندر سے کہا۔ "اس کے باپ نے تمہارے خلاف اپنی بیٹی کے اغوا کا کیس کروا دیا ہے۔"
"میرے خلاف۔۔۔۔۔ I don't believe it! میرا امام سے کیا تعلق ہے؟" اس نے پرسکون لہجے اور بے اثر چہرے کے ساتھ کہا۔

"تمہیں تو میں جانتا چاہتا ہوں کہ تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"
"پاپا! میں اس کو جانتا تک نہیں ہوں۔ ایک دو بار کے علاوہ میں اس سے ملا تک نہیں۔ پھر اس کے اغوا سے میرا کیا تعلق اور مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ اغوا ہو گئی ہے۔"
"سالار! اب یہ ایکٹنگ بند کرو۔ مجھے بتا دو کہ وہ جہاں ہے۔ میں نے ہاشم تبیین سے وعدہ کیا ہے کہ میں ان کی بیٹی کو ان تک پہنچاؤں گا۔"

"تو آپ اپنا وعدہ پورا کریں اگر ان کی بیٹی کو ان تک پہنچا سکتے ہیں تو ضرور پہنچائیں، مگر مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہے ہیں۔" اس بار سالار نے ناگواری سے کہا۔

"دیکھو سالار! تمہاری اور امام کے درمیان اگر کسی جھمکی اندر اسٹینڈنگ ہے تو ہم اس معاملے کو حل کر لیں گے۔ میں خود تمہاری اس کے ساتھ شادی کروا دوں گا۔ تم فی الحال یہ بتا دو کہ وہ کہاں ہے۔" سکندر عثمان نے اس بار اپنے لب دلچسپی میں تبدیل کر لیا۔

"قادر کا سبک پاپا۔ اسٹاپ۔ کون سی اندر اسٹینڈنگ، دیکھی شادی۔ میری کسی کے ساتھ اندر اسٹینڈنگ ہوتی تو میں اسے اغوا کروں گا اور میں اندر اسٹینڈنگ ڈیپ کروں گا امام جی لڑکی کے ساتھ۔ وہ میری ٹائپ ہے؟" اس بار سالار نے بلند آواز میں کہا۔
"تو پھر وہ تم پر اس کے اغوا کا الزام کیوں لگا رہے ہیں؟"

"یہ آپ ان سے پوچھیں۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس نے اسی ناگواری سے جواب دیا۔
"آج ہاشم تبیین کہہ رہے ہیں کل کو کوئی اور آکر کہے گا اور آپ پھر مجھ پر چلانا شروع کر دیں گے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے میں سو رہا تھا جب پولیس آکر باہر کھڑی ہو گئی اور اب آپ آگئے ہیں اور آتے ہی مجھ پر۔ مجھے تو یہ تک نہیں پتا کہ دسویں بہن اغوا ہوئی ہے یا نہیں۔ آخر وہ لوگ مجھ پر الزام کیوں لگا رہے ہیں۔ کیا ثبوت ہے ان کے پاس کہ میں نے ان کی بیٹی کو اغوا کیا ہے اور باغرض میں نے اغوا کیا بھی ہے تو کیا میں یہاں اپنے گھر بیٹھا رہوں گا۔ مجھے اس وقت اس لڑکی کے ساتھ ہونا چاہیئے۔"

”مجھے ایس بی سے تمہارے کہیں کی تھیلیاں کاٹنا چاہیے، پھر میں نے کراچی سے ہاشم مبین کو فون کیا، وہ مجھ سے بات کرنے پر تیار نہیں تھا۔ مجھے اس سے بات کرنے کے لئے منتیں کرنی پڑیں۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ اس کی بیٹی رات کو غائب ہوئی ہے۔ اور تم بھی رات کو گئے ہو اور صبح آئے ہو۔“

”تو پاپا! اس میں اغوا کہاں سے آیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں رات کو کہیں نہیں گیا اور دوسری بات یہ ہے کہ اغوا کرنے کے لئے کسی کے گھر جا کر لڑکی کو زبردستی لے جانا ضروری ہے اور میں کسی کے گھر نہیں گیا۔“

”ہاشم مبین کے چوکیدار نے رات کو تمہیں جاتے اور صبح آتے دیکھا ہے۔“

”اس کا چوکیدار جھوٹا ہے۔“ سالار نے بلند آواز میں کہا۔

”میرے چوکیدار نے تمہیں رات کو ایک لڑکی کو کار میں لے جاتے دیکھا ہے۔“ سکندر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ سالار چند لمبے کچھ بول نہ سکا۔ سکندر یقیناً گھر آئی ہی چوکیدار سے بات کر چکے تھے۔

”دو میری ایک فریڈ بھی جسے میں گھر چھوڑنے گیا تھا۔“ اس نے طیبہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کون ہے وہ فریڈ؟ اس کا نام اور پتہ بتاؤ۔“

”سوری پاپا میں نہیں بتا سکتا۔ it's personal۔“

”یہاں اسلام آباد چھوڑنے گئے تھے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”تم اسے لاہور چھوڑ کر آئے ہو۔ ایس بی نے مجھے خود بتایا ہے۔ تم چار ناکوں سے گزرے ہو۔

چاروں پر تھہرا انگریز نوٹ کیا کیا ہے۔ رستے میں تم نے اس سروس اسٹیشن پر ڈک کر گاڑی چیک کروائی ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ وہاں کھانا کھایا ہے۔“ سکندر نے اس سروس اسٹیشن اور ہوٹل کا نام بتاتے ہوئے کہا۔ سالار کچھ دیر سکندر کو دیکھتا رہا مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ ”ایس بی نے مجھے یہ سب کچھ خود بتایا ہے۔ اس نے ابھی ہاشم مبین کو یہ سب کچھ نہیں بتایا۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم سے بات کروں اور خاموشی کے ساتھ لڑکی کو وہاں پہنچا دوں یا اس کے گھر والوں کو اس لڑکی کا پتا بتا دوں تاکہ یہ معاملہ خاموشی سے کسی مسئلے کے بغیر ختم ہو جائے مگر وہ کب تک ہاشم مبین کو نہیں بتائے گا۔ دودھتی کا لٹا کر کے سب کچھ چھپا بھی کیا تب بھی ہاشم مبین کے اور بہت سے ذرائع ہیں۔ اسے وہاں سے رہا چل جائے گا اور پھر تمہاری پوری زندگی جیل میں گزرے گی۔“

سکندر نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔ وہ متاثر ہوئے بغیر انہیں دیکھتا رہا۔

”اب جھوٹ بولنا چھوڑ دو اور مجھے بتا دو کہ وہ لڑکی کہاں ہے۔“

”وہ لڑکی ریڈ لائٹ ایریا میں ہے۔“ سکندر کو اس کی بات پر کزنٹ لگا۔

”واٹ۔۔۔؟“

”میں اسے وہاں سے لایا تھا، وہاں چھوڑ آیا ہوں۔“

وہ سفید چہرے کے ساتھ سالار کو دیکھتے رہے۔

”مگر وہ اہماد نہیں تھی، میں برسوں لاہور گیا ہوا تھا وہاں سے میں رات گزارنے کے لئے اس لڑکی کو لایا تھا، آج میں اسے وہاں چھوڑ آیا۔ میرے پاس اس کا کوئی کاغذات نمبر تو نہیں ہے، مگر آپ میرے ساتھ لاہور پھیں تو میں آپ کو اس لڑکی کے پاس لے جاتا ہوں یا پتا بتا دیتا ہوں آپ خود پاپا میں کو کہیں کہ دو اس لڑکی سے تصدیق کر لیں۔“

کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ طیبہ اور سکندر بے یقینی سے سالار کو دیکھ رہے تھے جب کہ وہ بڑے مطمئن انداز میں کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم۔۔۔ تم اس طرح کی حرکت کر سکتے ہو۔ تم ایسی جگہ جاسکتے ہو؟“ ایک لمبی خاموشی کے بعد سکندر نے کہا۔

”آئی ایم سوری پاپا! مگر میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ اور اس بات کا اہماد کے بھائی وسم کو بھی پتا ہے۔ میں کئی بار ویک اینڈ پر اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں جاتا رہا ہوں اور وسم یہ بات جانتا ہے، آپ اس سے پوچھ لیں۔“

”ایڈریس دو اس لڑکی کا۔“ وہ کچھ دیر بعد فرما رہے۔

”میں اپنے کمرے سے لے کر آتا ہوں۔“ اس نے آٹھتے ہوئے کہا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے موبائل اٹھایا اور لاہور میں رہنے والے اپنے ایک دوست کو فون کرنے لگا۔ اسے ساری صورت حال بتانے کے بعد اس نے کہا۔

”اکمل! میں اپنے پاپا کو ریڈ لائٹ ایریا کے اس گھر کا پتا دے رہا ہوں جہاں ہم جاتے رہتے ہیں۔ تم وہاں کسی بھی ایسی لڑکی کو جو مجھے جانتی ہے اس کو اس بارے میں بتا دو، میں ابھی کچھ دیر تک تمہیں دوبارہ فون کرتا ہوں۔“

وہ کہتے ہوئے تیزی سے ایک چٹ پر ایک ایڈریس لکھنے لگا اور پھر اسے لے کر سکندر کے کمرے میں آیا۔ اس نے چٹ سکندر کے سامنے رک دی، جسے انہوں نے تقریباً چھین لیا۔ ایک نظر اس چٹ پر ڈال کر انہوں نے خوشنکشی نظروں سے اسے دیکھا۔

”دفعہ ہواؤ یہاں سے۔“ وہ اطمینان سے انداز میں وہاں سے آیا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے اکمل کو دوبارہ فون کیا۔

"میں جنہیں وہاں پہنچ کر فون کرتا ہوں۔" مکمل نے اس سے کہا وہ بیڈ پر لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ منٹ کے بعد مکمل نے اسے فون کیا۔

"سالار! میں نے سہیہ کو تیار کیا ہے۔ اسے میں نے سارا معاملہ سمجھا دیا ہے۔" مکمل نے اسے بتایا وہ سہیہ کو چاہتا تھا۔

"مکمل! اب تم ایک کاغذ اور پینٹل لو اور میں کچھ چیزیں لکھوا رہا ہوں اسے لکھو۔" اس نے مکمل سے کہا اور پھر اسے اپنے کمرے کے چرونی منظر اور لوکیشن کی تفصیلات لکھوا لے گا۔

"یہ کیا، میں نے دیکھا ہوا ہے تمہارا کمرہ۔" مکمل نے کچھ حیرانی سے اس سے پوچھا۔

"تم نے دیکھا ہے سہیہ نے تو نہیں دیکھا۔ یہ ساری تفصیلات میں سہیہ کے لئے لکھوا رہا ہوں اگر پولیس اس کے پاس آئی تو وہ یہ ساری چیزیں اس سے پوچھے گی صرف یہ تصدیق کرنے کے لئے کہ کیا وہ واقعی میرے ساتھ یہاں اسلام آباد میں تھی۔ دو گاڑی میں چھپ کر آئی تھی اور رات کے وقت آئی تھی اس لئے اسے زیادہ تفصیل کا نہیں پتا، مگر گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھیں اور ہائیں دو فون طرف لان ہے۔ میری گاڑی کا رنگ سرخ تھا۔ اسپورٹس کار اور نمبر..... وہ اسے لکھوا دیا۔

"ہم پولیس کے چار گاڑیوں سے گزر رہے تھے۔ اس نے سفید شہوار قمیص، سفید چادر اور سیاہ سوئٹر پہنا ہوا تھا، رستے میں ہم اس نام کے سروس اسٹیشن پر بھیڑے گئے۔" سالار نے نام بتایا، سروس اسٹیشن اور بومیل، وہ دھند کی وجہ سے صحیح طرح نہیں دیکھ سکی۔ "سالار یکے بعد دیگرے ہر چیز کی تفصیل لکھواتا گیا۔ سروس اسٹیشن پر گاڑی ٹھیک کرنے والے آدمی سے لے کر چائے پانے والے لڑکے کے محلے اور اس کمرے کی تفصیلات۔ انہوں نے کیا کہا تھا، سالار اور لڑکے کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔ اس نے چھوٹی چھوٹی تفصیلات اسے لکھوائی تھیں۔ اس نے اپنے گھر کے پورے سے لے کر اپنے کمرے تک کے راستے اور اپنے کمرے کا تمام علیہ بھی اسے نوٹ کروا دیا تھا۔

"سہیہ سے کہو یہ سب کچھ رٹ لے۔" اس نے مکمل کو آخری ہدایت دی اور فون بند کر دیا۔ فون بند کر کے وہ بیڈ پر بیٹھا ابھی کچھ سوچ رہا تھا جب سکندر مچھن اچانک وہ دروازہ کھول کر اس کے کمرے میں آئے۔

"اس لڑکی کا کیا نام ہے؟"

"سہیہ۔" سالار نے بے اختیار کہا۔ سکندر مچھن مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆☆

ان کے جانے کے بعد سالار کو اس دیکھل کا خیال آیا جس کے ذریعے انہوں نے ہاشم مین احمد سے رابطہ کیا تھا۔ اس دیکھل کو ہانڈ کرنے والا بھی حسن ہی تھا اور سالار سکندر کے نام سے وہ دیکھل بھی واقف

نہیں تھا، مگر سالار کے لئے قابل توثیق بات اس میں حسن کا زوال ہونا تھا، ہاشم مین احمد اس دیکھل سے حسن اور حسن سے اس تک بہت آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔

اس نے انکا فون حسن کو کیا اور حسن کو سارے معاملے کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

"میں جنہیں پہلے ہی اس سب سے منع کر رہا تھا۔" اس نے چھوٹے ہی سالار سے کہا۔ "میں وہم اور اس کی جعلی کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کے اثر و رسوخ سے بھی بخوبی واقف ہوں۔" وہ یوں جادو جادو۔

سالار نے کچھ کتابت بھرے لپچے میں اسے ٹوکا۔ "میں نے جنہیں فون اپنے مستقبل کا حال جاننے کے لئے نہیں کیا۔ میں صرف ایک خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں۔"

"کس خطرے سے؟" حسن چونکا۔ "تم نے جو دیکھل ہانڈ کیا تھا وہ اس کے ذریعے تم تک اور پھر مجھ تک جا آسانی پہنچ سکتے ہیں۔" سالار نے اس سے کہا۔

"میں دو گھنٹہ تک نہیں پہنچ سکتے۔" حسن نے اس کی بات پر قدرے لا پر واپی سے کہا۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ میں نے سارا کام پہلے ہی بہت محتاط ہو کر کیا ہے۔" وہ دیکھل بھی میرے اصلی نام اور پتے سے واقف نہیں ہے۔ اسے جوائیہ ریس اور فون نمبر میں نے دیا تھا وہ جعلی تھا۔

سالار بے اختیار منکرا دیا۔ اسے حسن نے ایسی لکھندی اور چالاک کی کی توقع رکھنی چاہئے تھی۔ وہ ہر کام بڑی صفائی سے سرانجام دینے کا ماہر تھا۔

"میں صرف اس کے پاس ایک بار گیا تھا پھر فون پر ہی رابطہ کیا اور اس ملاقات میں بھی میرا علیہ بالکل مختلف تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ صرف مٹپے سے ہاشم مین احمد مجھ تک پہنچ سکتے ہیں؟"

"اور اگر وہ پہنچ سکتے تو؟"

"تو..... پتا نہیں..... اس تو کہ بارے میں، میں اس سے نہیں سوچا۔" حسن نے صاف گوئی سے کہا۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم کچھ دنوں کے لئے کہیں عتاب ہو جاؤ اور وہاں ظاہر کرو کہ مجھے تمہاری یہ غیر موجودگی کچھ ضروری کاموں کے لئے تھی۔" سالار نے اسے مشورہ دیا۔

"اس سے بہتر مشورہ بھی میرے پاس ہے۔ میں اس دیکھل کو کچھ روپے پہنچا کر یہ ہدایت دے دیتا ہوں کہ ہاشم مین احمد پولیس کے پہنچے پر وہ انہیں میرا اہلکار علیہ بتائے۔ کم از کم اس طرح فوری طور پر میں کسی پریشانی کا شکار نہیں ہوں گا اور ان ہی دنوں میں وہ اپنے بھی چند ہتھکڑوں کے لئے اگلیز جادو رہا ہوں۔"

حسن نے تائید۔ "پولیس اگر پہنچ بھی گئی تو تب بھی میں ان کی پہنچ سے بہت دور رہوں گا، مگر مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکیں گے۔ اس لئے تم اطمینان رکھو۔"

”اگر تم واقعی اسے بے فکر اور مطمئن ہو تو ٹھیک ہو، ہو سکتا ہے وہ تم تک نہ ہی آئیں، مگر میں نے پھر بھی سوچا کہ میں جہیں تادوں۔“ سالار نے فون بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔
 ”ویسے تم اس لڑکی کو اب لاہور میں کہاں چھوڑ کر آئے ہو؟“

”لاہور کی ایک سڑک پر چھوڑ آیا ہوں اس کے علاوہ اور کہاں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے اپنے محل وقوع اور حدود و اربعہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ بس چلی گئی۔“

”عجیب بے وقوف ہو، کم از کم تم کو اس سے اس کا ٹھکانہ پوچھنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔“

”ہاں! مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی۔“ سالار نے دانستہ انداز سے آخری بار ہونے والی اپنی گفتگو کو ل کر دی۔

”میں جیہ ان ہوں کہ تم اب کس طرح کے معاملات میں انوالو ہونے لگے ہو۔ اپنی ٹائپ کی لڑکیوں کے ساتھ انوالو ہونا دوسری بات ہے مگر وہ سب کی بہن بھی لڑکیوں کے ساتھ انوالو ہو جانا۔ تمہارا ٹیٹ بھی دن بے دن گر جا رہا ہے۔“

”میں ”انوالو“ ہوا ہوں.....؟“ واقعی محفل سے پیدل ہو اور نہ کم از کم اس طرح کی بات مجھ سے نہ کرتے۔ ایڈوکیٹر اور انوالو مٹ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے حسن صاحب! سالار نے خیریت لکھتے میں کہا۔

”اور آپ نے یہ فاصلہ ایک ہی چھٹا جگہ میں طے کر لیا ہے سالار صاحب!“ حسن نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

”تمہارا دماغ خراب ہے اور کچھ نہیں۔“

”اور تمہارا دماغ مجھ سے زیادہ خراب ہے۔ ورنہ اس طرح کی حماقت کو ایڈوکیٹر بھی نہ کہتے۔“ حسن بھی قدر سے جھٹکایا ہوا تھا۔

”اگر تم نے میری مدد کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمہارے منہ میں جو آئے تم مجھے کہہ دو۔“ سالار کو اس کی بات پر اچانک فہم آ گیا۔

”ابھی میں نے جہیں کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ تم کس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہو۔ یہ ٹیٹ والی بات کی طرف یا دماغ خراب ہونے والی بات کی طرف؟“ حسن نے اسی انداز میں اس کے فہم سے متاثر ہونے لہجہ پر بولا۔

”مجھ اب منہ بند کر لو۔ فضول بحث مت کرو۔“

”اسی وقت ان تمام باتوں کو کرنے کا مطلب گڑے مر دے اکھاڑنا ہے۔“ حسن اب سنجیدہ تھا۔
 ”فرض کرو پولیس کسی صورت ہم تک پہنچ جاتی ہے اور پھر وہ مارا کا تپا جانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم

کیا بتائیں گے اور میں نہیں سمجھتا کہ دو کبھی بھی اس بات پر یقین کریں گے کہ امام کے بارے میں جہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ اس وقت تم کیمرہ کرو؟“

”کچھ بھی نہیں کروں گا۔ میں ان سے بھی وہی کہوں گا جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔“ اس نے ہلندہ آواز میں کہا۔

”ہاں اور سالار مسئلہ تمہارے اس بیان سے ہی شروع ہو گا۔ میں امام کے بارے میں نہیں جانتا ہوں۔“ حسن نے اس کا جملہ ڈبرایا۔ ”میں ابھی طرح اندازہ ہونا چاہنے کے دوپہر قیامت پر امام تک پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”یہ بہت بعد کی بات ہے، میں امکانات اور ممکنات پر غور کر کے پریشان نہیں ہوتا۔ جب وقت آنے لگا دیکھا جائے گا۔“ سالار نے لا پرواہی سے کہا۔

”تم مجھے صرف یہ دہ چاہئے کہ تم اس سارے معاملے کو لازمی رکھو اور پولیس کے ہتھکنڈے نہ لگو۔“

”تمہارے کہے بغیر میں بھی یہی کرتا۔ ویسے بھی میں اگر پکڑا گیا تو سب کو متہ دیکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ اس بار تم نے مجھے واقعی بڑی embarrassing صورتحال سے دوچار کیا ہے۔“

”او کے میں فون بند کر رہا ہوں کیونکہ تم پر پھر وہی دورہ پڑنے والا ہے۔ وہی نصیحتیں اور بچھڑاؤ۔“

”you are acting like my father.“

”سالار نے ٹھکانے کے فون بند کر دیا۔ اس کا ذہن کچھلی رات کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کے ماتھے کی تیریاں اور بل بہت لٹھلیاں تھیں۔

☆.....☆.....☆

”میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اس حد تک گر جائے گا۔“

”ریڈ لائٹ ایما می فٹ، کبھی میرے خاندان کی کچھلی سات لہلوں سے بھی کوئی وہاں نہیں گیا اور یہ لڑکا..... کیا ہے جو میں نے اسے نہیں دیا..... کیا ہے جس کی گردن دی ہے اور اسے دیکھو کبھی یہ خود کشی کی کوشش کرتا پھر تم پر اور کبھی ریڈ لائٹ ایما میرے اللہ..... آخر کس حد تک جائے گا؟“

سکندر عثمان نے اپنا سر قدام لیا۔

”مجھے تو گھر کے ملازموں پر بھی بہت زیادہ اعزاز ملتا ہے۔ آخر کیوں اس لڑکی کو انہوں نے اندر آنے دیا۔ گھر کے معاملات پر نظر رکھنی چاہئے انہیں۔“ طیبہ نے بات کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”گھر کے معاملات اور مالک کے معاملات پر نظر رکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہاں معاملہ گھر کا نہیں تھا، مالک کا تھا۔“ سکندر نے خیریت لکھتے میں کہا۔ ”اور پھر اس میں سے کسی نے بھی کسی لڑکی کو یہاں آئے نہیں دیکھا۔ وہ کہتا ہے وہ اسے اسی دن لایا تھا، پتہ کیا کہ اسے کہا ہے کہ ایسا نہیں ہوا اس نے

اس کے ساتھ کسی لڑکی کو آتے نہیں دیکھا۔ ہاں اجاتے ضرور دیکھا ہے ملازموں کا بھی یہی کہتا ہے۔ انہوں نے تو نہ کسی لڑکی کو آتے دیکھا ہے نہ ہی جاتے دیکھا ہے۔" سکندر نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ یقیناً اس لڑکی کو اچھی طرح چھپا کر لایا ہو گا۔"

"شیطان دماغ ہے اس کا۔۔۔۔۔ یہ تم جانتی ہو تم صرف یہ دعا کرو کہ یہ سارا معاملہ ختم ہو جائے۔ باشم مبین کی بیٹی مل جائے اور ہماری جان چھوٹ جائے تاکہ ہم اس کے بارے میں کچھ سوچ سکیں۔" سکندر عثمان نے کہا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہو گئی ہے، جس کی مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟" وہ بے حد بے بس نظر آ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ اگلے روز صبح معمول کے مطابق اٹھا اور کانچ جانے کے لئے تیار ہوئے لگا۔ ناشتہ کرنے کے لئے وہ ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو اس نے خلاف معمول وہاں سکندر عثمان کو موجود پایا۔ وہ عام طور پر اس وقت ناشتہ نہیں کیا کرتے تھے۔ ڈراپر سے فیکٹری چلا کر آتے تھے۔ سالار کو اس وقت انہیں وہاں موجود پا کر کچھ حیرت ہوئی، مگر ان کے متہوئے چہرے اور سرخ آنکھوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ ساری رات نہیں سو سکے۔

سالار کو صبح باہر نکلنے کے لئے تیار دیکھ کر انہوں نے قدر درستی سے اس سے کہا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"کانچ۔"

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔۔۔ میرے گلے میں یہ مصیبت ڈال کر تم خود کانچ جا رہے ہو۔ جب تک یہ معاملہ ختم نہیں ہو جاتا تم نہیں چلاؤ گے۔ تمہیں پتا ہے کہ تم کتنے خطرے میں ہو؟"

"کیسا خطرہ؟" وہ شکا۔

"میں نہیں جانتا باشم مبین تمہیں کوئی نقصان پہنچائے۔ اس نے فی الحال تمہارے لئے یہاں بہتر ہے کہ تم گھر پر رہو۔" سکندر عثمان نے دو نوک لہجے میں کہا۔ "اس کی بیٹی مل جائے پھر تم دوبارہ کانچ جانا شروع کر دیتا۔"

"اس کی بیٹی اگر ایک سال نہیں ملے گی تو کیا میں ایک سال تک اندر بیٹھا رہوں گا۔ آپ نے اسے میرے بیان کے بارے میں بتایا نہیں ہے۔" سالار نے تیز لہجے میں کہا۔

"میں اسے بتا چکا ہوں۔ سب سے بڑی بھی تمہاری بات کی تصدیق کر دی تھی۔" ان کے لہجے میں سب سے کا نام لیتے ہوئے تھی۔ "مگر باشم مبین ابھی میرے گھر ہے کہ اس کی بیٹی کو تم نے ہی اغوا کیا ہوا ہے۔"

"تمہیں کیا کروں۔۔۔۔۔ اسے یقین نہیں آتا تو نہ آئے۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ سالار نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے ناشتہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"تمہیں فرق نہیں پڑتا، مجھے پڑتا ہے۔ تم باشم مبین احمد کو نہیں جانتے۔ وہ کتنے اثر و رسوخ والا آدمی ہے اور کسی حد تک جا سکتا ہے اس کا اندازہ صرف مجھے ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائے۔ اس لئے ابھی تم گھر پر ہی رہو۔"

سکندر عثمان نے اس بار کچھ نرم لہجے میں کہا۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی حق بات کو کوئی اثر نہیں ہو گا۔ وہ ان کی بات نہیں مانے گا۔

"چلو امیری اسٹریڈ پر کا حرج ہو گا۔ سو رہی امیں گھر پر نہیں بیٹھ سکتا۔" سالار سکندر عثمان کے لہجے کی نرمی سے متاثر نہیں ہوا تھا۔

"تمہارا حرج ہوتا ہے یا نہیں مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں گھر پر چاہتا ہوں۔" کہتے کہتے۔ "اس بار انہوں نے اپنا کھانچا کر بلند آواز میں اس سے کہا۔

"تم اذکم آج تو مجھے جانے دیں۔ آج مجھے بہت سے ضروری کام پھلانے ہیں۔" سالار ایک دم ان کے ہنسنے پر کچھ پزل ہوا۔

"تم وہ کام ڈرائیور کو بتا دو، وہ کروے گا یا پھر کسی دوست سے فون پر بات کر لو۔" سکندر نے حتمی انداز میں کہا۔

"مگر چلو۔۔۔ آپ مجھے اس طرح۔" سکندر عثمان نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ ڈائننگ روم سے نکل رہے تھے۔ وہ کچھ دیر بلند آواز میں بیڑا تا پھر ٹھک کر خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سکندر عثمان اسے باہر نکلنے نہیں دیں گے مگر اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سب سے کم سامنے لانے پر اس کی اپنی فیملی کے ساتھ باشم مبین بھی مطمئن ہو جائیں گے اور کم از کم یہ مصیبت اس کے کندھوں سے اتر جائے گی، مگر اس کے لئے سکندر عثمان کا یہ انکشاف حیران کن تھا کہ باشم مبین نے ابھی بھی اس کے بیان پر یقین نہیں کیا تھا۔

سالار وہاں بیٹھا ناشتہ کرتے ہوئے کچھ دیر ان تمام معاملات کے بارے میں سوچتا رہا۔ کانچ نہ جانے کا مطلب گھر میں بند ہو جانا تھا اور وہ گھر میں بند نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔ ناشتہ کر کے کرتے اس نے اسے اوچھوڑا دیا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

☆ ☆ ☆

"سکندر صاحب امیں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔" وہ لاؤنج میں بیٹھتے تھے جب ملازمہ کچھ جھجکتے ہوئے ان کے پاس آئی۔

سے دوبارہ اس کے بارے میں ذکر نہیں۔

ناصر گجرانگنی محرم سکندر عثمان نے رکھائی کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔

”بس کافی ہے۔ اب تم چاہا یہاں سے — میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔“ انہوں نے اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کیا۔

سکندر عثمان پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر مٹھنے لگے۔ اس وقت ان کے سر پر واقعی آسمان ٹوٹ پڑا تھا اور اس وقت انہیں پہلی بار سالار کے ہاتھوں بے وقوف بننے کا احساس ہو رہا تھا۔ دوسرے دھناتی، مہارت اور بے ہودگی سے ان سے جھوٹ پر جھوٹ بولنا اور انہیں دھوکا دینا کیا تھا اور انہیں اس کا احساس تک نہیں ہو سکا تھا اور اگر خلافت انہیں یہ سب کچھ نہ بتاتی تو وہ ابھی بھی ناپک پر ناپک رکھے مطمئن بیٹھے ہوتے۔ یہی سوچ کر کہ سالار امامہ کے ساتھ انوالو نہیں ہے اور نہ ہی اس کی گمشدگی میں اس کا کوئی حصہ تھا۔ وہ چند دن گھر رہ کر ایک بار پھر کانچ جانا شروع کر چکا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ سالار کی گھرائی کروائی جاری تھی اور ہاشم بنین احمد کو سب کچھ بتا چکے کا مطلب کیا تھا۔ یہ وہی اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کا کچھ دیر پہلے کا طیمان یک دم ختم ہو گیا تھا۔ وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ کاغذات کیسے تھے۔ ان پانچ آدمیوں کی موجودگی کا مطلب کیا تھا، سالار اور امامہ کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا تھی اور اس وقت ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کا گلابا دین یا پھر اسے شہت کر دیں مگر وہ جانتے تھے وہ یہ دونوں کام نہیں کر سکتے تھے۔ سالار سکندر ان کا وہ چنا تھا جس سے وہ اپنا دلادیں سب سے زیادہ محبت کرتے تھے اور اس طرح بے وقوف بننے کے بعد پہلی بار وہ سوچ رہے تھے کہ وہ اب سالار سکندر کی کسی بات پر یقین نہیں کریں گے۔ وہ اسے مکمل طور پر ہر معاملے کے بارے میں اندھیرے میں رکھیں گے ویسے ہی جیسے وہ کر رہا تھا۔

”اس کی امامہ سے جان پچکان کیسے ہوئی؟“ سکندر عثمان نے اپنے کمرے میں بے چینی سے مٹھنے ہوئے طبیب سے پوچھا۔

”مجھے کیا پتا کہ اس کی جان پچکان امامہ سے کیسے ہوئی۔ کوئی کچھ تو ہے نہیں کہ میری انگلی پکڑ کر چلا ہو۔“ طبیب نے قدرے تنگی سے کہا۔

”میں نے تم سے بہت بار کہا تھا کہ اس پر نگر رکھا کرو مگر تم — تمہیں اپنی ایکونٹیز سے فرصت ملے تو تم کوئی اور کے بارے میں سوچو۔“

”اس پر توجہ دینا صرف میرا ہی فرض کیوں ہے۔“ طبیب یک دم بھڑک اٹھیں۔ ”آپ کو بھی تو چاہیے ایکٹیو بنو کر چھوڑ دینی چاہئیں۔ سالار اقوام میرے ہی سر کیوں۔“

”میں تم کو کوئی الزام نہیں دے رہا اور اس بحث کو ختم کرو۔ امامہ کے ساتھ شادی — تم اندازہ

کر سکتی ہو کہ ہاشم بنین کو جب اس تعلق کا پتا چلے گا تو وہ کیا کرنا شا کر کریں گے۔ مجھے یہ سوچ کر شاک لگ رہا ہے کہ اس نے اپنی حرکت کرنے کا سوچ کیسے لیا۔ اسے بالکل بھی احساس نہیں ہو کر ہماری اور ہماری فیملی کی سوسائٹی میں کتنی عزت ہے۔“ سکندر عثمان طبیب کے قریب صوفے پر بیٹھے ہوئے بولے۔ ”ایک پر اہم ختم ہوتی ہے تو ہمارے لئے دوسری پر اہم شروع کر دیتا ہے۔ یہ سارا اپکار اسی وقت شروع ہوا جو جب پچھلے سال اس نے خود بخوشی کی کوشش کے بعد اس کی جان بچائی تھی۔ ہم بے وقوف تھے کہ ہم نے اس معاملے پر نظر نہیں رکھی، ورنہ شاید یہ سب بہت پہلے سامنے آ جاتا۔“ سکندر عثمان اپنی کینٹی سلٹے ہوئے کہنے لگے۔

”اور پتہ چلے گا کہ اس کے ساتھ اپنی مرضی سے انوالو ہوتی ہوگی ورنہ اس طرح کوئی کسی کے ساتھ مرضی کے خلاف تو کھان نہیں کر سکتا اور ہاشم بنین احمد کو کیسے، دیو یوں شور مچا رہا ہے جیسے اس کی بیٹی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، جو کیا ہے سالار نے ہی کیا ہے۔ انہوں نے تو طویل آئی اور بھی افواہی ورنگ کروائی ہے۔“ طبیب نے سر سے سٹکے لگائیں۔

”جو بھی ہے، قصور ہمارے بننے کا ہے۔ نہ وہ ایسے کاموں میں پڑنا نہ اس طرح پھنستا۔ اب تو تم صرف یہ سوچ کر تھیں اس صورت حال سے کس طرح بچنا ہے۔“

”ابھی ہم اتنی بری طرح سے نہیں سمجھتے، جس طرح آپ سوچ رہے ہیں۔ اس پر یہ جرم ثابت نہیں ہوگا۔ یس ہیلم ہاشم بنین احمد کے پاس کوئی جوت نہیں ہے اور ثبوت کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔“

”اور جس دن ان تک کوئی ثبوت پہنچ جائے گا اس دن کیا ہوگا۔ تم نے یہ سوچا ہے۔“ سکندر عثمان نے کہا۔

”آپ پھر امکانات کی بات کر رہے ہیں۔ ایسا ہو تو نہیں ہے اور ہو سکتا ہے۔۔۔ ہو بھی نہ۔“

”اس نے ہمیں اگر اتنا بڑا دھوکا دے دیا ہے تو ہو سکتا ہے ایک اور دھوکا ہے جو کہ اس کا رابطہ اس لڑکی کے ساتھ نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ ابھی بھی اس لڑکی کے ساتھ رابطے میں ہو۔“ سکندر عثمان کو خیال آیا۔

”ہاں ہو سکتا ہے۔ پھر کیا کیا جائے۔“

”میں اس سے بات کروں گا تو کچھ پتہ چلے گا۔“ سکندر نے تنہا ہی لہجے میں کہا۔

”بس چند ماہ میں اس کا لی اسے مکمل ہو جائے گا پھر میں اسے باہر بھجوا دوں گا۔ کم از کم ہر وقت ہاشم بنین احمد کی طرف سے جن اندھ لڑکیوں کا میں حکار رہا ہوں وہ تو ختم ہوں گے۔“ انہوں نے سگریٹ کا ایک کش لگایا۔

”مگر آپ ایک چیز بھول رہے ہیں سکندر!“ طبیب نے بڑی بھینگی کی چند لمحوں کی خاموشی کے

بعد کہا۔

”کیا؟“ سکندر نے انہیں چونک کر دیکھا۔

”سالار کی امام کی ساتھ خفیہ شادی۔ اس شادی کے بارے میں جو کچھ بھی کرنا ہے وہ آپ کو خود ہی کرنا ہے۔ آپ کیا کریں گے، اس شادی کے بارے میں۔“

”طلاق کے علاوہ اس شادی کا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔“ سکندر عثمان نے قطعی لہجے میں کہا۔

”وہ شادی مانتے پر تیار نہیں ہے تو طلاق دینے پر رضامند ہو جائے گا۔“

”جب میں اسے ثبوت پیش کروں گا تو اسے اپنی شادی کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔“

”اور اگر شادی کا اعتراف کرنے کے بعد بھی اس نے امام کو طلاق دینے سے انکار کر دیا تو۔“

”کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا پڑے گا اور وہ میں نکال لوں گا۔ چاہے وہ اپنی مرضی سے اسے طلاق دے یا پھر مجھے زبردستی کرنا پڑے۔ میں یہ معاملہ ختم کروں گا، اس طرح کی شادی انسان کو ساری عمر خوار کرتی ہے۔ اس سے تو کچھ بچتا ہی نہیں پڑے گا اور نہ میں اسے اس بار مکمل طور پر اپنا جائیداد اسے عاقی کر دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ سکندر عثمان نے دونوں انداز میں کہا۔

☆ ☆ ☆

حسن کچھ دیر پہلے اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں تھا، جب اچانک اسے اپنے والد کی کال ملی، وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچنے کے لئے کمر بستہ رہے تھے۔ ان کا بچہ بے حد عجیب تھا مگر حسن نے توجہ نہیں دی، لیکن جب پندرہ منٹ بعد اپنے گھر پہنچا تو پتہ چل گیا کہ کڑی سکندر عثمان کی گاڑی دیکھ کر چونکا ہو گیا۔ وہ سالار کے گھر کی تمام گاڑیوں اور ان کے خبرز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

”سکندر انھیں کو میرے اس معاملے میں افواہ ہونے کے خاٹے سے کوئی ثبوت پیش ملے ہیں اس لئے مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ سالار کا دوست سمجھ کر پوچھ گچھ کے لئے آئے ہوں گے۔ میں بڑے اطمینان سے ان کی باتوں کا جواب دوں گا اور کسی بھی اٹرام کی تردید کر دوں گا لیکن میری پریشانی پاپا کے سامنے میری پوزیشن مشکوک کر دے گی، اس لئے انھیں سکندر کو دیکھ کر مجھے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔“ اس نے پہلے اپنا لہجہ ختم کیا اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اسٹڈی میں داخل ہو گیا۔ اس کے والد قاسم فاروقی اور سکندر عثمان کا بیٹا بیٹا رہے تھے، لیکن ان کے چہرے کی غیر معمولی شبہ کی اور اضطراب وہ ایک لمحے میں بھی بھانپ گیا تھا۔

”کیسے ہیں انھیں سکندر آپ اس بار بہت دنوں کے بعد آپ ہماری طرف آئے۔“ باوجود اس کے کہ سکندر یا قاسم نے اس کی نیلو کا جواب نہیں دیا۔ حسن نے بہت بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ اسے اس بار بھی جو اب نہیں ملا تھا۔ سکندر عثمان اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

”جیسو۔“ قاسم فاروقی نے قدرے درشتی سے کہا۔

”سکندر تم سے کچھ باتیں پوچھنے آیا ہے تمہیں ہر بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا ہے۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو میں سکندر سے کہہ چکا ہوں کہ وہ تمہیں پولیس کے پاس لے جائے۔ میری طرف سے تم بھارت میں جاؤ۔ میں تمہیں کسی بھی طرح بچانے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

قاسم فاروقی نے اس کے بیٹے کی بات پر توجہ نہیں دی۔

”پاپا! آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔“ حسن نے حیرت کا مظاہرہ کیا مگر اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ معاملہ اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔

”اور اسرار بننے کی کوشش مت کرو۔ سکندر اچھے چھوٹے ہیں، کیا پوچھنا چاہتے ہو اور میں دیکھتا ہوں یہ کیسے جھوٹ بول رہے۔“

”امام کے ساتھ سالار کی شادی میں شرکت کی ہے تم نے؟“

”انکل۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کیا بات کر رہے ہیں۔ کوئی سی شادی۔ کیسی شادی۔۔۔ حسن نے مزید حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”وہی شادی جو میری عدم موجودگی میں میرے گھر پر ہوئی جس کے لئے امام کو بھی زہر جھجوائے گئے تھے۔“

”پلیز انکل! آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ آپ کے گھر میں ضرور آتا جاتا رہتا ہوں مگر مجھے سالار کی کسی شادی کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے اور نہ ہی میری معلومات کے مطابق اس نے شادی کی ہے۔ مجھے تو اس لڑکی کا بھی پتا نہیں ہے، جس کا آپ نام لے رہے ہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے سالار کی کسی لڑکی کے ساتھ انوکھو منٹ ہو، مگر میں اس کے بارے میں نہیں جانتا، وہ ہر بات مجھے نہیں بتاتا۔“

سکندر عثمان اور قاسم فاروقی خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے۔ وہ خاموش ہو تو سکندر عثمان نے اپنے سامنے ٹیبل پر پڑا ہوا ایک لفافہ اٹھایا اور اس میں موجود چند کاغذ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ حسن کا رنگ کچھ ہلکا ہوا، وہ امام و سالار کا لڑکا تھا۔

”اس پر دیکھو۔“ تمہارے ہی signatures ہیں۔“ سکندر نے سر دھجے میں پوچھا۔ اگر یہ سوال انہوں نے قاسم فاروقی کے سامنے نہ کیا ہوتا تو وہ ان دھجکے کو اپنے دھجکے ماننے سے انکار کرتا مگر اس وقت وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

”یہ میرے ہی signatures ہیں، مگر میں نے نہیں کئے۔“ اس نے ہکا بکا ہوئے کہا۔

”پھر کس نے کئے ہیں، تمہارے فرشتوں نے یا سالار نے۔“ قاسم فاروقی نے طوے لہجے میں کہا۔

حسن کچھ بول نہیں سکا۔ وہ حواس باختہ سا باری باری انہیں دیکھنے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا

کہ سکندر عثمان اس طرح اس کے سامنے وہ نکاح نامہ نکال کر رکھ دیں گے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے وہ نکاح نامہ کہاں سے حاصل کیا تھا، سالار سے یا پھر..... اس کی ساری عہدگی اور چالاکی و ہری کی دھری رو گئی تھی۔

"تم یہ نہیں مانو گے کہ سالار کا امامہ کے ساتھ نکاح تمہاری موجودگی میں ہوا ہے۔" قاسم فاروقی نے اٹھ کھڑے ہوئے لہجہ میں اس سے کہا۔

"پاپا! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ سب سالار کی ضد پر ہوا تھا، اس نے مجھے مجبور کیا تھا۔" حسن نے یکدم سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کچھ بھی چھپانے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جھوٹ بولنا تو اپنی پوزیشن اور خراب کرتا۔

"میں نے اسے بہت سمجھا دیا تھا مگر....."

قاسم فاروقی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس وقت یہاں تمہیں صفائیاں اور وضائیں پیش کرنے کے لئے نہیں بلایا۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اس لڑکی کو اس نے کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"پاپا! مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔" حسن نے تیزی سے کہا۔

"تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔"

"آئی سوئیٹ پاپا! مجھے واقعی کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ اسے لاہور چھوڑ آیا تھا۔"

"یہ جھوٹ تم کسی اور سے بولنا، مجھے صرف بتاؤ۔" قاسم فاروقی نے ایک بار پھر اسی تند و تیز لہجے میں کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا پاپا! حسن نے احتجاج کیا۔

"لاہور کہاں چھوڑ آیا تھا؟"

"کسی سڑک پر۔ اس نے کہا تھا کہ وہ خود چل جائے گی۔"

"تم مجھے یا سکندر کو بے وقوف سمجھ رہے ہو، اس نے اس لڑکی سے شادی کی اور پھر اسے ایک سڑک پر چھوڑ دیا۔ بے وقوف مت بننا، سہیل۔" قاسم فاروقی ہلکا آٹھے۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں پاپا! اس نے کم از کم مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو سڑک پر چھوڑ آیا تھا۔" قاسم نے اس سے پوچھا نہیں کہ پھر اس نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کی کیوں، اگر اسے یہی پتا تھا۔

"پاپا! اس نے یہ شادی اس لڑکی کی مدد کے لئے کی تھی۔ اس کے گھر والے زبردستی اس کی شادی کسی لڑکے سے کرنا چاہتے تھے وہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سالار سے رابطہ کیا اور مدد مانگی اور سالار اس کی مدد پر تیار ہو گیا۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ سالار واقعی طور پر اس سے نکاح کر لے تاکہ اگر اس کے

والدین زبردستی اس کی شادی کرنا چاہیں تو وہ اس نکاح کا انکار نہیں روک سکے۔"

حسن اب سچائی پر پردہ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے پوری بات بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"اور اگر ضرورت پڑے تو یہاں تک ذرا بیٹے اس کو رہائی دلاؤ گی جاسکے مگر یہ کوئی محبت و غیرہ کی شادی نہیں تھی۔ وہ لڑکی ویسے بھی کسی اور لڑکے کو پسند کرتی تھی۔ آپ اس نکاح خانے کو دیکھیں تو اس میں بھی اس نے خلاق کا حق پہلے ہی لے لیا ہے، تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ سالار سے رابطہ کئے بغیر ہی خلاق حاصل کر لے۔"

"بس کیا پوچھو اور؟" قاسم فاروقی نے اس سے کہا۔ حسن کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ "میں قطعاً تمہاری کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ تم نے بہت اچھی کہانی بتائی ہے مگر میں کوئی پتہ نہیں ہوں کہ اس کہانی پر یقین کر لوں۔ تمہیں اب امامہ تک پہنچنے میں سکندر کی مدد کرنی ہے۔" قاسم فاروقی نے قطعی لہجے میں کہا۔

"پاپا! میں یہ کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔" حسن نے احتجاج کیا۔

"تم یہ کیسے کرو گے۔ یہ تم خود جان سکتے ہو۔ مجھے صرف یہ بتانا تھا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

"پاپا! پتہ آپ مجھ پر یقین کریں، میں امامہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نکاح کروانے کے علاوہ میں نے اور کچھ نہیں کیا۔" حسن نے کہا۔

"تم اس کے اتنے قریب ہو کہ اپنی خفیہ شادی میں وہ تمہیں گواہ کے طور پر لے رہا ہے مگر تمہیں یہ نہیں پتا کہ اس کی بیوی گھر سے بھاگنے کے بعد اب کہاں ہے۔ میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں حسن! کسی صورت میں بھی نہیں۔" قاسم فاروقی نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"تمہیں اگر پتا نہیں ہے تو بھی تم اس کا پتا کرواؤ..... کہ وہ کہاں ہے۔ سالار تم سے کچھ نہیں چھپاتے گا۔"

"پاپا! وہ بہت سی باتیں مجھے بھی نہیں بتاتا۔"

"دوسرے باتیں تمہیں بتاتا ہے، میں فی الحال صرف ایک چیز میں دلچسپی رکھتا ہوں اور وہ امامہ کے بارے میں معلومات ہیں۔ تم ہر طریقے سے اس سے امامہ کا پتا حاصل کرو اور سالار کو کسی بھی طرح یہ پتا نہیں چلانا چاہئے کہ سکندر کو اس کی شادی کی اطلاع مل چکی ہے، ورنہ اس نے اس سلسلے میں تم سے کوئی ملاقات کی ہے۔ اگر مجھے یہ پتا چلا کہ سالار یہ بات جان گیا ہے تو میں تمہارا کیا مشر کر دوں گا یہ تمہیں یاد رکھنا چاہئے۔ میں سکندر کو تو پہلے ہی اجازت دے چکا ہوں کہ وہ باہم بین کو تمہارا نامہ دے دے اس کے بعد باہم بین تمہارے ساتھ پولیس کے ذریعے اپنے پاس کی اور طریقے سے، میں بالکل پروا نہیں کروں گا۔ اب تم یہ ملے کر لو کہ تم نے سالار کے ساتھ دوستی نبھائی ہے یا پھر اس گھر میں رہتا ہے۔" قاسم

فاروقی نے قطعیت سے کہا۔

"پاپا میں کو شش کرتا ہوں کہ کسی طرح امامہ کے بارے میں کچھ معلومات مل جائیں۔ میں سالار سے اس کے بارے میں بات کروں گا۔ میں اسے یہ نہیں بتاؤں گا کہ سکندر راکھ کو اس سارے معاملے کے بارے میں بتا چاہا ہے۔" وہ میکانیکی انداز میں دہراتا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

سالار چند دن گھر بیٹھا رہا تھا مگر خیر خد کر کے اس نے کالج چاہنا شروع کر دیا۔ ہاشم مبین اور اس کے گھر والے امامہ کی تلاش میں زمین آسمان ایک کئے ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ یہ سب کچھ بڑی رازداری کے ساتھ کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے ملازمین اور پولیس کے ذریعے سکندر کو ان کی کوششوں کی خبر مل رہی تھی۔ وہ لاہور میں بھی امامہ کی ہر اس کھلی سے رابطہ کر رہے تھے جسے وہ جانتے تھے۔

سالار نے ایک دن اخبار میں باہر جاوید نامی ایک شخص کا خاکہ دیکھا۔ اس کے بارے میں معلومات دینے والے کے لئے انعام کا اعلان تھا۔ وہ اس نام سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہی وہ فرضی نام تھا جو حسن نے ویلن کو امامہ کے شوہر کا دیا تھا اور وہ اشتیاقاً یقیناً امامہ کے گھر والوں کی طرف سے تھا ملازمہ نیچے دیا گیا فون نمبر امامہ کے گھر کا نہیں تھا، وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ پولیس اس ویلن کے پاس پہنچ گئی ہو گی اور اس کے بعد اس ویلن نے اس آدمی کے کواؤف انہیں بتائے ہوں گے۔ اب یہ حقیقت صرف وہ دیکھ سکتا تھا، حسن اور خود وہ جانتا تھا کہ باہر جاوید سارے سے کوئی دھڑ نہیں رکھتا مگر وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ ہاشم مبین کے گھر والوں کو کسی حد تک بھڑکانے میں کامیاب رہا تھا۔

اس پورے عرصہ کے دوران سالار، امامہ کی کال کا بخیر رہا۔ اس نے کئی بار امامہ کو اس کے موبائل پر کال بھی کیا مگر ہر بار اسے موبائل آف ملتا۔ اسے یہ جتنس ہو رہا تھا کہ وہ کہاں تھی۔ اس جتنس کو ہوا دینے میں کچھ ہاتھ حسن کا بھی تھا جو بار بار اس سے امامہ کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا، بعض دفعہ وہ چڑھتا تھا۔

"مجھے کیا پتا کہ وہ کہاں ہے اور مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کر رہی۔ بعض دفعہ مجھے لگتا ہے اسے مجھ سے زیادہ تمہیں دیکھنی ہے۔"

اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ حسن کا یہ جتنس اور دلچسپی کسی مجبوری کی وجہ سے تھی۔ وہ بڑی طرح پھنسا ہوا تھا۔ سالار کا خیال تھا کہ امامہ اب تک جلال کے پاس جا چکی ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے شادی بھی کر چکی ہو اگرچہ اس نے امامہ سے جلال کی شادی کے بارے میں جھوٹ بولا تھا مگر اسے یقین تھا کہ امامہ نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا ہو گا۔ وہ اس کے پاس دو بار ضرور ملے ہو گی۔ خود سالار

بھی جانتا تھا کہ وہ خود جلال سے رابطہ قائم کرے یا پھر ذاتی طور پر جا کر ایک بار اس سے ملے۔ وہ جانتا جانتا تھا کہ امامہ اس کے ساتھ رہ رہی ہے یا نہیں، مگر فی الحال یہ دونوں کام اس کے لئے ناممکن تھے۔ سکندر عثمان مسلسل اس کی نگرانی کر رہا ہے تھے اور وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ وہ یہ نگرانی کروانے والے واحد نہیں ہیں۔ ہاشم مبین احمد بھی یہی کام کر رہا ہے تھے اور اگر وہ لاہور جاتے تو وہ خود بھی اس کے ساتھ عثمان اسے جانے دیتے اور باقرض جانے کی اجازت دے بھی دیتے تو شاید خود بھی اس کے ساتھ چل پڑتے اور وہ یہ نہیں جانتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس سارے معاملے میں اس کی دلچسپی کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اب یہ سب کچھ ایک طاقت لگ رہا تھا۔ ایکن طاقت جو اسے کافی مہنگی پڑ رہی تھی۔ سکندر اور طیبہ اب ہر وقت گھر پر رہتے تھے اور اسے کہیں بھی جانے کے لئے ان سے باقاعدہ اجازت لینی پڑتی تھی حسن اس سے اب کم کم ملنے لگا تھا۔ وہ اس کی وجہ بھی نہیں جانتا تھا۔ اس صورت حال سے وہ بہت پرہیز ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اس رات گھبیرا پر بیٹھا تھا جب اس کے موبائل پر ایک کال آئی۔ اس نے کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے لا پر دوائی سے موبائل اٹھا کر دیکھا اور پھر اسے ایک جھٹکا لگا تھا۔ اسکرین پر موجود نمبر اس کے اپنے موبائل کا تھا۔ امامہ اسے کال کر رہی تھی۔

"تو لاؤنر آپ نے ہمیں یاد کر لیا۔" اس نے بے اختیار مینی بھائی۔ اس کا موزیک دم فریش ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے والی پورٹ بکسر غائب ہو گئی تھی۔

"میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ اب تم مجھے بھی کال نہیں کرو گی۔ اتنا لبا عرصہ لگا دیا تم نے۔" دسی ملیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔

"میں بہت دنوں سے تمہیں فون کرنا چاہ رہی تھی مگر تم کہیں پاری تھی۔" دوسری طرف سے امامہ نے کہا۔

"کیوں، ایسی کیا مجبوری آگئی تھی۔ فون تو تمہارے پاس موجود تھا۔" سالار نے کہا۔

"میں کوئی مجبوری تھی۔" اس نے مختصر آہن۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" سالار نے کچھ جتنس آمیز انداز میں پوچھا۔

"پچکانہ سوال تم کرو سالار! جب تم جانتے ہو کہ میں تمہیں یہ نہیں بتاؤں گی تو پھر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میرے گھر والے کیسے ہیں؟"

سالار کچھ حیران ہوا۔ اسے امامہ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

"بالکل ٹھیک ہیں، خوش و خرم ہیں، پیش کر رہے ہیں۔" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "تم واقعی بہت اچھی بیٹی ہو، مگر سے جا کر بھی تمہیں گمراہ اور گمراہوں کا لکنا خیال ہے۔ ہائیکس۔"

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر امامہ نے کہا۔ "تو ہم کیسا ہے؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا مگر میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہو گا۔ وہ خراب کیسے ہو سکتا ہے۔" اس کے انداز اور لہجے میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"انہیں یہ تو پتا نہیں چلا کہ تم نے میری مدد کی تھی؟" سالار گواماہ کا لہجہ کچھ عجیب لگا۔

"ہاں!۔۔۔ ہاں! ذیور امامہ یوں پس اس دن میرے گھر پہنچ گئی تھی جس دن میں تمہیں لاہور چھوڑ کر آیا تھا۔" سالار نے کچھ استہزاء پر انداز میں کہا۔ "تمہارے فادر نے میرے خلاف ایف آئی آر کھلا دی تھی تمہیں انکار کرنے کے سلسلے میں۔" وہ ہنسا۔ "ذرا سوچو میرے جیسا بندہ کسی کو انکار کر سکتا ہے اور وہ بھی تمہیں۔ جو کسی بھی وقت کسی کو شوٹ کر سکتی ہے۔"

اس کے لہجے میں اس بار خطر تھا۔ "تمہارے فادر نے پوری کوشش کی ہے کہ میں جیل پہنچ جاؤں اور باقی کی زندگی وہاں گزاروں مگر بس میں کچھ خوش قسمت واقع ہو ا ہوں کہ بچ گیا ہوں۔ مگر سے کاٹنگ تک میری گمرانی کی جاتی ہے۔ ڈمب کا لڑتی ہیں اور بھی بہت کچھ ہو رہا ہے۔ اب تمہیں کیا کیا بتاؤں۔ بہر حال تمہاری پہلی بیمن خاصا سچ کر رہی ہے۔" اس نے دبانے والے انداز میں کہا۔

"میں نہیں جانتی تھی کہ وہ تم تک پہنچ جائیں گے۔" اس بار امامہ کا لہجہ معذرت خواہ تھا۔ "میرا خیال تھا کہ انہیں کسی بھی طرح تم پر شک نہیں ہو گا۔ مجھے انفسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں اسٹے پراپلر کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔"

"واقعی تمہاری وجہ سے مجھے بہت سے پراپلر کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔"

"میری کوشش تھی کہ میں پہلے خود کو محفوظ کر لوں پھر ی تمہیں فون کروں اور اب میں واقعی محفوظ ہوں۔"

سالار نے کچھ تجسس آمیز دلچسپی کے ساتھ اس کی بات سنی۔ "تمہارا موبائل میں اب استعمال نہیں کروں گی اور میں اسے واپس بھیجنا چاہتی ہوں، مگر میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ اسے بتا رہی تھی۔ "میں تمہیں کچھ پیسے بھی بھجواؤں گی۔ ان تمام اخراجات کے لئے جو تمہیں میرے لئے سکے۔"

سالار نے اس بار اس کی بات کاٹی۔ "تمہیں پیسے رہنے دو۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ موبائل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس دوسرا ہے۔ تم جاؤ تو اسے استعمال کرتی رہو۔"

"تمہیں، میں اب اسے استعمال نہیں کروں گی۔ میری ضرورت ختم ہو چکی ہے۔"

اس نے کہا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم اب مجھے طلاق کے

بچہ زبجواد اور طلاق کے بچہ زکے ساتھ نکاح نامہ کی ایک کاپی بھی جو میں پہلے تم سے نہیں لے سکی۔"

"کہاں بھجواؤں؟" سالار نے اس کے مطالبے کے جواب میں کہا۔ اس کے ذہن میں ایک دم ایک جھماکا ہوا تھا۔ وہ اگر اب طلاق کا مطالبہ کر رہی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے ابھی تک کسی سے شادی نہیں کی تھی نہ ہی طلاق کے اس حق کو استعمال کیا تھا، جو نکاح نامہ میں وہ اس کی خواہش پر اسے تھمبش کر چکا تھا۔

"تم ہی وکیل کے پاس دو بچہ زبجواد جس کو تم نے ہار کیا تھا اور مجھے اس کا نام اور پتا لکھوا دو، میں وہ بچہ زکس سے لے لوں گی۔"

سالار مضطرب رہا۔ وہ بے حد محتاط تھی۔ "مگر میرا تو اس وکیل کے ساتھ ڈائریکٹ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں ہوں پھر مجھے زکس تک کیسے پہنچاؤں۔"

"جس دوست کے ذریعے تم نے اس وکیل سے رابطہ کیا تھا وہی دوست کے ذریعے وہ بچہ زکس تک پہنچاؤ۔" یہ تو طے تھا کہ وہ اسے کسی بھی طرح اپنا کوئی اثاثہ نہ دینے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اس پر پوری طرح قائم تھی۔

"تم طلاق لینا کیوں چاہتی ہو؟" وہ اس وقت بہت موڈ میں تھا۔

دوسری طرف یک دم خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ اس سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"طلاق کیوں لینا چاہتی ہو؟" اس نے قہقہے میں جواب دیا۔ "یہ تو پہلے ہی طے تھا کہ میں تم سے طلاق لوں گی پھر اس سوال کی کیا تک نفی ہے۔" امامہ کے لہجے میں تحرائی تھی۔

"وہ جب کی تھی، اب تو خاصا سادہ بات گزر گیا ہے اور میں تمہیں طلاق دینا نہیں چاہتا۔" سالار نے بے حد سلیدگی سے کہا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ دوسری طرف اس وقت امامہ کے دلوں کے نیچے سے حقیقت زبیں نکل گئی ہو گی۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں یہ کہہ رہا ہوں امامہ ذیوراکہ میں تمہیں طلاق دینا نہیں چاہتا، نہ ہی دوں گا۔" اس نے ایک اور دم کا حکم کیا۔

"تم۔۔۔ تم طلاق کا حق پہلے ہی مجھے دے چکے ہو۔" امامہ نے بے اختیار کہا۔

"سب کہاں۔۔۔ کس وقت۔۔۔ کس صدی میں۔" سالار نے اطمینان سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے، میں نے نکاح سے پہلے تمہیں کہا تھا کہ نکاح نامے میں طلاق کا حق چاہتی ہوں میں۔ اب اگر تم طلاق نہیں دیتے تو میں خود ہی وہ حق استعمال کر سکتی ہوں۔ تمہیں یہ یاد ہو چاہئے۔"

وہ جباری تھی۔

”اگر میں تمہیں یہ حق دیتا تو تم یہ حق استعمال کر سکتی تھی مگر میں نے تو تمہیں ایسا کوئی حق دیا ہی نہیں۔ تم نے نکاح نہ دیکھا وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ خیر تم نے دیکھا ہی ہو گا ورنہ آج طلاق کی بات کیوں کر رہی ہو تھی۔“

دوسری طرف ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ سالار نے وہاں میں تیر چلایا تاہم وہ نشانے پر بیٹھا تھا۔ امام نے یقیناً پیچہ زسائن کرتے ہوئے انہیں دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ سالار بے حد مظلوم ہو رہا تھا۔

”تم نے مجھے دھوکا دیا۔“ بہت دیر بعد اس نے امام کو کہتے سنا۔
”ہاں، بالکل اسی طرح جس طرح تم نے بدل دیکھا کہ مجھے دھوکا دیا۔“ وہ برہنہ ہو گیا۔
”میں سمجھتا ہوں کہ تم اور میں بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہم دونوں میں اتنی برائیاں اور اتنی خامیاں ہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو مکمل طور پر complement کرتے ہیں۔“ وہ اب ایک بار پھر تشبیہی سے کہہ رہا تھا۔

”زندگی۔ سالار! زندگی اور تمہارے ساتھ۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔“ امام نے حد لے لیے میں کہا۔
”مجھے پتہ نہیں کی بات ذہن اپنی چاہنے کہ میری دشمنی میں ناممکن کا لفظ نہیں ہے یا مجھے تم سے یہ ریکویسٹ کرنی چاہئے کہ آؤ اس ناممکن کو مکمل کرنا۔“ وہ اب مذاق اڑا رہا تھا۔
”تم نے مجھ پر بہت احسان کئے ہیں۔ ایک احسان اور کرو۔ مجھے طلاق دے دو۔۔۔۔۔“
”نہیں، میں تم پر احسان کرتے کرتے تنگ ہو گیا ہوں اب اور نہیں کر سکتا اور یہ والا احسان۔۔۔۔۔“

یہ تو ناممکن ہے۔“ سالار ایک بار پھر سنجیدہ ہو گیا تھا۔
”میں تمہاری چاہ کی لڑی نہیں ہوں سالار! تمہارا اور میرا لاکھ لاکھ اختلاف ہے، ورنہ شاید میں تمہاری پیشکش پر غور کرتی مگر اب اس صورت میں یہ ممکن نہیں ہے۔ تم پلیز مجھے طلاق دے دو۔“
وہ اب نرم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ سالار کا دل بے اختیار پھٹنے کو چاہا۔
”تم کہ میری پیشکش پر غور کرنے کا وعدہ کرو تو میں اپنا لاکھ لاکھ اختلاف بدل لیتا ہوں۔“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔

”تم مجھے کی کوشش کرو، تمہاری اور میری ہر چیز مختلف ہے۔ زندگی کی فلاسفی ہی مختلف ہے۔ ہم دونوں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔“ اس بار وہ بھجھکاؤ کی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں میری اور تمہاری فلاسفی آف لاکھ بہت ملتی ہے۔ جنہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہ ملتی نہ بھی ہوئی تو بھی ذرا سے ایئر جیشنٹ کے بعد ملنے لگے گی۔“

وہ اس طرح بولا جیسے اپنے بہترین دوست سے ”انگو کر رہا ہو۔“
”ایسے بھی مجھ میں کی کیا ہے۔ میں تمہارے پرانے منیجر احمد جیسا خوب صورت نہ سہی مگر

جلال انصر جیسا معمولی شکل و صورت کا بھی نہیں ہوں۔ میری فیملی کو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ کیئر میرا کتنا پرانت ہو گا، اس کا تمہیں اندازہ ہے۔ میں ہر لحاظ سے بہتر ہوں۔“ وہ اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر سکرپٹ ناچ رہی تھی۔ وہ امام کو بری طرح زچ کر رہا تھا اور وہ ہوری تھی۔

”میرے لئے کوئی بھی شخص جلال جیسا نہیں ہو سکتا اور تم۔ تم تو کسی صورت بھی نہیں۔“ اس کی آواز میں پہلی بار نمایاں غلٹی تھی۔

”کیوں؟“ سالار نے بے حد مصوہیت سے پوچھا۔
”تم مجھے انہیں نہیں دیکھتے ہو۔ آخر تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتے۔ دیکھو، تم نے اگر مجھے طلاق نہ دی تو

میں کورٹ میں چلی جاؤں گی۔“ وہ اب اسے دھمکا رہی تھی۔ سالار اس کی بات پر بے اختیار ہنسنا۔
”یہ آر موٹ ونگ۔ جب چاہیں جائیں۔ کورٹ سے اچھی جگہ میل ملاقات کے لئے اور کون سی ہو گی۔ آئے سائے کھڑے ہو کر بات کرنے کا مزہ ہی اور ہو گا۔“ وہ مظلوم ہو رہا تھا۔
”وہیے تمہیں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ کورٹ میں صرف میں نہیں پہنچوں گا، بلکہ تمہارے پرنس بھی پہنچیں گے۔“ وہ دہرائیہ انداز میں بولا۔

”سالار! میرے لئے پہلے ہی بہت سے پراجیکٹس ہیں تم ان میں اضافہ نہ کرو۔ میری زندگی بہت مشکل ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ کم از کم تم تو میری مشکلات کو مت بڑھاؤ۔“
اس بار امام کے لہجے میں زنجیدی اور بے چارگی تھی۔ وہ کچھ اور مظلوم ہو رہا۔

”میں تمہارے مسائل میں اضافہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔۔۔؟ مائی ڈیئر! میں تو تمہاری ہمدردی میں کھل رہا ہوں۔ تمہارے مسائل کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم خود سوچو، میرے ساتھ رہ کر تم اتنی اچھی اور مظلوم زندگی گزار سکتی ہو۔“ وہ اظہار بڑی جنجیدی سے بولا۔

”تم جانتے ہو نا، میں نے اتنی مشکلات کس لئے سکھا ہیں۔ تم سمجھتے ہو، میں ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنے پر تیار ہو جاؤں گی جو ہر وہ کبیر و گناہ کرتا ہے جسے میرے پیئر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناپسند کرتے ہیں۔ نیک عورتیں نیک مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور بری عورتیں برے مردوں کے لئے۔ میں نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں مگر میں اتنی بری نہیں ہوں کہ تمہارے جیسا ہر امر و میری زندگی میں آئے۔ جلال مجھے نہیں ملا مگر میں تمہارے ساتھ بھی زندگی نہیں گزاروں گی۔“ اس نے بے حد غلج انداز میں تمام لحاظ بالا لئے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

”شاید اسی لئے جلال نے تم ہی سے شادی نہیں کی، کیونکہ نیک مردوں کے لئے نیک عورتیں ہوتی ہیں، تمہارے جیسی نہیں۔“

سالار نے اسی نگرا توڑا نہ از میں جواب دیا۔

دوسری طرف خاموشی رہی۔ اتنی لمبی خاموشی کہ سالار کو اسے مخاطب کرنا پڑا۔ "ہیلو۔۔۔ تم سن رہی ہو؟"

"سالار! مجھے طلاق دے دو۔" اسے امامہ کی آواز بھڑائی ہوئی لگی۔ سالار کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔

"تم کو رت میں جا کر لے لو، جیسے تم مجھ سے کہہ چکی ہو۔" سالار نے ترکی پر ترکی کہا اور دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔

حسن نے ان چند ماہ میں سالار سے امامہ کے بارے میں جاننے کی بے حد کوشش کی تھی (حسن کے اپنے بیان کے مطابق) مگر وہ ناکام رہا تھا۔ وہ اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے کہ سالار اور امامہ کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ سالار کی طرح خود انہوں نے موہاں پر بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی ہوئی۔

سکندر نے سالار کو امریکہ میں مختلف پریوٹسٹنٹز میں اپنا بی بی کی طرف سے لے کر دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا آئیڈیل میک ریڈر ایسا تھا کہ کوئی بھی بی بی نہ دے سکتی تھی اسے پہلے ہی خوش محسوس کرے گی۔

امامہ نے سالار کو وہ بارہ فون نہیں کیا تھا حالانکہ سالار کا خیال تھا کہ وہ اسے دوبارہ فون کرے گی اور جب وہ اسے بتا دے گا کہ وہ اسے نکاح خانے میں پہلے ہی طلاق کا حق دے چکا ہے اور وہ نکاح خانے کی کوئی بھی امی اس کے حوالے کر دے گا۔ وہ اس سے یہ بھی کہہ دے گا کہ اس نے اس کے ساتھ صرف ایک مذاق کیا تھا مگر امامہ نے دوبارہ اس سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ یہی سالار نے اپنے بی بی زہرا میں اس نکاح خانے کو دوبارہ کیسے کی زحمت کی اور نہ وہ بہت پہلے وہاں اس کی عدم موجودگی سے واقف ہو جاتا۔

جس دن وہ آخری بار بی بی دے کر واپس گھر آیا۔ سکندر عثمان کو اس نے اپنا پتھر پٹایا۔

"تم اپنا سامان بیک کر لو، آج رات کی فلائٹ ہے تم امریکہ جا رہے ہو، کامران کے پاس۔"

"کیوں پٹایا اس طرح اپنا بیک۔۔۔ سب کچھ ٹھیک تو ہے؟"

"تمہارے علاوہ سب کچھ ٹھیک ہے۔" سکندر نے حتمی سے کہا۔

"مگر پھر آپ مجھے اس طرح اپنا بیک کیوں بھیج رہے ہیں؟"

"یہ میں تمہیں رات کو انیورٹ پورٹ چھوڑنے کے لئے جاتے ہوئے بتاؤں گا۔ فی الحال تم جا کر اپنا سامان بیک کر لو۔"

"پاپا جیڑ! آپ مجھے بتائیں آپ اس طرف مجھے کیوں بھجوا رہے ہیں؟" سالار نے کمزور احتجاج کیا۔

"میں نے کہا تھا میں تمہیں بتا دوں گا۔ تم جا کر اپنا سامان بیک کر دو، ورنہ میں تمہیں سامان کے بغیر ہی

انیورٹ پورٹ چھوڑ آؤں گا۔"

سکندر نے اسے دھمکایا۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اپنا سامان بیک کرتے ہوئے اچھے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ سکندر عثمان کے اس چانک فیملے کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اچانک اس کے ذہن میں جھمکا سا ہوا۔ اس نے اپنی دراز کھول کر اپنے بی بی زکوانا شروع کر دیے۔ وہاں نکاح نامہ نہیں تھا۔ اسے ان کے اس فیملے کی کچھ آنکلی تھی اور اسے پچھتاوا ہوا کہ اس نے نکاح نامہ کو اتنی لاپرواہی سے وہاں کیوں رکھا تھا۔ وہ نکاح نامہ سکندر عثمان کے علاوہ کسی اور کے پاس ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ان کے علاوہ کوئی اور اس کے کمرے میں آئے اور اس کی دراز کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں اب کوئی الجھن نہیں تھی۔ اس نے بی بی خاموشی کے ساتھ اپنا سامان بیک کیا۔ وہ اب صرف یہ سوچ رہا تھا کہ سکندر عثمان سے انیورٹ پورٹ جاتے ہوئے کیا بات کرے گا۔

رات کو انیورٹ پورٹ چھوڑنے کے لئے صرف سکندر اس کے ساتھ آئے تھے، طیارہ نہیں۔ ان کا لیجر اور اندازہ بے حد دو کھارہ خشک تھا۔ سالار نے بھی اس بار کوئی سوال نہیں کیا۔ انیورٹ پورٹ جاتے ہوئے سکندر عثمان نے اپنا پریفیکس کھول کر ایک ساڈو کاغذ اور قلم نکالا اور پریفیکس کے اوپر رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اس پر سائن کر دو۔"

"یہ کیا ہے؟" سالار نے حیرانی سے اس ساڈو کاغذ کو دیکھا۔

"تم صرف سائن کرو، سوال مت کرو۔" انہوں نے بے حد روکھے انداز میں کہا۔ سالار نے طیارے کیسے کہے بغیر ان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم لے کر اس کاغذ پر سائن کر دیے۔ سکندر نے اس کاغذ کو تھپ کر کے پریفیکس میں رکھا اور پریفیکس کھول کر دوبارہ بند کر دیا۔

"جو کچھ تم کر چکے ہو، اس کے بعد تم سے کچھ کہنا کوئی بات کرنا بے کار ہے۔ تم مجھ سے ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا جھوٹ بولتے رہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ مجھے تو کبھی حقیقت کا پتا ہی نہیں چلے گا۔ میرا دل تو یہ جانتا ہے کہ تمہیں امریکہ بھیجنے کے بجائے باختم بین احمد کے حوالے کر دوں گا کہ تمہیں اندازہ ہو اپنی حماقت کا، مگر میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں تمہارا باپ ہوں، مجھے تمہیں بچانا ہی ہے۔ تم میری اس مجبوری کا آئی ٹک فائدہ اٹھاتے رہے ہو مگر آئندہ نہیں اٹھا سکو گے۔ میں تمہارا نکاح نامہ امامہ کے حوالے کر دوں گا اور اگر مجھے دوبارہ بھی یہ پتا چلا کہ تم نے اس سے رابطہ کیا ہے یا رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو میں اس بار کروں گا تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم میرے لئے کافی مصیبتیں کمزری کر چکے ہو، اب ان کا سلسلہ بند ہو جانا چاہئے سمجھے تم۔"

انہوں نے اکڑے ہوئے لہجہ میں کہا۔ وہ جو اب میں کچھ کہنے کے بجائے کڑی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں عجیب طرح کی لاہ اور اطمینان تھا۔ سکندر رحمان بے اختیار سستے۔ یہ ان کا وہ بیٹا تھا جو ۱۵+ کا آئی کیو رکھتا تھا۔ کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ وہ سرے سے کوئی آئی کیو رکھتا بھی تھا یا نہیں۔

☆.....☆.....☆

ایکچند ماہ جو اس نے امریکہ میں گزارے تھے وہ اس کی زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار سیر و تفریح کے لئے اپنی فیملی کے ساتھ اور ان کے بغیر امریکہ اور یورپ جا تا رہا تھا مگر اس بار جس طریقے سے سکندر نے اسے امریکہ بھجوا یا تھا اس نے جہاں ایک طرف اسے مقفل کیا تھا تو دوسری طرف اس کے لئے بہت سے دوسرے براہِ عملہ بھی بیکار کر دیئے تھے۔ اس کے جو دوست اسے لیوٹر کے بعد امریکہ آگئے تھے۔ وہ امریکہ کی مختلف یونیورسٹیز میں پڑھ رہے تھے۔ وہ کسی ایک اسٹنٹ میں نہیں تھے۔ کچھ بین حال اس کے رشتہ داروں اور کرکڑن تھا۔ خود اس کے اپنے بہن بھائی بھی ایک جگہ پر نہیں تھے۔ وہ اپنی فیملی سے اتنا بچھڑ چکا تھا کہ ان کی کسی محسوس کر تایا جو م سٹینٹس کا دکھارہ ہوتا۔ یہ صرف اس طرح اچانک وہاں بھجوائے جانے کا نتیجہ تھا کہ وہ اس طرح اضطراب کا دکھارہ ہو رہا تھا۔

کامران سارا دن یونیورسٹی میں ہوتا اور وہ گھر آتا بھی تو اپنی اسٹنڈر میں مصروف ہو جاتا۔ اس کے ایگزاکٹر تھے، جبکہ سالار سارا دن یا تو پارٹنٹ میں پیشا فلیس دیکھ کر ہٹایا پھر جھوٹو گھمانے میں مصروف رہتا اور جب وہ ان دونوں کاموں سے بیزار ہو جاتا تو آوارہ گردی کے لئے لگ جاتا۔ اس نے وہاں اپنے قیام کے دوران نیو یارک میں اس علاقے کا پچھ پچھان مارا تھا جہاں کامران دور رہتا تھا۔ وہاں کا کوئی ناٹ کلب، ڈسکو، چب، پار، تھیٹر، سٹیما یا میوزیم اور آرٹ گیلری ایسی نہیں تھی جہاں وہ نہتا ہو۔

اس کا ایک بیک ر پکار دیا تھا کہ جن تین Ivy league کی یونیورسٹیز میں اس نے اپنا کئی تھا تھا تینوں میں رزلٹ آنے سے پہلے ہی اس کی ایڈمیشن کی درخواستیں قبول کی جا چکی تھیں۔ وہ تینوں یونیورسٹیز ایسی تھیں جن میں اس کے دورِ قریب کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا اور یہ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سکندر رحمان اپنی پوری کوشش کریں گے کہ اسے ایسی یونیورسٹی میں ایڈمٹ کروائیں جہاں اس کے بہن بھائیوں میں سے نہیں تو کم از کم اس کے رشتہ داروں میں سے کوئی ضرور موجود ہو تاکہ وہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے رہیں۔ سالار کی جگہ ان کا کوئی دوسرا بیٹا Ivy league کی کسی یونیورسٹی میں ایڈمیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو تا تو سکندر رحمان خوش ہوتا۔ اور اس چیز کو اپنے اور اپنی پوری فیملی کے لئے اعزاز سمجھتے مگر یہاں وہ اس خوف میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ سالار پر فخر دیکھ کر کھین گے۔ سالار نے ان یونیورسٹیز میں سے Yale کو چنا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ نہ صرف Yale میں ان کا کوئی شیا سا اور واقف کار نہیں تھا بلکہ، New Haven میں بھی سکندر رحمان کا کوئی رشتہ دار

اور دوست نہیں تھا۔

رزلٹ آنے کے بعد اسے یونیورسٹی سے میرٹ اسکالرشپ بھی مل گیا تھا۔ اپنے باقی بھائیوں کے برعکس اس نے خد کر کے ہوٹل میں رہنے کے بجائے ایک پارٹنٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ سکندر رحمان اسے پارٹنٹ میں رکھنے کے لئے تیار نہیں تھے، مگر اسکالرشپ ملنے کی وجہ سے اس کے پاس اتنی رقم آگئی تھی کہ وہ خود ہی کوئی پارٹنٹ لے لیتا کیونکہ یونیورسٹی کے اخراجات کے لئے سکندر اس کے اکاؤنٹ میں پہلے ہی ایک لاکھ بیسویں رقم جمع کروا چکے تھے حالانکہ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا بھی اسکالرشپ لے رہا تھا مگر سالار سکندر کا کوٹھ لٹائی نے خاص طور پر ان سے پروہ "کام" اور "مطالعہ" کرنے کے لئے بتایا تھا جو اس سے پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔ دوڑ میں یہ خاص طور پر انہیں تنگ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا جس چیز کو ان کے دوسرے بیٹے مشرق کہتے وہ اسے مغرب کہتا۔ جسے دوسرے زمین قرار دیتے وہ اس کے آسمان ہونے پر واپس دینا شروع کر دیتا۔ وہ اس کی باتوں، حرکتوں اور خد پر زیادہ سے زیادہ باندھ دیتا اور کویٹیرول لیول ہائی کر سکتے تھے اور کچھ نہیں۔

New Haven جانے سے پہلے سکندر اور طیبہ اس کے لئے خاص طور پر پاکستان سے امریکہ آئے تھے۔ وہ کئی دن تک اسے سمجھاتے رہے تھے، جنہیں وہ اطمینان سے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے لگا رہا تھا۔ وہ کئی سالوں سے نصیحتیں سننے کا عادی تھا اور عملی طور پر وہ نصیحتیں اب اس پر قطعاً کوئی اثر نہیں کرتی تھیں۔ دوسری طرف سکندر اور طیبہ واپس پاکستان جاتے ہوئے بے حد فخر مند بلکہ کسی حد تک خود فخر دہی تھے۔

Yale سے خاص میں ایم بی اے کرنے آیا تھا اور اس نے وہاں آنے کے چند ہفتوں کے اندر ہی اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔

پاکستان میں جن اداروں میں وہ چار ہوتا تھا کہ وہ بھی بہت اچھے تھے، مگر وہاں تعلیم اس کے لئے ٹیکہ واک تھی۔ Yale میں مقابلہ بہت مشکل تھا وہاں بے حد قابل لوگ اور چین اسٹوڈنٹ موجود تھے۔ اس کے باوجود وہ بہت جلد نروں میں آنے لگا تھا۔

اس میں اگر ایک طرف اس کی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کا دخل تھا تو دوسری طرف اس کے رویے کا بھی۔ اسٹین اسٹوڈنٹس والی روایتی فٹناری اور خوش اخلاقی اس میں مفقود تھی۔ اس میں لحاظ اور مرویت بھی نہیں تھی اور نہ ہی وہ احساس کمتری اور مرغوبیت تھی جو اسٹین اسٹوڈنٹس امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیز میں فطری طور پر لے کر آتے ہیں۔ اس نے سمجھنے سے ہی بہترین اداروں میں پڑھا تھا۔ ایسے ادارے جہاں پڑھانے والے زیادہ تر غیر تھکی تھے اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بھی کوئی علم کے پیٹے ہوئے سرچشمے نہیں ہوتے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ Yale اسے اسکالرشپ دے کر اس پر کوئی احساس نہیں کیا وہ

اگر باقی دونوں جو نیورسٹیز میں سے کسی کا انتخاب کرتا تو کارکاشپ اسے وہاں سے بھی مل جاتا اور اگر ایسا نہ بھی ہو تا جب بھی اسے یہ معلوم تھا کہ اس کے مال باپ کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ جہاں جانا چاہتا یا مشین لے سکتا تھا۔ اگر اپنے پہلی بیک گراؤ پر اسٹیل اور قابلیت کا زخم نہ ہو تا جب بھی سالار سکندر اس قدر تلخ اور الگ تھلک قسم کی نیچے رکھتا تھا کہ وہ کسی کو اپنی خوش اخلاقی کے جھوٹے مظاہرہ سے متاثر نہیں کر سکتا تھا۔ رہی سہی کسر اس کے آئی کیو لیول نے پوری کر دی تھی۔

شروع کے چند ہفتوں میں ہی اس نے اپنے نو فیصد اور کلاس فیلوز کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی اور یہ بھی پہلے بار نہیں ہوا تھا۔ وہ بچپن سے تعلیمی اداروں میں اسی قسم کی توجہ حاصل کیا کرتا تھا۔ وہ ایسا اسٹوڈنٹ نہیں تھا جو فضول باتوں پر بحث برائے بحث کرتا۔ اس کے سوال ہی اس طرح کے ہوتے تھے کہ اس کے اکثر نو فیصد کو فوری طور پر ان کا جواب دینے میں دشواری ہوتی۔ جو اب غیر تسلی بخش بھی ہوتا، جب تک وہ یہ جانتا نہیں تھا صرف خاموش ہو جاتا تھا، مگر وہ یہ تاثر بھی نہیں دیتا تھا کہ وہ مطمئن ہو گیا تھا یا اس جواب کو تسلیم کر رہا تھا۔ وہ بحث صرف ان پر دھیس کے ساتھ کرتا تھا جن کے بارے میں اسے یہ یقین ہوتا کہ وہ ان سے واقعی کچھ نہ کچھ سیکھے گا یا جن کے پاس صرف روایتی یا کتابی علم نہیں تھا۔ پڑھائی وہاں بھی اس کے لئے بہت مشکل نہیں تھی، نہ ہی اس کا سارا وقت پڑھائی میں گزرتا تھا۔ پہلے کی نسبت اسے کچھ زیادہ وقت دینا پڑتا تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنے لئے اور اپنی سرگرمیوں کے لئے وقت نکال لیا کرتا تھا۔

وہاں کسی ہوم سائنس کا کھار نہیں تھا کہ چوبیس گھنٹے پاکستان کو یاد کرتا رہتا یا پاکستان کے ساتھ اس طرح کے مشق میں مبتلا ہوتا کہ ہر وقت اس کے گھر کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتا نہ ہی امریکہ اس کے لئے کوئی نئی اور اچھی جگہ تھی اس لئے اس نے وہاں موجود پاکستانیوں کو تلاش کرنے اور ان کے ساتھ روابط بڑھانے کی دانت طوطی پر کوئی کوشش نہیں کی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود بخود وہاں موجود کچھ پاکستانیوں نے اس کی شناسائی ہو گئی۔

نیورسٹیز کی دوسری بہت سی سوسائٹیز، ایسوسی ایشنز اور کلبز میں اس کی دلچسپی تھی اور اس کے پاس ان کی ممبر شپ بھی تھی۔

پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنا زیادہ تر وقت بے کار پھرنے میں ضائع کرتا تھا۔ خاص طور پر ویک اینڈز۔ سینما، کلبز، ڈسکو، جیمز۔ اس کی زندگی انٹینس چاروں کے درمیان تقسیم شدہ تھی۔ برتنی فلم، ہر نیا اسٹیج پلے، ہر نیا کسٹرو اور کوئی بھی نئی اسسٹرو میٹیل پر غار منہ وہ نہیں چھوڑتا تھا یا پھر برنیا چھو، بڑا ریسٹورنٹ، میپل سے مہنگا اور سستے سے سستا۔ اسے ہر ایک کے بارے میں مکمل معلومات تھیں۔

اور اس سب کے درمیان وہ ایلو وچر اس کے ذہن میں اب تک تھا جس کی وجہ سے وہ امریکہ میں موجود تھا۔ سکندر کو اس کے نکاح کا پتہ تھا، کیسے چلا تھا، سالار نے ہانے کی کوشش نہیں کی مگر وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ سکندر عثمان کو اس کے بارے میں کیسے پتہ چلا ہو گا۔ یہ حسن و ناصبر نہیں تھے جنہوں نے سکندر عثمان کو سالار اور امامہ کے بارے میں بتایا ہو گا۔ وہ ان کی طرف سے مطمئن تھا یہ خود امامہ ہی ہو گی، جس نے اس سے خون پر بات کرنے کے بعد یہ سوچا ہو گا کہ اس کے بجائے سکندر عثمان سے ساری بات کی جائے اور اس نے یقیناً ایسا ہی کیا ہو گا یا اس لئے اس نے دوبارہ سالار سے رابطہ نہیں کیا۔ سکندر نے اس سے رابطہ کرنے کے بعد ہی اس کے گھر سے کی تلاش کی کہ وہ نکاح نامہ پر آہ کر لیا تھا۔

مگر یہ سب کب ہوا تھا؟ یہ؟ وہ سوال تھا جس کا جواب وہ نہیں دے سکتا تھا۔ جو بھی تھا امامہ کے لئے اس کی ناپسندیدگی میں پاکستان سے امریکہ آتے ہوئے کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ یکے بعد دیگرے وہ اس کے ہاتھوں ڈک اٹھانے پر مجبور ہوا تھا اور اب وہ چیتا تھا کہ اس نے اس تمام معاملے میں امامہ کی مدد کیے کی۔ بعض دفعہ اسے خیال ہوتا تھا کہ آخر وہ امامہ جیسی لڑکی کی مدد کرنے پر تیار کیسے ہو گیا تھا اور اس حد تک مدد کہ۔۔۔

وہ اب ان تمام واقعات کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی کوخت محسوس کرتا تھا۔ آخر میں نے اس کی مدد کیوں کی جبکہ مجھے جو کرنا چاہئے تھا وہ یہ تھا کہ اس کے رابطہ کرنے پر میں وسم کو اس کے والدین کو خود بخود اپنے والدین کو اس سارے معاملے کے بارے میں بتا دیتا یا پھر جلال کے بارے میں انہیں بتا دیتا یا پھر اس کے کنبے پر اس کے ساتھ سرے سے نکاح کرتا ہی نہ یا اسے گھر سے فرار ہونے میں تو کبھی اس طرح مدد نہ کرتا۔

بعض دفعہ اسے لگتا کہ جیسے وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح اس کے ہاتھوں میں استعمال ہوا تھا۔ اتنی فرما بزداری، اتنی تابع و اداری آخر کیوں۔۔۔؟ جبکہ وہ اس کے ساتھ کوئی تعلق یا واسطہ نہیں رکھتی تھی اور وہ کسی طرح سے بھی اس کی مدد کرنے پر مجبور نہیں تھا۔

اب اسے وہ سب کچھ ایک الگ الگ پچر سے زیادہ محانت لگتا۔ وہ کسی سائیکالوجسٹ کی طرح امامہ کے بارے میں اپنے رویے کا تجزیہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ مطمئن ہو جاتا۔

”جوں جوں وقت گزرتا جائے گا وہ مکمل طور پر میرے ذہن سے نکل جائے گی نہ بھی ابھی تب بھی مجھے کیا فرق پڑے گا۔“ وہ سوچتا۔

☆ ☆ ☆

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں اس کے حلقہ احباب میں اضافہ ہونے لگا اور اسی حلقہ احباب میں ایک نام سعد کا تھا۔ اس کا تعلق کرچی سے تھا۔ سالار کی طرح وہ بھی امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتا

تھانگر سالار کے برعکس اس کا گھرانہ خاصاً مذہبی تھا۔ یہ سالار کا اندازہ تھا۔ سعد کی جس حرافت بہت اچھی تھی اور وہ بہت چلند سمجھی تھا۔ نیو بیوں میں ایک امریکی دوست کے توسط سے اس کی ملاقات سعد سے ہوئی تھی اور اس کی طرف دوستی میں پہل کرنے والا سعد ہی تھا۔ سالار نے اس دوستی کو قبول کرنے میں قدرے تاہل کیا کیونکہ اسے یوں لگتا تھا جیسے سعد اور اس کے درمیان کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ سعد وہاں سے ایم فل کر رہا تھا۔ سالار کے برعکس وہ پڑھائی کے ساتھ چاب بھی کرتا تھا۔ اس کا حلیہ اس کی مذہب سے جڑ جاتی واپس لگتی تانے کے لئے کافی تھا۔ اس نے ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور مذہب کے بارے میں اس کا علم بہت زیادہ تھا۔ سالار نے زندگی میں پہلی بار کسی ایسے شخص سے دوستی کی تھی جو مذہبی تھا۔

سعد پانچ وقت کی نماز پڑھتا تھا اور دوسروں کو بھی اس کے لئے کہا کرتا تھا۔ وہ مختلف امریکائی بزنس اور کلبز میں بھی بہت اکیلے تھا۔ سالار کے برعکس امریکہ میں اس کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا صرف ایک دور کے چچا تھے، جو کسی دوسری اسٹیٹ میں رہتے تھے۔ شاید وہی نے اپنی بھائی کو دور کرنے کے لئے وہ بہت زیادہ سوشل تھا۔ سالار کے برعکس وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور شاید یہ لڑا پیار ہی تھا جس نے اس کے والدین کو اسے اچھی اور تعلیم کے لئے بھیج دیا تھا اور وہ اس کے باقی دونوں بھائی سعد کے والد کے ساتھ گریجویٹیشن کے بعد بزنس میں شریک ہو گئے تھے۔

وہ بھی ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر رہتا تھا مگر اس کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں چار لوگ بھی رہتے تھے۔ ان چار میں سے دو عرب اور ایک بنگلہ دیشی کے علاوہ ایک اور پاکستانی تھا۔ وہ تمام اسٹوڈنٹس تھے۔

سعد پہلی ہی ملاقات میں سالار سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ سالار کے امریکی دوست جیف نے جب سعد کو سالار کی اکیڈمک کامیابیوں کے بارے میں بتایا تو، ایک کی طرح سعد بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔

سالار کو سعد کا چہرہ دیکھ کر اور خاص طور پر اس کی ڈاڑھی دیکھ کر ہمیشہ حلال کا خیال آتا۔ ڈاڑھی کی وجہ سے دونوں میں تجرّبہ سی مماثلت اور مشابہت نظر آتی۔ کئی بار دوسرے دوستوں کے علاوہ سعد بھی دیکھ کر انڈیز پر اس کے ساتھ ہوتا۔

”تم مسلمان ہو لیکن مذہب کی سرے سے پابندی نہیں کرتے۔“ سعد نے ایک دفعہ سالار سے کہا تھا۔

”اور تم ضرورت سے زیادہ مذہبی ہو۔“ سالار نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ جس طرح تم پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہو اور ہر وقت اسلام کی بات کرتے

رہتے ہو یہ کچھ اور اینکٹ ٹاپ چیز ہو جاتی ہے۔“ سالار نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ کہا۔ ”تم محض نہیں ہو ہر وقت نمازیں پڑھ کر۔“

”یہ فرض ہے۔ اللہ کی طرف سے ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں، اسے ہر وقت یاد رکھیں۔“ سعد نے زور دیتے ہوئے کہا۔ سالار نے ایک جھٹکائی۔

”تم بھی عبادت کیا کرو، آخر تم بھی مسلمان ہو۔“ سعد نے اس سے کہا۔

”میں جانتا ہوں اور عبادت نہ کرنے سے کیا میں مسلمان نہیں رہوں گا۔“ اس نے کچھ جیسے لہجے میں سعد سے کہا۔

”صرف ہم کا مسلمان بن کر زندگی گزارنا چاہتے ہو تم؟“

”سعد! پلین اس قسم کے فتوے لپٹا کر پات پت کرنا بہت کمزور ہے۔ میں جانتا ہوں جس مذہب میں دلچسپی ہے مگر مجھے نہیں ہے۔ بہتر ہے ہم ایک دوسرے کی رائے اور جذبات کا خیال رکھیں اور ایک دوسرے پر کچھ غور کرنے کی کوشش نہ کریں۔ جیسے میں تم سے یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ تم نماز چھوڑ دو، اس طرح تم بھی مجھ سے یہ نہ کہو کہ میں نماز پڑھوں۔“ سالار نے انتہائی صاف گوئی سے کہا تو سعد خاموش ہو گیا۔

مگر کچھ دنوں بعد ایک دن وہ اس کے اپارٹمنٹ پر آیا۔ سالار اس کی قاضی کے لئے کچھ لانے کے لئے بچن میں گیا تو سعد بھی اس کے پیچھے ہی آیا۔ اس نے باتوں کے دوران فریخ کھول لیا اور اس میں موجود کھانے کی چیزوں پر نظر دوڑانے لگا۔ سالار کچھل کر رات ایک فاسٹ فوڈ outlet سے اپنا پیسنڈیہ برگر لے کر آیا تھا۔ دو قرین میں رکھا تھا۔ سعد نے اسے نکال لیا۔

”اسے رکھ دو، یہ تم نے کھانا۔“ سالار نے جلدی سے کہا۔

”کیوں؟“ سعد نے مانگ کر دوپٹی کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

”اس میں پورک (سورکا گوشت) ہے۔“ سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

”غدا کی مت کرو۔“ سعد ٹھٹک گیا۔

”اس میں مذاق والی کوئی بات ہے۔“ سالار نے جھرتی سے اسے دیکھا۔ سعد نے جیسے پچھتے والے انداز میں پلیٹ شیف پر رکھ دی۔

”تم پورک کھاتے ہو؟“

”میں پورک نہیں کھاتا۔ میں صرف یہ برگر کھاتا ہوں کیونکہ یہ مجھے پسند ہے۔“ سالار نے برز جاتے ہوئے کہا۔

”تم جانتے ہو یہ حرام ہے؟“

”اسلام میں؟“

”اب تم پھر وہی تہفہ و عہد شروع مت کرنا، میں صرف پورک ہی نہیں کھاتا، ہر قسم کا گوشت کھا لیتا ہوں۔“ سارا نے لاپرواہی سے کہا۔ وہ اب فریج کی طرف جا رہا تھا۔
”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”خیر اس میں ایسی بے یقینی والی کیا بات ہے۔ یہ کھانے کے لئے ہی ہوتا ہے۔“ وہ اب فریج میں پائے و دودھ کے بیگٹ کو نکال رہا تھا۔
”ہر چیز کھانے کے لئے نہیں ہوتی۔“ سعد کچھ حائل۔ ”ٹھیک ہے تم زیادہ ذہنی نہ کسی مکر مسلمان تو ہو اور اتنا تو تم جانتے ہی ہو گے کہ پورک اسلام میں حرام ہے، کم از کم ایک مسلمان کے لئے۔“ سارا خاموشی سے اپنے کلام میں مصروف رہا۔

”میرے لئے کچھ نہ جانتا، میں نہیں کھاؤں گا۔“ سعد یک دم بکن سے نکل گیا۔
”کیوں؟“ سارا نے مز کر کے دیکھا۔ سعد واٹش شیٹ کے سامنے کھڑا صابن سے ہاتھ دھو رہا تھا۔
”کیا ہوا؟“ سارا نے اس سے قدرے حیرانی سے پوچھا۔
سعد نے جواب میں کچھ نہیں کہا وہ اسی طرح کھلم بڑھتے ہوئے ہاتھ دھو رہا تھا۔ سارا جھپٹی ہوئی ٹکڑوں سے ہونٹ بھیٹتے اسے دیکھتا رہا۔ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے سارا سے کہا۔
”میں تو اس فریج میں رکھی کوئی چیز نہیں کھا سکتا، کچھ تھکے ہوئے بچوں میں بھی نہیں کھا سکتا۔ اگر تم یہ بزرگ کھالیتے ہو تو اور بھی کیا کچھ نہیں کھالیتے ہو گے۔ چلو باہر چلتے ہیں وہاں جا کر کچھ کھاتے ہیں۔“
”یہ بہت افسوسناک ہے۔“ سارا نے قدرے ناراضی سے کہا۔

”نہیں، افسوس والی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں یہ حرام گوشت نہیں کھانا چاہتا اور تم اس معاملے میں بہتیز کے حامی نہیں ہو۔“ سعد نے کہا۔

”میں نے تمہیں یہ گوشت کھانے کی کوشش نہیں کی۔ تم نہیں کھاتے، اسی لئے میں نے وہ بزرگ کھاتے ہی جیسا منع کر دیا۔“ سارا نے کہا۔ ”مگر تم کو شاید کوئی توہا ہو گیا ہے۔ تم اس طرح ری ایکٹ کر رہے ہو جیسے میں اپنے پورے فلیٹ میں اس جانور کو پاؤں ہوا ہے اور رات دن ان ہی کے ساتھ رہتا ہوں۔“ سارا ناراض سا ہو گیا۔

”چلو باہر چلتے ہیں۔“ سعد نے اس کی ناراضی کو ختم کرنے کے لئے کہا۔
”باہر چل کر کچھ کھائیں گے تو میں ہل چے نہیں کروں گا، تم کرو گے۔“ سارا نے کہا۔
”ٹھیک ہے، میں کروں گا، تو پورا اہم۔ تم چلو۔“ سعد نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اور اگلی دھند تم میرے پیارٹنٹ پر آتے ہوئے گھر سے کچھ کھانے کے لئے کر آنا۔“ سارا نے قدرے طنز سے طنز لے کر کہا۔
”اچھا لے آؤں گا۔“ سعد نے کہا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس ایک اینڈر چیمبل کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی طرح بہت سے لوگ وہاں پھر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد ایک بیچ پر آکر بیٹھ گیا۔ بہت لاپرواہی سے ایک آکس کریما اسٹیک کھاتے ہوئے وہ ادھر ادھر نظریں دوڑانے میں مصروف تھا جب اس کی توجہ تین سال کے ایک بچے نے اپنے طرف مبذول کر لی۔ وہ بچہ ایک فٹ پال کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر سیلاب چاب اوڑھے ایک لڑکی کھڑی تھی جو مسکراتے ہوئے اس بچے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ہاں موجود بہت سے انتہین میں سے ایک تھی مگر چاب میں بلیس و احمد لڑکی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر اسے دیکھنے لگا۔ وہ بچہ فٹ پال کو پاؤں سے ٹھوکر لگاتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی بیٹھی طرف آ گیا تھا۔ ایک اور ٹھوکر لگنے والے سیدھا سارا کی طرف بیٹھ گیا۔ یہ غیر ارادی عمل کے تحت سارا نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اپنے دائیں پاؤں میں پیچھے ہوئے جا کر گر کر اسے اس پاؤں کو روکا اور پھر پاؤں بٹایا نہیں بلکہ اسی طرح فٹ پال پر ہی رکھا مگر اس بار اس کی نظر اس لڑکی کے ہاتھ کے اس پیچے پر تھی جو تیز رفتاری سے پال کے پیچھے اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے بالکل پاس آنے کے بجائے وہ کچھ دور ٹک گیا۔ شاید وہ توقع کر رہا تھا کہ سارا پال کو اس کی طرف لڑکھائے گا مگر سارا اسی طرح فٹ پال پر ایک پاؤں رکھے بائیں ہاتھ سے آکس کریما کھاتے ہوئے وہ لڑکی اس لڑکی کو دیکھتا رہا۔ شاید اسے توقع تھی کہ اب وہ قریب آئے گی۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ کچھ دیر تک اسے پال نہ چھوڑتے دیکھ کر وہ لڑکی کچھ حیرانی سے آگے اس کی طرف آئی تھی۔
”یہ فٹ پال چھوڑ دیں۔“

اس نے قریب آکر بیڑی شائع کی۔ سارا چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے فٹ پال سے اپنا پاؤں اٹھا لیا وہاں بیٹھے بیٹھے فٹ پال کو ایک زوردار لگب لگائی۔
فٹ پال آتے ہوئے بہت دور جا کر گر کر لگ لگنے کے بعد اس نے اطمینان سے اس لڑکی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اب سرخ ہو رہا تھا جبکہ وہ بچہ ایک بار پھر اس فٹ پال کی طرف بھاگتا جا رہا تھا جو اب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لڑکی نے زہر اب اس سے کچھ کھا اور پھر واپس مڑ گئی۔ سارا اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کو سن یا سمجھ نہیں سکا مگر اس کے سرخ چہرے اور ساٹھرات سے وہ بے اندازہ بخونی لگا سکتا تھا کہ وہ کوئی خوشحال اور الفاظ نہیں تھے۔ اسے اپنی حرکت پر شرمندگی بھی ہوئی مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی وہ لڑکی امامہ سے مشابہت رکھتی تھی۔

وہ لمبے سے سیاہ کوٹ میں سیاہ چاب اوڑھے ہوئے تھی۔ دراز قد اور بہت ڈبیلی چلتی تھی۔ بالکل امام کی طرح۔ اس کی سفید رگت اور سیاہ آنکھیں بھی اسے امام جیسی ہی محسوس ہوتی تھیں۔ امام بہت لمبی چوڑی چادر میں خود کو چھپانے کبھی تھی۔ وہ چاب نہیں لیتی تھی مگر اس کے پاؤں اس وقت اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے اسے اس کا خیال آیا تھا اور لا شعوری طور پر اس نے وہ نہیں کیا جو وہ لڑکی چاہتی تھی۔ شاید اسے کسی حد تک یہ تسکین ہوتی تھی کہ اس نے امام کی بات نہیں مانی مگر..... وہ امام نہیں تھی۔

”آخر کیا ہو رہا ہے مجھے، اس طرح تو.....“ اس نے حیران ہوتے ہوئے سوچا۔ وہ بیہوش میں سے ایک سگریٹ نکال کر سگاتا لگا۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس لڑکی کو دیکھنے لگا جو اپنے بچے کو فٹ پال کے ساتھ کھیلنے و کچر کر سکر رہی تھی۔ سالار اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے علاوہ ہر شے سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس رات وہ کافی دیر تک امام کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے اور حال انصر کے بارے میں اسے یقین تھا اب تک وہ دونوں شادی کر چکے ہوں گے، کیونکہ اپنا نکاح نامہ سدر سے حاصل کرنے کے بعد وہ یہ جان چکی ہوگی کہ طلاق کا حق پہلے ہی اس کے پاس تھا۔ اسے اس سلسلے میں سالار کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ جلال انصر اس کے کہنے پر بھی امام سے شادی پر تیار نہیں ہوا تھا۔ بھر بھی نہ جانے کیوں یہ یقین تھا کہ جلال انصر ایک بار امام کے اپنے پاس پہنچ جانے پر اسے انکار نہیں کر سکا ہو گا۔ اس کی منت نہایت دیر ہو مان گیا ہو گا۔

امام اس کے مقابلے میں بہت خوب صورت تھی اور امام کا خاندان ملک کے طاقت ور ترین خاندانوں میں سے ایک تھا۔ کوئی انسانی ہی ہو گا جو جلال انصر جیسی حیثیت رکھتے ہوئے امام کو سونے کی چڑیا نہ جھٹتا ہو یا پھر ہو سکتا ہے وہ واقعی امام کی محبت میں مبتلا ہو جو بھی تھا اسے یقین تھا کہ وہ دونوں شادی کر چکے ہوں گے اور پتا نہیں کس طرح باشم تبین کی آنکھوں میں دھول ٹھوکر چھپنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے یا یہ بھی ممکن ہے کہ باشم تبین نے اب تک انھیں دعوٰی نکالا ہو۔

”مجھے پتا تو کرنا چاہئے اس بارے میں.....“ اس نے سوچا اور پھر اگلے ہی لمحے خود کو جھڑکا۔ ”فار کاڈ سیک سالار ارفع کرو اسے، جانے دو، کیوں خواہوا اس کے پیچھے پڑے ہو۔ یہ جان کر آخر کیا مل جائے گا کہ باشم تبین اس تک پہنچے ہیں یا نہیں.....“ اس نے بے اختیار خود کو جھڑکا مگر اس کا جشم نہیں ٹھہرا۔

”واقعی میں نے یہاں آنے کے بعد یہ جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی کہ باشم تبین اب تک اس تک پہنچے ہیں یا نہیں.....“ اسے حیرانی ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”میرا نام وہیں لایا ہو ڈ ہے۔“

وہ لڑکی اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھانے ہوئے تھی۔ وہ اس وقت لائبریری کی بک شیفٹ سے ایک کتاب نکال رہا تھا، جب وہ اس کے قریب آئی تھی۔

”سالار سکندر! اس نے وہیں سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کر لیا۔

”میں جانتی ہوں، جنہیں تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہیں نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔ سالار نے اس سے یہ نہیں کہا کہ اسے بھی تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی نگاہ کے پچاس کے پچاس لوگوں کو ان کے نام سے جانتا اور پہچانتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ان کا بریف یا نوڈل بھی بغیر ان کے کسی غلطی کے بتا سکتا تھا۔ جیسے وہ اس وقت وہیں کو یہ بتا کر حیران کر سکتا تھا کہ وہ نیو جرسی سے آئی تھی۔ وہاں وہ سال ایک یورپ کھلی میں کام کرتی رہی تھی۔ اس کے پاس مارکیٹنگ میں ایک ڈگری تھی اور وہ اب دوسری ڈگری کے لئے وہاں آئی تھی اور وہ اس سے کم از کم پچھتے سات سال پہلے ہی تھی۔ اگرچہ اپنے قد و قامت سے سالار اس سے بہت بڑا لگتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت اپنے بچے میں سب سے کم عرق تھا۔ اپنے بچے میں صرف وہی تھا جو کسی قسم کی چاب کے بغیر سیدھا ایم بی اے کے لئے آیا تھا۔ باقی سب کے پاس نہیں تھیں کچھ سال کام کرنے کا تجربہ تھا مگر اس وقت وہیں کو یہ سب کچھ بتانا اسے خوش فہمی کا دکھانے کے مترادف تھا۔

”اگر میں آپ کو کافی کی دعوت دوں تو؟“ وہیں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا۔

”تو میں اسے قبول کر لوں گا۔“

وہ اس کی بات پر ہنسی۔ ”تو پھر بیٹے ہیں، کافی پیتے ہیں۔“ سالار نے کندھے اچکائے اور کتاب کو دوبارہ شیفٹ میں رکھ دیا۔

کینے میو یا میں بیچ کر وہ دونوں تقریباً آدھ گھنٹہ تک ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ یہ وہیں کے ساتھ اس کی شناسائی کا آغاز تھا۔ سالار کے لئے کسی لڑکی کے ساتھ تعلقات بڑھانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ کام بہت آسانی سے کر لیا کرتا تھا۔ اس بار مزید آسانی یہ تھی کہ پہل وہیں کی طرف سے ہوتی تھی۔

تین چار ملاقاتوں کے بعد اس نے ایک رات وہیں کو اپنے خلیت پر رات گزارنے کے لئے انوائٹ کر لیا تھا اور وہیں نے کسی تاہل کے بغیر اس کی دعوت قبول کر لی۔ وہ دونوں یونیورسٹی کے بعد آگئے بہت سی جگہوں پر پھر تے رہے۔ سالار کے خلیت پر ان کی دلہنی لیٹ ثابت ہوئی تھی۔

وہ دن میں اپنے اور اس کے لئے نگاہ تیار کرنے لگا جبکہ وہیں بے تکلفی سے ادھر سے ادھر پھرتے ہوئے اس کے پار نمٹ کا جائزہ لے رہی تھی پھر وہ اس کے قریب آکر کاؤنٹر کے سامنے کھڑی

ہو گئی۔ "بہت اچھا اپارٹمنٹ ہے تمہارا۔ میں سوچ رہی تھی کہ تم آکھیں رہتے ہو تو اپارٹمنٹ کا حلیہ خاصا خراب ہو گا مگر تم نے تو ہر چیز بڑے سلیقے سے دیکھی ہوئی ہے۔ تم ایسے ہی رہتے ہو یا یہ اہتمام خاص میرے لئے کیا گیا ہے۔"

سالار نے ایک گلاس اس کے آگے رکھ دیا۔ "میں ایسے ہی رہتا ہوں، قرینے اور طریقے سے۔" اس نے گھونٹ بھرا اور گلاس دوبارہ کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے وہ ویش کے قریب چلا آیا اس نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ویش مسکرای۔ سالار نے اسے اپنے کچھ اور قریب کیا اور پھر یک دم ساکت ہو گیا۔ اس کی نظریں ویش کی گردن کی ذخیرہ میں جھولنے اس موتی پر پڑی تھیں، جسے آج اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سردی کے موسم کی وجہ سے ویش بھاری بھر کم سویر زاور نکلیں پہنا کر تھی۔ اس نے ایک دو پار اس کے کھلے کارلے سے نظر آنے والی اس زنجیر کو دیکھا تھا مگر اس زنجیر میں لٹکا ہوا وہ موتی آج پہلی بار اس کی نظروں میں آیا تھا کیونکہ آج پہلی بار ویش ایک گہرے لکھے کی شرٹ میں لمبوس تھی۔ وہ اس شرٹ کے اوپر ایک سویر پہنے ہوئے تھی، جسے اس نے سالار کے اپارٹمنٹ میں آکر آثار دیا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ ایک جھماکے کے ساتھ وہ موتی اسے لکھیں اور۔۔۔ کہیں بہت پیچھے۔ کسی اور کے پاس لے گیا تھا۔۔۔ مس کرتے ہاتھ اور انگلیاں۔ ہاتھ اور کٹائی۔ کٹائی سے کہنی تک کا سطر کرتی انگلیاں۔ آنکھوں سے پیشانی۔ پیشانی سے سفید چادر کے نیچے سیاہ بالوں پر لگتے ہوئے ہاتھ۔۔۔

امام کی گردن کے گرد موجود زنجیر تک تھی۔ اس میں لٹکے والا موتی اس کی پٹلی کی ہڈی کے بالکل ساتھ جھونکا تھا۔ زنجیر تھوڑی سی بھی لمبی ہوتی تو وہ اسے دیکھ لیتا۔ اس رات وہ بہت لگ لگے کی شرٹ اور سویر میں لمبوس تھی۔ اس موتی کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لئے مفلج ہو گیا۔

وہ اسے کس وقت یاد آئی تھی۔ اس نے موتی سے نظریں چرانے کی کوشش کی۔ دوایں رات خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ویش کو دیکھ کر ہار دیا اور مسکراتے کی کوشش کی۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت لگتی ہیں۔"

"مجھے تمہاری آنکھوں سے گھٹن آتی ہے۔"

کسی آواز نے اسے ایک چابک مارا اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی۔ ویش کے وجود سے اپنے بازو ہٹاتے ہوئے وہ چند قدم پیچھے مڑا اور کاؤنٹر پر پڑا ہوا گلاس اٹھالیا۔ ویش ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ چند قدم آگے بڑھ آئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ تشویش سے پوچھا۔

سالار نے کچھ کہے بغیر ایک ہی سانس میں گلاس خالی کیا۔ ویش اس کے جواب نہ دینے پر اب کچھ اچھے ہوئے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

ویش میں اس کی دلچسپی ختم ہونے میں صرف چند منٹ لگے تھے۔ وہ نہیں چاہتا اسے کیوں اس کے وجود سے ابھین ہوئے تھی۔ وہ پچھلے دو گھنٹے ایک ہائٹ گلاب میں اس کے ساتھ ڈانس کرتا رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ بے حد خوش تھا اور اب چند منٹوں میں۔۔۔

سالار نے اپنے کندھے سے جھٹکے اور منک کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنا گلاس دھوئے لگا۔ ویش دوسرا گلاس لے کر اس کے پاس پہنچ آئی۔ سالار نے اسے گلاس لے لیا۔ وہ اپنے سینے پر دونوں بازو پہنے اس کے بالکل پاس کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ سالار کو اس کی نظروں سے جھپٹا ہٹ ہو رہی تھی۔

"میں۔۔۔ میری طبیعت کچھ عجیب نہیں ہے۔"

گلاس کو حریف پر رکھتے ہوئے اس نے ویش سے کہا۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بالواسطہ طور پر اسے وہاں سے جانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ویش کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ سالار کا رویہ بدلے حد توہین آمیز تھا۔ وہ چند لمبے اسے گھورتی رہی پھر تیزی کے ساتھ اپنا سویر اور یکے آٹھ کر اپارٹمنٹ کا دروازہ دھماکے سے بند کر کے باہر نکل گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کپڑا کر صوف پر بیٹھ گیا۔

ویش اور امام دونوں کیس کی قسم کی کوئی مشابہت نہیں تھی۔ دونوں کی گردنوں میں موجود موتی بھی بالکل ایک جیسے نہیں تھا اس کے باوجود اس وقت اس کی گردن اور گردن میں جھولنے اس موتی کو دیکھ کر اسے بے اعتقاد وہ یاد آئی تھی۔ کیوں؟ اب پھر کیوں؟ آخر اس وقت کیوں؟ وہ بے حد مشتعل ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی رات خراب ہو گئی تھی، اس نے سینئر نیٹیل پر پڑا ہوا ایک کرسل کا گلے دان اٹھایا اور پوری قوت سے اسے دیوار پر دے مارا۔

دیکھ ایڈ کے بعد ویش نے اس کی دوبارہ ملاقات ہوئی، لیکن وہ اس سے بڑے روکنے اور اکڑے ہوئے انداز میں ملا۔ یہ اس سے تعلقات شروع کرنے سے پہلے ہی ختم کرنے کا وعدہ راستہ تھا۔ اسے ہر اس صورت سے جھپٹا ہٹ ہوتی تھی جو اسے کسی بھی طرح سے امام کی یاد دلاتی اور ویش ان عورتوں میں شامل ہو گئی تھی۔ ویش جو اس کی طرف سے کسی معذرت اور دلچسپی و محبت کا انتظار کر رہی تھی وہ اس کے اس رویے سے بری طرح دلبرداشتہ ہو گئی تھی۔ Sale میں یہ اس کا پہلا انجیر تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے چند ماہ وہ برصغیر میں بے حد مصروف رہا، ہر ماہ مصروف کہ امام کو یاد رکھنے اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کو کل پر ناظر بار بار شاہیہ یہ سلسلہ ابھی چلتا رہا مگر اس شام امام چانک کی ملاقات جلال انصر سے نہ ہو جاتی۔

وہ ایک اینڈ پریویشن گیا ہوا تھا جہاں اس کے بچا رہتے تھے وہ وہاں اپنے ایک کزن کی شادی منینہ کرتے آیا تھا۔

اس شام سالار اپنے کزن کے ہمراہ تھا جو ایک ریسٹورنٹ چلا رہا تھا۔ وہ وہاں کھانا کھانے آیا ہوا تھا۔ اس کا کزن آرڈر دینے کے بعد کسی کام سے اٹھ کر گیا تھا۔ سالار کھانا کھانا کر رہا تھا جب کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔

”جیلو۔۔۔“ سالار نے بے اختیار مڑ کر اسے دیکھا۔

”آپ سالار ہیں؟“ اس آدمی نے پوچھا۔

وہ جلال اصرار تھا۔ اسے پہچاننے میں لمبہ بھر کے لئے دقت اس نے ہوئی تھی کیونکہ اس کے چہرے سے اب ڈرامی کا جب بھی۔

سالار نے گھڑے ہو کر اس سے بات چلائی۔ ایک سال پہلے کا ایڈوچر ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہی ٹھیک ٹھیک کے بعد اس نے جلال کو دیکھا تھا اس کی دعوت دی۔

”تمہیں مجھے ذرا جلدی ہے۔ بس آپ پر اتفاقاً نظر پڑ گیا تو آگیا۔“ جلال نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”امام کیسی ہے؟“ جلال نے بات کرتے کرتے اچانک کہا۔ سالار کو لگا وہ اس کا سوال ٹھیک سے سن نہیں سکا۔

”سوری۔۔۔“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں استفسار کیا۔ جلال نے اپنا سوال دہرایا۔

”میں امام کا پوچھ رہا تھا۔ وہ کیسی ہے؟“

سالار چلتیں چپکائے بغیر اسے دیکھنا پارہا۔ وہ امام کے بارے میں اس سے کیوں پوچھ رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتا یہ تو آپ کو پتا ہونا چاہئے۔“ اس نے کچھ اچھے ہوئے انداز میں کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

اس بار جلال حیران ہوا۔ ”مجھے کس لئے؟“

”کیونکہ وہ آپ کی بیوی ہے۔“

”بیری بیوی؟“ جلال کو جیسے کرٹ لگا۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بیری بیوی کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ۔ میں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ آپ ابھی طرح جانتے ہیں۔ ایک سال پہلے آپ ہی تو آئے تھے اس سلسلے میں مجھ سے بات کرنے کے لئے۔“ جلال نے بیٹھے اسے کچھ یاد دلایا۔

”میں نے تو آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ آپ خود اس سے شادی کر لیں۔“

سالار نے ہنسی سے اسے دیکھنا پارہا۔

”میں تو یہ سوچ کر آپ کے پاس آیا تھا کہ شاید آپ نے اس سے شادی کر لی ہوگی۔“ وہ اب وضاحت کر رہا تھا۔

”آپ نے اس سے شادی نہیں کی؟“ سالار نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ آپ سے تو ساری بات ہوئی تھی میں نے انکار کر دیا پھر اس سے میری شادی کیسے ہو سکتی تھی؟ پھر میں نے سنا کہ وہ گھر سے نکلیں چلی گئی۔ میں نے سوچا آپ کے ساتھ کہیں چلی گئی ہوگی۔ اسی لئے تو آپ کو کچھ کر آپ کی طرف آیا تھا۔“

”میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ میں تو پچھلے سات آٹھ ماہ سے نہیں ہوں۔“ سالار نے کہا۔

”اور مجھے یہاں آئے دو ماہ ہوئے ہیں۔“ جلال نے بتایا۔

”مجھ سے ملاقات کے بعد کیا اس نے دوبارہ آپ سے رابطہ ملاقات کرنے کی کوشش کی تھی؟“

سالار نے کچھ اچھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مجھ سے نہیں ملی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لاہور جا کر اس نے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔“ سالار کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

”مجھ سے رابطہ کرنے سے کیا ہوتا؟“

”آپ کے لئے وہ گھر سے نکلی تھی۔ اسے آپ کے پاس جانا چاہئے تھا۔“

”نہیں۔۔۔ وہ میرے لئے گھر سے نہیں نکلی تھی۔ آپ تو ابھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ پھر آپ یہ مت کہیں کہ وہ میرے لئے گھر سے نکلی تھی۔“ جلال کے لہجے میں اچانک کچھ تبدیلی آئی۔

”ساری بات آپ ہی سے تو ہوئی تھی۔“

”کیا آپ واقعی جانتے کہہ رہے ہیں کہ وہ دوبارہ آپ کے پاس نہیں گئی؟“

”میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا اور وہ میرے ساتھ ہوتی تو میں آپ کے پاس اس کے بارے میں پوچھنے کیوں آتا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ جلال کے لہجے میں اب بے نیازی تھی۔

”آپ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر دے سکتے ہیں؟“ سالار نے کہا۔

”نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کو مجھ سے اور مجھے آپ سے دوبارہ رابطے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ جلال نے بڑی صاف گوئی سے کہا اور اپنی مڑ کیا۔

سالار کچھ اچھے ہوئے انداز میں اس کی پشت پر نظر پڑتا رہا۔ یہ ناقابل یقین بات تھی کہ وہ جلال سے نہیں ملی۔ کیوں؟ کیا اس نے میری اس بات پر واقعی یقین کر لیا تھا کہ جلال نے شادی کر لی

پر غور کے بغیر کیا۔

"کیا وہ تمہیں فون کیا کرتی تھی؟"

وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ "گھر سے پہلے جانے کے بعد اس نے صرف ایک بار فون کیا تھا پھر میں یہاں آ گیا۔ ہو سکتا ہے اس نے دوبارہ بھی فون کیا ہو جس کے بارے میں آپ مجھے نہیں بتا رہے۔"

"اس نے تمہیں فون نہیں کیا۔ اگر کرتی تو تمہاری اور اس کی شادی کے بارے میں بہت سے معاملات کو ختم کر دیتا۔ میں تمہاری طرف سے اسے طلاق دے دیتا۔"

"یہ سب آپ کیسے کر سکتے ہیں؟"

سالار نے بہت پرسکون انداز میں کہا۔

"یہاں تمہیں مجھوانے سے پہلے میں نے ایک پیپر پر تمہارے signatures لئے تھے، میں طلاق نامہ تیار کروا چکا ہوں۔" سکندر نے جانتے ہوئے کہا۔

"fake document" (جعلی ڈاکومنٹ)۔ "سالار نے اسی انداز میں تہہر کیا۔" میں تو نہیں جانتا تھا کہ آپ طلاق نامہ تیار کر دانے کے لئے مجھ سے سائن کروا رہے ہیں۔"

"تم پھر اس مصیبت کو میرے سر پر لانا چاہتے ہو؟" سکندر کو ایک دم غصہ آ گیا۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ میں اس کے ساتھ رشتہ کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ آپ، میری طرف سے یہ رشتہ ختم نہیں کر سکتے۔ یہ میرا معاملہ ہے میں خود ہی اسے ختم کروں گا۔"

"تم صرف یہ شکر کرو کہ تم اس وقت یہاں اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہو ورنہ تم نے جس خاندان کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا وہ خاندان قبر تک بھی تمہارا پیچھا چھوڑنا اور یہ بھی ممکن ہے وہ یہاں بھی تمہاری نگہانی کروا رہے ہوں۔ یہ انتظار کرو رہے ہوں کہ تم مطمئن ہو کر دوبارہ امادہ کے ساتھ رابطہ کرو اور وہ تم کو دلوں کے لئے ایک کٹواں تیار کر دیں۔"

"آپ مجھے خواہ مخواہ خود کر رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں کہ یہاں امریکہ میں کوئی میری نگہانی کر رہا ہو گا اور وہ بھی اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اور دوسری بات یہ کہ میں امادہ کے ساتھ تو کوئی رابطہ نہیں کر رہا کیونکہ میں واقعی نہیں جانتا وہ کہاں ہے، پھر رابطے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تو پھر تمہیں اس کے بارے میں اس قدر کا انصاف ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جہاں ہے یہی ہے رہنے والا ہے۔" سکندر کو کچھ اطمینان ہوا۔

"آپ میرے موبائل کے فلیش چیک کریں۔ وہ موبائل اس کے پاس ہے۔ ہو سکتا ہے پہلے نہیں تو اب وہ اس سے کاڑھ کر لیتی ہو۔"

"وہ اس سے کاڑھ نہیں کرتی۔ موبائل مستقل طور پر بند ہے۔ جو چند کاٹز اس نے کی تھیں وہ سب میڈیکل کالج میں ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں کو ہی کی تھیں اور پیس پیلے ہی انہیں انوسٹی گیٹ کر چکی ہے۔ لاہور میں وہ ایک لڑکی کے گھر کی تھی مگر وہ لڑکی پٹارہ میں تھی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ اس کے گھر سے پہلی گئی، کہاں گئی، یہ پیس کو پتا نہیں چل سکا۔"

سالار جھپٹی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "آپ کو حسن نے میرے اور اس کے بارے میں بتایا تھا؟"

سکندر کچھ بول نہیں سکے۔ موبائل کے امادہ کے پاس ہونے کے بارے میں صرف حسن ہی جانتا تھا، کم از کم یہ ایسی بات تھی جو سکندر عثمان صرف اس کے کمرے کی تلاش کے لے کر نہیں جان سکتے تھے۔

اسے ان سے بات کرتے ہوئے پہلی بار اپنا کم حسن پر شبہ ہوا تھا کیونکہ سکندر عثمان کو اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا پتا تھا جو صرف اسے نہیں بلکہ پھر حسن کو..... کوئی تیسرا ان سے واقف نہیں تھا۔ اس نے سکندر عثمان کو کچھ نہیں بتایا تھا واقعی طور پر یہ حسن ہی ہو سکتا تھا جس نے انہیں ساری تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مجھے حسن نے بتایا ہے یا کسی اور نے..... یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ اس بات کے بارے میں مجھے پتا نہ چلتا۔ یہ صرف میری حماقت تھی کہ میں نے ہاشم مبین کے الزامات کو

منجھدی سے نہیں لیا اور تمہارے جوتے پر یقین کر لیا۔"

سالار نے کچھ نہیں کہا، وہ صرف ہاتھ پر تیریاں لئے انہیں دیکھتا اور ان کی بات سننا رہا۔ "اب جب میں نے تمہیں اس سارے معاملے سے بچا لیا ہے تو تمہیں دوبارہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہئے جس سے....."

سکندر عثمان نے قدرے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا مگر اس سے پہلے کہ ان کی بات مکمل ہوتی سالار ایک جھٹکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

سکندر عثمان کے ساتھ ہونے والی اس گفتگو کے بعد وہ ساری رات اس تمام معاملے کے بارے میں سوچتا رہا۔ پہلی بار اسے باکاسا، فوس اور بچپتا وادو اقرار اسے امادہ ہاشم کو اس کے کہنے پر فوراً طلاق دے دینی چاہئے تھی پھر شاید وہ جلال کے پاس پہلی جاتی اور وہ دونوں شادی کر لیتے۔ امادہ کے لئے بے حد ناپسندیدگی کر سکتے کے باوجود اس نے پہلی بار اپنی غلطی تسلیم کی۔

"اس نے دوبارہ مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ طلاق لینے کے لئے کورٹ نہیں گئی۔ اس کے خاندان والے بھی ابھی تک اسے ڈھونڈ نہیں سکے۔ وہ جلال انصر کے پاس بھی نہیں گئی تو پھر آخر وہ کہاں گئی، کیا

اس کے ساتھ کوئی حادثہ.....؟"

ہے؟ سالار کو اپنا جھوٹ یاد آیا مگر یہ کیسے ممکن ہے وہ مزید الجھا۔ میری بات پر اسے یقین کیسے آسکتا ہے جبکہ وہ کبھی بھی رہی تھی کہ اسے میری بات پر یقین نہیں ہے۔
وہ کرسی کھینچ کر وہ بارہ بیٹھ گیا۔

اور اگر جمال کے پاس نہیں گئی تو پھر وہ کہاں گئی۔ کیا کسی اور شخص کے پاس؟ جس سے اس نے مجھے بے خبر رکھا، مگر یہ ممکن نہیں ہے اگر کوئی ہوتا تو وہ مجھے اس سے بھی رابطہ کرنے کے لئے کہتی۔ اگر وہ فوری طور پر جمال کے پاس نہیں بھی گئی تھی تو سکندر سے نکاح نامہ لینے اور إطلاق کے حق کے بارے میں جاننے کے بعد اسے اسی کے پاس جانا چاہئے تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے جمال کی اس فرضی شادی کے بارے میں اسے کیوں بتایا۔ شاید وہ اسے پریشان کرنا چاہتا تھا یا پھر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اب کیا کرے گی یا پھر شاید وہ بار بار اس کے اس مطالبے سے شک آگیا تھا کہ وہ پھر جمال کے پاس جائے، پھر جمال سے رابطہ کرے، وہ ایسا کرنے کی وجہ نہیں جانتا تھا، جو بھی تھا پھر حال اسے یقین تھا امامہ جمال کے پاس جائے گی۔

مگر سالار کو اب پتہ چلا تھا کہ اس کی توقع پانچ ماہ کے برعکس وہ وہاں ہی نہیں۔
وہ اب کھانا سرور کر رہا تھا، اس کا کزن آچکا تھا، وہ دونوں ہاتھیں کرتے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ سالار کھانا کھا رہا تھا اور ہاتھیں کرتے ہوئے بھی مسلسل امامہ اور جمال کے بارے میں سوچتا رہا۔ کئی ماہ بعد یک دم وہ اس کے ذہن میں پھر تازہ ہو گئی تھی۔

"کیوں اتنی فٹیں کہ وہ بارہا اپنے گھر واپس چلی گئی ہو؟" کھانا کھا رہے اسے اچانک خیال آیا۔
"ہاں یہ ممکن ہے۔" اس کا ذہن متوازی ایک ہی جگہ اٹکا ہوا تھا۔ "مجھے پاپا سے بات کرنی چاہیے۔" انہیں بتائیے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتا ہو گا۔ "سکندر عثمان بھی ان دنوں شادی میں شرکت کی غرض سے وہیں تھے۔
واپس گھر آنے کے بعد رات کے قریب جب اس نے سکندر کو جھانک دیا تو اس نے ان سے امامہ کے بارے میں پوچھا۔

"پاپا! کیا امامہ واپس اپنے گھر آگئی ہے؟" اس نے کسی تمہید کے بغیر سوال کیا۔
اور اس کے سوال نے کچھ دیر کے لئے سکندر کو خاموش رکھا۔
"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" چند لمحوں کے بعد انہوں نے درشتی سے کہا۔
"بس ایسے ہی۔"

"اس کے بارے میں اتنا غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی اسلٹ پر اپنا دھیان رکھو تو بہتر ہے۔"

"پاپا! پتہ! آپ میرے سوال کا جواب دیں۔"
"کیوں جواب دوں۔ تمہارا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے؟" سکندر کی ناراضی میں اضافہ ہو گیا۔
"پاپا! اس کا ایک بوائے فرینڈ مجھے آج ملے یہاں، وہی جس کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔"
"تو پھر.....؟"

"تو پھر یہ کہ ان دونوں نے شادی نہیں کی۔ وہ بتا رہا تھا کہ امامہ اس کے پاس گئی تھی نہیں۔ جب کہ میں کچھ رہا تھا کہ لاہور جانے کے بعد وہ اسی کے پاس گئی ہوگی۔"
سکندر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ اس کے پاس گئی یا نہیں۔ اس نے اس سے شادی کی یا نہیں۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ نہ ہی تمہیں اس میں انوکھ ہونے کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے مگر میں جانا چاہتا ہوں کیا امامہ آپ کے پاس آگئی تھی؟ آپ نے اسے شادی کے بچہ نہ سمجھ لیا ہے۔ میرا مطلب کس کے ذریعے۔" سالار نے کہا۔
"تم سے کس نے کہا کہ اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا؟"

وہ ان کے سوال پر حیران ہوا۔ "میں نے خود اندازہ لگایا۔"
"اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا، وہ رابطہ کرتی تو میں باہم یقین کو اس کے بارے میں بتا دیتا۔" سالار ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔ "میں نے تمہارے کمرے کی تلاشی لی تھی اور میرے ساتھ وہ نکاح نامہ لگ گیا۔"

"مجھے یہاں بھجواتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ آپ وہ بچہ زاماد تک بھجوا دیں گے۔"
"ہاں۔ یہ اس صورت میں ہوتا اگر وہ مجھ سے رابطہ کرتی تھی تو اس نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔" انہیں یہ یقین کیوں ہے کہ اس نے مجھ سے ضرور رابطہ کیا ہو گا؟ "اس بار سکندر نے سوال کر ڈالا۔
سالار کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے پوچھا۔

"پاپا! میں اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا؟"
"نہیں، پاپا! اس کو پتا چلتا تو اب تک وہ باہم یقین کے گھر واپس آجکتی ہوتی مگر پاپا! ابھی بھی اس کی تلاش میں ہے۔" سکندر نے کہا۔

"ایک بات تو طے ہے سالار کہ اب تم وہ بارہ امامہ کے بارے میں کوئی قیاس نہیں کر دے گے۔ وہ جہاں ہے جس حال میں ہے نہیں اپنا دماغ تھکنے کی ضرورت نہیں، تمہارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ پاپا! میں یہی اسے دھمکے گی کہ میں وہ بچہ نہ باہم یقین تک پہنچا دوں گا، تاکہ تمہاری جان ہمیشہ کے لئے اس سے محفوظ رہے۔"

"پاپا! کیا اس نے واقعی کبھی گھر نہیں کیا مجھ سے بات کرنے کے لئے۔" سالار نے ان کی بات

وہ جیلا بار بہت سنجیدگی سے، کسی ناراضی یا غصے کے بغیر اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”یہ تو ممکن نہیں ہے کہ وہ مجھ سے اتنی شدید نفرت اور ناپسندیدگی رکھنے کے بعد میری بیوی کے طور پر کہیں خاموشی کی زندگی گزار رہی ہو، پھر آخر کیا وجہ ہے کہ امامہ کسی کے ساتھ بھی دوبارہ رابطہ نہیں کر رہی۔ اب تک جب ایک سال سے زیادہ گزر گیا ہے کیا وہ واقعی حادثے کا شکار ہو گئی ہے؟ کیا حادثہ پیش آ سکتا ہے؟“

اس کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کی ذہنی روایک بار پھر بھٹکتی گئی۔

”اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے تو میں کیا کروں۔ وہ اپنے رسک پر گھر سے نفلی قحی اور حادثہ تو کسی کو کسی بھی وقت پیش آ سکتا ہے پھر مجھے اس کے بارے میں اتنا فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ چاہا ٹھیک کہتے ہیں جب میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر مجھے اس کے بارے میں اتنا تجسس بھی نہیں رکھنا چاہیے۔ خاص طور پر ایک ایسی لڑکی کے بارے میں جو اس حد تک احسان فراموش ہو جو اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتی ہو اور مجھے اتنا گھٹیا سمجھتی ہو اس کے ساتھ جو بھی ہو ابو کا ٹھیک ہی ہوا ہو گا وہی کاٹل قحی۔“

اس نے اس کے بارے میں ہر خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

کچھ دیر پہلے کی سانسٹ آئیز سنجیدگی وہ اب محسوس نہیں کر رہا تھا نہ ہی اسے اب کسی قسم کے بچپناؤ سے احساس تھا۔ وہ ویسے بھی چھوٹی موٹی باتوں پر بچپناؤ کے عادی نہیں تھا۔ اس نے سکون کے عالم میں آگئیں بند کر لیں اس کے ذہن میں اب دور دور تک کہیں امامہ کا قسم کا تصور موجود نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

”بھئی Vandame گئے ہو؟“ اس دن یونیورسٹی سے نکلتے ہوئے مائیک نے سالار سے پوچھا۔

”ایک دفعہ۔“

”کیسی جگہ ہے؟“ مائیک نے سوال کیا۔

”بری نہیں ہے۔“ سالار نے تبصرہ کیا۔

”اس ویک اینڈ پر وہاں چلتے ہیں۔“

”کیوں؟“ ”میری گرل فرینڈ کو بہت دلچسپی ہے اس جگہ میں۔ وہ اکثر جاتی ہے۔“ مائیک نے کہا۔

”تو تمہیں تو پھر اس کے ساتھ ہی جانا چاہیے۔“ سالار نے کہا۔

”نہیں سب لوگ چلتے ہیں، زیادہ تر وہ آئے گا۔“ مائیک نے کہا۔

”سب لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ اس بار دانش نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”جتنے دوست بھی ہیں۔ سب۔“

”میں، سالار، تم، سہیلی اور سعد۔“

”سعد کو کہتے ہیں۔۔۔ وہ جٹ کلب کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگانے لگے گا پھر ایک لمبا چوڑا حلقہ ڈسے گا۔“ سالار نے مدخلت کی۔

”تو پھر ٹھیک ہے ہم لوگ ہی چلتے ہیں۔“ دانش نے کہا۔

”سینئر اکو بھی انوائس کر لیتے ہیں۔“ سالار نے اپنی گرل فرینڈ کا نام لیا۔

اس ویک اینڈ پر سب وہاں گئے اور تین چار گھنٹوں تک انہوں نے وہاں خوب انجوائے کیا۔ اگلے روز سالار میچ، دیر سے آٹھا۔ وہاں بھی لڑکی تیار کر رہا تھا جب سعد نے اسے فون کیا۔

”ابھی آٹھے ہو؟“ سعد نے اس کی آواز سننے ہی کہا۔

”ہاں دس منٹ پہلے۔“

”رات کو دیر تک باہر رہے ہو گے۔“ اس لئے۔۔۔ سعد نے اندازہ لگا دیا۔

”ہاں۔۔۔ ہم لوگ باہر گئے ہوئے تھے۔“ سالار نے دانش طور پر ٹاٹ کلب کا نام نہیں لیا۔

”ہم لوگ کون۔۔۔؟ تم اور سینئر؟“

”نہیں پورا گروپ ہی۔“ سالار نے کہا۔

”پورا گروپ؟“ ”جیسے لے کر نہیں گئے۔ میں سر گیا تھا؟“ سعد نے پزیر کر کہا۔

”تمہارا احتیال ہی نہیں آیا ہمیں۔“ سالار نے طعیناں سے کہا۔

”بہت گھٹیا آدمی ہو تم سالار، بہت ہی گھٹیا۔۔۔ یہ دانش بھی کیا تھا؟“

”ہم سب مانی ڈیر ہم سب۔“ سالار نے اسی طعینان کے ساتھ کہا۔

”مجھے کیوں نہیں لے کر گئے تم لوگ؟“ سعد کی گفتگو میں کچھ اور اضافہ ہوا۔

”تم ابھی بیٹے ہو۔ ہر جگہ بچوں کو لے کر نہیں جاسکتے۔“ سالار نے شرارت سے کہا۔

”میں ابھی آکر تمہاری ٹانگیں توڑتا ہوں، پھر تمہیں اندازہ ہو گا کہ یہ بچہ بڑا ہو کیا ہے۔“

”مذاق نہیں کر رہا۔۔۔ ہم نے تمہیں ساتھ جانے کو اس لئے نہیں کہا کیونکہ تم جانتے ہی نہیں۔“

اس بار سالار واقعی سنجیدہ ہوا۔

”کیوں تم لوگ دوڑ میں جا رہے تھے کہ میں وہاں نہ جاتا۔“ سعد کے غصے میں کوئی کی نہیں آئی۔

”تم ازم تم سے دوڑ ہی کیجئے۔ ہم لوگ ٹاٹ کلب گئے ہوئے تھے اور تم کو وہاں نہیں جانا تھا۔“

”کیوں مجھے وہاں کیوں نہیں جانا تھا۔“ سعد کے جواب نے سالار کو کچھ حیران کیا۔

”تم ساتھ چلتے؟“

”آف کورس۔“

”مگر تمہیں وہاں جا کر کیا کرنا تھا۔ نہ تم ڈر تک کرتے ہو، نہ تم ڈانس کرتے ہو۔۔۔۔۔ پھر وہاں جا کر تم کیا کرتے۔۔۔۔۔ ہمیں نصیحتیں کرتے۔“

”اُمس بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ڈر تک اور ڈانس نہیں کرتا، مگر آؤنگک تو ہو جاتی۔ میں انجوائے کرتا۔“ سعد نے کہا۔

”مگر ایسی جگہوں پر جانا اسلام میں جائز نہیں ہے؟“ سالار نے چہیتے ہوئے کچھ میں کہا۔ سعد ہنہ لہے کچھ نہیں کہہ سکا۔

”میں وہاں کوئی غلط کام کرنے تو نہیں جا رہا تھا، تم سے کہہ رہا ہوں صرف آؤنگک کی غرض سے جاتا۔“ چند لمحوں بعد اس نے قدر متعلیٰ ہوئے کہا۔

”اوکے! اگلی بار ہمارا پروگرام ہے گا تو تمہیں بھی ساتھ لے لیں گے بلکہ مجھے پہلے ہی بتا دینا تو کل رات بھی تمہیں ساتھ لے لیتا ہوں۔“ خیر آج کیا کر رہے ہو؟“ سعد اب اس سے معمول کی باتیں

کرنے لگا۔ دس چار سو منٹ تک ان دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی پھر سالار نے فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

”تم اس ویب ایڈیٹر پر کیا کر رہے ہو؟“ اس دن سعد نے سالار سے پوچھا۔ وہ یونیورسٹی کے کینفے لیبر میں موجود تھے۔

”میں اس ویب ایڈیٹر پر نیو پاک جا رہا ہوں، سینڈرا کے ساتھ۔“ سالار نے اپنا پروگرام بتایا۔

”کیوں؟“ سعد نے پوچھا۔

”اس کے بھائی کی شادی ہے۔ مجھے انوائٹ کیا ہے اس نے۔“

”واپس کب آؤ گے؟“

”اتوار کی رات کو۔“

”تم ایسا کرو کہ اپنے اپارٹمنٹ کی چابی مجھے دے جاؤ۔ میں دو دن تمہارے اپارٹمنٹ پر گزار دوں گا، کچھ اسائنمنٹس ہیں جو مجھے تیار کرنے ہیں اور اس ویب ایڈیٹر وہ چاروں ہی مگر ہوں گے۔ وہاں بیاز شہر ہو گا جس تمہارے اپارٹمنٹ میں اطمینان سے بڑھ لوں گا۔“ سعد نے کہا۔

”اوکے تم میرے اپارٹمنٹ میں رہ لینا۔“ سالار نے کندھے سے پکارتے ہوئے کہا۔

اسے سینڈرا کے ساتھ جمعہ کی رات کو لکھنا تھا۔ سالار کا بیگ اس کی گاڑی کی ڈی کی میں تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ سینڈرا کو مین آخری وقت میں چند کام نبھانے پڑے اور وہ جو شرام تھکے کار اور کسے بیٹھے تھے ان کا پروگرام ملتے کی صبح تک ملتوی ہو گیا۔ سینڈرا اپنے انک کیسٹ کے طور پر کہیں رہتی تھی اور وہ اس

کے پاس رات نہیں گزار سکتا تھا۔ اسے اپنے اپارٹمنٹ واپس آنا پڑا۔

رات کو تقریباً گیارہ بجے سینڈرا کو اس کی رہائش گاہ پر ڈراپ کرنے کے بعد وہ اپنے اپارٹمنٹ چلا آیا۔ اس نے سعد کو ایک چابی دی تھی۔ دوسری چابی اس کے پاس ہی تھی وہ جانتا تھا کہ سعد اس وقت بیٹھا پڑھ رہا ہو گا مگر اس نے اسے ڈسٹرب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ لوگ روم کی لائٹ آن تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا وہ اپنے بیدروم میں جاتا جانتا تھا مگر بیڈروم کے دروازے پر ہی ڈرک گیا۔

بیڈروم کا دروازہ بند تھا مگر اس کے باوجود اندر سے ابھرنے والے قہقہے اور باتوں کی آواز میں سن سکتا تھا۔ سعد کے ساتھ اندر کوئی عورت تھی۔ وہ جاہد ہو گیا۔ اس کے گروپ میں صرف سعد تھا جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ کسی لڑکی کے ساتھ اس کے تعلقات نہیں تھے۔ وہ جتنا مذہبی آدمی تھا اس سے یہ توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی وہ اندر داخل نہیں ہوا۔ قدرے بے چینی سے وہ اپنے مڑکیا اور حب اس کی نظر لوگ روم کی ٹیبل پر رکھی بوجل اور گلاس پر پڑی وہاں سے کچن کا ڈسٹر جہاں کھانے کے برتن ابھی تک بڑے ہوئے تھے۔ وہ مزید وہاں کے تغیر اسی طرح خاموشی سے وہاں سے نکل آیا۔

اس کے لئے یہ بات ناقابل یقین تھی کہ سعد وہاں کسی لڑکی کے ساتھ رہنے کے لئے آیا تھا۔ بالکل ناقابل یقین۔۔۔۔۔ جو شخص حرام گوشت نہ کھاتا ہو۔ شراب نہ پیتا ہو، پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہو، ہر وقت اسلام کی بات کرتا رہتا ہو، دوسروں کو اسلام کی تبلیغ کرتا ہو، وہ کسی لڑکی کے ساتھ۔۔۔۔۔ اپارٹمنٹ کے دروازے کو باہر سے بند کرتے ہوئے وہ اسی طرح شک کے عالم میں تھا۔۔۔۔۔ بوجل اور گلاس تو قہیں ظاہر کر رہے تھے کہ اس نے پی بھی ہو گی اور شاید کھانا وغیرہ بھی کھایا ہو گا۔ اسی فریج اور کچن میں جہاں کا وہ اپنی تک پینے کے لئے پانی نہیں ہوتا تھا۔ اسے فنی آتی تھی، جو اپنے آپ کو جتنا اچھا اور سچا مسلمان ظاہر کرنا چاہتا ہے کو شش کرنا کھائی دیتا ہے وہ اتنا بڑا افراد ہوتا ہے۔ ایک یہ شخص تھا جو یوں ظاہر کرتا تھا جیسے پورے امریکہ میں ایک ہی مسلمان ہے اور ایک وہی خلی امام۔۔۔۔۔ جو فینٹ جینی بی جی چادر اوڑھتی تھی اور کردار اس کا یہ تھا کہ ایک لڑکے کے لئے گھر سے بھاگ گئی۔۔۔۔۔ اور بننے پھرنے جیسے سچے مسلمان۔۔۔۔۔ جیسے اپنی گاڑی میں آکر بیٹھتے ہوئے اس نے کچھ تحفے سوچا۔ ”منافقت اور جھوٹ کی حد ان پر ختم ہو جاتی ہے۔“

وہ گاڑی پر پارک سے نکلتے ہوئے پوچھا تھا، اس وقت وہ سینڈرا کے پاس نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے وائس کے پاس جانے کا فیصلہ کیا وہ اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ سالار نے یہاں نہ دیا کہ وہ پورہ رہا تھا اس لئے اس نے وائس کے پاس آئے اور رات وہاں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ وائس مطمئن ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اتوار کی رات کو جب وہ وہاں بیویوں اپنے اپارٹمنٹ آیا تو سعد وہاں نہیں تھا اس کے قلیب میں کہیں بھی ایسے آثار نہیں تھے جس سے یہ پتا چلتا کہ وہاں کوئی عورت آئی تھی، وہاں کی وہ بوتل بھی اسے کہیں نہیں ملی۔ وہ زیر لب مسکراتا ہوا پورے اپارٹمنٹ کا قسطنطنیہ جائزہ لیتا رہا۔ وہاں موجود ہر چیز ویسے ہی جتنی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ سالار نے اپنا سامان رکھنے کے بعد سعد کو فون کیا۔ کچھ دیر رہی یا نہیں کرتے رہنے کے بعد وہ موضوع پر آگیا۔

"پھر ابھی رہی تھیاری لائن؟" اسائنٹ بن گئے؟
"ہاں یار! میں تو وہ دن اچھا خاصا پرستار رہا۔ اسائنٹس تقریباً مکمل کر لی ہیں۔ تم بتاؤ تمہارا اثر پ کیا رہا؟" سعد نے جواب دیا پچھا۔

"بہت اچھا۔"

"تفصی دیر میں پہنچ گئے تھے وہاں، رات کو سڑ کرتے ہوئے کوئی پراہم تو نہیں ہوئی؟"

سعد نے سرسری سے سچے میں پوچھا۔

"میں رات کو سڑ نہیں کیا؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ فرمائیلے کی رات کو نہیں سڑنے کی صبح گئے تھے ہم لوگ وہاں۔" سالار نے بتایا۔

"تم پھر سینڈر کی طرف رہے تھے؟"

"نہیں، دائیں کے پاس۔"

"بیویں یہاں آجاتے اپنے اپارٹمنٹ پر۔"

"آپا تھا۔" سالار نے بڑے لطیفانہ سے کہا۔

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ سالار دلی دل میں ہنسا۔ سعد کے بیروں کے پیچھے سے بیٹیہاں اس وقت زمین نکل گئی تھی۔

"آئے تھے۔؟" اس بار وہ بے اختیار ہلکا ہوا۔

"کیا رہے کے قریب۔ تم اس وقت کسی لڑکی کے ساتھ مصروف تھے۔ میں نے تم لوگوں کو

ڈسٹرب کرنا سنا نہیں سمجھا۔ اس لئے وہاں سے واپس آگیا۔"

وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ سعد پر اس وقت سخت غاری ہو چکا ہوگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ

سکتا تھا کہ سالار اس طرح اس کا بھانڈا پھینک دے گا۔

"ویسے تم نے کبھی اپنی گرل فرینڈ سے ملوایا نہیں۔" اس نے مزید کہا۔ سعد کو سانس لینے میں جتنی

وقت ہو رہی ہوگی وہ اندازہ کر سکتا تھا۔

"بس ویسے ہی۔ لو اداوں گا۔" اس نے دوسری طرف سے بے حد رحم اور معذرت سے خواہانہ انداز میں کہا۔

"مگر تم کسی اور سے اس کا ذکر مت کرنا۔" اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔

"میں کیوں ذکر کروں گا، تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

سالار اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ اسے اس وقت سعد پر کچھ ترس بھی آ رہا تھا۔

اس رات سعد نے پندرہ منوں بعد ہی فون کر دیا۔ سالار کو اس کی شرمندگی کا اچھی طرح اندازہ تھا۔

اس واقعے کے بعد سالار کا خیال تھا کہ سعد دوبارہ بھی اس کے سامنے اپنی مذہبی عقیدت اور

دائستگی کا ذکر نہیں کرے گا مگر اسے یہ کچھ کر حیرت ہوئی تھی کہ سعد میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اب

بھی اسی شدہ دے مذہب پر بات کرتا۔ دوسروں کو نوک دیتا۔ فحشیں کرتا۔ نماز پڑھنے کی ہدایت دیتا۔

سعد، قہرات دینے کے لئے کہتا۔ اللہ سے محبت کے بارے میں گفتگوں کرنے کے لئے تیار رہتا اور

مذہب کے بارے میں بات کر رہا ہوتا تو کسی آیت یا حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو

بھی آجاتے۔

اس کے گروپ کے لوگوں کے ساتھ اور بہت سے لوگ سعد سے بہت متاثر تھے اور اس کے

کردار سے بہت متوجہ۔ اور اللہ سے اس کی محبت پر شک کا شکار، ایک مذہبی مسلم۔ جوانی کی

مصروف زندگی میں بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سعد بات کرنا جانتا تھا اس کا انداز بیان بے حد

متاثر کن تھا۔ اور اس کے شناسا لوگوں میں صرف سالار تھا، جس پر اس کی فصاحت کوئی اثر نہیں کرتی تھی

جو اس سے فزہ پر برابر بھی متاثر نہیں تھا اور نہ ہی کسی شک کا شکار۔ جسے سعد کی ڈاڑھی اس کی دین کے

لئے اشتقامت کا یقین دلائے میں کامیاب ہوئی تھی نہ ہی دوسروں کے لئے اس کا ادب و احترام، اس کا

زرم انداز گفتگو۔

امام سے مذہبی لوگوں کے لئے اس کی ناپسندیدگی کا آغاز ہوا تھا۔ جلال نے اسے آگے بڑھایا تھا

اور سعد نے اسے اختیار پہ پہنچایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مذہبی لوگوں سے بڑھ کر منافق کوئی دوسرا نہیں

ہوتا۔ ڈاڑھی رکھنے والا مرد اور پردہ کرنے والی عورت کسی بھی قسم کی، بلکہ ہر قسم کی برائی کا شکار ہوتے

جس اور ان لوگوں سے زیادہ جو خود کو مذہبی نہیں سمجھتے۔

اتفاق سے ملنے والے تینوں لوگوں نے اس یقین کو مستحکم کیا۔ امام باہم، پردہ کرنے والی لڑکی اور

ایک لڑکے کے لئے اپنے مختیار، اپنے خاندان، اپنے گھر کو چھوڑ کر رات میں فرار ہو جانے والی لڑکی۔

نبال انصر۔ ڈاڑھی والا مرد، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں سرشار ہو کر نعش پڑھنے

والا اور ایک لڑکی سے انصر چلنے والا اور پھر اسے سچ راستے میں چھوڑ کر ایک طرف ہو جانے والا، پھر

دین الگ، دنیا الگ رکھ کر بات کرنے والا۔ سعد فخر کے بارے میں اس کی رائے ایک اور واقعہ سے اور خراب ہوئی۔

وہ ایک دن اس کے لپارمنٹ پر آیا ہوا تھا۔ سالار اس وقت کیمپور ٹران کے اپنا کام کرتے ہوئے اس سے باتیں کرنے لگا، پھر اسے کچھ چیزیں لانے کے لئے اپنے لپارمنٹ سے قریبی مارکیٹ جانا پڑا اور اسے پیدل وہاں آنے چاہئے اور شاپنگ کرنے میں نہیں مشغول تھے۔ سعد اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ جب سالار وہاں آیا تو سعد کیمپور پر جنگل میں مصروف تھا۔ وہ کچھ دیر مزید اس کے پاس بیٹھا، کپ شپ کرنا بار بار پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سالار نے لپارمنٹ پر ایک بار پھر کیمپور پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ بھی کچھ دیر جنگل کرنا چاہتا تھا اور یہ ایک اتفاق تھا کہ اس نے لاشعوری طور پر کیمپور چلائے ہوئے اس کی بھرتی دیکھی۔ وہاں ان ویب سائٹس اور سٹور کی تفصیلات تھیں جو کچھ دیر پہلے اس نے سعد نے دیکھی تھیں۔

سعد نے جن چند ویب سائٹس کو دیکھا تھا وہ پورے لوگرانی سے متعلق تھیں۔ اسے اپنے کسی دوسرے دوست کے ان سٹور دیکھنے پر پاؤں ویب سائٹس کو وزٹ کرنے پر حیرت ہوئی تو نہ اعتراض۔ وہ خود انکی ویب سائٹس کا وزٹ کرنا چاہتا تھا مگر سعد کے ان ویب سائٹس کو وزٹ کرنے پر اسے حیرت ہوئی تھی۔ اس کی نظروں میں وہ کچھ اور نیچے آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”پھر تمہاری کیا پلاننگ ہے؟ پاکستان آنے کا ارادہ ہے؟“

وہ اس دن فون پر سکندر سے بات کر رہا تھا۔ سکندر نے اسے بتایا تھا کہ وہ علیحدہ کے ساتھ کچھ بہتوں کے لئے آسٹریلیا جا رہے ہیں۔ انہیں وہاں اپنے رشتہ داروں کے ہاں ہونے والی شادی کی کچھ تقریبات میں شرکت کرنی تھی۔

”آپ وہ لوگ وہاں نہیں ہوں گے تو میں پاکستان آکر کیا کروں گا۔“ اسے یابوسی ہوئی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ تم بہن بھائیوں سے ملنا، اپنا تہنہ نہیں ہمت کر رہی ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”پاپا میں اس صری چٹیاں گزاروں گا۔ پاکستان آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”تم کیا یہ کہہ رہی ہو کہ تمہارے ساتھ آسٹریلیا چلو، معیار بھی جا رہا ہے۔“ انہوں نے اس کے بڑے بھائی کا نام لیتے ہوئے کہا۔

”میرا دل خراب نہیں ہے کہ میں اس طرح منہ اٹھا کر آپ کے ساتھ آسٹریلیا چلوں۔ معیو کے ساتھ میری کون سی اندر اسٹینڈنگ ہے، جو آپ مجھے اس کے جانے کا تار رہے ہیں۔“ اس نے خاصی بیزارگی کے ساتھ کہا۔

”میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا اگر تم وہاں جانا چاہتے ہو تو ایسا ہی کسی بس اپنا خیال رکھنا اور دیکھو سالار کو کوئی غلط کام مت کرنا۔“

انہوں نے اسے سمجھائی۔ وہ اس غلط کام کی نوعیت کے بارے میں ابھی طرح جانتا تھا اور وہ یہ جملہ سننے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اب اگر سکندر ہر بار فون بند کرنے سے پہلے اس سے یہ جملہ نہ کہتے تو اسے حیرت ہوتی۔

سکندر سے بات کرنے کے بعد اس نے فون کر کے اپنی سیٹ کینسل کرادی۔ فون کا ریسیور رکھنے کے بعد صوفے پر چٹ لینا چھت کو گھورتے ہوئے وہ لیوئر مٹی بند ہونے کے بعد اگلے کچھ بہتوں کی مصروفیات کے بارے میں سوچتا رہا۔

”مجھے چند دن سکینگ (skiing) کے لئے گئیں جانا چاہئے یا پھر کسی دوسری انیٹیٹ کو وزٹ کرنا چاہئے۔“ وہ منسوب ہونا لگا۔ ”ٹھیک ہے میں کل لیوئر مٹی سے واپس آئی تو آپ میرے ملوں گا۔ باقی کا پروگرام وہاں سے کر لیں گا۔“ اس نے فیصلہ کیا۔

اگلے دن اس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر سکینگ کے لئے جانے کا پروگرام طے کر لیا۔ اس نے سکندر اور اپنے بڑے بھائی کو اپنے پروگرام کے بارے میں بتا دیا۔

چٹیاں شروع ہونے سے ایک دن پہلے اس نے ایک انڈین ریستورنٹ میں کھانا کھایا، وہ کھانا کھانے کے بعد بھی کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا مگر وہ ایک قریبی باب میں چلا گیا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے دوران اس نے وہاں چند پیگ پیگ۔

رات دس بجے کے قریب ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے اچانک حسی ہونے لگی۔ گاڑی روک کر وہ کچھ دیر کے لئے سڑک کے گرد پھیلے ہوئے سبزے پر چلنے لگا۔ سرد ہوا اور نکلی تے کچھ دیر کے لئے اسے جڑوں کر دیا مگر چند منٹوں کے بعد ایک بار پھر اسے حسی ہونے لگی۔ اسے اپنے سینے اور پیٹ میں ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہو رہا تھا۔

یہ کھانے کا اثر تھا یا پیگ کا۔ فوری طور پر اسے اندازہ نہیں ہوا۔ اب اس کا سریری طرح پتھر ہوا تھا۔ یک دم وہ جھٹکے ہوئے اس نے اسے اختیار تے کی اور پھر چند منٹ اسی طرح جھکا رہا۔ معدہ خالی ہو جانے کے بعد بھی اس کو اپنی حالت بہتر محسوس نہیں ہوئی۔ سیدھا کمرے رہنے کی کوشش میں اس کے سر لاکھڑا گئے۔ اس نے سڑک پر اپنی گاڑی کی طرف جانے کی کوشش کی مگر اس کا سر اب پہلے سے زیادہ پتھر ہوا تھا۔ چند گز دور مرکزی گاڑی کو دیکھنے میں بھی اسے وقت ہو رہی تھی۔ اس نے ہٹکل چند قدم اٹھائے مگر گاڑی کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ پتھر کر زمین پر گر پڑا اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

کھل طور پر ہوش کھونے سے پہلے اس نے کسی کو اپنے آپ کو بھجھوڑتے محسوس کیا۔ کوئی ہنسنے آواز میں اس کے قریب کچھ کبھ رہا تھا، آوازیں ایک سے زیادہ تھیں۔ سالار نے اپنے سر کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے سر کو حرکت نہیں دے سکا۔ اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی ناکام رہی۔ وہ اب مکمل طور پر تاریکی میں جا چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے دو دن ہاسٹل میں گزارے تھے۔ وہاں سے گاڑی میں گزرنے والے کسی جوڑے نے اسے گرتے دیکھا تھا اور وہی اسے اٹھا کر ہاسٹل لے آئے تھے۔ ڈاکٹر کے مطابق وہ فوڈ پوائزننگ کا شکار ہوا تھا۔ وہ ہاسٹل آنے کے چند گھنٹوں کے بعد ہوش میں آ گیا تھا اور وہاں سے پہلے جانے کی خواہش رکھنے کے باوجود جسمانی طور پر اپنے آپ کو اتاری بری حالت میں محسوس کر رہا تھا کہ وہاں سے جائیں سکا۔

اگلے دن شام تک اس کی حالت کچھ بہتر ہونے لگی مگر ڈاکٹر کی ہدایت پر سالار نے وہ رات بھی وہیں گزار دی۔ اتوار کو سہ پہر کے قریب وہ گر آیا تھا مگر آرتھریٹس اس نے فوراً پیر کے ساتھ ملے پا جانے والا پیر و گرام چند دنوں کے لئے ملتی کر دیا۔ اسے بھر کو بچ لکنا تھا اور اس نے ملے لے لیا تھا کہ جانے سے پہلے وہ ایک بار پھر میڈرڈ کو کال کرے گا جین اب پر و گرام کینسل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اس کو بلکد اپنے کسی بھی دوست کو کال کرنے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔

ایک جگہ پہلے سینڈ ویج کے ساتھ کافی کا ایک کپ پینے کے بعد اس نے سکون آور دوائی اور سونے کے لئے چلا گیا۔

اگلے دن جب اس کی آنکھ کھلی اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ سالار کو فینڈے بیدار ہوتے ہی سر میں شدید درد کا احساس ہوا۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس نے اپنا کھانا چھوڑا اور اس کا قابضیت زیادہ گرم تھا۔ "کم آن!" وہ بیخاری سے بڑ بڑایا۔ جھپٹلے دو دن کی بیماری کے بعد وہ اگلے دو دن ستر پر پڑے ہوئے نہیں گزارنا چاہتا تھا اور اس وقت اسے اس کے آگے تھر آرہے تھے۔

جوں توں بیدار ہوئے لکڑی کے دروازے پر ہاتھ دھکے لگا کر پھر پھر میں آ گیا کافی بننے کے لئے رکھ کر وہ آنکھیں بند کر کے سو گیا۔ پھر ڈاکٹر نے اسے ہاتھ دھکے لگا کر پھر پھر میں آ گیا کافی بننے کے لئے رکھ کر وہ آنکھیں بند کر کے سو گیا۔ پھر ڈاکٹر نے اسے ہاتھ دھکے لگا کر پھر پھر میں آ گیا کافی بننے کے لئے رکھ کر وہ آنکھیں بند کر کے سو گیا۔

سینڈرڈ کا اندازہ تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر کیننگ کے لئے چلا گیا تھا۔ یہی خیال سکندر اور کامران کا تھا۔ انہوں نے بھی اسے چند کالز کی تھیں۔ چند کالز اس کے کچھ گلاس فیلڈ کی تھیں۔ وہ بھی چھٹیاں گزارنے کے لئے اپنے گھروں کو جانے سے پہلے کی گئی تھیں۔ ہر ایک نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ انہیں

جوانی کال کرے اگر اس نے جھپٹلے دو دن اپنا نمٹ پر گزارے ہوتے تو وہ یقیناً یہ کام کرنا محراب وہ جانتا تھا کہ اب وہ سب وہاں جا چکے ہوں گے البتہ وہ سکندر، کامران اور سعد کو پاکستان میں کال کر سکتا تھا مگر اس وقت وہ یہ کام کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

کافی کے ایک گک کے ساتھ دو سلاٹس کھانے کے بعد اس نے گھر پر موجود چند میڈیسنز لیں اور پھر دوبارہ بیدار ہو کر لیٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بغاوت کے لئے اتنا ہی کافی تھا اور شام تک وہ اگر مکمل طور پر نہیں تھک جاتا تو کب تک ٹھیک ہو چکا ہوگا۔

اس کا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا۔ شام کے وقت وہ میڈیسن کے زیر اثر آنے والی خیریت سے بیدار ہوا تو اس کا جسم بری طرح بیمار میں جھپٹ کر رہا تھا۔ اس کی زبان اور ہونٹ خشک تھے اور اسے اپنا منہ کافوں سے بھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پورے جسم کے ساتھ ساتھ اس کا سر بھی شدید درد کی گرفت میں تھا اور شاید اس کے اس طرح بیدار ہونے کی وجہ یہ شدید بیمار اور تکلیف ہی تھی۔

اس بار اندازے منہ بیل پر لپٹے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹکے پر ہاتھ کے نیچے رکھتے ہوئے کافوں کے انگوٹھوں سے نیپٹھوں کو سسلے ہوئے سر میں اٹھنے والی درد کی فیوس کو کم کرنے کی کوشش کی مگر وہ بری طرح ناکام رہا۔ چہرہ ٹکے میں چھپانے وہ بے حس و حرکت پڑا۔

تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش میں وہ کب وہ بارہ فیصد کی آغوش میں گیا اسے اندازہ نہیں ہوا۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس وقت کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور صرف کمرہ ہی نہیں پورا مگر تاریک تھا وہ پہلے سے زیادہ تکلیف میں تھا۔ چند منٹوں تک بیدار نہ ہونے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر لیٹ گیا۔ ایک بار پھر اس نے اپنے ذہن کو تاریکی میں ڈبوئے محسوس کیا مگر اس بار یہ فینڈ نہیں تھیں۔ وہ فیلڈ کی کسی درمیانی کیفیت میں سے گزر رہا تھا۔ وہ اب خود کو کراہتے ہوئے سن رہا تھا مگر وہ اپنی آواز کا گانا نہیں گھونٹ پار تھا۔ سینٹرل ہسپتال ہونے کے باوجود اسے بے تحاشا سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جسم بری طرح کاپر رہا تھا اور مکمل اس کی کپکاپات کو ختم کرنے میں ناکام تھا وہ جسمانی طور پر خود بخود کچھ کچھ پیٹنے پائنتے پاؤں ہونے کے قابل نہیں تھا۔ اسے اپنے سینے اور پیٹ میں ایک بار پھر درد محسوس ہونے لگا تھا۔

اس کی کراہوں میں اب شدت آتی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر محسوس کرنے پر اس نے اٹھنے اور تیزی سے واپس روم تک جانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ چند گھنٹوں کے لئے وہ بیدار پڑا مگر کچھ منٹوں میں کامیاب ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ بیدار سے اترنے کی کوشش کرنا اسے ایک زور کی اپکائی آئی۔ جھپٹلے چوبیس گھنٹوں میں اندر در در جانے والی تھوڑی بہت خوراک بھی باہر آ گئی تھی۔ وہ طبی کے عالم میں بھی اپنے پیڑوں اور سیکل سے بے نیاز نہیں تھا مگر وہ مکمل طور پر گندگی سے تھوڑے سے

کھل طور پر ہوش کھونے سے پہلے اس نے کسی کو اپنے آپ کو جھوٹے محسوس کیا۔ کوئی بلند آواز میں اس کے قریب کچھ کہہ رہا تھا، آواز میں ایک سے زیادہ تھیں۔
سالار نے اپنے سر کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے سر کو حرکت نہیں دے سکا۔ اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی ناکام رہی۔ وہ اب مکمل طور پر تاریکی میں جا چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے دو دن ہاسٹل میں گزارے تھے۔ وہاں سے گاڑی میں گزرنے والے کسی جوڑے نے اسے گرتے دیکھا تھا اور وہی اسے اٹھا کر ہاسٹل لے آئے تھے۔ ڈاکٹر کے مطابق وہ فوڈ پازنگ کا مختار ہوا تھا۔ وہ ہاسٹل آنے کے چند گھنٹوں کے بعد ہوش میں آگیا تھا اور وہاں سے چلے جانے کی خواہش رکھنے کے باوجود جسمانی طور پر اپنے آپ کو ابھی بری حالت میں محسوس کر رہا تھا کہ وہاں سے جانیں سکا۔
اگلے دن شام تک اس کی حالت کچھ بہتر ہونے لگی مگر ڈاکٹر کی ہدایت پر سالار نے دو رات بھی وہیں گزار دی۔ انوار کو سپر کے قریب وہ گھر آگیا تھا اور گھر آتے ہی اس نے نو آہ پٹر کے ساتھ ملے جا پانے والا ہر وگرام چند دنوں کے لئے ملوثی کر دیا۔ اسے پھر کو بچ لگنا تھا اور اس نے بچے کیا تھا کہ جانتے سے پہلے وہ ایک بار پھر بیڈ راکو کال کرے گا لیکن اب پر وگرام کیسٹل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اس کو بالکل اپنے بھی دوسٹ کو کال کرنے کا اور ابھی تک کر دیا۔

ایک ہفتے پہلے ہیڈ ویج کے ساتھ کافی کا ایک کپ پینے کے بعد اس نے سکون آور دوا لی اور سونے کے لئے چلا گیا۔

اگلے دن جب اس کی آنکھ کھلی اس وقت قیام رہا رہے تھے۔ سالار کو فینڈ سے بیدار ہوتے ہی سر میں شدید درد کا احساس ہوا۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس نے اپنا تھا اور جسم چھوا، اس کا تھا بہت زیادہ گرم تھا۔
”اگم آن!“ وہ بیزار سی سے بڑبڑایا۔ پچھلے دو دن کی بیماری کے بعد وہ اگلے دو دن بستر پر پڑے ہوئے نہیں گزارنا چاہتا تھا اور اس وقت اسے اس کے آثار نظر آ رہے تھے۔

جوں توں بیڈ سے نکل کر وہ نہ باجھ دھوے بغیر ایک بار پھر بکچن میں آگیا کافی پینے کے لئے رکھ کر وہ آنکر answerphone پر ریکارڈ کاٹ کر سننے لگا، چند کالز سعد کی تھیں جس نے وہاں پاکستان جانے سے پہلے اس سے ملنے کے لئے بار بار اسے رنگ کیا تھا اور پھر آخری کال میں اس کے اس طرح غائب ہونے پر اسے ابھی خاصی صلاوا میں مبتلا تھیں۔

بیڈر کا اندازہ تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر کونکے کے لئے چلا گیا تھا۔ یہی خیال سکندر اور کامران کا تھا۔ انہوں نے بھی اسے چند کالز کی تھیں۔ چند کالز اس کے کچھ کلاس فیلو کی تھیں۔ وہ بھی چٹایاں گزارنے کے لئے اپنے گھروں کو جاتے سے پہلے کی گئی تھیں۔ ہر ایک نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ انہیں

جو ابھی کال کرے اگر اس نے پچھلے دو دن اپارٹمنٹ پر گزارے ہوتے تو وہ یقیناً یہ کام کرنا مگر اب وہ جانتا تھا کہ اب وہ سب واپس جا چکے ہوں گے البتہ وہ سکندر، کامران اور سعد کو پاکستان میں کال کر سکتا تھا مگر اس وقت وہ یہ کام کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

کافی کے ایک کپ کے ساتھ دو سلاٹس کھانے کے بعد اس نے گھر پر موجود چند میڈیسیلز اور پھر دو بار بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بخار کے لئے اتنا ہی کافی تھا اور شام تک وہ اگر مکمل طور پر نہیں ٹھیک ہو جاتا تو حد تک ٹھیک ہو چکا ہو گا۔

اس کا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا۔ شام کے وقت وہ میڈیسن کے زیر اثر آنے والی نیند سے بیدار ہوا تو اس کا جسم بری طرح بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کی زبان اور ہونٹ خشک تھے اور اسے اپنا سلیق کافوں سے مجرا ہو محسوس ہو رہا تھا۔ پورے جسم کے ساتھ ساتھ اس کا سر بھی شدید درد کی گرفت میں تھا اور شاید اس کے اس طرح بیدار ہونے کی وجہ یہ شدید بخار اور تکلیف ہی تھی۔

اس بار اندھ منہ، بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ کیے پر اتھے کے نیچے رکھتے ہوئے ہاتھوں کے انگوٹھوں سے ٹینڈوں کو سسلتے ہوئے سر میں اٹھنے والی درد کی ٹیسوں کو کم کرنے کی کوشش کی مگر وہ بری طرح ناکام رہا۔ چہرہ ٹھیکے میں چھپانے وہ بے حس حرکت پڑا۔

تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش میں وہ جب دو بارہ نیند کی آغوش میں گیا اسے اندازہ نہیں ہوا۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس وقت کرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور صرف کمرہ ہی نہیں پورا گھر تاریک تھا وہ پہلے سے زیادہ تکلیف میں تھا۔ چند منٹوں تک بیڈ سے اٹھنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر لیٹ گیا۔ ایک بار پھر اس نے اپنے ذہن کو تاریکی میں ڈبوئے محسوس کیا مگر اس بار یہ نیند نہیں تھی۔ وہ غنودگی کی کسی درمیانی کیفیت میں سے گزر رہا تھا۔ وہ اب خود کو کہہ رہے تھے کہ سن رہا تھا مگر وہ اپنی آواز کا گواہ نہیں سمجھتا تھا۔ بیٹھنے کیلئے ہانکے ہونے کے باوجود اسے بے حاشا ساروی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جسم بری طرح کاہل رہا تھا اور مکمل اس کی کپکپاہٹ کو قسم کرنے میں ناکام تھا وہ جسمانی طور پر خود بخود کچھ بھی پسینہ یا زور ہٹنے کے قابل نہیں تھا۔ اسے اپنے سینے اور پیٹ میں ایک بار پھر درد محسوس ہونے لگا تھا۔

اس کی کہہ ابوں میں اب شدت آتی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر حلی محسوس کرنے پر اس نے اٹھنے اور بیڈ سے واپس روک دم جانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ چند گھنٹوں کے لئے وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ بیڈ سے اترنے کی کوشش کرتا اسے ایک زور کی الٹائی آئی۔ پچھلے پچیس گھنٹوں میں اندر وہ جانے والی تھوڑی بہت خوراک بھی باہر آئی تھی۔ وہ طبیعی کے عالم میں بھی اپنے کپڑوں اور مکمل سے بے نیاز نہیں تھا مگر وہ مکمل طور پر مگدی سے نصرت سے ہوئے

سے بس تھا اسے اپنا پورا وجود مفلوج محسوس ہو رہا تھا۔ بے جان سی حالت میں وہ اسی طرح دو بارہ بستر پر لیٹ گیا۔ اسے اپنا دل ڈھونڈتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اگر دے ماحول سے مکمل طور پر بے نیاز ہو چکا تھا۔ فطرت کی کیفیت میں گراہوں کے ساتھ اس کے منہ میں جو کچھ آ رہا تھا وہ بولتا ہوا چلا رہا تھا۔

فطرت کا یہ سلسلہ کتنے کتنے جاری رہا تھا اسے یاد نہیں۔ ہاں! البتہ اسے یہ ضرور یاد تھا اس کیفیت کے دوران اسے ایک پار یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ سر رہا ہے اور اسی وقت زندگی میں پہلی بار موت سے عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا وہ کسی نہ کسی طرح خون تک پہنچتا ہوا پتا تھا وہ کسی کو بلاتا ہوا تھا مگر وہ ہنسنے سے پہلے تک نہیں اتر سکا۔ شدید ہنسنے سے مکمل طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

اور پھر بالآخر وہ خود ہی اس کیفیت سے باہر آ گیا تھا اس وقت رات کا چھٹا پہر تھا جب وہ اس فنوڈی سے باہر نکلا تھا۔ آنکھیں کھولنے پر اس نے کمرے میں وہی تاریکی دیکھی تھی مگر اس کا جسم اب پہلے کی طرح گرم نہیں تھا۔ لکڑی کھل طور پر ختم ہو چکی تھی اس کے سر اور جسم میں ہونے والا درد بھی بہت بڑھا تھا۔

کمرے کی چھت کو کچھ دیر گھورنے کے بعد اس نے لیٹے لیٹے اندھیرے میں سائید لپسٹ کو دھوٹ کر آن کر دیا۔ روشنی نے کچھ دیر کے لئے اس کی آنکھوں کو چند حیا کر بند ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ تیز حیا کر آنکھوں کے بند پتوں کو چھوا۔ وہ سوچے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں جبین ہو رہی تھی۔ سوچے ہوئے پتوں کو ہشکل کھینے کہتے ہوئے وہ اب ارد گرد کی چیزوں پر غور کر رہا تھا اور اپنے ساتھ ہونے والے تمام واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ جمناکوں کے ساتھ اسے سب کچھ یاد آتا جا رہا تھا۔

اسے بے اختیار اپنے آپ سے گھن آئی، بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی شرمت کے منہ کھول کر اسے آتار کر دور چھینک دیا۔ پھر لڑکھڑاتے ہوئے وہ بیڈ سے اتر گیا اور کھل اور بیڈ شیٹ بھی کھینچ کر اس نے بیڈ سے آتار کر فرش پر ڈال دیئے۔

ان ہی لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ وہ سوچے سمجھے بغیر ہاتھ روم میں گھس گیا۔

ہاتھ روم میں موجود بڑے آئینے کے سامنے اپنے چہرے پر نظر پڑے ہی اسے جیسے شاک لگا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں ان کے گرد پانے والے پتلے بہت نمایاں تھے اور چہرہ بالکل زرد تھا۔ اس کے ہونٹوں پر چوڑیاں بھی ہوئی تھیں۔ اسے اس وقت دیکھنے والا بھی سوچتا کہ وہ کسی لمبی بیماری سے آغلا ہے۔

”چشمیں کھینے میں اتنی شیوہ بڑھ گئی ہے؟“ اس نے جبرائی کے عالم میں اپنے کالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”اتنی بری شکل تو میری فوڈ اپ انزیک کے بعد ہا چٹل میں رہ کر بھی نہیں ہوئی تھی جتنی ایک دن کے

اس بخار نے کر دی ہے۔“

وہ بے نتیجی کے عالم میں اپنے آنکھوں کے مفلوج کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ لب میں پانی بھر کر وہ اس میں لیٹ گیا۔ اسے جبرائی ہو رہی تھی کہ بخار کی حالت میں بھی اس نے فوری طور پر اسی وقت اپنے کپڑے کیوں نہیں بدل لئے وہ کیوں وہیں پڑا رہا۔

ہاتھ روم سے باہر نکلتے کے بعد بیڈ روم میں رہنے کے بجائے وہ کچن میں چلا گیا۔ اسے بے تماشاً بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے نوڈل بنائے اور انہیں کھائے لگا۔ ”مجھے صبح ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنا تفصیلی چیک اپ کروانا چاہیے۔“ اس نے نوڈل کھاتے ہوئے سوچا، لیکن ایک بار پھر اس کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ نہانے کے بعد اسے اگرچہ اپنا وجود بہت بڑھا چکا تھا محسوس ہو رہا تھا مگر اس کی تھکت شتم نہیں ہوئی تھی۔

نوڈل کھانے کے دوران اس نے ٹی وی آن کر دیا اور جیتل سرج کے لئے ایک جیتل پر آنے والا گاڈ شو دیکھتے ہوئے اس نے ریموٹ رکھ دیا اور ایک بار پھر نوڈل کے پیالے پر جھک گیا۔ اس نے ابھی نوڈل کر دیا کہ سوراچے منہ میں رکھا ہی تھا کہ وہ بے اختیار رک گیا۔ ابھی جوئی نظروں سے ناک شو کو دیکھتے ہوئے اس نے ریموٹ کو ایک بار پھر اٹھایا۔ ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے وہ ایک بار پھر جیتل سرج کرنے لگا مگر اس بار وہ ہر جیتل کو پہلے سے زیادہ شہیر کر دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کی ابلیمن بڑھتی جا رہی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ بڑبڑایا۔

اسے ابھی طرح یاد تھا وہ جمعہ کی رات کو سڑک پر بے ہوش ہونے کے بعد ہاسپٹل گیا تھا۔ ہسپتال کا سارا دن اس نے وہیں گزارا تھا اور اتوار کی سہ پہر کو وہ وہاں آیا تھا۔ اتوار کی سہ پہر کو سونے کے بعد وہ اگلے دن گیارہ بجے کے قریب آٹھا تھا۔ پھر اسی رات اسے بخار ہو گیا تھا۔ شاید اس نے منگل کا سارا دن بخار کی حالت میں گزارا تھا اور اب یقیناً منگل کی رات تھی، مگر ٹی وی سمجھتا ہے کچھ اور بتا رہے تھے۔ وہ ہسپتال کی رات تھی اور اگلا طالع ہونے والا دن اتوار کا تھا۔

اس نے اپنی رست واضح پر ایک نغرد وڑائی جو لوگ روم کی میز پر پڑی تھی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے نوڈل کھا لیا۔ میز پر رکھ دیا ایک تخت ہی جیسے اس کی بھوک اڑ گئی تھی۔ وہاں موجود تارخ نے اسے جیسے ایک اور بھلا دیا تھا۔

”کیا مطلب ہے، کیا میں پانچ دن بخار میں مبتلا رہا ہوں۔ پانچ دن ہوش و حواس سے بے خبر رہا ہوں؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ یہ کہنے لگا۔

”پانچ دن، پانچ دن تو بہت ہوتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے، مجھے پانچ دن گزرنے کا پتہ ہی نہ

پلے..... میں پانچ دن تک اس طرح بے ہوش کیسے رہ سکتا ہوں۔"
وہ نوکڑے قدموں کے ساتھ تیزی سے answerphone کی طرف بڑھ گیا، فون پر اس کے لئے کوئی ریکارڈ پیغام نہیں تھا۔

"پاپائے مجھے کوئی کال نہیں کی اور..... سحر سب کو کیا ہو گیا..... کیا میں انہیں یاد نہیں رہا۔"
اسے جیسے کوئی پیغام نہ پا کر شک لگا تھا۔ وہ بہت دیر تک فائل سائیکل فون کے پاس بیٹھا رہا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پاپا کو میرا خیال ہی نہ رہا ہو یا کسی اور فرینڈ کو..... یا پھر کسی اور کو..... اس طرح مجھے کیسے چھوڑ دیا انہوں نے اور اس وقت اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ ایک بار پھر کچکا رہے تھے۔ وہ غائب یا کڑی نہیں تھی پھر وہ کیا تھا جو اسے کاپٹے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ اٹھ کر وہاں صوفے کی طرف چلا آیا۔

نوڈلز کے پیالے کو ہاتھ میں لے کر وہ ایک بار پھر انہیں کھانے لگا اس بار نوڈلز میں چند منٹ پہلے کا ڈائمنڈ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اسے لگا وہ بے ڈاکٹر رہے چند گرم کڑوں کو چہا رہا ہے۔ چند کوچے لینے کے بعد اس نے پیالہ دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ اسے کھا نہیں پا رہا تھا۔ وہ اب بھی عجیب سی بے چینی کی گرفت میں تھا۔ کیا واقعی وہ پانچ دن یہاں اکیلا اس طرح گزارا تھا کہ اسے خود اپنے بارے میں پتا تھا اور نہ ہی کسی اور کو۔

وہ ایک بار پھر دواش روم میں چلا گیا۔ اس کا چہرہ کچھ دیر پہلے جیسا نہیں لگ رہا تھا نہ اسے وہ کچھ بہتر ہو گیا تھا مگر اس کی شیو اور آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے حلقے اب بھی اسی طرح موجود تھے۔ آجینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ کچھ دیر تک اپنی آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے حلقوں کو چھو تا رہا یوں جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ وہ واقعی وہاں موجود تھے یا پھر اس کا وہم ہے۔ اسے ایک دم اپنے چہرے پر موجود بالوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔

وہیں کھڑے کھڑے اس نے شیو کٹ نکالی اور شیو کرنے لگا۔ شیو کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ کا کپ رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے اسے تین کٹ لگے۔ اس نے شیو کے بعد اپنا چہرہ دھویا اور اس کے بعد تو لیے سے آجینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے اسے شک کرنے لگا جب اسے ان زخموں سے رستے ہوئے خون کا احساس ہوا اس نے چہرے کو تو لیے سے چھپانا بند کر دیا۔

خالی الذہنی کے عالم میں وہ آجینے میں اپنے چہرے کو دیکھنے لگا۔
اس کے گالوں پر آہستہ آہستہ ایک بار پھر خون کے قطرے صوبار ہو رہے تھے۔ گہرا سرخ رنگ، دو چلیں چمکے بغیر ان قطرہوں کو دیکھنا رہ۔ تین تین نئے سرخ قطرے۔

"What is next to ecstasy"

"Pain"

سرد اور مدھم آواز آئی۔ وہ پتھر کے ریت کی طرح ساکت ہو گیا۔

"What is next to pain"

"Nothingness"

اسے ایک ایک لفظ یاد تھا۔

"Nothingness"

"وہ آجینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے بڑ بڑایا۔ اس کے گالوں کی حرکت سے فون کے قطرے اس کے گالوں پر پھسلنے لگے۔

"And what comes next to nothingness"

"Hell"

سالار کو ایک دم ایسا ہی آئی۔ وہ دواش جین پر بے اختیار دوہرا ہو گیا۔ چند منٹ پہلے کھائی گئی خوراک ایک بار پھر باہر آگئی تھی۔ اس نے غل کھول دیا۔ اس نے اس کے بعد کیا پوچھا تھا۔ اس نے اس کے جواب میں کیا کیا تھا اسے یاد تھا۔

"ابھی جنہیں کوئی چیز سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ابھی آئے گی بھی نہیں۔ ایک وقت آئے گا جب تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ ہر شخص پر ایک وقت آتا ہے جب وہ سب کچھ سمجھنے لگتا ہے جب کوئی سمجھ نہ نہیں رہتا۔ میں اس دور سے گزر رہی ہوں۔ تم پر وہ دور آئندہ کبھی آئے گا۔ اس کے بعد تم دیکھنا۔ کیا تمہیں پتہ آتی ہے۔"

سالار کو ایک اور ایسا ہی آئی، اسے اپنی آنکھوں سے پانی بہتا ہوا محسوس ہوا۔

"زندگی میں ہم کبھی اس مقام پر آجاتے ہیں جہاں سارے رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہاں صرف ہم ہوتے ہیں اور اللہ ہو تا ہے۔ کوئی ماں باپ کوئی بہن بھائی، کوئی دوست نہیں ہوتا۔ پھر ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے ہر دلوں کے نیچے زمین ہے نہ ہمارے سر کے اوپر کوئی آسمان، بس صرف ایک اللہ ہے جو ہمیں اس خلا میں بھی تھا ہے ہوتے ہے۔ پھر پتا چلتا ہے ہم زمین پر پڑی مٹی کے ڈھیر میں ایک ڈرے یا درخت پر لگے ہوئے ایک پتے سے زیادہ کی وقعت نہیں رکھتے۔ پھر پتا چلتا ہے کہ ہمارے ہوتے پانچ ہونے سے صرف ہمیں فرق پڑتا ہے۔ صرف ہمارا کردار ختم ہو جاتا ہے۔ کائنات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی کسی چیز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

سالار کو اپنے سینے میں عجیب سا درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پہتے ہوئے پانی کو منہ میں ڈالا اسے ایک بار پھر ایسا ہی آئی۔

”اس کے بعد ہماری عقل ٹھکانے آجاتی ہے۔“

وہ اس آواز کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے حیرانی پوری تھی وہ اس وقت کیوں یاد آتی تھی۔

اس نے پانی کے پھینٹے اپنے چہرے پر مارے شروع کر دیے۔ چہرے کو ایک بار پھر پونچھ لگا۔ آخر شبیر کی بوجھل کھول کر اس نے گالوں پر موجود ان زخموں پر لگا کر شروع کر دیا جہاں اب اسے پہلی بار تکلیف ہو رہی تھی۔

واش روم سے باہر نکلے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کا ہاتھ اب بھی کاپ رہے ہیں۔
”مجھے ڈاکٹر کے پاس چلے جانا چاہئے۔“ وہ اپنی مضامین پھینچنے لگا۔ ”مجھے مدد کی ضرورت ہے اپنا چیک اپ کروانا ہے۔“

وہ نہیں جانتا تھا اسے ایک دم وہاں وحشت کیوں ہونے لگی تھی۔ اسے اپنا سانس وہاں بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی اس کی گردن پر پادوس رکھے آہستہ واپڈاؤل رہا تھا۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ سب لوگ مجھے اس طرح بھول جائیں۔ اس طرح.....“
اس نے اپنی وارڈ روپ سے نئے کپڑے نکال کر ایک بار پھر کچھ دیر پہلے کا پہتا ہوا لباس بدلنا شروع کر دیا۔ وہ جلد در جلد ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتا تھا اسے اپنے لپارمنٹ سے ایک دم خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

اس رات گھر آکر وہ تقریباً ساری رات جاگتا رہا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت نے اسے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ اس کا ذہن یہ تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ اسے اس طرح ہلکا دیا گیا ہے۔ وہاں باپ کی ضرورت سے زیادہ توجہ ہمیشہ حاصل کرتا رہا تھا۔ کچھ اس کی حرکتوں کی وجہ سے بھی سکندر رحمان اور طیبہ کو اس کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط ہونا پڑا۔ وہ ہمیشہ ہی اس کے بارے میں فکر مند رہے تھے، مگر اب یک دم چند دنوں کے لئے وہ جیسے سب کی زندگی سے لکل گیا تھا۔ دوستوں کی، بہن بھائیوں کی، ماں باپ کی۔ وہ اگر اس بیماری کے دوران وہاں اس لپارمنٹ میں مر جاتا تو کسی کو پتا تک نہیں چلتا شاید جب تک جب تک اس کی لاش نکلتے سڑنے نہ لگی اور اس موسم میں ایسا ہونے میں کتنے دن لگتے۔

وہ اس رات ایک ٹیکہ کھنے کے بعد اپنے answerphone کو چیک کرتا رہا۔ اگلا پورا ہفتہ اس نے اسی بے چینی کے عالم میں اپنے لپارمنٹ میں گزارا۔ پورے ہفتے کے دوران اسے کتنے سے کوئی کال نہیں ملی۔
”کیا سب لوگ مجھے بھول گئے ہیں؟“

وہ وحشت زدہ ہو گیا۔ ایک ہفتہ تک بے وقوفوں کی طرح کسی کی کال کا انتظار کرتے رہنے کے بعد اس نے خود سب سے رابطہ کی کوشش کی۔

وہ انہیں فون پر بتانا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ کس کیفیت سے گزر رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ٹھکڑ کرنا چاہتا تھا، مگر ہر ایک سے رابطہ کرنے پر اسے پہلی بار یوں محسوس ہوا جیسے کسی کو اس میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ ہر ایک کے پاس اپنی مصروفیات کی تعصبات تھیں۔

سکندر اور طیبہ اسے آسٹریلیا میں اپنی سرگرمیوں سے آگاہ کرتے رہے۔ وہاں کیا کر رہے تھے، کتنا نجانوئے کر رہے تھے۔ وہ کچھ غائب دماغی کے عالم میں ان کی باتیں سننا رہا۔
”تم نجانوئے کر رہے ہو اپنی چھٹیاں؟“

بہت لمبی چوڑی بات کے بعد طیبہ نے بالآخر اس سے پوچھا۔
”ہیں؟ ہاں، بہت.....“ وہ صرف تین لفظ بول سکا۔
وہ واقعی نہیں جانتا تھا کہ اسے طیبہ سے کیا کہنا ہے کیا بتانا چاہئے؟

باری باری سب سے بات کرتے ہوئے وہ پہلی بار اس قسم کی صورت حال اور کیفیت سے دوچار ہوا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو بنیادی طور پر صرف اپنی زندگی سے دلچسپی تھی۔ شاید وہ انہیں اپنے ساتھ ہونے والے واقعات بتانا چاہتا تو وہ اس کے لئے تشویش کا اظہار کرتے۔ پریشان ہو جاتے مگر وہ سب بعد میں ہوتا۔ اس کے بتانے کے بعد وہ اس سے پہلے ان کی زندگی کے دائرے میں اس کی زندگی کہاں آتی تھی۔ کس کو دلچسپی تھی یہ سننے میں کہ اس کے چند دن کس طرح غائب ہو گئے۔

اور شاید جب ہی اس نے پہلی بار سوچا کہ میری زندگی ختم بھی ہوگی تو کسی دوسرے کو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ دنیا میں کیا تبدیلی آئے گی؟ میرا خاندان کیا محسوس کرے گا؟ کچھ بھی نہیں۔ چند دنوں کے دکھ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں اور دنیا میں تو شاید چند گھنٹوں کے لئے بھی کوئی تبدیلی نہ آئے۔

سالادر سکندر اگر غائب ہو جائے تو واقعی کسی دوسرے کو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ چاہے اس کا آئی کیو کیل ۱۵۰+ ہو۔ وہ اپنی سوچوں کو جھٹکنے کی کوشش کرتا مگر ایسی مایوسی اور اس طرح کی ذہنی حالت۔ آخر مجھے ہو کیا گیا ہے، اگر سب لوگ کچھ دنوں کے لئے مجھے بھول بھی گئے تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ بعض دفعہ ایسا ہو جاتا ہے میں بھی تو بہت بار بہت سے لوگوں کے ساتھ رابطہ نہیں رکھتا۔ پھر اگر میرے ساتھ ایسا ہو گیا تو۔

مگر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ اور اگر واقعی میں، میں اس بے ہوشی سے واپس ہوش میں نہ آتا تو۔ اگر میرا انتظار کم نہ ہوتا تو اگر سنیے یا چیل کا وہ درختم نہ ہوتا۔ اپنے ذہن سے وہ یہ سب کچھ جھٹکنے کی کوشش کرتا لیکن کام نہ پتا یہ تکلیف سے زیادہ خوف تھا جس کا فلاں وہ اس چانک پناری کے دوران ہوا تھا۔ شاید میں کچھ زیادہ حساس ہوا جا رہا ہوں۔ ”وہ سوچتا رہا کہ ایک معمولی سی بے ہوشی کو خواہ مخواہ ہونا کس سر پر کیوں سوار کر رہا ہوں۔“

وہ جھٹھلا تا۔

"کم از کم آپ تو ٹھیک ہو چکا ہوں پھر آخر آپ مجھے کیا تکلیف ہے کہ میں اس طرح موت کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ آخر پہلے بھی تو کئی بار بیمار ہو چکا ہوں۔ خود کشی کی کوشش کر چکا ہوں، جب مجھے کسی خوف نے لگتے نہیں کیا تو آخر آپ مجھے اس طرح کے خوف لگ کر لے گئے ہیں۔

اس کی ابھمن اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔
"اور پھر مجھے تو بخار کی وہ تکلیف ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ میرے لئے تو یہ صرف خواب یا کو مایا طرح ہے۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔" وہ مسکرائے کی کوشش کرتا۔

"کیا چیز ہے جو مجھے پریشان کر رہی ہے۔ کیا بیماری؟ یا پھر یہ بات کہ کسی کو میری ضرورت نہیں پڑی۔ کسی کو میری یاد نہیں آئی۔ خیال تک نہیں، میرے اپنے لوگوں کو بھی، میرے فیملی ممبرز کو۔ دوستوں کو۔۔۔۔۔"

"مائی گاڈ۔۔۔۔۔ تمہیں کیا ہوا ہے سالار؟" یونیورسٹی کھلتے ہی پہلے ہی دن سینڈرا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔" سالار نے مسکرائے کی کوشش کی۔

"تم بیمار ہے ہو؟" اسے تشویش ہوئی۔

"ہاں توڑا بہت۔"

"مگر مجھے تو نہیں لگتے کہ تم توڑے بہت بیمار ہے ہو۔ تمہارا وزن کم ہو گیا ہے اور آنکھوں کے گرد جھٹکتے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا بیماری تھی تمہیں؟"

"کچھ نہیں، توڑا سا بخار اور فوڈ پوڈ انڈک۔۔۔۔۔" وہ پھر مسکرایا۔

"تم پاکستان گئے ہوئے تھے؟"

"نہیں، بمبئی تھا۔"

"مگر میں نے تو تمہیں نیو یارک جانے سے پہلے ہی ہارنگ کیا۔ ہمیشہ answerphone ہی ملا۔ تم یہ ریکارڈ کر دیتے کہ تم پاکستان جا رہے ہو۔"

"جسٹ اسٹاپ اس! وہ سب اختیار جھٹھلا یا۔" سوال پر سوال کرتی جا رہی ہو تم۔"

سینڈرا حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ "تم میری بیوی تو نہیں ہو کہ اس طرح بات کر رہی ہو مجھ سے؟"

"سالار کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا۔ تم بس قسم کرو یہ ساری بات کیا ہوا؟ کیوں ہو؟ کہاں رہے؟ کیوں رہے، ریش۔"

سینڈرا چند لمبے بول نہیں سکی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح کی ایکٹ کرے گا۔

سینڈرا اس دن اس سے یہ سارے سوال پوچھنے والی انہی نہیں تھی۔ اس کے تمام دوستوں اور جاننے والوں نے اسے دیکھتے ہی کچھ اسی طرح کے سوال، تبصرے یا تاثرات دیئے تھے۔

وہ دن ختم ہونے تک بری طرح جھٹھلاہٹ کا شکار ہو چکا تھا اور کسی حد تک مشتعل بھی۔ دو کم از کم ان سوالوں کو سننے کے لئے یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔ اس طرح کے تبصرے اسے بار بار یاد دہانی کر رہے تھے کہ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہو چکا ہے اور وہ ان احساسات سے بچھٹکارا پانا چاہتا تھا۔

دانش کی گاڑی کے بونٹ پر بیٹھا بار پھر ایک لمحی لے کر اپنے اپارٹمنٹ پر واپس آیا۔

☆.....☆.....☆

پروفیسر روہشن اپنا لیچر شروع کر چکے تھے۔ سالار نے اپنے سامنے پڑے پیپر پر تاریخ اور ٹاپک لکھا۔ وہ آئٹاک Recession کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ سالار ہمیشہ کی طرح ان پر نظر میں تھامے ہوئے تھا مگر اس کا ذہن غیر حاضر تھا اور یہ اس کے ساتھ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے کہیں اور پہنچ گیا تھا۔ وہاں، وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ ایک ایجنٹ سے دوسرے ایجنٹ، دوسرے سے تیسری..... ایک آواز سے دوسری، دوسری سے تیسری..... اس کا سفر کہاں سے شروع ہوا، کہاں نہیں۔

”سالار! چلتا نہیں ہے۔“ سیٹلر نے اس کا کندھا ہلایا۔

وہ چونک گیا، کلاس خالی تھی، صرف سیٹلر اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بے چینی سے خالی کلاس کو ادھر پھر وال کھاگ کو دیکھا پھر اپنی رست واضح کر۔

”پروفیسر روہشن کہاں گئے؟“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”کلاس ختم ہو گئی، دوپہلے گئے۔“ سیٹلر نے کچھ حیران ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔

”کلاس ختم ہو گئی؟“ اسے جیسے یقین نہیں آیا۔

”ہاں!“ سالار نے بے اختیار اپنی آنکھوں کو سالار اور پھر اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ داد چیز جو اسے پروفیسر روہشن کے لیچر کے بارے میں یاد تھی، وہ صرف ٹاپک تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

”تم کچھ اپ سیٹ ہو؟“ سیٹلر نے پوچھا۔

”نہیں، کچھ نہیں۔ میں کچھ دیر کے لئے یہاں آگیا بیٹھتا ہوں۔“

”اوکے۔“ سیٹلر نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی چیزیں اٹھا کر باہر چلی گئی۔

وہ اپنے سینے پر ہازہ باندھے سامنے نظر آنے والے رائٹنگ بورڈ کو دیکھنے لگا۔ آج یہ تیسری کلاس تھی جس میں اس کے ساتھ یہ ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا یوٹیو بی ویڈیو بارہوا جو ان کرنے کے بعد سب کچھ معمول پر آجائے گا وہ پریزنٹیشن کے اس فیڈر سے باہر آجائے گا جس کا وہ بظاہر تھا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں بھی مکمل طور پر ایسی ذہنی انتشار کا شکار تھا جس میں وہ اسنے دنوں سے تھا پہلی بار اس کا دل پڑھائی سے بھی ایسا ہورہا تھا۔ وہاں ہر چیز اسے معنوں کی لگ رہی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار صحیح معنوں میں ڈپریشن کا شکار ہوا تھا۔ اسلاید، یونیورسٹی، فریڈز، کلب، پارٹیز، ریسٹورنٹس، سیر و تقریر، ہر چیز اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے دو متون سے متاثر ہو کر دم چھوڑ دیا۔ answerphone پر اکثر اس کا

باب ۵

”مووی دیکھنے کا پروگرام ہے اس ویکی اینڈ پر، چلو گے؟“ دانش اس دن اس کے پاس آیا

ہوا تھا۔

”ہاں، چلوں گا۔“ سالار تیار ہو گیا۔

”تم تیار رہنا، میں جیسے چک کر لوں گا۔“ دانش نے پروگرام ملے کیا۔

دانش پروگرام کے مطابق اسے لینے کے لئے آیا تھا۔ وہ ایک اچھی تفریح میں کچھ وقت گزار سکے گا دیکھنے کے لئے آیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ کم از کم اس رات وہ ایک اچھی تفریح میں کچھ وقت گزار سکے گا مگر مووی شروع ہونے کے دس منٹ بعد اسے وہاں بیٹھے بیٹھے ایک شدید قسم کی گھبراہٹ ہونے لگی۔ سامنے اسکرین پر نظر آنے والے کردار اسے کچھ پتیاں نظر آنے لگے جن کی حرکات اور آوازیں گو وہ کھنسنے سے قاصر تھا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر بہت آہستگی سے اٹھ کر باہر آیا۔ وہ پارک میں بہت دیر تک

ہیام ہوتا کہ وہ گھر نہیں ہے۔ وہ فریڈ کے اصرار پر ان کے ساتھ نہیں جانے کا پروگرام بناتا اور پھر ایک دم جانے سے انکار کر دیتا۔ چار بھی جانتا تو کسی وقت بھی بغیر بتائے آٹھ کر واپس چلا آتا۔ وہ یوں بدوشی میں بھی نہیں کر رہا تھا۔ ایک دن جاتا وہ دن غائب رہتا۔ ایک ہی دن لیتا، اگلے دو ہی دن پھوڑ دیتا۔

اپنے اپارٹمنٹ میں بھی بکھار وہ سارا دن بیڈ پر لیٹے ہوئے گزار دیتا، بعض دفعہ وہ قلم و دیکنا شروع کر تا اور ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد بھی اس کی بکھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ فی دی میں تھوڑا کھاتا ہوئے وہ اسی کیفیت کا شکار رہتا۔ اس کی بیوگ بالکل ختم ہو گئی تھی۔ وہ کوئی چیز کھانا شروع کرتا اور پھر ایک دم اس کا دل ڈوب جاتا۔ وہ اسی طرح اسے چھوڑ دیتا، بعض دفعہ وہ پورا پورا دن کچھ بھی نہیں کھاتا تھا۔ صرف یکے بعد دیگرے کافی کے کپ اپنے اندر اٹھاتا رہتا۔

وہ جین اسو کر نہیں تھا مگر ان دنوں بن گیا تھا۔ وہ اپنی چیزیں بہت قریب سے رکھنے کا عادی تھا مگر ان دنوں اس کا پارٹمنٹ گند کی کی مثال تھا اور اسے ان بخیری ہوئی چیزوں کو دیکھ کر کوئی انکھن نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اپنے بین بھائیوں اور والدین سے بھی گفتگو بہت مختصر کر دی تھی۔ وہ فون پر بولتے رہے۔ وہ دوسری طرف کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے سناتا رہتا، وہاں ہاں میں جواب دے دیتا۔ اس کے پاس انہیں بتانے کے لئے، ان کے ساتھ شیئر کرنے کے لئے ایک دم سب کچھ ختم ہو گیا تھا اور اسے ان سے ایک بات کی بھی وجہ معلوم نہیں تھی۔

اور اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ اس کی ان تمام کیفیات اور حالت کا تعلق امام باشم سے ہے نہ وہ اس کی زندگی میں آئی نہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا۔ پہلے وہ اسے تپاندہ کرتا تھا اب اسے امام سے نفرت ہونے لگی تھی۔ پچھتے دے کا جو پلاسٹک احساس کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہا تھا وہ غائب ہو گیا تھا۔

"اس کے ساتھ جو ہوا، لہجہ، بول، میں نے اس کے ساتھ جو کیا، لہجہ کیا۔ اس کے ساتھ اس سے زیادہ رہا ہونا چاہئے تھا۔"

وہ خود بخود ہی اپنے آپ سے کہتا رہتا۔ اسے امام باشم کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ، ہر حرف، ہر جملے سے نفرت تھی۔ اسے اس کی باتیں یاد آئیں اور اس کی نیند غائب ہو جاتی۔ ایک عجیب سی دشت اسے گھیر لیجے۔ اس نے اس رات جن باتوں کا مذاق اڑایا تھا، وہ اب ہر وقت اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھیں۔

"کیا میں پاگل ہو رہا ہوں، کیا میں اپنے ہوش و حواس آہستہ آہستہ کھاتا جا رہا ہوں، کیا میں شیڈ و فریڈ کا شکار ہوں۔" بعض دفعہ اسے پیچھے بھاگنے خوف محسوس ہونے لگتا۔

ہر چیز کی بے معنیت بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر چیز کی بے مقصدیت اور عیاں ہو رہی تھی۔ وہ کون تھا، کیا تھا، کیوں تھا، کہاں کھڑا تھا، کیوں کھڑا تھا؟ اسے ہر وقت یہ سوالات ٹھک کرتے لگے۔ کیا وہ یا اگر میں

Yes ایک ایسا ہی کی ڈگری کے لوں گا۔ بہت اچھی جاہل مل جائے گی، کوئی فیکٹری شروع کر لوں گا پھر۔ کیا یہ وہ کام تھا جس کے لئے مجھے زمین پر اتار دیا۔ ۱۵۰ آئی کیو کیل کے ساتھ۔ کہ میں چند اور ڈگریاں لوں، شاید سائینس کروں، شاید کروں، پیٹے پیدا کروں، پیش کروں پھر مر جاؤں، ہاں۔

اس نے زندگی میں چار دفعہ صرف اپنے تجسس کے لئے موت کے تجربے سے گزرنے کی کوشش کی تھی مگر اب شدید ڈپریشن کے عالم میں بھی وہ خود کو کسی کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے موت کے بارے میں سوچنے کے باوجود بھی وہ اسے چھوڑ نہیں چاہتا تھا۔

لیکن اگر اس سے کوئی یہ پوچھ لیتا کہ کیا وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تو وہ ہاں میں جواب دیتے ہیں بھی تامل کرتا۔ وہ زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ زندگی کے مفہوم کو نہیں جانتا تھا۔

وہ مرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ موت کے مفہوم سے بھی واقف نہیں تھا۔

وہ کسی غلام میں مطلق تھا، کسی درمیان والی جگہ میں، کسی ڈیجیٹل کیفیت میں۔ زندہ رہتے ہوئے مرد، مرد ہوتے ہوئے زندہ۔۔۔ دوسری کی انتہا پر پہنچ رہا تھا۔ لہ۔ ۱۵۰ آئی کیو رکھنے والا وہ شخص جو اپنے سامنے کبھی اور کسی جانے والی کو بھی چیز نہیں بھلا سکتا تھا۔ سرنگ کا دھواں اڑاتے، بیڑ کے کھونٹے، لینے، جاسٹ کلب میں رقص کرتے، مینجے ریٹورنٹ میں ڈنکرتے، اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ رات گزارتے، وہ صرف ایک بات سوچتا تھا۔

کیا زندگی کا مقصد یہی ہے؟
"پیش اور آسائش؟" شاید لباس، بہترین خوراک، اعلیٰ ترین سوتیلیں۔ ساتھ ستر سال کی

ایک زندگی اور پھر؟

اس کے بعد اس پھر کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا مگر اس "پھر" کی وجہ سے اس کی زندگی کے معمولات بکڑ گئے تھے۔ وہ رفتہ رفتہ خوبائی کا شکار ہو رہا تھا اور یہ ان ہی دنوں تھا کہ اس نے ایمانک مذہب میں دلچسپی لینا شروع کی۔ ڈپریشن سے نجات کے لئے وہ بہت سے لوگوں کو یہی کام کر دیتا تھا۔ اس نے بھی یہی کام شروع کر دیا۔ اس نے اسلام کے بارے میں کچھ کتابیں پڑھنے کی کوشش کی۔ تمام کتابیں اس کے سر کے اوپر سے گزرتیں۔ کوئی لفظ، کوئی بات اسے اپنی طرف نہیں کھینچ رہی تھی۔ وہ خود پر جبر کے چند صفحات پڑھتا اور ان کتابوں کو دکھ دیتا، کچھ وقت گزرنے کے بعد پھر اٹھتا پھر دکھ دیتا۔

"نہیں، شاید مجھے عملی طور پر عبادت شروع کرنی چاہئے۔ اس سے ہو سکتا ہے کہ مجھے کچھ فائدہ ہو۔"

وہ اپنے آپ کو خودی سمجھتا اور ایک دن جب وہ مسجد کے پاس تھا تو اس نے یہی کیا۔
"میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" اس نے مسجد کو باہر نکلتے دیکھ کر کہا۔

"مگر میں تو عشا کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔" سعد نے اسے یاد دہانی کروائی۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے اپنے جاگڑے کتے کو کہتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ مسجد چلو گے؟" وہ تیران ہوا۔

"ہاں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"نماز پڑھنے کے لئے؟"

"ہاں! سالار نے کہا۔" اس طرح دیکھنے کی کیا ضرورت ہے، میں کافر تو نہیں ہوں۔"

"کافر تو نہیں ہو مگر۔۔۔ چلو خیر، پڑھا لیتا آج۔" سعد نے کچھ کہتے کہتے بات بدل دی۔

"میں تو یہیں پہلے ہی کتنی بار ساتھ چلنے کے لئے کہہ چکا ہوں۔"

سالار نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ خاموشی سے چلنے ہوئے اس کے ساتھ باہر آ گیا۔

"اب اگر آج مسجد جاسی رہے ہو تو پھر جاتے رہتا۔ یہ نہ ہو کہ اب آج پہلا اور آخری ورت ہی

ہو۔" سعد نے عمارت سے باہر نکلنے ہوئے اس سے کہا۔ باہر اس وقت برف باری ہو رہی تھی۔ مسجد،

رہائش کی عمارت سے کچھ فاصلے پر تھی۔ وہ ایک مصری خاندان کا گھر تھا جس کا چھلا حصہ مسجد کے طور پر ان

لوگوں نے استعمال کے لئے دیا ہوا تھا جبکہ اوپر والے حصے میں وہ لوگ خود رہتے تھے۔ بعض دفعہ وہاں

نمازیوں کی تعداد بیس بجگیں ہو جاتی مگر زیادہ تر یہ تعداد دس پندرہ کے درمیان ہی رہتی تھی۔

مسجد مسجد تک پہنچتے تک سالار کو ان تفصیلات سے آگاہ کرنا پڑا۔ سالار خاموشی اور کچھ لافٹائی کے

عالم میں سڑک پر احتیاط سے چلتی گاڑیوں اور ہر طرف موجود برف کے ڈھیر پر نظریں ڈرتا تھا اس کے

ساتھ چل رہا۔

پانچ سات منٹ چلتے رہنے کے بعد ایک موٹر سائیکل گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو

گیا۔ دروازہ بند تھا مگر لاک نہیں تھا اور سعد نے دروازے پر دستک دی تھی، نہ ہی کسی سے اجازت مانگی

تھی۔ بڑے مانوس سے انداز میں اس نے دروازے کا پینڈل کھمایا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ سالار نے

اس کی بیز دی کی۔

"تم وضو کر لو۔" سعد نے اچانک اسے مخاطب کیا اور پھر اسے ساتھ لے کر ایک دروازہ کھول کر

ایک ہاتھ روم میں داخل ہو گیا۔

سعد کی زیر نگرانی جب تک وہ وضو کے آخری حصے تک پہنچا، خنڈ اپنی گرم میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اپنے بالوں کا مس کر کے وہ ایک بار پھر شٹکا۔ سعد سمجھا اسے صحیح طریقہ پتا نہیں، اس نے ایک بار پھر

اسے بہادری دی۔ وہ خالی الذہنی کے عالم میں اپنے ہاتھوں کو ایک بار پھر حرکت دینے لگا۔

گدی تک ہاتھ بھیرتے ہوئے اس کا ہاتھ گردن میں موجود زنجیر سے ٹکرایا تھا۔ اس کی نظر بے اختیار

سامنے آئینے میں گئی۔ وہ ایک بار پھر کہیں اور پہنچ چکا تھا۔ سعد نے اس سے کچھ کہا تھا۔ اس بار اس نے نہیں سنا۔

کمرے میں موجود دس افراد وہ صوفوں میں کھڑے ہو رہے تھے۔ وہ سعد کے ساتھ پچھلی صف میں

کھڑا ہو گیا۔ امام صاحب نے امامت شروع کر دی، سب کے ساتھ اس نے بھی نیت کی۔

"نماز سے واقعی سکون ملتا ہے؟" اس نے کوئی دو پلٹے پہلے ایک لڑکے کو نماز کے مسئلے پر سعد کے

ساتھ بحث میں الجھایا تھا۔

"مجھے تو ملتا ہے۔" سعد نے کہا تھا۔

"میں تمہاری بات نہیں کر رہا۔ میں سب کی بات کر رہا ہوں، سب کو ملتا ہے؟" اس لڑکے نے

کہا تھا۔ "یہ منحصر ہے کہ سب کتنا اذیت ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔"

سالار بڑے آگاہانہ ہوئے انداز میں ان کی بحث کسی حد اعلیٰ پائے پر کے بغیر متاثر نہ ہوا۔ اس

وقت وہ شعوری طور پر نماز میں انتہا کی پید کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سکون؟" میں واقعی دیکھنا چاہتا ہوں کہ نماز سے سکون کیسے ملتا ہے۔" اس نے رکوع میں جاتے

ہوئے اپنے دل میں سوچا پھر اس نے پہلا سجدہ کیا۔ اس کے اضطراب اور بے چینی میں یک بہ یک اضافہ

ہو گیا۔ جن الفاظ کو وہ امام صاحب کی زبان سے سن رہا تھا، وہ بہت نامانوس لگ رہے تھے، جو لوگ اس کے

ارد گرد کھڑے تھے وہ اسے نا آشنا لگ رہے تھے، جس ماحول میں وہ موجود تھا وہ اسے غیر فطری لگ رہا تھا

اور جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ اسے منافقت محسوس ہو رہی تھی۔

ہر سجدے کے ساتھ اس کے دل و دماغ کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے پہلی چار رکعتیں بمشکل ختم

کیں۔ سلام پھیرنے کے دوران اس نے اپنے دائیں جانب والے اوچھڑے شخص کے گالوں پر آنسو

دیکھے، اس کا دل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہا۔ وہی کڑا کر کے ایک بار پھر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک بار

پھر نماز میں پوری طرح سنبھک ہونے کی کوشش کی۔

"اس بار میں پڑھی جانے والی آیات کے ہر لفظ پر غور کروں گا۔ شاید اس طرح۔" اس کی سوچ

کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ نیت کی جاری تھی۔ اس کا دل مزید اچاٹ ہو گیا۔ سر کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے

آیات کے مفہوم پر غور کرنے کی کوشش کی۔

"الحمد لله رب العالمین۔" سورۃ فاتحہ کی تلاوت شروع ہوئی۔

"الرحمن الرحیم۔" اس نے توجہ مرکوز کئے کی پوری کوشش کی۔

"الحکیم بوم الدین۔" توجہ بھنگی۔

"ایک قعدہ والیاک نشتمین۔" اسے سورۃ فاتحہ کا ترجمہ آتا تھا۔ اس نے چند دن پہلے ہی پڑھا تھا۔

"احمد! الصراط المستقیم۔" (سید حارثہ) اس نے ذہن میں دہرایا۔

"صراط المستقیم..... سید حارثہ؟" اس کا دل چاہا وہاں سے بھاگ جائے۔ اس نے وہاں نماز جاری رکھنے کی ایک آخری کوشش کی۔

"صراط الذین انعمت۔" اس کا ذہن ایک بار پھر پیچھے گیا۔

"علیم غیر المغلوب علیہم والضالین۔" اس نے اپنے ہاتھ سے بے ہاتھ کھولے، وہ آخری صف میں کھڑا تھا، بہت آہستگی سے چند قدم پیچھے گیا اور صف سے اٹھ گیا۔

"یہ کام میں نہیں کر سکتا، نماز نہیں پڑھ سکتا۔" اس نے جیسے اعتراف کیا۔ بہت خاموشی کے ساتھ وہ اور پیچھے ہوتا گیا۔ باقی لوگ اب رکوع میں جا رہے تھے، وہ مزکر دہے قدموں مگر تیز رفتاری سے باہر نکل آیا۔

مسجد سے نکلے ہوئے اس کے جائزہ اس کے ہاتھ میں تھے۔ غائب دہائی کے عالم میں وہ باہر نیزہ صوبوں پر کھڑے ہو کر چند لمبے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ نیزہ صوبوں انگریزوں کی طرف سے جڑا رہا اور ہاتھوں میں جائزہ پکڑے وہ خالی الذہنی کے عالم میں عمارت کی تعمیر و تباہی کی طرف آگیا۔ وہاں بھی ایک دروازہ اور دیکھ نیزہ صوبوں نظر آ رہی تھیں مگر وہ نیزہ صوبوں برف سے اٹھ بیٹھی تھیں۔ دروازے پر موجود لائٹ بھی روشن نہیں تھی۔ اس نے جبکہ کسب سے اوپر والی نیزہ صوبوں کو اپنے جائزہ کے ساتھ صاف کیا اور برف صاف کرنے کے بعد وہاں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر پہلے ہونے والی برف باری اب شمع ہو چکی تھی۔ اس نے نیزہ صوبوں پر بیٹھ کر اپنے جائزہ بکمان لیے۔ تسے کئے کے بعد وہ ایک بار پھر صحرانہ ہو کر دروازے سے نکل نکلا کر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ جبکہ کی بیٹیوں میں تھے۔ جبکہ کے ساتھ لگے ہوئے hood کو دھری پر چڑھا چکا تھا۔ سامنے سڑک پر اکاڑ کا ڈیول کی آمد و رفت جاری تھی۔

وہ نیزہ صوبوں پر اپنی ناگہانی پھیلائے اپنی پشت دروازے سے نکالنے لگا اکاڑ کا ڈیول اور فٹ ہاتھ پر پہلنے والے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ وہاں اس سرد اور کبر آور درایت میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے وہ کچھ دیر پہلے مسجد کے گرم کمرے سے زیادہ سکون محسوس کر رہا تھا کہ ایک دم بڑھ خیر و محسوس کر رہا تھا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر لائٹر نکال لیا اور اسے جلا کر اپنے بیروں کے قریب نیزہ صوبوں پر پڑی برف کو پگھلانے لگا کچھ دیر تک وہ اس سرگرمی میں مشغول رہا پھر جیسے اس نے آٹا کر لائٹر دہار دیا جیب میں ڈال لیا۔ جس وقت وہ صبحا ہوا اس نے اپنے بالکل سامنے ایک عورت کو کھڑا کیا۔ وہ بیٹھا ناں وقت وہاں آخر کھڑی ہوئی تھی جس وقت وہ نیزہ صوبوں پر جھکا اپنے دونوں پاؤں کے درمیان موجود برف کو لائٹر سے پگھلا رہا تھا۔ وہ نیم تاریکی میں بھی اس کے چہرے کی مسکراہٹ کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ مٹی اسکرٹ اور ایک مختصر لٹاؤز میں ملبوس تھی۔ اس نے فرکوت پہتا ہوا تھا مگر وہ فرکوت آگے سے دانستہ طور پر کھلا

چھوڑا گیا تھا۔

وہ فرکوت کی دونوں بیٹیوں میں ہاتھ ڈالے سالار کے بالکل سامنے بڑے اسٹاکس سے کھڑی تھی۔ سالار نے سر سے لے کر پاؤں تک اسے دیکھا۔ اس کی لمبی ناخنیں اس سردی میں بھی پر بند تھیں۔ اس کے عقب میں موجود کانوں کی روشنیوں کے بیک گراؤڈ میں اس کی ناخنیں یک دم بہت لمبیاں ہو رہی تھیں اور اس کی ناخنیں بہت خوب صورت تھیں۔ کچھ دیر تک وہاں سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ اس عورت کے بیروں میں بوٹ لٹائی ہوئی تھیں کے جوتے تھے۔ سالار حیران تھا وہ برف کے اس ڈھیر پر ان جوتوں کے ساتھ کس طرح چلتی ہوگی۔ "I charge 50 for an hour"

اس عورت نے بڑے دوستانہ انداز میں کہا۔ سالار نے اس کی چانگوں سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی نظریں ایک بار پھر اس کی چانگوں پر پڑیں۔ کئی سالوں میں پہلی بار اسے کسی پر ترس آیا۔ کچھ کجیوری تھی کہ وہ اس برف باری میں بھی اس طرح پر بند پھرنے پر مجبور تھی، جبکہ وہ اس صوفی جینز میں بھی سردی کو اپنی پاؤں میں محسوس کر رہا تھا۔ "OK 40 dollars"

اسے خاموش دیکھ کر اس عورت کو اندیشہ وہ کہ شاید وہ قیمت اس کے لئے قابل قبول نہیں تھی، اس لئے اس نے فوراً اس میں سے کئی کر دی۔ سالار جانتا تھا چائیس ڈالرز بھی زیادہ تھے۔ وہ اس سڑک پر بیٹھ ڈالرز میں بھی ایک کھنڈ کے لئے کسی لڑکی کو حاصل کر سکتا تھا وہ ہفتدہ چائیس سال کی تھی اور ہاتھ کرتے ہوئے ممتاز نظروں سے سڑک پر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ سالار جانتا تھا یہ احتیاط کسی پولیس کار یا پولیس والے کے لئے تھی۔

"Ok 30..... No more hargaining"

"take it or leave it"

سالار کی خاموشی نے اس کی قیمت کو کچھ اور کم کیا۔ سالار نے اس بار کچھ بھی کہنے اپنی جینٹ کے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہاں موجود چند کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس کے پاس اس وقت دولت نہیں تھا۔ اس عورت نے حیرانی سے اسے دیکھا اور پھر ان لوگوں کو اس کے ہاتھ سے چھپت لیا۔ وہ پہلا کاپ تھا، جو اسے اپنے منٹ کر رہا تھا اور وہ بھی پچاس ڈالر، جبکہ وہ اپنی قیمت کم کر چکی تھی۔

"تم میرے ساتھ چلو گے یا میں تمہارے ساتھ۔" وہ اب بیڑی سے نکلنے سے اس سے پوچھ رہی تھی۔ "نہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا نہ تم میرے ساتھ۔" تم میں سے جانا۔ سالار نے ایک بار پھر سڑک کے دوسری طرف موجود کانوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

وہ عورت بے چینی سے اسے دیکھتی رہی۔

”واقعی؟“

”ہاں۔“ سالار نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

”تو پھر تم نے یہ کیوں دیکھے ہیں؟“ اس عورت نے اپنے ہاتھ میں پکڑے نوٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

”تاکہ تم میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، میں سڑک کے اس پار ڈکانیں دیکھنا چاہتا ہوں اور تم اس میں رکاوٹ بن گئی ہو۔“ اس نے سرد مہری سے کہا۔

عورت بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسی۔ ”تم اچھا مذاق کر لیتے ہو، کیا میں واقعی چلی جاؤں؟“

”ہاں۔“

وہ عورت کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ ”اوکے، جھجک یو جی۔“ سالار نے اسے سڑک پار کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ لا شعوری طور پر اسے جانتا دیکھا۔ وہ سڑک پار کر کے ایک دوسرے کو نے کی طرف جا رہی تھی وہاں ایک اور آدمی کھڑا تھا۔

سالار نے دوبارہ نظریں ان دو کالوں پر جمائیں، برف باری ایک بار پھر شروع ہو چکی تھی۔ وہ پھر بھی اطمینان سے وہیں بیٹھا رہا۔ برف اب اس کے اوپر بھی گر رہی تھی۔

وہ رات کے ڈھائی بجے تک وہیں بیٹھا رہا جب سڑک کے پار دو کالوں کی اندر کی لائٹس اس نے دیکھے بعد دیگرے بند ہوتے دیکھیں تو وہ اپنی جینٹ اور جینز سے برف جھڑتا ہوا اڑکھ کھڑا ہوا۔ اگر وہ تھے دھتے سے وہ اپنی آنکھیں ملاتا رہا ہوتا تو اس وقت تک وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے پاؤں دو کھڑا ہو کر قدم اٹھانے میں اسے کچھ وقت ہوئی۔ چند منٹ وہیں کھڑا وہ اپنے پیروں کو جھٹک رہا اور پھر اسی طرح جینٹ کی سیٹیوں میں ہاتھ ڈال کر وہاں پار فٹ کی طرف جانے لگا۔ وہ جانا تھا سہارے اسے مسجد سے نکل کر بہت زیادہ دھوڑا ہوا گاؤں اس کے بعد وہ وہاں چلا گیا ہو گا۔

☆.....☆.....☆

”کہاں چلے گئے تھے تم؟“ سعد اسے دیکھنے ہی چلا۔ وہ کچھ کے بغیر اندر چلا آیا۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ سعد دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے آگیا۔ سالار اپنی جینٹ اُتار رہا تھا۔

”کہیں نہیں گیا تھا۔“ اس نے جینٹ لٹکاتے ہوئے کہا۔

”جہیں چاہے کہ میں نے جہیں کتنا تلاش کیا ہے، کہاں کہاں فون کئے ہیں اور اب تو میں اتنا پریشان ہوں چکا تھا کہ پولیس کو فون کرنے والا تھا۔ تم آخر اس طرح تہاڑ چھوڑ کر گئے کہاں تھے؟“

سالار کچھ کے بغیر اپنے جاگڑا آثار نے لگا۔

”میں نے جہیں بتایا ہے، کہیں نہیں۔“

”تو پھر اب تک کہاں تھے؟“ سعد اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

”وہیں تھا، مسجد کے پچھلے حصے میں فٹ پاتھ پر۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”وہاں اتنے کھینے تم وہاں فٹ پاتھ پر برف میں بیٹھے رہے ہو۔“ سعد دم بخود رہ گیا۔

”ہاں؟“

”کوئی تک فنی ہے اس حرکت کی۔“ وہ کچھ جھلایا۔

”نہیں، کوئی تک نہیں بنتی۔“ سالار نے اسی طرح سیدھا ہیل پر لیٹے ہوئے کہا۔

”کچھ کھایا ہے؟“

”نہیں۔“

”تو کھانا کھالو۔“

”نہیں، بھوک نہیں ہے۔“ وہ اب چھت پر نظریں جماتے ہوئے تھا۔ سعد اس کے قریب بیڑ پر بیٹھ گیا۔

”تہاڑے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟ بتا سکتے ہو مجھے۔“ سالار نے گردن کو ہلکی سی حرکت دے کر اسے دیکھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ بے تاثر لہجے میں کہا گیا۔ ”میں سمجھا، تم اپنے پار فٹ چلے گئے ہو، مگر وہاں بار بار رنگ کرنے پر بھی تم نہ ملے۔“ سعد بڑا برا تھا۔ سالار کی نظریں چھت پر ہی جمیں۔

”اس سے بہتر تھا کہ میں جہیں اپنے ساتھ نماز پڑھنے لے کر ہی نہ جاتا۔ آئندہ میرے ساتھ مت جانا۔“ سعد نے ناراضی سے کہا۔ وہ اب اس کے بیڑ سے اٹھ گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے کام بناتا رہا پھر وہ ٹائٹ بلب آن کر کے اپنے بیڑ پر لیٹ گیا۔ اس نے ابھی آنکھیں بند کی تھیں، جب اس نے سالار کی آواز سنی۔

”سعد؟“

”ہاں؟“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”یہ“ صراحتاً مستقیم کیا ہو تا ہے؟“

سادہ لہجے میں پوچھنے کے سوال نے سعد کو حیران کر دیا۔ اس نے گردن موڑ کر بائیں جانب بیڑ پر سیدھا لیٹنے کے سالار کو دیکھا۔

”صراحتاً مستقیم..... سیدھے راستے کو کہتے ہیں۔“

”جانتا ہوں مگر سیدھا راستہ کیا ہو تا ہے؟“ اگلا سوال آیا۔

”سعد نے اس کی طرف کروٹ لے لی۔ ”سید عمارت..... مطلب نیکی کا رستہ.....“
 ”نیکی کیا ہوتی ہے؟“ لہجہ ابھی بے چارہ تھا۔
 ”اچھے کام کو نیکی کہتے ہیں۔“
 ”اچھا کام کیا ہوتا ہے؟“

”اچھا کام..... کوئی ایسا کام جو کسی دوسرے کے لئے کیا گیا ہو۔ کسی کی مدد کی گئی ہو، کسی پر مہربانی کی گئی ہو، وہ اچھا کام ہوتا ہے اور ہر اچھا کام نیکی ہوتی ہے۔“
 ”ابھی کچھ گھنٹے پہلے میں نے وہاں فٹ بال کھڑے ایک hooker کو کپاس ڈال کر دیئے، جبکہ وہ صرف ہمیں ڈالر ٹانگ رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے یہ نیکی ہوئی؟“
 ”سعد کا دل چاہا وہ ایک گھونسا اس کے منہ پر پھینک مارے، وہ عجیب آدمی تھا۔
 ”بکواس بند کر دو اور سو جاؤ، مجھے بھی سونے دو۔“ اس نے مکمل لپیٹ لیا۔
 ”سالار کو حیرت ہوئی، وہ کس بات پر ناراض ہوا تھا۔“ تو یہ نیکی نہیں ہوئی؟“
 ”میں نے تم سے کہا ہے، اپنا منہ بند کر دو اور سو جاؤ۔“ سعد ایک بار پھر دھڑاڑا۔
 ”انتظار راض ہونے کی ضرورت تو نہیں ہے، میں نے تم سے ایک بہت معمولی سا سوال کیا ہے۔“
 سالار نے بڑے قہر سے کہا۔

”سعد یک دم کچھ مشتعل ہوتے ہوئے اٹھ کر بیچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے لیپ آن کر دیا۔
 ”تھمارے جیسے آدمی کو میں کیا صراطِ مستقیم سمجھاؤں۔ کیا تم پاگل ہو یا جاہل ہو..... یا غیر مسلم ہو..... کیا ہو..... کچھ بھی نہیں ہو..... جہیں خود بنا ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم کیا ہو تا ہے مگر تم جیسا آدمی جو مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے نماز درمیان میں چھوڑ کر چلا آتا ہے، وہ کیسے جان سکتا ہے یہ۔“
 ”میں نماز اس لئے چھوڑ کر چلا آیا کیونکہ تم کہتے ہو اس میں سکون نہیں ملے گا۔ مجھے سکون نہیں ملا، میں چھوڑ آیا۔“ اس کے پر سکون انداز میں کہے ہوئے جملے نے سعد کو مزید مشتعل کیا۔
 ”جہیں نماز اس میں سکون نہیں ملا، کیونکہ مسجد تمہاری جگہ نہیں ہے، تمہارے لئے سکون کی جگہیں سینما، تھیٹر، بار اور کلب ہیں۔ مسجد تمہارے لئے نہیں ہے۔ جہیں نماز میں سکون گہاں سے مل جاتا..... اور تم چاہتے ہو، میں جہیں تباہی صراطِ مستقیم کیا ہوتا ہے۔“

وہ بیڈ پر سیدھا لٹا نیکیں جھپکاتے بغیر سعد کو دیکھ کر بڑا۔
 ”تمہارے جیسا شخص جو نماز سے بھاگ جاتا ہے، شراب پیتا اور زنا کرتا ہے۔ وہ صراطِ مستقیم کے مطلب کو کبھی سمجھ سکتا ہے اس پر آسکتا ہے۔“
 ”تمہارا مطلب ہے جو شراب پیئے اور زنا کرتے ہیں مگر نماز سے بھاگتے نہیں، نماز بھی پڑھ لیتے

”یہ وہ صراطِ مستقیم کا مطلب سمجھتے ہیں اور صراطِ مستقیم یہ ہیں۔“
 سعد کچھ بول نہیں سکا۔ دھم آواز اور بے چارہ نے اس کے ایک ہی سوال نے اسے خاموش کر دیا تھا۔ سالار اب بھی اسی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”تم ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے سالار!“ اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ سالار کے کانوں میں ایک جھماکے کے ساتھ ایک دوسری آواز گونج اٹھی تھی۔
 ”ہاں، میں واقعی نہیں سمجھ سکتا۔ لائٹ آف کر دو، مجھے نیند آ رہی ہے۔“ اس نے مزید کچھ کہے بغیر آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆.....☆

”مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ تم اپنے اپارٹمنٹ پر ہی ہو گے، صرف تم نے جان بوجھ کر answerphone لگا دیا ہو گا۔“
 سعد اگلے دن دس بجے سالار کے اپارٹمنٹ پر موجود تھا۔ سالار نے نیند میں اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔
 ”تم اس طرح بتاتے بغیر بھاگ کیوں آئے میرے اپارٹمنٹ سے۔“ سعد نے اندر آتے ہوئے بھڑاڑا۔
 ”بھاگا تو نہیں، تم سو رہے تھے، میں نے تمہیں جگنا مناسب نہیں سمجھا۔“ سالار نے آنکھیں ملٹے ہوئے کہا۔

”کس وقت آئے تھے تم؟“
 ”شاید چار پانچ بجے۔“
 ”یہ جانے کا کون سا وقت تھا؟“ سعد نے تنگ کر کہا۔
 ”اور تم اس طرح آئے کیوں؟“ سالار کچھ کہنے کے بجائے لوگ روم کے صوف پر جا کر ادھارے منہ لیٹ گیا۔
 ”شاید میری باتوں سے تم ناراض ہو گئے تھے۔ میں اسی لئے ایکسکسپوز کرنے آیا ہوں۔“ سعد نے دوسرے صوف پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کون سی باتوں سے؟“ سالار نے گردن کو ہلکا ساڑتھا کرتے ہوئے اسی طرح لیٹے سعد سے پوچھا۔
 ”وہی سب کچھ جو میں نے کچھ جملے میں آکر ذات کو تم سے کہہ دیا۔“ سعد نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”نہیں، میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر تو ناراض نہیں ہو سکتا۔ تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس پر جہیں ایکسکسپوز کرنے کے لئے یہاں آنا پڑا۔“ سالار نے اسی کے انداز میں کہا۔

"پھر تم اس طرح اپنا کب میرے بارڈر ٹسٹ سے کیوں آگئے؟" سعد بھند ہوا۔

"بس میرا دل گھبرا گیا اور میں یہاں آگیا اور چونکہ سوچا جانتا تھا اس لئے answerphone لگا دیا۔"

سالار نے پر سکون انداز میں کہا۔ "پھر بھی میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے تم سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں صبح سے بہت بچھتا رہا ہوں۔"

"جانے دو اسے۔" اس نے اسی طرح چہرہ صوفیہ پر چھپائے کہا۔

"سالار! تمہارے ساتھ آج کل پرائیلم کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"نہیں، کچھ نہ کچھ تو ہے۔ کچھ عجیب سے ہوتے جا رہے ہو تم۔"

اس بار سالار ایک دم کروٹ بدلتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ چپ لینے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ٹھنڈا کون سی بات عجیب سی ہوتی جا رہی ہے مجھ میں۔"

"بہت ساری ہیں، تم بہت چپ چپ رہنے لگے ہو، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُلجھنے لگے ہو۔ عباد مجھے بتا رہا تھا کہ بے ضرورتی جانا بھی چھوڑا ہوا ہے تم نے اور سب سے بڑی بات کہ مذہب میں دلچسپی لے رہے ہو۔" اس کے آخری جملے میں سالار کے ماتھے پر تیریاں اُٹکیں۔

"مذہب میں دلچسپی؟ یہ تمہیں غلط فہمی ہے۔ میں مذہب میں دلچسپی لینے کی کوشش نہیں کر رہا، میں صرف سکون حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ میں بہت ڈپریشن ہوں۔ مجھے زندگی میں کبھی اس طرح کا..... اور اس حد تک ڈپریشن نہیں ہوا جس کا شکار میں آج کل ہوں اور میں صرف اس ڈپریشن سے نجات حاصل کرنے کے لئے رات نماز پڑھنے کے لئے چلا گیا تھا۔ اس نے بہت ترقی سے کہا۔

"ڈپریشن کیوں ہے تمہیں؟" سعد نے پوچھا۔

"اگر یہ مجھے پتا ہوتا تو مجھے یقیناً ڈپریشن نہ ہوتا۔ میں اب تک اس کا کچھ نہ کچھ کر چکا ہوں۔"

"پھر بھی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی، بچے بیٹھے بٹھائے ڈپریشن تو نہیں ہو جاتا۔" سعد نے تبرا کیا۔

سالار جانتا تھا، دو ٹھیک کہہ رہا ہے، مگر وہ اسے وجہ تار خود پر بٹھنے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کسی دوسرے کے بارے میں تو مجھے پتا نہیں، مگر مجھے تو یقیناً بٹھائے ہی ہو جاتا ہے۔" سالار

نے کہا۔

"تم کوئی افغانی ڈیپریسٹ لے لیتے۔" سعد نے کہا۔

"میں ان کا ذکر کبھی نہ کرنا چاہتا ہوں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔"

"تم تم کسی سائیکالوجسٹ سے مل لیتے۔"

"میں یہ کام تو کبھی نہیں کروں گا، میں ننگ آچکا ہوں ان لوگوں سے ملنے لگے۔ کم از کم اب تو میں نہیں ملوں گا۔" سالار نے بے اختیار کہا۔

"پہلے کسی سلسلے میں ملے رہے ہو تم؟" سعد نے کچھ چونک کر جتنس کے عالم میں پوچھا۔ "بہت سی باتیں تھیں، تم انہیں رہتے دو۔" وہ اب چپ لپٹا سمجھ کر گھور رہا تھا۔

"تو پھر تم اپنا کردہ عبادت کیا کرو، نماز پڑھا کرو۔"

"میں نے کوشش کی تھی مگر میں نماز نہیں پڑھ سکتا تو مجھے وہاں کوئی سکون ملا، نہ ہی میں یہ جانتا تھا

کہ میں جو پڑھ رہا ہوں وہ کیا ہے، کیوں پڑھ رہا ہوں۔"

"تو تم یہ جانتے کی کوشش کرو کہ....."

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اب پھر رات والی بحث شروع ہو جائے گی، صراطِ مستقیم والی اور پھر تمہیں غصہ آئے گا۔"

"نہیں، مجھے غصہ نہیں آئے گا۔" سعد نے کہا۔

"جب مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ صراطِ مستقیم کیا ہے تو پھر میں نماز کیسے پڑھ سکتا ہوں۔"

"تم نماز پڑھنا شروع کرو گے تو تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ صراطِ مستقیم کیا ہے۔"

"کیسے؟"

"تم خود ہی غلط کاموں سے بچنے لگو گے، اچھے کام کرنے لگو گے۔" سعد نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"مگر میں کوئی غلط کام نہیں کرتا اور نہ ہی مجھے اچھے کام کرنے کی خواہش ہے۔ میری زندگی نارمل ہے۔"

"تمہیں یہ احساس ہو بھی نہیں سکتا کہ تمہارا کون سا کام صحیح ہے اور کون سا غلط۔ جب تک کہ....."

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"صحیح اور غلط کام میرا مسئلہ نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے بس بے سکونی رہتی ہے اور اس کا تعلق میرے کاموں سے نہیں ہے۔"

"تم وہ تمام کام کرتے ہو جو انسان کی کو بے سکون کر دیتے ہیں۔"

"ٹھنڈا؟" سالار نے چیخے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم پورک کھاتے ہو۔"

"کم آن۔" وہ بے اختیار ہلچلایا۔ "پورک یہاں کہاں آگیا، تم مجھے ایک بات بتاؤ۔" سالار آٹھ کر

بیٹھ گیا۔ "تم تو بڑی باقاعداہی سے نماز پڑھتے ہو، بڑی عبادت کرتے ہو، نماز نے تمہاری زندگی میں

گوں سی تہ لیلیاں کر دیں؟

"مجھے بے سکونی نہیں ہے۔"

"حالانکہ تمہارے قارموں کے مطابق جہیں بھی بے سکونی ہونی چاہئے، کیونکہ تم بھی بہت سے

غلط کام کرتے ہو۔" سالار نے ترکی پر ترکی جواب دیا۔

"مثلاً..... میں کیا غلط کام کرتا ہوں؟"

"تم جانتے ہو، میرے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں..... میں نہیں جانتا، تم دہراؤ۔" سعد نے جیسے اسے پہنچ گیا۔

سالار اسے کچھ دیر دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا سعد کہ صرف عبادت کرنے سے زندگی میں کوئی بہت نمایاں ترقی پانے لائی جاسکتی ہے۔ اچھے کاموں یا کردار کا تعلق عبادت کرنے سے پانے کرنے سے نہیں ہوتا۔"

سعد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں اسی لئے تم سے کہتا ہوں کہ اپنے مذہب میں کچھ دلچسپی لو، اسلام کے بارے میں کچھ علم حاصل کرو تاکہ اگر اس لحاظ سے تم کی غلطی اور سوچ کو بدل سکو۔"

"میری سوچ غلط نہیں ہے، میں نے مذہبی لوگوں سے زیادہ جھوٹا مافیہ اور دھوکے باز کبھی کو نہیں پایا۔ میں امید کرتا ہوں تم برا نہیں مانو گے، مگر میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ابھی تک مجھے تین ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا جو بہت بڑے مسلمان بنے ہیں اور اسلام کی بات کرتے ہیں اور تینوں false (مناظر) ہیں۔" وہ بڑی سختی سے کہہ رہا تھا۔

"سب سے پہلے میں ایک لڑکی سے ملا، وہ بھی بڑی مذہبی بنتی تھی، پردہ کرتی تھی، بڑی پارسا اور پاک باز ہوئے گاؤں دار۔ کرتی تھی اور ساتھ میں ایک لڑکے کے ساتھ ایلچر چار دیواری تھی، اپنے منکبتر کے ہوتے ہوئے اس کے لئے گھر سے بھاگ بھی گئی۔ اسے ضرورت پڑی تو اس نے ایک ایسے شخص کی بھی مدد لی تھی وہ بہت برا شخص تھی یعنی اسے اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنے میں کوئی فکر نہیں سمجھتا۔ حضرت پیار سا خان فاقہ نے۔" اس کے لبوں پر استہزاء کی مسکراہٹ تھی۔

"اس کے بعد میں ایک اور آدمی سے ملا جس نے ڈالری رکھی ہوئی تھی۔ بڑا پکا اور سچا قسم کا مسلمان تھا وہ بھی لیکن اس نے اس لڑکی کی مدد نہیں کی، جس نے اس سے بھیک مانگنے کی حد تک دعا مانگی تھی۔ اس نے اس لڑکی سے شادی نہیں کی تھی وہ محبت کے نام پر بے وقوف بنا رہا اور ابھی کچھ عرصہ پہلے میں یہاں امریکہ میں اس سے ملا تو اس کی ڈالری بھی غائب ہو چکی تھی، شاید اس کے اسلام کے ساتھ۔" وہ ہنسنا۔ "اور تیسرے تم ہو..... تم نے رک نہیں کھاتے، صرف یہ ایک حرام کام ہے، جو تم نہیں کرتے، باقی تمہارے لئے سب کچھ جائز ہے۔ جھوٹ بولنا، شراب پینا، زنا کرنا، غلبہ میں جانا..... قیمت

کرنا، دوسروں کا مذاق اڑانا، حالانکہ وہ اپنے تم پر بے نیک ہو، تم نے ڈالری رکھی ہوئی ہے، تم جہاد اسلام کا کھاتے ہو اسلام کی باتیں کر کر کے۔ زبردستی نماز پڑھانے پر تلے رہتے ہو، ہر بات میں مذہب کا حوالہ لے آتے ہو، یہ آیت اور وہ حدیث..... وہ آیت اور یہ حدیث..... اس کے علاوہ تمہاری زبان پر اور کچھ ہوتا نہیں اور جب میں تمہارا عمل دیکھتا ہوں تو میں ڈوڑھ بھر بھی تم سے متاثر نہیں ہوتا۔ کتنا مشکل ہوتا ہے اسلام کے بارے میں تمہارا الجھن منانا، جہیں جہیں بتا نہیں سکتا۔ مجھ میں اور تم میں زیادہ فرق تو نہیں ہے۔ تم ڈالری رکھ کر اور اسلام اسلام کے کہ وہ سارے کام کرتے ہو جو میں ڈالری کے اور اسلام کی بات کے بغیر کرتا ہوں۔ عبادت نے کیا انتخاب برپا کیا ہے تمہاری زندگی میں، سوائے اس کے کہ جہیں ایک خوش فہمی ہو گئی ہے کہ تم تو سید سے جنت میں جاؤ گے اور ہم سارے دوزخ میں۔ تمہارے قول و فعل میں اگر یہ تضاد نہ ہو تو ہمیں تم سے یہ سب نہ کہتا مگر میں تم سے ریکوریسٹ کرتا ہوں کہ تم دوسروں کو مذہب کی طرف راغب کرنے کی کوشش نہ کیا کرو، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم خود بھی مذہب کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہو۔ اب میری ان ساری باتوں کو ماننا مت کرنا۔"

سالار اب بھیل پر پڑا ایک سگریٹ سلاخ ہاتھ۔ سعد تقریباً گونگ ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے، مجھ سے کچھ غلطیاں ہو جاتی ہیں، مگر اللہ انسان کو معاف کر دیتا ہے اور میں نے بھی یہ تو نہیں کہا کہ میں بہت ہی اچھا مسلمان ہوں اور میں ضرور جنت میں جاؤں گا لیکن میں اگر ایک اچھا کام کرتا ہوں اور دوسروں کو اس کی پیروی کرنے کی طرف سے مجھ پر فرض ہے۔"

سعد نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس سے کہا۔

"سعد! تم خود تو دوسروں کی ذمہ داری اپنے سر پر مت لو، پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کرو، پھر دوسروں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرو تاکہ کوئی جہیں منافق نہ کہہ سکے اور جہاں تک اللہ کے معاف کر دینے کا تعلق ہے تو اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ تمہاری غلطیوں کو معاف کر سکتا ہے تو پھر وہ ہمیں بھی معاف کر سکتا ہے، ہمارے گناہوں کے لئے تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے سے تمہاری نیکیوں میں اضافہ ہو گا اور تم اپنے گناہوں سمیت اللہ کے قریب ہو جاؤ گے تو ایسا نہیں ہو گا۔ بہتر ہے تم پناہ لے کر ایک دیکھاڑ ٹھیک کرو، صرف اپنے آپ کو دیکھو، دوسروں کو ٹھیک بنانے کی کوشش نہ کرو، ہمیں برا ہی رہنے دو۔"

اس نے تشری سے کہا۔ اس لئے اس کے دل میں جو آیا اس نے سعد سے کہہ دیا تھا۔ جب وہ خاموش ہوا تو سعد اٹھ کر چلا گیا۔

اس دن کے بعد اس نے دوبارہ کبھی سالار کے سامنے اسلام کی بات نہیں کی۔

وہ اس ویک اینڈ پر بہت دنوں کے بعد گیسٹورنٹ گیا تھا۔ اپنا آرڈر دینے کو نوٹ کروانے کے بعد وہ ریسٹورنٹ کے شیشوں سے باہر سڑک کو دیکھنے لگا۔ وہ جس میز پر بیٹھا تھا وہ کھڑکی کے قریب تھی اور قد آدم کھڑکیوں کے شیشوں کے پاس بیٹھ کر اسے یونی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ باہر فٹ پاتھ پر بیٹھا ہو تھا۔

کسی لڑکی کی سسکیوں نے اس کی محویت کو توڑا تھا، اس نے بے اختیار مڑ کر دیکھا، اس سے پہلے میز پر ایک لڑکا اور لڑکی بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی کسی بات پر روتے ہوئے سسکیاں لے رہی تھی اور لڑکے کا ہاتھ اپنے آسوپہ پیچھے رہی تھی۔ لڑکا اس کے ہاتھ کو چھو رہا تھا۔ وہ شاید اسے تسلی دے رہا تھا۔ ریسٹورنٹ اتنا چھوٹا اور ٹھیکڑا تھا کہ قریب قریب جیس کہ وہ بڑی آسانی سے ان کی گفتگو سن سکتا تھا مگر وہ وہاں اس کام کے لئے نہیں آیا تھا، وہ سیدھا ہو گیا۔ لاہواری کی ایک لہری اس کے اندر سے اٹھی تھی۔ اسے اس طرح کے قصے اچھے نہیں لگتے تھے۔ اس کا موزہ خراب ہو چکا تھا، وہ وہاں سکون سے کچھ وقت گزارنے آیا تھا اور یہ سب کچھ۔ اس کا دل اچھا ہونے لگا۔ وہ دونوں رہیں تھے اور اسی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا مگر غیر محسوس طور پر اس کی سامتیں ابھی بھی ان ہی سسکیوں کی طرف مرکوز تھیں۔ اس نے کچھ دیر بعد مڑ کر ایک بار پھر اس لڑکی کو دیکھا۔ اس بار اس کے مڑنے پر لڑکی نے بھی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ چند لمحوں کے لئے ان دونوں کی نظریں ملی تھیں اور وہ چند لمحے اس پر بہت بھاری گردے تھے۔ اس کی آنکھیں متورم اور سرخ ہو رہی تھیں۔ اسے یک دم ایک اور چہرہ یاد آیا۔ امام باہم کا چہرہ وہ اس کی متورم آنکھیں۔

ویر اس کا آرڈر لے کر آچکا تھا اور وہ اسے سر دے کر لے لگا۔ اس نے پانی کے چند گھونٹ پیتے ہوئے اپنے ذہن سے اس چہرے کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ اس نے چند گھرے سانس لئے۔ ویر نے اپنا کام کرتے کرتے اسے غور سے دیکھا مگر سالار کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف تھا۔

"آج موسم بہت اچھا ہے اور میں یہاں اچھے لمحے گزارنے آیا ہوں، ایک اچھا کھانا کھانے آیا ہوں، اس کے بعد میں یہاں سے ایک فلم دیکھنے جاؤں گا، مجھے اس لڑکی کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ کسی بھی طرح نہیں۔ وہ بالکل خبی، وہ بکواس کرتی تھی اور مجھے اس کے حوالے سے کسی قسم کا کوئی پچھتاوا نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے کیا یاد ہو گیا، کہاں مری، یہ سب اس نے خود کیا تھا۔ میں نے صرف مذاق کیا تھا اس کے ساتھ۔ وہ مجھ سے رابطہ کرتی تو میں اسے طاق دے دیتا۔"

لاشعوری طور پر خود کو سمجھاتے سمجھاتے ایک بار پھر اس کا پچھتاوا اس کے سامنے آنے لگا تھا۔ پچھتے پچھتی ہوئی لڑکی کی سسکیاں اب اس کے دماغ میں تیز سے اٹنی کی طرح چبھ رہی تھیں۔

"میں اپنی ٹھیک تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے بہت کھردرے انداز میں ویر کو مخاطب کیا۔ ویر

جہاں ہو گیا۔

"کس لئے سر؟"

"یا تو ان دونوں کی ٹھیک تبدیل کر دو یا میری۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ویر نے ایک نظر اس جوڑے کو دیکھا پھر وہ سالار کا سانس بھالیں مگر اس نے کونے میں لگی ہوئی ایک ٹھیک پر سالار کو بٹھا دیا۔ سالار کو چند لمحوں کے لئے وہاں آکر واقعی سکون ملا تھا۔ سسکیوں کی آواز اب وہاں نہیں آ رہی تھی مگر اب اس لڑکی کا چہرہ اس کے بالکل سامنے تھا۔ چالوں کا پہلا بیج منہ میں ڈالنے کی اس کی نظر اس لڑکی پر دوبارہ پڑی۔

وہ ایک بار پھر بد مزہ ہو گیا اسے ہر چیز یک دم بے ڈانڈ لگنے لگی تھی۔ یہ یقیناً اس کی ذہنی کیفیت تھی، ویر وہاں کا کھانا بہت اچھا ہوتا تھا۔

"انسان نعمتوں کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ میری زبان پر ڈانڈ دیکھنے کی حس ہے، یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ میں اگر کوئی چیز کھاتی ہوں تو میں اس کا ڈانڈ محسوس کر سکتی ہوں۔ اچھا کھانا کھا کر خوشی محسوس کر سکتی ہوں۔ بہت سے لوگ اس نعمت سے بھی محروم ہوتے ہیں۔"

اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی تھی اور یہ شاید انتہا ثابت ہوئی۔ وہ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ اس نے پوری قوت سے بیچ اپنی پلیٹ میں بٹھا اور پتہ آواز میں دھاڑا۔

"شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ۔" ریسٹورنٹ میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔

"یو پیٹ... یو پیٹری، جسٹ شٹ اپ۔" وہ اب اپنی میز سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"تم میرے ذہن سے نکل کیوں نہیں جاتیں؟"

دونوں کپٹیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ چلا گیا۔

"میں جہیں ماراؤں گا، اگر تم مجھے دوبارہ نظر آئیں۔"

وہ ایک بار پھر چلا گیا اور پھر اس نے پانی کا گلاس اس آٹھار کپانی بنیا اور اس وقت پہلی بار اسے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں، ان کی ٹھیکوں کا احساس ہوا، وہ سب اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک ویر اس کی طرف آ رہا تھا، اس کے چہرے پر تشویش تھی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے سر؟"

سالار نے کچھ بھی کہے بغیر اپنا اٹال لگا لیا اور چند کرنسی نوٹ ٹھیک پر رکھ دیئے۔ ایک لفظ بھی مزید کہے بغیر وہ ریسٹورنٹ سے نکل گیا۔

وہ امام نہیں تھی، ایک جوت تھا جو اسے چٹ گیا تھا۔ وہ جہاں جاتا وہ وہاں ہوتی۔ کہیں اس کا چہرہ،

کہیں اس کی آواز اور جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہوتیں وہاں سالار کا بچپتا ہوتا۔ وہ ایک چیز بھولے کی کوشش کرتا تو دوسری چیز اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی، بغض و نفہ وہ اتنا مشتعل ہو جاتا کہ اس کا دل چاہتا ہوتا وہ دوبارہ ملے تو وہ اس کا گلا دبا دے یا اسے شٹ کر دے۔ اسے اس کی ہر بات سے نفرت تھی۔ اس راست اس کے ساتھ سفر میں گزارے ہوئے چند گھنٹے اس کی پوری زندگی کو چٹو کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”مگر آپ کیوں آرہے ہیں؟“ سالار نے جھٹکنا اپنے سب سے بڑے بھائی سے پوچھا۔ وہ دونوں فون پر بات کر رہے تھے اور اس نے سالار کو چند فون بعد نیو یون آنے کی اطلاع دی تھی۔ سالار اس وقت روٹھیں کی زندگی گزار رہا ہوتا تو وہ اس اطلاع پر یقیناً خوش ہو جاتا مگر وہ اس وقت ذہنی ابتری کے جس دور سے گزر رہا تھا اس میں کامران کا آنا اسے بے حد ناگوار نظر رہا تھا اور وہ یہ ناگوار ہی چھپا بھی نہیں سکا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا، کیوں آرہے ہیں تم سے ملنے کے لئے آرہا ہوں۔“ کامران اس کے سچے پر کچھ حیران ہوا۔ ”اور پاپا نے بھی کہا ہے کہ میں تم سے ملنے کے لئے چاہوں۔“ وہ ہونٹ جھپٹے اس کی بات سننا رہا۔

”تم مجھے تاثیر پورٹ سے چک کر لینا، میں تمہیں ایک دن پہلے اپنی قاتل کی ناعنگ کے بارے میں بتا دوں گا۔“

”یکہ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر لے دیتے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔“

”چارون کے بعد اس نے کامران کو تاثیر پورٹ سے رہنویو کیا۔ وہ سالار کو کچھ کر حیران رہ گیا۔“

”تم کیا ہو؟“ اس نے چھوٹے ہی سالار سے پوچھا۔

”نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ سالار نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”لگ تو نہیں رہے ہو۔“ کامران کی تشویش میں کچھ اور اضافہ ہونے لگا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کیا کرتا تھا، آج خلاف معمول وہ آنکھیں چراہ تھا۔

گلاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بھی وہ بہت غور سے سالار کو دیکھتا رہا۔ وہ بے حد احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کامران کو حیرانی ہوئی تھی وہ اس قدر پیش ڈرائیو کرتا تھا کہ اس کے ساتھ جھپٹے ہوئے بڑے سے بڑا جی دار ڈری ڈیڑا تھا۔ سعد کو یہ ایک مثبت تبدیلی تھی مگر یہ واحد مثبت تبدیلی تھی جو اس نے محسوس کی تھی۔ باقی تبدیلیاں اس کو پریشان کر رہی تھیں۔

”اسٹریڈیکسی جاری ہیں تمہاری؟“

”ٹھیک ہیں۔“

اسے سفر کے دوران بھی اسی طرح کے جواب ملتے رہے تھے۔ یہ اس کے پارٹنر کی حالت تھی جس نے کامران کے اضطراب کو اتنا بڑھایا تھا کہ وہ کچھ مشتعل ہو گیا تھا۔

”یہ تمہارا پارٹنر ہے سالار..... مائی گاڈ۔“ سالار کے چپچپے اس کے پارٹنر میں داخل ہوتے ہی وہ چلا اٹھا تھا۔ سالار اپنی چیزوں کو جس طرح منظم کرکے کا عادی تھا وہ نظم و ضبط وہاں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہاں ہر چیز اہر حالت میں نظر آ رہی تھی۔ جگہ جگہ اس کے کپڑے، جرابیں اور جوتے پھرے پڑے تھے۔ کن یوں، اخباروں اور میگزینز کا بھی جیبنی قابل تھا۔ کچن کی حالت سب سے بری تھی اور پھر روم کی اس سے بھی زیادہ۔ کامران نے کچھ شاک کی حالت میں پورے پارٹنر کا جائزہ لیا۔

”کہتے ہاے تم نے سلفائی فٹن کی ہے؟“

”میں ابھی کر رہا ہوں۔“ سالار نے سر دھری کے عالم میں چیزیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

”تم اس طرح رہنے کے عادی تو نہیں تھے اب کیا ہوا ہے؟“ کامران بہت پریشان تھا۔ کامران نے اچانک ایک میز پر سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری اینٹ لڑے کے پاس جا کر سگریٹ کے ٹکڑوں کو سونگھنا شروع کر دیا۔ سالار نے چپٹی ہوئی تیز نظروں سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ کامران نے چند لمحوں کے بعد دو اینٹ لڑے پیچھے پیچھے دیا۔

Salar! what are you upto this time?

”مجھے صاف صاف بتاؤ، مسئلہ کیا ہے۔ ڈرنگز استعمال کر رہے ہو تم؟“

”نہیں، میں کچھ استعمال نہیں کر رہا۔“ اس کے جواب نے کامران کو خاصا مشتعل کر دیا۔ وہ اسے کندھے سے کپڑے تقریباً پھینکتے ہوئے پھر روم کے آئینے کے سامنے لے آیا۔

”کل ویکھو اپنی، ڈرگ ایڈکٹ والی شکل سے یا نہیں اور حرکتیں تو بالکل ویسی ہیں۔ دیکھو، نظریں آٹھا ڈالنی، پیر وہ کھینچا۔“

وہ اسے اب کار سے کھینچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سالار آئینے میں اپنے آپ کو دیکھے بغیر بھی جانتا تھا کہ وہ اس وقت کیسا نظر آ رہا ہوگا۔ گہرے حلقوں اور بڑی ہونٹ شید کے ساتھ وہ کیسا نظر آ سکتا تھا۔ یہی سب کامران مہاسوں اور ہونٹوں پر بھی ہوئی چیزوں نے پوری کر دی تھی جو بے تحاشا شکی اور سگریٹ پینے کا نتیجہ تھے۔ مہاسوں کی وجہ سے اس نے روز شیو کر کے بند کر دی تھی۔ کچھ ناراضی کے عالم میں اس نے کامران سے اپنا کار پچھرا یا اور آئینے پر نظریں دوڑا لے بغیر پھر روم سے نکلنے کی کوشش کی۔

”لعنت برس رہی ہے تمہاری شکل پر۔“

لعنت وہ لفظ تھا جو کامران اکثر استعمال کیا کرتا تھا سالار نے پہلے بھی اس لفظ کو محسوس نہیں کیا تھا مگر اس وقت کامران کے منہ سے ہی جملہ سن کر وہ جیسے بھڑک اٹھا تھا۔

"ہاں، اعلیٰ درجہ رہی ہے میری شکل تو؟" وہ قدرے بھروسے انداز میں کامران کے سامنے حق کرکھڑا ہوا گیا۔

"جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں ڈرگز نہیں لے رہا تو میں نہیں لے رہا۔ آپ کو میرا یقین کرنا چاہیے۔"

"تم پر یقین۔"

کامران نے طے کر لیا کہ اس کے پیچھے ہاتھ روم سے باہر آتے ہوئے کہا۔ اس نے ہونٹ بھیجنے لے اور کمرے کی چیزیں سینٹھ کا کام جاری رکھا۔

"یونیورسٹی چار ہے تو تم؟" سعد کو اچانک ایک اور اندیشہ ہوا۔

"چار ہوں۔" وہ چیزیں اٹھا کر بار کامران کو تسلی نہیں ہوئی۔

"میرے ساتھ ہاتھ مل چلو، میں تمہارا پینک اپ کروانا چاہتا ہوں۔"

"اگر آپ یہ سب کرنے آتے ہیں تو بہتر ہے وہاں پہلے جائیں میں کوئی کنڈرگارٹن کاپی نہیں ہوں۔ میں اپنا خیال رکھ سکتا ہوں۔" کامران نے اس بار کچھ کہنے کے بجائے اس کے ساتھ مل کر چیزیں اٹھانی شروع کر دیں۔ سالار نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ اس معاملے پر دو بار بحث نہیں کرے گا مگر اس کا یہ انداز غلط تھا۔ کامران نے اس کے پاس اپنے قیام کو لمبا کر دیا۔ وہ چین دن کے بجائے دوپہر ایک بجے وہاں رہا۔ سالار اس کے قیام کے دوران باقاعدگی سے یونیورسٹی چانار ہاؤس کا کامران اس دوران اس کے دوستوں اور یونیورسٹی کے پروفیسرز سے ملتا رہا۔ سسٹر میں ملنے کی خبر بھی اسے سالار کے دوستوں سے ہی ملتی تھی اور کامران کے لئے یہ ایک شاگ تھا۔ سالار سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی، مگر سسٹر میں ملے ہوئے سالار وہ بھی اس کی طرح سے جبکہ وہ جبکہ عرصہ پہلے تک یونیورسٹی کے پیچھے رہنا دیکھ کر ایک کرتے ہوئے ٹاپ کر رہا تھا۔

اس بار اس نے سالار سے اس معاملے کو ڈسکس نہیں کیا بلکہ پاکستان سکندر عثمان کو فون کر کے اس سارے معاملے سے آگاہ کر دیا۔ سکندر عثمان کے بیچوں سگے سے ایک بار پھر زمین گھل گئی تھی۔ سالار نے اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھا تھا۔ وہ ایک ڈیڑھ سال کے بعد ان کے لئے کوئی نئی مسئلہ کھڑا کرنا چاہتا تھا اور پاشتمین والے معاملے کو بھی اتنا ہی عرصہ ہونے والا تھا۔

"آپ ابھی اس سے اس معاملے پر بات نہ کریں۔" یونیورسٹی میں کچھ پھٹپھٹا ہونے والی ہیں، آپ اسے پاکستان بلا لیں، کچھ عرصے کے لئے وہاں رہیں پھر میری سے کہیں کہ وہ اس کے ساتھ وہاں رہیں یا نہیں۔

سکندر نے اس بار ایسا ہی کیا تھا۔ وہ اتنا بے پھر پھٹپھٹا شروع ہونے سے پہلے نہ ہوں کتنے تھے۔ اس کا طبع دیکھ کر سکندر عثمان کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگی تھیں مگر انہوں نے کامران کی طرح

اس سے بحث نہیں کی۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ پاکستان چلنے کے لئے کہا۔ اس کے احتجاج اور تعلیمی مصروفیات کے بھانے کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے زبردستی اس کی سیٹ بک کر دوائی اور اسے پاکستان لے آئے۔

☆.....☆.....☆

دورات ایک بچے پاکستان پہنچے۔ سکندر اور طیبہ سونے کے لئے چلے گئے۔ وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ تقریباً بیڑھ سال کے بعد اپنے کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ دوسرا تھا جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ لائٹ آف کر کے اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ غلامت کے دوران سوتا رہا تھا، اس لئے اس وقت اسے نیند محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ جغرافیائی تبدیلی تھی جس کی وجہ سے وہ نہیں جا رہا تھا۔

"میں واقعی آہستہ آہستہ بے خوابی کا شکار ہو جاؤں گا۔"

اس نے تاریکی میں کمرے کی چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر ای طرح بیڈ پر کروں میں بدلنے رہنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ کمرے کی کھڑکیوں کی طرف جاتے ہوئے اس نے پردوں کو ہٹا دیا۔ اس کی کھڑکیوں کے پار وسیع سائینڈ لان کے دوسرے طرف پاشتمین کا گھر نظر آ رہا تھا۔ اس نے اسے سالوں سے کھڑکی کے پردے آگے پیچھے کرتے کبھی پاشتمین کے گھر پر غور نہیں کیا تھا، مگر اس وقت وہ بہت دیر تک تاریکی میں اس گھر کے اوپر والے فلور کی لائٹس میں نظر آتے ہوئے اس عمارت کو دیکھتا رہا۔ بہت ساری باتیں اس کے ذہن میں آتی تھیں۔ اس نے پردے ایک بار پھر براہ کر دیئے۔

"وہ سب کے گھر والوں کو اماندہ کیا تھا؟"

اس نے اگلے دن ناصرہ کو بلا کر پوچھا۔ ناصرہ نے اسے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"نہیں، ٹی، کہاں پتا چلا۔ انہوں نے تو ایک ایک جگہ پیمانہ داری ہے، مگر کہیں سے کچھ بتائیں چلا۔ انہیں شک ابھی بھی آپ پر ہی ہے۔" سسٹری بی بی تو بہت کا لیاں دیتی ہیں آپ کو۔" سالار سے دیکھتا رہا۔

"مگر کے نوکر روں سے بھی پولیس سے ہوئی ہو چو کچھ کی تھی مگر میں نے تو خیال ہے ذرا بھی کچھ بتایا ہو۔ انہوں نے مجھے کام سے بھی نکال دیا تھا۔ مجھے بھی، میری بیٹی کو بھی پھر بعد میں دو بار دیکھ لیا۔ آپ کے بارے میں مجھ سے پوچھتے رہتے ہی۔ شاید رکھا بھی ان لوگوں نے دو بارہ اسی لئے ہے کہ یہاں کی فیزیز میں وہاں دیتی رہوں۔ میں بھی آئیں بائیں شامیں کر کے ٹال دیتی ہوں۔" وہ بات کو کہاں سے کہاں لے کر جا رہی تھی۔

سالار نے فوراً اہمیت کی۔ "پولیس ابھی بھی دھوڑ رہی ہے؟"

"ہاں جی، ابھی بھی عداوت کر رہے ہیں۔ مجھے زیادہ نوکریاں ملیں، وہ لوگ جبریل چھپاتے ہیں نوکر روں

ہے۔ امام بی بی کی بات بھی نہیں کرتے وہارے سامنے مگر پھر بھی کبھی کبھار کوئی اڑتی خیر مل جاتی ہے ہمیں۔ سالار صاحب انکيا آپ کو بھی امام بی بی کا پتا نہیں ہے۔"

ناصرہ نے بات کرتے کرتے اچانک اس سے پوچھا۔

"مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟" سالار نے ناصرہ کو گھورا۔

"ایسے ہی پوچھ رہی ہوں جی آپ کے ساتھ ان کی دوستی تھی، اس لئے میں نے سوچا شاید آپ کو پتا ہو۔ وہ جو ایک بار آپ نے میرے ہاتھ کچھ کاغذ بھجوائے تھے، وہ کس لئے تھے؟" اس کا جنس اب تشویشناک حد تک بڑھ چکا تھا۔

"اس گھر کے کاغذات تھے، میں نے یہ گھر اس کے نام کر دیا تھا۔" ناصرہ کا منہ کھلے کا کھارہ گیا پھر وہ سنبھل گئی۔

"ہی ای گھر تو سکندر صاحب کے نام پر ہے۔"

"ہاں اگر یہ مجھے تب پتا نہیں تھا۔ یہ بات تم نے ان لوگوں کو بتائی ہے کہ تم یہاں سے کوئی کاغذ لے کر اس کے پاس گئی تھیں۔" ناصرہ نے کانوں کو ہاتھ لگا لئے۔

"تو یہ کمر بنی امیں نے کیوں بتانا تھا۔ میں نے تو سکندر صاحب کو نہیں بتایا۔"

"اور یہ ہی بہتر ہے کہ تم اپنا منہ اسی طرح ہمیشہ کے لئے بند رکھو، اگر یہ بات ان کو پتا چلی تو پتا نہیں سامان سمیت اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیں گے۔ تم ان کے غصے کو جانتی ہو۔ چاہا اب یہاں سے۔"

سالار نے ترشی سے کہا۔ ناصرہ خاموشی سے اس کے کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆☆

وہ ایک اینڈر بھی کبھار ہانکے کے لئے مار گئی پہلا یوں پر جایا کر تا تھا۔ وہ ایک اینڈر نہیں تھا مگر اچانک ہی اس کا موڑ وہاں جانے کا نٹن گیا۔

ہمیشہ کی طرح گاڑی پیچھے پارک کر کے وہ ایک بیک اپنی پشت پر ڈالے ہانکے کر جا رہا۔ واپسی کا سفر اس نے تب شروع کیا جب سامنے لمبے ہوئے گئے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اسے اپنی گاڑی تک پہنچنے میں دو گھنٹے لگیں گے۔ واپسی کے سفر کو کچھ تیزی سے طے کرنے کے لئے وہ سڑک پر آ گیا جہاں سے عام طور پر لوگ گزرتے تھے۔ اس نے ابھی کچھ فاصلے طے کیا تھا جب اسے اپنے پیچھے تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ سالار نے ایک نظر مڑ کر دیکھا۔ وہ دو لڑکے تھے جو اس سے کافی پیچھے تھے، مگر بہت تیزی سے آگے آ رہے تھے۔

سالار نے گردن واپس موڑ لی اور اسی طرح اپنا پیچھے کا سفر جاری رکھا۔ اسے اپنے پیٹے سے دو لڑکے منھکوں نہیں لگے تھے۔ جنہر اور شرش میں ملبوس ان کا ملبہ عام لڑکوں جیسا تھا مگر پھر ملتے ملتے

اسے ایک دم کوئی اپنے ہاتھ میں محسوس ہوا۔ وہ برقی رفتار سے بے پلٹا اور ساکت ہو گیا۔ ان دونوں لڑکوں کے ہاتھ میں ریوٹو گن تھیں اور وہ اس کے ہاتھوں سامنے تھے۔

"اپنے ہاتھ اوپر کر دو ورنہ تم جہیں شوٹ کر دیں گے۔"

ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا۔ سالار نے بے اختیار اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ ان میں سے ایک اس کے پیچھے گیا اور بہت تیزی سے اس نے اسے کھینچے ہوئے دھکا دیا۔ سالار لڑکھڑایا مگر سنبھل گیا۔

"ادھر چلو۔" سالار نے کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر اس طرف جانا شروع کر دیا جہاں وہ اسے مرکز سے ہٹانا چاہتے تھے، تاکہ کوئی یک دم وہاں نہ آجائے۔ ان میں سے ایک اسے تقریباً کھینچتے ہوئے اس راستے سے ہٹا کر جھالیوں اور درختوں کے بہت اندر تک لے گیا۔

"مکھنوں کے مٹی بنیو۔" ایک نے درشتی سے اس سے کہا۔

سالار نے خاموشی سے اس کے حکم پر عمل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اس کی چیزیں جیسٹیں گے اور پھر اسے چھوڑ دیں گے اور وہ ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا، جس پر وہ دونوں مشتعل ہو کر اسے نقصان پہنچاتے۔ ان میں سے ایک اس کے پیچھے گیا اور اس نے اس کی پشت پر لٹکا ہوا چوٹا سا بیگ اتار لیا۔ اس بیگ میں ایک کمرہ، چند قم رول، بیٹری، مٹی اسکوپ، فرسٹ ایڈ کٹ، والٹ، پانی کی بوتل اور چند کھانے کی چیزیں تھیں جس لڑکے نے بیگ اتارا تھا وہ بیگ کھول کر اندر موجود چیزوں کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے والٹ کھول کر اس کے اندر موجود کرنسی اور کرپٹ کارڈز کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس نے بیگ میں سے لٹوکا کپڑا نکال لیا اور پھر فرسٹ ایڈ کٹ بھی نکال لی۔

"اب تم کھڑے ہو جاؤ۔" اس لڑکے نے ٹھٹھکانا انداز میں کہا۔ سالار اس طرح ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے کھڑا ہو گیا۔ اس لڑکے نے اس کی پشت پر جا کر اس کی شارٹس کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ان میں شواہد اور اس میں موجود گاڑی کی پانی نکال لی۔

"گنڈا کار ہے؟" سالار کو کھیل پار کچھ تشویش ہوئی۔

"تم لوگ میرا بیگ لے جاؤ مگر کار کو رہو۔ دو۔" سالار نے پہلی بار انہیں مخاطب کیا۔

"کیوں؟" لڑکوں نے کہیں رہتے دیں۔ تم ہماری حالت کے بیٹے ہو کہ کار کو رہتے دیں۔" اس لڑکے نے

درشت لہجے میں کہا۔

"تم لوگ اگر کار لے جانے کی کوشش کرو گے تو جہیں بہت سے راپٹرو ہوں گے۔ صرف کار کی پانی مٹی جانے سے تم کار نہیں لے جا سکو گے۔ اس میں اور بھی بہت سے لاکس ہیں۔" سالار نے ان سے کہا۔

”وہ ہمارا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں۔“ اس لڑکے نے اس سے کہا اور پھر آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں سے گھاس کھینچ لیے۔

”اپنے جاگڑا آثار دو۔“ سالار نے جیڑی سے اسے دیکھا۔

”جاگڑو کس لئے؟“ اس بار اس لڑکے نے جواب دینے کے بجائے پوری قوت سے ایک تھپڑ سالار کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا، چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے تارے بچھ گئے۔

”دو بارہ کوئی سوال مت کرنا، جاگڑا آثار دو۔“

سالار شخصیں نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ دوسرے لڑکے نے اس پر تانے ہوئے ریلو اور کے جھیر کو ایک بار جتانے والے انداز میں حرکت دی۔ پہلے لڑکے نے ایک اور تھپڑ اس بار سالار کے دوسرے گال پر دے مارا۔

”اب دیکھو اس طرح۔۔۔ جاگڑا آثار دو۔“ اس نے خنسی سے کہا۔ سالار نے اس بار اس کی طرف دیکھے بغیر پیچھے جھٹک کر آہستہ آہستہ اپنے دونوں جاگڑا آثار دیئے۔ اب اس کے پیروں میں صرف جراثیم رہ گئی تھیں۔

”اپنی شرٹ آٹار دو۔“ سالار ایک بار پھر اعتراض کرنا چاہتا تھا مگر وہ دوبارہ تھپڑ کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر ان دونوں کے پاس ریلو اور نہ ہوتے تو وہ جسمانی طور پر ان سے بہت بہتر تھا اور یقیناً اس وقت ان کی ٹھکانی کر رہا ہوتا، مگر ان کے پاس ریلو اور کی موجودگی نے ایک دم ہی اسے ان کے سامنے پس ہٹ کر دیا تھا۔ اس نے اپنی شرٹ آٹار کر اس لڑکے کی طرف بڑھائی۔

”نیچے نیچے لگو۔“ اس لڑکے نے تھماتے انداز میں کہا۔ سالار نے شرٹ نیچے پھینک دی۔ اس لڑکے نے اپنے ہائیں ہاتھ کو جبب میں ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ وہ پلاسٹک کی باریک ڈوری کا ایک ٹکچا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سالار کی کچھ میں آگیا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بے اختیار پریشان ہوا، شام ہو رہی تھی، کچھ ہی دیر میں وہاں اندھیرا اچھا جاتا اور وہاں سے رہائی کس طرح حاصل کرنا۔

”وکیو، جیسے باغ و صومست، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم میرا ایک اور میری کار لے جاؤ۔“ اس نے اس بار ہاتھ اٹھاتے انداز میں کہا۔

اس لڑکے نے کچھ بھی کہے بغیر جیڑی قوت سے اس کے پیٹ میں ایک گھونر مارا۔ سالار درد سے دھرا ہوا گیا۔ اس کے منہ سے ایک بچہ نکل چکی تھی۔

”کوئی مشورہ نہیں۔“

اس لڑکے نے جیسے اسے یاد کر دیا اور زور سے ایک طرف دھکیلا۔ درد سے ہلجھاتے ہوئے سالار نے اندھوں کی طرح اس کی پیروی کی۔ ایک درخت کے سنے کے ساتھ بٹھا کر اس لڑکے نے

بڑی مہارت کے ساتھ اس کے دونوں بازوؤں کو پکڑنے سے تنے کے پیچھے لے جا کر اس کی کٹانوں پر وہ زوری پھینکا شروع کر دی۔ دوسرا لڑکا سالار سے ذرا فاصلے پر اطمینان سے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے سالار پر ریلو اور تانے رہا۔

اس کے ہاتھوں کو ابھی طرح پکڑنے کے بعد اس لڑکے نے سامنے آ کر اس کے پیروں کی جڑیں اٹھائیں اور پھر فرسٹ ایڈ کٹ میں موجود چھنی سے اس نے سالار کی شرٹ کی پٹیاں کاٹنی شروع کر دیں۔ ان میں سے کچھ پٹیوں کو اس نے ایک بار پھر بیڑی مہارت کے ساتھ اس کے ٹخنوں کے گرد پھینک کر گر لگا دی پھر اس نے شرٹ کا پکٹ کھولا اور اس میں موجود دسارے نشو باہر نکال لئے۔

”منہ کھولو۔“ سالار جانتا تھا، وہ اب کیا کرنے والا ہے۔ وہ جتنی گالیاں اسے دل میں دے سکتا تھا اس وقت دے رہا تھا۔ اس لڑکے نے یکے بعد دیگرے وہ سارے نشو اس کے منہ میں ٹھونس دیئے اور پھر شرٹ کی واحد جگہ جانے والی پٹی کو کھولنے کی کلام کی طرح اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے درخت کے تنے کے پیچھے اسے باندھ دیا۔

دوسرا لڑکا اب اطمینان سے بیگ بند کر رہا تھا، پھر چند منٹوں کے بعد وہ دونوں وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ ان کے وہاں سے جاتے ہی سالار نے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی کوشش شروع کر دی، مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی سمیت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس لڑکے نے بڑی مہارت کے ساتھ اسے باندھا تھا، وہ صرف ہلنے چلنے کی کوشش سے خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا، نہ ہی زوری ڈھیلی کر سکتا تھا۔ وہ زوری اس کے حرکت کرنے پر اس کے گوشت کے اندر دھنسی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی حالت اس وقت بے حد خراب ہو رہی تھی۔ وہ نہ کسی کو آواز دے سکتا تھا نہ کسی دوسرے طریقے سے خود اپنی طرف کسی کو متوجہ کر سکتا تھا۔

اس کے ارد گرد قد آدم جھاڑیاں تھیں اور شام کے ڈھلتے سماؤں میں ان جھاڑیوں میں اس کی طرف کسی کو متوجہ ہو جانا کوئی مجبوری ہو سکتا تھا۔ اس کے جسم پر اس وقت لباس کے نام پر صرف ٹخنوں سے کچھ نیچے تک لٹکے والی برمودا شارٹس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا اور شام ہونے کے ساتھ ساتھ خنکی بڑھ رہی تھی۔ گھر میں کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ پلاسٹک کے لئے یہاں آیا ہوا ہے اور جب گھرنے پہنچنے پر اس کی تلاش شروع ہو گی تب بھی یہاں اس تاریکی میں درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان بندھے ہوئے اس کے وجود تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

آدھ گھنٹے کی ہمدردی کے بعد جب اپنے پیروں کے گرد موجود پٹیوں کو ڈھیلا کرنے اور پھر انہیں کھولنے میں کامیاب ہوا، اس وقت سورج مکمل غروب ہو چکا تھا اگرچہ چاند نہ نکلا ہوتا تو شاید وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور گرد کے ماحول کو سمجھ نہ دیکھ پاتا۔ اکاڈکا گزرنے والی گاڑیوں اور لوگوں کا شور اب نہ

ہونے کے برابر تھا۔ اس کے اور گرد و جھنگروں کی آوازیں گونج رہی تھیں اور وہ گردن سے کر تک اپنی پشت پر درخت کے تنے کی وجہ سے آنے والی بارگڑ اور خراشوں کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ درخت کے دوسری طرف اس کے ہاتھوں کی کلائیوں میں موجود زوری اب اس کے گوشت میں اتری ہوئی تھی۔ وہ ہاتھوں کو مزید حرکت دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ کلائیوں سے آگہی نہیں برداشت نہیں کر پار تھا۔ اس کے منہ کے اندر موجود لٹوزاب گل پتکے تھے اور ان کے گلے کی وجہ سے وہ منہ میں نکال کر طرح کسی ہوئی پٹنی کو حرکت دینے کا حقا کہہ دو گئے تھے۔ آواز نکالنے میں اب بھی برج طرح کا کام تھا کیونکہ وہ ان گلے ہوئے لٹوز کو نہ نگل سکتا تھا نہ اگل سکتا تھا۔ وہ اسے زیادہ تھکے کر وہ انہیں پیڑ کی طرح چبانے میں بھی کام تھا۔

اس کے جسم پر کچلی طاری ہو رہی تھی۔ وہ صبح تک اس حالت میں وہاں بقیہ غصہ کر رہا تھا اگر خوف یا کسی زہریلے کیڑے کے کاٹنے سے نہ مر جاتا۔ اس کے جسم پر اب چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے اور بار بار وہ اسے کاٹ رہے تھے۔ وہ اپنی ہڈیوں کا ہونے والے کیڑوں کو جھٹک رہا تھا مگر باقی جسم پر رینگنے والے کیڑوں کو جھٹکنے میں کام تھا اور وہ انہیں جانتا تھا کہ ان چھوٹے کیڑوں کے بعد اسے ان کیڑوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہ ان کیڑوں کا چھو اور سناپ ہونے تو۔۔۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت مزید خراب ہو رہی تھی۔ "آخر یہ سب میرے ساتھ کیوں ہوا ہے؟ آخر میں نے کیا کیا ہے؟" وہ بے چارگی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ "اور میں یہاں مر گیا تو؟" تو میری تلاش تک وہ بارہ کسی کو نہیں ملے گی۔ کیڑے کوڈے اور جانور جیسے کھا جائیں گے۔"

اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ ایک عجیب طرح کے خوف نے اسے اپنی گرفت میں لیا۔ تو کیا میں اس طرح مروں گا، یہاں۔ اس حالت میں۔ بے لیاں۔ بے نشان۔ گھروالوں کو ہانک نہیں ہو گا میرے بارے میں۔ کیا میرا انجام یہ ہوتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنے لگی۔ اسے اپنی موت سے ایک دم خوف آیا تاکہ خوف کہ اسے سانس لینا مشکل کھینے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے موت اس کے سامنے اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو۔ اس کے انتھار میں۔ یہ دیکھنے کہ وہ کس طرح سسک سسک کر مارتا ہے۔

وہ دردی پر دانے بغیر ایک بار پھر اپنی کلائیوں کی زوری کو توڑنے یا پھیلنے کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بازو ٹھیک ہونے لگے۔

پندرہ منٹ بعد اس نے ایک بار پھر اپنی ہڈیوں کا جھجھکنا دیکھا اور اس وقت اسے احساس ہوا کہ اس کے منہ کی پٹنی ڈھیلی ہو گئی تھی، وہ گردن کو ہلاتے ہوئے اسے منہ سے نکال سکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے

لٹوز نکال دیے تھے۔ اگلے کی منٹ وہ کمرے سانس لینا اور باہر دو بلند آواز میں اپنی مدد کے لئے آوازیں دینے لگا۔ سختی بلند آوازیں جتنی وہ کوشش کر سکتا تھا۔

اس کا انداز بالکل بدلتی تھا۔ آدھے گھنٹے تک مسلسل آوازیں دیتے رہنے کے بعد اس کی ہمت اور گادوں جو اب دے گئے۔ اس کا سانس پھول رہا تھا، یوں جیسے وہ کئی میل دوڑنا رہا ہو مگر اب بھی کوئی اس کی مدد کے لئے نہیں آیا تھا۔ کلائی کے زخم اب اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہے تھے اور کیڑے اب اس کے چہرے اور گردن پر بھی کاٹ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتا کہ دم اسے کیا ہوا، بس وہ بلند آواز میں بچوں کی طرح پوٹ پوٹ کر رونے لگا۔

وہ زندگی میں پہلی بار بری طرح زور بٹھا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اسے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا اور اس وقت درخت کے اس تنے کے ساتھ بندھے کھٹکے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا ہے۔ وہ موت سے اسی طرح خوفزدہ ہو رہا تھا، جس طرح وہ نیو نیو میں ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا وہ کتنی دیر اسی طرح بے بسی کے عالم میں بلند آوازیں دے رہا تھا، مگر اس کے آسوس خفگ ہونے لگے۔ شاید وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اب وہ بھی اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ حلال ساہو کر اس نے درخت کے تنے سے سر لٹکاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کندھوں اور بازوؤں میں انکار اور زور بٹھا تھا کہ اسے لگ رہا تھا وہ کچھ دیر میں مفلوج ہو جائیں گے پھر وہ کبھی انہیں حرکت نہیں دے سکے گا۔

"میں نے بھی کبھی کے ساتھ اس طرح نہیں کیا پھر میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔" اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے۔

"سالار! میرے لئے پہلے ہی بہت پر اظہار ہیں، تم اس میں اضافہ نہ کرو، میری زندگی بہت مشکل ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اور مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ کم از کم تم تو میری پکڑ میں کو کچھ، میری مشکلات کو موت بڑھاؤ۔" درخت کے تنے کے ساتھ ٹپک لگنے والے سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ نیچے بہت نیچے بہت دور۔ اسلام آباد کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

"میں تمہارے مسائل میں اضافہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؟ میں؟" مائی ڈیر اما! میں تو تمہاری ہمدردی میں کھل رہا ہوں۔ تمہارے مسائل ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم خود سوچو، میرے ساتھ رہ کر تم کو تنہا اکیلا اور محفوظ زندگی گزار سکتی ہو۔" سالار نے اپنے ہونٹ جھٹکے۔

"سالار! مجھے حلاق دے دو۔" بھرائی ہوئی لاجبست آئینہ آواز۔

"سویت ہارٹ! تم کو رٹ میں جا کر لے لو۔ جیسا کہ تم کہہ چکی ہو۔"

وہ اب چپ چاپ خود سے بہت دور نظر آنے والی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی اس کے سامنے جیسے آئینہ لے کر کھڑا ہو گیا تھا جس میں وہ اپنا عکس دیکھ سکتا تھا اور اپنے ساتھ ساتھ کسی اور کا بھی۔

”میں نے امامہ کے ساتھ صرف مذاق کیا تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔

”میں۔۔۔ میں اسے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔“ اسے اپنے الفاظ کھوکھلے لگے۔

وہ چنانچہ کسی کو وضاحت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح اسلام آباد کی روٹینوں کو دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

”میں مانتا ہوں، مجھ سے کچھ غلطیاں ہو سکتی ہیں۔“

اس بار اس کی آواز بھرائی ہوئی سرگوشی تھی۔ ”میں جانے پانتے ہوں مجھے اس کے لئے مسائل کھڑے کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دھوکا دیا مگر مجھ سے غلطی ہو گئی اور مجھے سمجھنا ہوا ابھی ہے۔ میں چاہتا ہوں میرے طلاق نہ دینے سے اور حلال کے بارے میں جھوٹ بول دینے سے اسے بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ مجھے واقعی سمجھنا ہوا ہے اس سب کے لئے مگر اس کے علاوہ تو میں نے کسی اور کو بھی دھوکا نہیں دیا، کسی کے لئے پریشانی کھڑی نہیں کی۔“

وہ ایک بار پھر رونے لگا۔

”میرے خدا۔۔۔ اگر ایک بار میں یہاں سے بچ گیا، میں یہاں سے نکل گیا تو میں امامہ کو ڈھونڈوں گا، میں اسے طلاق دے دوں گا، میں دوبارہ کبھی اسے تنگ نہیں کروں گا۔ میں حلال کے بارے میں بھی اسے سچ بتا دوں گا۔ بس ایک بار آپ مجھے یہاں سے جانے دیں۔“

وہ اب جھوٹ جھوٹ کر رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ امامہ نے اس کے طلاق نہ دینے سے انکار پر کیا محسوس کیا ہو گا۔ شاید اسی طرح اس نے بھی اپنے ہاتھ بندھے ہوئے محسوس کئے ہوں گے جس طرح وہ کر رہا تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے پہلی بار وہ امامہ کی بے بسی، خوف اور تکلیف کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے حلال انصر کی شادی کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا تھا اور اس کے جھوٹ پر امامہ کے چہرے کا تاثر اسے اب بھی یاد تھا۔ اس وقت وہ اس تاثر سے بے حد محفوظ ہوا تھا۔ وہ اسلام آباد سے لاہور تک تقریباً پوری رات روتی رہی تھی اور وہ بے حد مسرور تھا۔

وہ اس وقت اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس اندہ جبری رات میں اس گاڑی میں سڑکرتے ہوئے اسے اپنے آگے اور پیچھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہو گا، واحد پناہ گا، جس کا وہ سوچ کر نفی تھی وہ حلال انصر کا گھر تھا اور سالار سکندر نے اسے وہاں جانے نہیں دیا تھا۔ ودرات کے اس پہر وہاں اعصاب میں اترنے والی تاریکی میں بیٹھ کر ان اندیشوں اور خوف کا اندازہ کر سکتا تھا جو اس رات امامہ کو لڑا رہے تھے۔

”مجھے افسوس ہے، مجھے واقعی افسوس ہے لیکن۔۔۔ لیکن میں نہیں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر۔۔۔ اگر وہ مجھے

دوبارہ ملی تو میں اس سے ایکسکس ذکر لوں گا، میں جس حد تک ممکن ہو اس کی مدد کروں گا مگر اس وقت۔۔۔ اس وقت تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر۔۔۔ اگر میں نے کبھی۔۔۔ کبھی کوئی نیکی کی ہے تو مجھے اس کے بدلے یہاں سے رہائی دلاوے۔ اور گاڈ پلایز۔ پلایز۔ پلایز۔“ اس نے ہنسنے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنی نیکیاں سننے کی کوشش کی جنہیں وہ گنوا سکے۔ اس وقت پہلی بار اس پر یہ ہونا ایک انکشاف ہوا کہ اس نے زندگی میں اب تک کوئی نیکی نہیں کی تھی۔ کوئی نیکی جسے وہ اس وقت اللہ کے سامنے پیش کر کے اس کے بدلے میں رہائی مانگا۔ ایک اور خوف نے پھر اس کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی خیرات نہیں کی تھی، وہ اس پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ بوٹلر اور ریسٹورنٹس میں مپ خوش ولی سے دیا کرتا تھا، مگر کبھی کسی فقیر کے ہاتھ پھیلائے پر اس نے اسے کچھ نہیں دیا تھا۔

اسکول کا بچ، مختلف کاموں کے لئے جب منع فرم ہوتے جب بھی وہ ٹکس خریدنے یا بیچنے سے صاف انکار کر دیتا۔

”میں جبریت پر یقین نہیں کرتا۔“ اس کی زبان پر رونگٹے انداز میں صرف ایک ہی جملہ ہوتا تھا۔ ”میرے پاس اتنی فالوئر تو ہیں کہ میں ہر جگہ لٹا پھروں۔“ اس کا یہ رویہ نیو زیون میں بھی جاری رہا تھا۔ یہ سب صرف جبریت ہی تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ جبریت کے علاوہ بھی کسی کی مدد کرنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اسے کوئی ایسا نسخہ یاد نہیں آیا، جب اس نے کسی کی مدد کی کی ہو، صرف امامہ کی مدد کی تھی اور اس مدد کے بعد اس نے جو کچھ کیا تھا اس کے بعد وہ اسے نیکی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ عبادت کرنے کا بھی عادی نہیں تھا۔ شاید نیچین میں اس نے چند بار سکندر کے ساتھ عید کی نماز پڑھی ہو مگر وہ بھی عبادت سے زیادہ ایک رسم تھی۔ اسے نیو زیون میں دورات یاد آئی جب وہ عشاء کی نماز اور صوری چھوڑ کر بھاگ آیا تھا اور اس کے ساتھ اسے اس hooker کو دے دیے ہوئے ۵۰ ڈالر بھی یاد آئے۔ شاید وہ واحد موقع تھا

جب اسے کسی پر زس آیا تھا۔ وہ مستقل اپنے ذہن کو اپنی کسی نیکی کی تلاش میں لٹکا لٹکا رہا مگر ناکام رہا۔ اور پھر اسے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ کیا تھا جو وہ نہیں کر چکا تھا۔ اس کے آنسو، گڑگڑانا، رونا سب کچھ ایک دم ختم ہو گیا۔ حساب کتاب بالکل صاف تھا۔ وہ اگر آج اس حالت میں مرنے کا تو اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہوتی۔ پائیس سال کی عمر میں وہاں بیٹھے کی گھنٹے صرف کرنے پر بھی جس شخص کو اپنی کوئی نیکی یاد نہ آئے جبکہ اس شخص کا ایک کیو لیول ۱۵۰+ ہو اور اس کی میموری فوٹو گرافک۔ وہ شخص اللہ سے یہ چاہتا ہو کہ اسے اس کی کسی نیکی کے بدلے اسے آزمائش سے رہا کر دیا جائے جس میں وہ جھپٹ گیا ہے۔

”What is next to ecstasy?”

اس نے ٹھن اتار میں کوئین پیتے ہوئے ایک بار اپنے دوست سے پوچھا تھا، وہ بھی کوئین لے رہا تھا۔ ”more ecstasy“ اس نے کہا تھا۔ اس نے کوئین لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

There is no end to ecstasy. It is preceded by pleasure and followed by more ecstasy.

وہ نشتے کی حالت میں اس سے کہہ رہا تھا۔ سالار مطمئن نہیں ہوا۔

No, it does end, What happens when it ends? When it really ends?

اس کے دوست نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

You know it yourself, don't you? You have been through it oft and on.

سالار جواب دینے کے بجائے دوبارہ کوئین لینے لگا تھا۔

اس کی کلاہیوں کے گوشے میں اتارنی ڈوری اسے اب جواب دے رہی تھی۔ "pain" (درو)۔

"What is next to pain?"

اس نے مسکندہ خیر لہجے میں اس رات امامہ باشم سے پوچھا تھا۔

"Nothingness"

رشتی نما کوئی چیز لہراتے ہوئے اس کے جسم پر گری تھی۔ اس کے سر، چہرے، گردن، سینے، پیٹ۔ اور وہاں سے تیز رفتاری سے رینگتی ہوئی اتر گئی۔ سالار نے کانپتے جسم کے ساتھ اپنی چیخوں کی جھمی۔ وہ کوئی سانپ تھا جو اسے کالے بلیئر چلا گیا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ اس کا جسم اب جاڑے کے مریض کی طرح تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"Nothingness" آواز بالکل صاف تھی۔

"And what is next to nothingness?"

تحقیر آمیز آواز اور مسکراہٹ اس کی تھی۔

"Hell"

اس نے یہی کہا تھا۔ وہ پچھلے آٹھ گھنٹے سے وہاں بندھا ہوا تھا۔ اس دیرانے، اس تاریکی، اس وحشت ناک تنہائی میں۔ وہ پورا ایک گھنٹہ خلق کے بل پوری قوت سے مدد کے لیے پکارا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا خلق آواز نکالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

Nothingness سے Hell وہ ان دونوں کے بیچ کہیں مطلق تھا یا شاید Nothingness میں داخل

ہوئے والا تھا اور Hell تک پہنچنے والا تھا۔

"جہنم خوف نہیں آتا یہ پوچھتے ہوئے Hell کے بعد آگے کیا آئے گا؟ دوزخ کے بعد آگے کیا آسکتا ہے؟ انسان کے معتب اور مغلوب ہو جانے کے بعد باقی بچا ہی کیا ہے جسے جاننے کا تمہیں اشتیاق ہے؟"

سالار نے وحشت بھری نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ وہ کیا تھا، قبر یادوزخ یا زندگی میں اس کا ایک مہجر..... جھوک، جیاس، بے بسی، بے یاری و مددگاری، جسم پر پلٹے کیڑے جنہیں وہ خود کو کاٹنے سے روک تک نہیں پار رہا تھا۔ مطلوب ہوتے ہوئے ہاتھ پاؤں، پشت اور ہاتھوں کی کلاہیوں پر لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے زخم۔ خوف تھا یا دبشت، چاہیں کیا تھا مگر وہ بلند آواز میں یا گلوں کی طرح نہیں مارنے لگا تھا۔ اس کی جینیں دور دور تک فضا میں گونج رہی تھیں۔ مذیلی اور ذوقی انداز میں بلند کی جانے والی بے مقصد اور خوفناک جینیں۔ اس نے زندگی میں اس طرح کا خوف کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔ اسے اپنے ارد گرد عجیب سے بھوت پلٹے پھرتے نظر آنے لگے تھے۔

اسے لگ رہا تھا اس کے دماغ کی رگ چھٹنے والی ہے یا پھر نروس بریک ڈاؤن، پھر اس کی جینیں آہستہ آہستہ دم توڑتی گئیں۔ اس کا کارٹ پھر بند ہو گیا تھا۔ اب صرف سرراٹھیں تھیں جو اسے سنا کی دے رہی تھیں۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اب مر رہا ہے۔ اس کا ہارٹ فیل ہو رہا ہے یا پھر وہ اپنا ذہنی توازن کھو دینے والا ہے اور اسی وقت اچانک تنے کے پیچھے بندھی ہوئی کلاہیوں کی ڈوری ڈھیلی ہو گئی۔ ہوش و حواس کھوٹے ہوئے اس کے اعصاب نے ایک بار پھر جھجکا لیا۔

اس نے فحلا ہوٹ دانتوں میں دباتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ ڈوری اور ڈھیلی ہوتی گئی۔ شاید مسلسل تنے کی رگڑ لگتے لگتے درمیان سے ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ہاتھوں کو پتھر اور حرکت دی اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ درخت کے تنے سے آواز ہو چکا تھا۔

اس نے بے چینی کے عالم میں اپنے بازوؤں کو سیسہ کیا۔ درد کی تیز لہریں اس کے بازوؤں سے گزریں۔

"کیا میں، میں بچا گیا ہوں؟"

اس نے بے چینی سے اندھیرے میں اپنے بازوؤں اور ہاتھوں کے بولے دیکھے ہوئے سوچا۔ "کیوں؟ کس لئے؟" "ماؤں ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ اس نے اپنی گردن کے گرد موبو داس بنی کو اتاراجو پہلے اس کے منہ کے گرد پاندھی لگی تھی، بازوؤں کو دی گئی معمولی حرکت سے اس کے منہ سے کراہ گئی تھی۔ اس کے بازوؤں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اتنی تکلیف کہ اسے لگ رہا تھا وہ دوبارہ کبھی اپنے بازو استعمال نہیں کر سکے گا۔ اس کی انگلیں بھی سن ہو رہی تھیں۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ وہ لڑکھڑاکر بازوؤں کے بل زمین پر گر۔ بالکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ اس نے دوسری کوشش ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کی۔ اس بار وہ ٹھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ دونوں لڑکے اس کے جاکر زور گھڑی بھی لے چا سکے تھے۔ اس کی جراثیم وہیں کہیں پڑی تھیں۔ وہ اندھیرے میں انہیں ٹول کر بہن سکتا تھا مگر بازوؤں اور ہاتھوں کو استعمال میں لانا پڑنا اور وہ

اس وقت یہ کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔ جسائی طور پر، نہ ذہنی طور پر۔

وہ اس وقت صرف وہاں سے نکل جاتا جتنا تھا۔ ہر قیمت پر، اندھیرے میں غموں کی گھاٹی۔ جہازوں سے اٹھتا خوشی لیتا وہ کسی نہ کسی طرح اس راستے پر آگیا تھا جس راستے سے وہ دونوں بنا کر اسے وہاں لے آئے تھے اور پھر نکلے گاؤں اس نے نیچے کا سفر لے لیا۔ اس کے بیرون میں چھ اور کنکریاں چھ رہی تھیں مگر وہ جس ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار تھا اس کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا وقت ہو تھا مگر اسے یہ اندازہ تھا کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکا ہے۔ اسے نیچے آنے میں کتنا وقت لگا اور اس نے یہ سفر کس طرح لے لیا۔ وہ نہیں جانتا۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ وہ پورے راستہ بلند آواز سے روتا رہا تھا۔

اسلام آباد کی سڑکوں پر آکر اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں بھی اس نے اپنے علیہ کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی کہیں لڑکے کی خواہش کی نہ ہی کسی کی مدد لینے کی۔ وہ اسی طرح روتا ہوا اڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اس سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔

وہ پولیس کی ایک پڑونگ کا تھی جس نے سب سے پہلے اسے دیکھا اور اس کے پاس آکر ڈک گئی اندر موجود کشتیل اس کے سامنے نیچے اترے اور اسے روک لیا۔ وہ پہلی بار ہوش و حواس میں آیا تھا مگر اس وقت بھی وہ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں پر قابو پانے میں ناکام ہو رہا تھا وہ لوگ اب اس سے کچھ بچ رہے تھے، مگر وہ کیا جواب دیتا۔

اگلے چند روز میں وہ ایک باغیچہ میں تھا جہاں اسے فرسٹ اینڈ کی گئی۔ وہ اس سے اس کے گھر کا پتہ چھ رہے تھے مگر اس کا گانا بند تھا۔ وہ انہیں کچھ بھی بتانے کے قابل نہیں تھا۔ سوچے ہوئے باتوں کے ساتھ اس نے ایک کاغذ پر اپنے گھر کا فون نمبر اور ایڈریس تحریر کیا۔

"اگلی اور کتنی دیر سے یہاں رہنا پڑے گا؟"

"زیادہ تو نہیں جیسے ہی ہوش آتا ہے ہم وہ بارہ چیک اپ کریں گے، پھر ڈسچارج کر دیں گے زیادہ شدید قسم کی انجری نہیں ہیں۔ بس گھر میں کچھ دن تک مکمل طور پر ریست کرنا پڑے گا۔"

اس کا ذہن لا شعور سے شعور کا سفر طے کر رہا تھا۔ پہلے جو صرف بے معنی آوازیں تھیں۔ اب وہ انہیں معلوم پہناتا تھا۔ آوازوں کو پہچان رہا تھا ان میں سے ایک آواز سکندر عثمان کی تھی۔ دوسری یقیناً کسی ڈاکٹر کی۔ سالار نے آہستہ آہستہ انہیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں یک دم چندھیا گئیں۔ کمرے میں بہت تیز روشنی یا کم از کم اسے ایسا ہی لگا تھا وہ ان کے پہلی ڈاکٹر کا پرائیویٹ کلینک تھا۔ وہ ایک باغیچہ پر بھی یہاں ایسے ہی ایک کمرے میں روچکا تھا وہ یہ پہچاننے کے لئے ایک ٹھہری کافی تھی اس کا ذہن بالکل صحیح کام کر رہا تھا۔

جسم کے مختلف حصوں میں ہونے والے درد کا احساس اسے بھر پور لگا تھا۔ اس کے باوجود کہ اب وہ ایک ہلکا بہت نرم اور آرام دہن جسم تھا۔

اس کے جسم پر وہ لباس نہیں تھا جو اس نے اس سرکاری باغیچہ میں پہنا تھا، جہاں اسے لے جایا گیا تھا۔ وہ ایک اور لباس میں ملبوس تھا اور یقیناً اس کے جسم کو پانی کی مدد سے صاف بھی کیا گیا تھا کیونکہ اسے آج سے بازوؤں والی شرٹ سے جھانکنے اپنے بازوؤں پر کبھی بھی مٹی یا گرد ٹھہر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی کلاں کے گرد بلیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس کے بازوؤں پر چھوٹے چھوٹے بہت سے نشانات تھے۔ بازو اور ہاتھ سوچے ہوئے تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ ایسے ہی بہت سے نشانات اس کے چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی ہوں گے۔ اسے اپنی ایک آنکھ میں جھکی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے جڑے بھی دکھ رہے تھے مگر اس نے بھی زیادہ برا حال لگے کا تھا۔ اس کے بازو میں ایک ڈپ گئی ہوئی تھی جواب تقریباً تھمے ہوئے والی تھی۔

پہلی بار اس کو ہوش میں ڈاکٹر نے ہی دیکھا تھا۔ وہ ان کا پہلی ڈاکٹر نہیں تھا۔ شاید اس کے ساتھ کام کرنے والا کوئی اور فزیشن تھا۔ اس نے سکندر کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ "ہوش آگیا ہے؟" سالار نے ایک صوفے پر بیٹھی ٹیبلہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا مگر سکندر آگے نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر اب اس کے پاس آکر اس کی نبض چیک کر رہا تھا۔

"اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

سالار جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔ وہ صرف منہ کھول کر رہ گیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا، سالار نے غصے پر رکھا ہوا اپنی سرنگی میں ہلاہلا۔ "بولنے کی کوشش کرو۔" ڈاکٹر شاید پہلے ہی اس کے گلے کے پرالم کے بارے میں جانتا تھا۔ سالار نے ایک بار پھر لگی میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر نے نرس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی نرس سے ایک جوتی مانگ آ کر اٹھایا۔

"منہ کھولیں۔" سالار نے دیکھتے جڑوں کے ساتھ اپنا منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر کچھ دیر اس کے حلق کا معائنہ کرنا پھر اس نے ہار جینڈ کر دی۔

"کچھ کا کچھلی چیک اپ کرنا پڑے گا۔" اس نے مگر سکندر عثمان کو بتایا پھر اس نے ایک رانٹنگ پیڈ اور بین سالار کی طرف بلا دیا۔ نرس تک اس کے بازو میں لگی ڈپ اتار نکلی تھی۔

"اندھ کر بیٹھو اور بتاؤ کیا ہوا ہے۔ گھٹے کو؟" اسے اندھ کر بیٹھنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ نرس نے کچھ اس کے پیچھے رکھ دیا تھا اور رانٹنگ پیڈ ہاتھ میں لے کر چلتا رہا۔

"کیا ہوا تھا؟ گھٹے کو، جسم کو، دماغ کو۔" وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھا۔ سوتی ہوئی آنکھوں میں پکڑے چین کو وہ دیکھتا رہا۔ اسے یاد تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اسے اپنی وہ چھٹی یاد آ رہی تھیں

جنہوں نے اسے اب بولنے کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ کیا لکھا جائے کہ مجھے ایک پہاڑ پر ساری چیزیں چین کر باندھ دیا گیا تھا یا پھر یہ کہ مجھے چند کھٹکوں کے لئے زندہ قبر میں اُتار دیا گیا تھا تاکہ مجھے میرے مولوں کا جواب مل جائے۔

"What is next to ecstasy?"

وہ سفید صاف کاغذ کو دیکھتا رہا پھر اس نے مختصر سی تحریر میں اپنے ساتھ ہونے والا واقعہ تحریر کر دیا۔ ڈاکٹر نے رائٹنگ پیڈ پکڑ کر ایک نظر ان سات اٹھ جملوں پر ڈالی اور پھر اسے سکندر عثمان کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ کو چاہئے کہ فوری طور پر پولیس سے رابطہ کریں، تاکہ کار برآمد کی جاسکے، پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ پتا نہیں وہ گاڑی کہاں سے کہاں لے جا چکے ہوں گے۔" ڈاکٹر نے ہمدردانہ انداز میں سکندر کو مشورہ دیا۔ سکندر نے رائٹنگ پیڈ پر ایک نظر ڈالی۔

"ہاں، میں پولیس سے کاغذات کرتا ہوں۔" پھر کچھ دیر ان دونوں کے درمیان اس کے گتے کے چپکے اپ کے سلسلے میں بات ہوتی رہی پھر ڈاکٹر بس کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ اس کے باہر لگتی ہی سکندر عثمان نے ہاتھ میں جکڑا ہوا رائٹنگ پیڈ سالار کے سینے پر دے مارا۔

"یہ جھوٹ کا پلندہ! اپنے پاس رکھو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اب میں تمہاری کسی بات پر اعتبار کروں گا۔ نہیں کبھی نہیں۔"

سکندر رہے مشتعل تھے۔

"یہ بھی تمہارا کوئی نیا ٹیڈ وچر ہو گا۔ خود کشی کی کوئی نئی کوشش۔"

وہ کہتا جاتا تھا۔ "فارگاڈ سیک۔ ایسا نہیں ہے۔" مگر وہ دو گھنٹوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"میں کیا کہوں ڈاکٹر سے کہ اس کو عادت ہے ایسے قاتلوں اور ایسی حرکتوں کی، یہ پیدا ہی ان کا موسم کے لئے ہوا ہے۔"

سالار نے سکندر عثمان کو کبھی اس حد تک مشتعل نہیں دیکھا تھا، شاید وہ واقعی اب اس سے شک آ چکے تھے۔ طیبہ خاموشی سے پاس کھڑی تھیں۔

"ہر سال ایک نیا قاتل، ایک نئی مصیبت، آخر تمہیں یہ یاد کر کے کیا گناہ کر بیٹھے ہیں ہم۔"

سکندر عثمان کو یقین تھا یہ بھی اس کے کسی سنے ایڈ وچر کا حصہ تھا جو ٹوکا چار بار خود کو مارنے کی کوشش کر سکتا تھا اس کے ہاتھ پاؤں پر موجود ان زخموں کو کوئی دیکھی قرار نہیں دے سکتا تھا وہ بھی اس صورت میں جب اس واقعے کا کوئی گواہ نہیں تھا۔

سالار کو "شیر آیا، شیر آیا" والی کہانی یاد آئی۔ بعض کہانیاں واقعی سچی ہوتی ہیں۔ وہ بار بار جھوٹ

بول کر اب اپنا اعتبار گنوا چکا تھا۔ شاید وہ سب کچھ ہی گنوا چکا تھا۔ اپنی عزت، خود اعتمادی، غرور، فخر، ہر چیز وہ کسی پاتال میں پھینک چکا تھا۔

"کوئی فیڈر امس کے پاس نہ گزر گئے تھے جنہیں تو تم نے سوچا ہاں باپ کو محروم کیوں رکھوں، انہیں خوار اور ذلیل کئے بغیر عرصہ ہو گیا ہے۔ اب نئی تکلیف دینی چاہئے۔"

"ہو سکتا ہے سکندر! یہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔ آپ پولیس کو گاڑی کے بارے میں اطلاع دوں۔"

اب طیبہ رائٹنگ پیڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے کے بعد سکندر سے کہہ رہی تھیں۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟" کبھی آج تک ٹھیک کہا ہے اس نے، مجھے اس بجواس کے ایک لحظہ پر بھی یقین نہیں ہے۔

تمہارا یہ بیٹا کسی دن مجھے اپنی کسی حرکت کی وجہ سے پہچانی پر پڑھا دے گا اور تم کہہ رہی ہو کہ پولیس کو اطلاع دوں، ادا پناہ ملے گا۔ کار کے ساتھ بھی کچھ نہ کچھ کیا ہو گا اس نے، سچ دہی ہو گی کسی کو، یا کہیں ٹھیک آ یا ہو گا۔"

وہ اب اسے واقعی کا گایاں دے رہے تھے۔ اس نے کبھی انہیں کا گایاں دیتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ وہ صرف ڈانٹا کرتے تھے اور وہ ان کی ذات پر بھی مشتعل ہو جاتا تھا۔ چاروں بھائیوں میں وہ احقر تھا ہواں باپ کی ذات سننے کا بھی روادار نہیں تھا اور اس سے بات کرتے ہوئے سکندر بہت محتاط ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ کسی بھی بات پر مشتعل ہو جایا کرتا تھا، مگر آج پہلی دفعہ سالار کو ان کی گالیوں پر بھی غصہ نہیں آیا تھا۔

وہ انداز کو سکتا تھا کہ اس نے انہیں کس حد تک زچ کر دیا ہے۔ وہ پہلی بار اس بیٹے پر بیٹھے اپنے ماں باپ کی حالت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا چیزیں جو انہوں نے اسے نہیں دی تھی۔ اس کے منہ سے

نکلتے سے پہلے وہ اس کی فرمائش پوری کر دینے کے حامی تھے اور وہ اس کے بدلے میں انہیں کیا دیتا رہا تھا۔ کیا دے رہا تھا، ذہنی اذیت، پریشانی، تکلیف، اس کے علاوہ اس کے کہن بھائیوں میں سے کسی نے ان کے لئے کوئی پریشانی نہیں کھڑی کی تھی۔ صرف ایک وہ تھا جو۔

"کسی دن تمہاری وجہ سے ہم دونوں کو خود کشی کرنی پڑے گی۔ تمہیں تب ہی سکون ملے گا، صرف تب ہی یقین آئے گا کہ تمہیں۔"

کچھ رات اس پہاڑ پر اس طرح بندھے ہوئے اسے پہلی بار ان کی یاد آئی تھی۔ پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ اسے ان کی کتنی ضرورت تھی، وہ ان کے بغیر کیا کرے گا، اس کے لئے ان کے علاوہ کون پریشان ہو گا۔

اسے سکندر کے لفظوں سے زندگی میں پہلی بار کوئی بے عزتی محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ ہمیشہ سے سکندر کے زیادہ قریب رہا تھا اور اس کے سب سے زیادہ محظوظ بھی ان ہی کے ساتھ ہوتے رہے تھے۔

"سیرادل چادر ہا ہے کہ میں دو بارہ بھی تمہاری شکل تک نہ دیکھوں۔" جیسے دو بارہ وہیں بیٹھو
وہ جس جگہ کے بارے میں تم جھوٹ بول رہے ہو۔"
"اب بس کرو سکندر۔" طیبہ نے ان کو ٹوکا۔

"میں بس کروں۔۔۔۔۔ یہ کیوں نہیں کرتا، کبھی تو جس کھالے یہ ہم لوگوں پر اور اپنی حرکتیں
چھوڑ دے۔ کیا اس پر یہ فرض کر کے اسے زمین پر آچار کیا تھا کہ یہ ہماری زندگی برباد ہے۔"
سکندر طیبہ کی بات پر مزید مشتعل ہو گئے۔

"ابھی وہ پولیس والے بیان لینے آجائیں گے۔ جنہوں نے اسے سڑک پر پکڑا تھا۔ یہ کون سی چیز
کر رہے ان کے سامنے کہ اس بے چارے کو کسی نے ٹوٹ لیا ہے۔ اچھا تو یہ ہو تاکہ اس بار واقعی کوئی
اسے لے لیا اور اسے پھانسی سے پھینک دیا تاکہ میری جان بچوٹ جاتی۔

سالار بے اختیار کھنکھارے لگا۔ سکندر اور طیبہ جھوٹے کھنکھارے دہرائے وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے رو رہا تھا۔ وہ
زندگی میں پہلی بار اسے رو نہا کر دے تھے اور وہ بھی ہاتھ جوڑے۔ دو کیا کر رہا تھا؟ کیا چادر ہاتھ لگایا تھا یا
تھا؟ سکندر عثمان ہانگل سناکت تھے، طیبہ اس کے قریب بیٹھ بیٹھ نہیں، انہوں نے سالار کو اپنے ساتھ
لگاتے ہوئے جھینڈ کی کوشش کی۔ وہ بیٹھوں کی طرح ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اس کی پٹنٹی کی طرف کھڑے سکندر عثمان کو اچانک احساس ہوا کہ شاید اس بار وہ جھوٹ نہیں بول
رہا تھا۔ شاید اس کے ساتھ واقعی کوئی حادثہ ہوا تھا۔ وہ طیبہ کے ساتھ لپٹا خٹے بیٹھوں کی طرح لنگھیں
سے دور رہا تھا۔ طیبہ اسے چپ کر واتے کر واتے خود بھی روئے لگیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تو کیا بڑی
بڑی باتوں پر بھی رونے کا عادی نہیں تھا، پھر آج کیا ہوا تھا کہ اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔

اس سے دور کھڑے سکندر عثمان کے دل کو کچھ ہوئے لگا۔

"اگر یہ ساری رات واقعی وہ نہ مارا ہوا تھا تو۔۔۔؟"

وہ ساری رات اس کے انتظار میں جاگتے رہے اور بگڑتے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ
گلاڑی لے کر پھر کھڑا لاہور یا گئیوں اور آوارہ گردی کے لئے چلا گیا ہو گا۔ انہیں تشویش ہو رہی تھی مگر وہ
سالار سکندر کی حرکتوں سے واقف تھے۔ اس لئے تشویش سے زیادہ غصہ تھا اور وہ اسی تشویش سے قریب
وہ سونے کے لئے چلے گئے تھے جب انہیں فون پر پولیس کی طرف سے یہ اطلاع ملی۔

وہ ہسپتال پہنچے تھے اور انہوں نے اسے وہاں بہت اہتر حالت میں دیکھا تھا مگر وہ یہ یقین کرنے پر تیار
نہیں تھے کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے وہ خود کو آیت پتیا چار ہاتھوں میں لپیٹ لیا
کاٹ لے۔ وہ ان دے کو توڑتے ہوئے ٹریک کی سمیٹر میں اپنی بانٹیک دے مارے۔ سلیپنگ پلائے لے۔
اپنے آپ کو ہاتھ کر پانی میں اُنڈا کر چائے۔ اس کے لئے ایک بار پھر اپنی ہی حالت کو نیا مشکل تھا۔

اس کا جسم کیڑوں کے کاٹنے کے نشانات سے جگہ جگہ بھرا ہوا تھا۔ بعض جگہوں پر بلیا بٹ تھی۔
اس کے ہجر بھی بری طرح سے زخمی تھے۔ ہاتھوں کی کانٹوں، گردن اور پشت کا بھی یہی حال تھا اور اس
کے جڑوں پر بھی خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود سکندر عثمان کو یقین تھا کہ یہ سب کچھ اس کی
اپنی کارستانی ہی ہوگی۔

شاید اس وقت دو بولنے کے قابل ہو تا اور وضاحتیں پیش کر تا تو وہ بھی اس پر یقین نہ کرتے
مگر اسے اس طرح لنگھوں کے ساتھ روئے دیکھ کر انہیں یقین آئے لگا تھا کہ وہ جگہ بگڑ رہا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل گئے اور انہوں نے موہاگل پر پولیس سے رابطہ کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد انہیں
پتا چل گیا کہ سرخ رنگ کی ایک اسپورٹس کار پہلے ہی پکڑی جا چکی ہے اور اس کے ساتھ دو لڑکے بھی۔
پولیس نے انہیں ایک معمول کی چیکنگ کے دوران انٹرنس اور گاڑی کے کاغذات نہ ہونے پر گھبرا
جانے پر پکڑا تھا۔ انہوں نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ انہوں نے گاڑی کیس سے جھینٹی تھی، وہ صرف یہی
کہتے رہے کہ وہ گاڑی انہیں کیس کی تھی اور وہ صرف شرقی اور جنس سے مجبور ہو کر چلانے لگے۔ چند
پولیس کے پاس، ابھی تک کسی گاڑی کی ایف آئی آر بھی درج نہیں کر والی تھی اس لئے ان کے بیان کی
تصدیق مشکل ہو گئی تھی۔

مگر سکندر عثمان کی ایف آئی آر کے کچھ دیر بعد ہی انہیں کار کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ اب وہ
صحیح معنوں میں سالار کے بارے میں تشویش کا شکار ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

سکندر اور طیبہ سالار کو اس رات وہیں نہیں لے کر آئے، وہ اس رات ہسپتال میں ہی رہا لنگے
دن اس کے جسم کا درد اور سوجن میں کافی کمی واقع ہو چکی تھی۔ وہ دونوں کیا روپیے کے قریب اسے گھر
لے آئے۔ اس سے پہلے پولیس کے دو ہیکڑوں نے اس سے ایک لہا چوڑا تحریری بیان لیا تھا۔

سکندر اور طیبہ کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پہلی بار اس نے اپنی کڑکیوں پر
لگی ہوئی مختلف بلاخر کی ان نیڈر تصویروں کو دیکھا اسے بے اختیار شرم آئی۔ طیبہ اور سکندر بہت بار اس
کے کمرے میں آئے رہے تھے اور وہ تصویروں ان کے لئے کوئی نئی یا قابل اعتراض چیز نہیں تھیں۔

"تم اب آرام کرو۔ میں نے تمہارے فریج میں پھل اور جوس رکھوا دیے۔ جھوک لگے تو کھال کر
کھا لیتا یا پھر ملازم کو بلا لیتا۔ وہ کھال دے گا۔"

طیبہ نے اس سے کہا۔ وہ اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر اس کے پاس رہے پھر کڑکی کے
پروٹے برابر کر کے اسے سونے کی تاکید کرتے ہوئے چلے گئے، وہ ان کے باہر نکلنے یا آنے پر جیٹھ گیا۔
اس نے کمرے کے دروازے کو کھول کر دیکھا۔ کڑکیوں کے پروٹے بنا کر اس نے بہت تیزی سے

ان پر لگی ہوئی تمام تصویروں کو آثارنا شروع کر دیا۔ پھر سترہ تصویریں، کٹ آؤٹ۔ اس نے چند منٹ میں پورا کمرہ صاف کر دیا وہ آتش روم میں جا کر اس نے ہاتھ میں آب انہیں پھینک دیا۔

داش روم کی لائٹ جلانے پر اس کی نظر اپنے چہرے پر پڑی تھی۔ وہ بری طرح سو جا ہوا اور تیار ہو رہا تھا وہ ایسے ہی چہرے کی توقع کر رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر داش روم سے نکل آیا۔ اس کے کمرے میں پورے نوگرانی کے بہت سے بیگزین بھی پڑے تھے۔ وہ انہیں اٹھا لایا۔ اس نے انہیں بھی ہاتھ میں پھینک دیا، پھر وہ پاری اپنے ریکم میں پڑی ہوئی گندی ویڈیو ڈھانڈھا کہ اس میں سے شیپ نکالے لگا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اس کا کارپٹ شیپ کے ذخیرے بھر رہا ہوا تھا۔

اس نے وہاں موجود تمام ویڈیو ڈسک مینج کر دیا اور شیپ کے اس ذخیرہ کو اٹھا کر ہاتھ میں پھینک دیا اور لائبر کے ساتھ اس نے انہیں آگ لگا دی۔ ایک چنگاری بھڑکی تھی اور تصویریں اور شیپ کا وہاں بھر بیٹنے لگا تھا اس نے انگیزا سٹ آن کر دیا۔ ہاتھ روم کی کمرکیاں کھول دیں وہ اس ذخیرہ کو اس لئے جارہا تھا کیونکہ وہ اس آگ سے بچتا چاہتا تھا وہ درخش میں اسے اپنی لچوں میں لئے لیجے۔

”آگ کی پلٹیں تصویریں اور شیپ کے اس ذخیرہ کو کھا رہی تھیں۔ یوں جیسے وہ صرف آگ کے لئے ہی بنائی گئی تھیں۔“

وہ پلٹیں جھپکے بغیر ہاتھ میں آب کے اس ذخیرہ کو دیکھ رہا تھا یوں جیسے وہ اس وقت کسی دوزخ کے کنارے کھڑا تھا۔ ایک رات پہلے اسے اپنی سپاڑی پر اس حالت میں اسلام آباد کی روشتیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی اور وہ اس کے بعد دوبارہ کبھی ان روشتیوں کو نہیں دیکھ سکے گا۔

اس نے ہڈیانی حالت میں گلا چھڑا کر چیخے ہوئے بار بار کہا تھا ”ایک بار، صرف ایک بار، مجھے ایک موقع دیں۔ صرف ایک موقع، میں دوبارہ گناہ کے پاس تک نہیں جاؤں گا۔ میں کبھی گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا۔“ اسے یہ موقع دے دیا گیا تھا اب اس وعدے کو پورا کرنے کا وقت تھا۔ آگ نے ان سب کاغذوں کو راکھ بنا دیا تھا اب آگ بجھ گئی تو اس نے پانی کھول کر پانیپ کے ساتھ اس کو ابھنا شروع کر دیا۔

سالار پلٹ کر دوبارہ واش بین کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اس کے گلے میں موجود دوسنے کی مٹین کو وہ لوگ اتار کر لئے گئے تھے مگر اس کے کان کی لومیں موجود ڈائمنڈ ٹائپ وہیں تھا۔ وہ پائینٹ میں جڑا ہوا تھا اور ان لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ شاید ان کا خیال ہو گا کہ وہ کوئی معمولی چھریا پھر زرقن ہو گیا پھر شاید اس کے لیے کھلے ہاؤں کی وجہ سے اس کے کان کی لومیں بھی رہی ہو گی۔

وہ کچھ دیر آئینے میں خود کو دیکھتا رہا پھر اس نے کان کی لومیں موجود دو جلیکس اٹھا کر واش بین کے

پاس رکھ دیا۔ شیونگ کٹ میں موجود کلپر اس نے نکالا اور اپنے بال کاٹنے لگا۔ بڑی دیر لگی اور بے دردی کے ساتھ۔ واش بین میں بہتا ہوا پانی ان بالوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہا تھا۔

رہز رکھ کر اس نے شیونگ کٹ شروع کر دی۔ وہ جیسے اپنی تمام نشانیوں سے چھٹا چھڑا رہا تھا۔ شیونگ کرنے کے بعد اس نے اپنے کپڑے نکالے اپنے ہاتھوں پر بندھی پٹیاں کھولیں اور شاور کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ اپنے پورے جسم کے ایک ایک حصے کو کھلے پڑھ کر صاف کر جا رہا یوں جیسے وہ آج پہلی بار اسلام سے متعارف ہوا ہو۔ پہلی بار مسلمان ہوا ہو۔

داش روم سے باہر آکر اس نے فریج میں رکھے سب کے چند کھلے کھائے اور پھر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ وہاں اس کی آنکھ الارم سے کھلی جسے اس نے سونے سے پہلے لگا دیا تھا وہ سو رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”مائی گاڈ سالار! اپنے بالوں کو کیا کیا ہے تم نے؟“ طیبہ اسے دیکھتے ہی کچھ دیر کے لئے بھول گئیں کہ وہ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ سالار نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر ان کے سامنے کر دیا۔

”میں مارکیٹ جانا چاہتا ہوں۔“ اس پر کھسا ہوا تھا۔

”کس لئے؟“ طیبہ نے اسے جھانپ کر دیکھا۔

”تم ابھی ٹھیک نہیں ہوئے ہو۔ کچھ کھٹے ہوئے ہیں جنہیں ہاتھل سے آئے اور تم ایک بار پھر آوارہ گردی کے لئے نکلتا چاہتے ہو۔“ طیبہ نے اسے قدرے نرم آواز میں بھڑکا۔

”مئی! میں کچھ کتاہیں خریدنا چاہتا ہوں۔“ سالار نے ایک بار پھر کاغذ پر کھسا ”میں آوارہ گردی کرنے کے لئے نہیں جا رہا۔“

طیبہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ ”تم ڈرائیور کے ساتھ چلے جاؤ۔“ سالار نے سر ہلادیا۔

☆.....☆.....☆

وہ جس وقت مارکیٹ کی پارکنگ میں گاڑی سے اترا شام ہو چکی تھی۔ مارکیٹ کی روشتیاں وہاں جیسے رنگ و نور کا ایک سیلاب لے آئی تھیں۔ وہ جگہ جگہ پھرتے لڑکے لڑکیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ مغربی طبوسات میں بیٹوں بے غم لڑی اور لاپرواہی سے حقہ کھاتے ہوئے اسے زندگی میں پہلی بار اس جگہ سے وحشت ہوئی تھی، وہی وحشت جو وہ آڑا تیس گھنٹے پہلے مارگھ کی ان پہاڑیوں پر محسوس کرتا رہا تھا۔ وہ ان ہی لڑکوں میں سے ایک تھا لڑکیوں سے چھینچھڑا کرنے والا۔ بلند و بالا کھائے والا، فضول اور بے ہودہ باتیں کرنے والا، اپنا سر پیچھے دوکھی بھی تیز پر دھیان دینے بغیر سامنے نظر آنے والی بک شاپ میں چلا آیا۔

اپنی جیب سے کاغذ نکال کر اس نے دکاندار کو اپنی مطلوب کتابوں کے بارے میں بتایا۔ وہ قرآن

اختلاف کیا تھا ہم ایسا ہے کہ ایک لڑکی اس طرح اپنا گھر چھوڑ کر چلی جائے۔

”میں نے اس سے اس لئے شادی نہیں کی کیونکہ وہ قسم نہ تھکتی پر یقین نہیں رکھتا۔ تم سمجھتے ہو میں تمہارے جیسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنے پر تیار ہو جاؤں گی۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ جو قسم نہ تھکتی پر یقین رکھتا ہے اور پھر بھی گناہ کرتا ہے جو ہر وہ کام کرتا ہے جس سے میرے بغیر بچنے کے منع فرمایا۔ میں اگر حضرت محمد ﷺ پر یقین نہ رکھنے والے سے شادی نہیں کروں گی تو میں آپ ﷺ کی نافرمانی کرنے والے کے ساتھ بھی زندگی نہیں گزاروں گی۔“

اسے امام ہاشم کا ہر لفظ یاد تھا۔ وہ منہ پر ہنسی پاری غور کر رہا تھا۔

”تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔“

اس نے بہت بار سالار سے یہ جملہ کہا تھا۔ اتنی بار کہ وہ اس جملے سے چڑنے لگا تھا۔ آخر وہ یہ بات کہہ کر اس پر کیا جتنا پابندی تھی یہ کہ وہ کوئی بہت بڑی کامیاب ریاضیاتی اور وہ اس سے بہت کمتر۔۔۔۔۔

اب وہ سوچ رہا تھا وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔ وہ وہاں تھی کچھ بھی سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ کچھ میں رہنے والا کیڑا یہ کیسے جان سکتا تھا کہ وہ کس گندگی میں رہتا ہے۔ اسے اپنے بھانے دوسرے گندگی میں لپٹے اور گندگی میں رہتے نظر آتی ہیں۔ وہ بھی تپ گندگی میں ہی تھا۔

”مجھے تمہاری آنکھوں سے، تمہارے کھلے کر بیان سے گھن آتی ہے۔“ اسے پہلی بار اب ان دونوں چیزوں سے گھن آئی۔ آئینے کے سامنے رکھے ہوئے پر یہ جملہ کسی بزرگ (buzz word) کی طرح لگی ماہ تک اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔ وہ ہر بار اسے ذہن سے مشکلہ کچھ مشتعل ہوتا، اسے کام میں مصروف ہو جاتا مگر اب پہلی بار اس نے محسوس کیا تھا کہ اسے خود بھی اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ اپنا گریبان بند رکھنے لگا تھا۔ اپنی آنکھوں کو جھانکے لگا۔ وہ آئینے میں بھی خود اپنی آنکھوں میں دیکھتے سے کترانے لگا تھا۔

اس نے کبھی کسی سے یہ نہیں سنا تھا کہ کسی کو اس کی آنکھوں اس کی نظروں سے گھن آتی تھی۔ خاص طور پر کسی لڑکی کو۔

یہ اس کی آنکھیں نہیں ان آنکھوں میں جھلکے والا ڈاٹر تھا، جس سے امام ہاشم کو گھن آتی تھی۔ امام ہاشم سے پہلے کسی لڑکی نے اس تاثر کو شناخت نہیں کیا تھا۔

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی لڑکیوں کی کہانی میں رہتا تھا اور وہ ایسی ہی لڑکیوں کو پسند کر تھا۔ امام ہاشم نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کی تھی وہ اس کے چہرے کو دیکھتی اور اسے اپنی طرف دیکھتے کہ نظر پٹائی پٹائی پھر اس اور چچ کو دیکھنے لگتی۔ سالار کو خوش فہمی تھی کہ وہ اس سے نظریں اس لئے چارہ ہی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں بہت پرکشش تھیں۔

اسے پہلی بار اس کے منہ سے فون پر یہ سن کر شکاں لگا تھا کہ اسے اس کی آنکھوں سے گھن آتی تھی۔ ”آنکھیں روح کی کڑیاں ہوتی ہیں؟“ اس نے کہیں پڑھا تھا تو کیا میری آنکھیں میرے اندر کچھ گندگی کو دکھانا شروع ہو گئی تھیں۔ اسے جواب نہیں ہوا۔ ایسا ہی تھا مگر اس گندگی کو دیکھنے کے لئے سامنے والے کپاک ہو تا ضروری تھا اور امام ہاشم کپاک تھی۔

☆.....☆.....☆

”آپ اب مجھے کچھ بھی نہ سمجھائیں۔ آپ کو اب مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

سالار نے سکندر سے آنکھیں ملا کر بغیر کہا۔

۲۰۰۰ء مارچ ۲۰۰۰ء سالار کا بار تھا اور جانے سے پہلے سکندر نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہی پرانی نصیحتیں کسی موبوس می آس اور امید میں ایک بار پھر اس کے کانوں میں غصے کی کوشش کی تھی مگر اس بار ان کے بات شروع کرتے ہی سالار نے انہیں شاید زندگی میں پہلی دفعہ یقین دہانی کروائی تھی اور زندگی میں پہلی بار سکندر حثان کو اس کے الفاظ پر یقین آ گیا تھا۔

وہ اس حادثے کے بعد اس میں آنے والی تبدیلیوں کو واضح طور دیکھ رہے تھے۔ وہ پہلے والا سالار نہیں رہا تھا، اس کی زندگی ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کا حلیہ، اس کا انداز سب کچھ۔۔۔۔۔ اس کے اندر کے شعلے کو جیسے کسی نے چھوک مار کر بجھا دیا تھا۔ صحیح وہ تھا یا غلط، وہ تبدیلیاں اچھی تھیں یا بری۔ خود سکندر حثان ابھی اس پر کوئی رائے دینے کے قابل نہیں ہوئے تھے مگر انہیں یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ اس میں کوئی بہت بڑی تبدیلی آئی تھی۔ انہیں یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار چوٹ کھائی تھی اور زندگی میں پہلی بار پڑنے والی چوٹ، بڑے بڑوں کو لادتی ہے وہ تو پھر آئیس بائیس سال کا لڑکا تھا۔

زندگی میں بعض دفعہ ہمیں پتا نہیں چلتا کہ ہم تاریکی سے باہر آئے ہیں یا تاریکی میں داخل ہوئے ہیں۔ اندھیرے میں سمت کا پتا نہیں چلتا مگر آسان اور زمین کا پتا ضرور چل جاتا ہے بلکہ ہر حال میں چلتا ہے۔ سر اٹھانے پر آسمان ہی ہوتا ہے۔ نظر آئے نہ آئے۔ سر جھانکنے پر زمین ہی ہوتی ہے، دکھائی دے نہ دے مگر زندگی میں سڑک کرنے کے لئے صرف چار سمتوں ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ دائیں، بائیں، آگے، پیچھے یا چھوٹی سمت ہر دوں کے نیچے ہوتی ہے۔ وہاں زمین نہ ہو تو پاتال آ جاتا ہے۔ پاتال میں بیچنے کے بعد کسی سمت کی ضرورت نہیں رہتی۔

چھٹی سمت سر سے اوپر ہوتی ہے۔ وہاں جایا ہی نہیں جاسکتا۔ وہاں اللہ ہوتا ہے۔ آنکھوں سے نظر نہ آنے والا محروم کی ہر عزت، خون کی ہر گردش، ہر آنے جانے والے سانس، حلق سے اترنے والے ہر نوالہ کے ساتھ محسوس ہونے والا وہ نغمہ گورنگ میو ری ۱۵۰۰ + آئی کیو لیول اسے اب عذاب لگ

رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھولا چاہتا تھا۔ وہ سب جو وہ کرتا رہا، وہ کچھ بھی بھلانے کے قابل نہیں تھا۔ کوئی اس سے اس کی تکلیف پوچھتا۔

☆.....☆.....☆

نیو یون واپس آنے کے بعد اس نے زندگی کے ایک سے سزا کو شروع کیا تھا۔ اس رات اس جنگل کے ہولناک اندھیرے اور تھکنی میں اس درخت کے ساتھ بندھے جلتے ہوئے گئے کئے تمام وعدے یاد تھے۔

وہ سب سے بالکل الگ تھک رہنے لگا تھا۔ "معمولی سے رابطہ اور تعلق کے بھی بغیر۔" "مجھے تم سے نہیں ملنا۔"

وہ صاف گو تو ہمیشہ سے ہی تھا مگر اس حد تک ہو جائے گا اس کے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ چند ہفتے اس کے بارے میں اس کا گروپ چھوٹ گیا اور پھر یہ چھوٹ گیا کہ اعتراضات اور تبصرے میں تبدیلی ہو گئی اور اس کے بعد خطی جملوں اور ٹیپوں کی شکل میں پھر سب اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہو گئے۔ سالار سکندر کی زندگی کا مرکز اور گورنمنٹ تھا وہ سزا کوئی اس کی زندگی کا۔ اس نے نیو یون میں جھپٹنے کے بعد جو چند کام کئے تھے اس میں جلال انصر سے ملاقات کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ پاکستان سے واپس آتے ہوئے اس کے گھر سے امریکہ میں اس کا ایڈریس لے آیا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس کا ایک کزن بھی اسی ہاسٹل میں کام کر رہا تھا جہاں جلال کام کر رہا تھا۔ باقی کام بہت آسان ثابت ہوا۔ ضرورت سے زیادہ آسان۔

وہ اس سے ایک بار مل کر اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اسے ان تمام جھوٹوں کے بارے میں بتا دینا چاہتا تھا جو وہ اس سے امامہ کے بارے میں اور امامہ سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے تعلق میں اپنے رول کے لئے شرمندہ تھا۔ وہ اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ وہ جلال انصر تک پہنچ چکا تھا اور وہ امامہ باہم تک پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ جلال انصر کے ساتھ ہاسٹل کے کینے ٹیری میں بیٹھا ہوا تھا۔ جلال انصر کے چہرے پر بے حد سنجیدگی تھی اور اس کے ماتھے پر پڑے ہوئے ٹی اس کی ناراضی کو ظاہر کر رہے تھے۔ سالار کچھ دیر پہلے ہی وہاں پہنچا تھا اور جلال انصر اسے اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا ہو گیا تھا۔ اس نے جلال سے چند منٹ بات کی تھی۔ وہ دیکھنے انکار کر دینے کے بعد ہاآخر کینے ٹیری میں آ گیا تھا۔

"سب سے پہلے تو میں یہ جانتا تھا ہوں گا کہ تم نے مجھے ڈھونڈا کیسے؟" اس نے آپ جناب کے تمام تھکات کو برطرف رکھتے ہوئے ٹیکل پر بیٹھے ہی سالار سے کہا۔

"یہ اہم نہیں ہے۔"

"یہ بہت اہم ہے۔ اگر تم واقعی یہ چاہتے ہو کہ میں کچھ دیر تمہارے ساتھ یہاں گزاروں تو مجھے بتا دو چاہئے کہ تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟"

"میں نے اپنے کزن سے مدد لی ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس شہر میں بہت عرصے سے کام کر رہا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا اس نے آپ کو کیسے ڈھونڈا ہے۔ میں نے صرف اس کو آپ کا نام اور کچھ دوسری معلومات دی تھیں۔" سالار نے کہا۔

"کیسے؟" جلال نے بڑے رسمی انداز میں کہا، وہ ٹیکل پر آتے ہوئے اپنی لٹکے ساتھ لے کر آیا تھا۔

"نہیں، میں نہیں کھاؤں گا۔" سالار نے ٹیکل کے ساتھ معذرت کر لی۔

جلال نے کندھے سے اچکائے اور کھانا شروع کر دیا۔

"کس معاملے میں بات کرنا چاہتے تھے تم مجھ سے؟"

"میں آپ کو چند حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔"

جلال نے اپنی ہانسی اچانک کیا۔ "حقائق؟"

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں امامہ کا دوست نہیں تھا۔ وہ میرے دوست کی بہن تھی۔ صرف میری ٹیکسٹ ڈور neighbour..... جلال نے کھانا چارٹر کر لیا۔

"میری اس سے معمولی جان بچان تھی۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ ایک بار اس نے مجھے فرسٹ ایڈ دے کر میری جان بچائی تھی۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتی تھی خود میں بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے آپ پر یوں ظاہر کیا جیسے وہ میری بہت گہری دوست تھی۔ میں آپ دونوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنا چاہتا تھا۔"

جلال سنجیدگی سے اس کی بات سننے ہوئے کھانا کھا رہا تھا۔

"اس کے بعد جب امامہ گھر سے اٹھ کر آپ کے پاس آنا چاہتی تھی تو میں نے اس سے جھوٹ بولا۔ آپ کی شادی کے بارے میں۔"

اس بار جلال کھانا کھاتے کھاتے رک گیا۔ "میں نے اس سے کہا کہ آپ شادی کر چکے ہیں۔ وہ آپ کے پاس اسی لئے نہیں آئی تھی۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں نے بہت نامناسب حرکت کی ہے مگر اس وقت تک وہ برہنہ تھی۔ امامہ سے میرا کوئی رابطہ نہیں تھا مگر یہ ایک اتفاق ہے کہ آپ سے میرا رابطہ ہو گیا۔ میں آپ سے ایک سکر ڈرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہاری معذرت قبول کرتا ہوں مگر میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری وجہ سے میرے اور امامہ کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی، میں پہلے ہی اس سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔" جلال نے بڑی

صاف گوئی سے کہا۔

”وہ آپ سے بہت محبت کرتی تھی۔“ سالار نے دھیمی آواز میں کہا۔

”ہاں میں جانتا ہوں مگر شادی وغیرہ میں صرف محبت تو نہیں دیکھی جاتی اور بھی بہت کچھ دیکھا جاتا ہے۔“ جمال بہت حقیقت پسندانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”جمال! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔“

”پہلی بات یہ کہ میرا اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ میرا اس کے ساتھ رابطہ ہوتا بھی تب بھی میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔“

”اس کو آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔“ سالار نے کہا۔

”میں نہیں سمجھتا کہ اسے میرے سہارے کی ضرورت ہے۔ اب تو بہت عرصہ گزر چکا ہے اب تک وہ کوئی نہ کوئی سہارا تلاش کر چکی ہوگی۔“ جمال نے اطمینان سے کہا۔

”ہو سکتا ہے اس نے ایسا نہ کیا ہو۔ وہ ابھی بھی آپ کا انتظار کر رہی ہو۔“

”میں اس طرح کے امکانات پر غور کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میرے لئے اپنے کیریئر کی اس سٹیج پر شادی کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ بھی اس سے۔“

”کیوں؟“

”اس کیوں کا جواب میں تمہیں کیوں دوں۔ تمہارا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس سے کیوں شادی نہیں کرتا چاہتا۔ میں تب ہی اسے تپا چکا ہوں اور اتنے عرصے کے بعد تم دوبارہ آکر پھر وہی چیز دو رہا اس کھولنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ جمال نے قدرے ناراضی سے کہا۔

”میں صرف اس نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو میری وجہ سے آپ دونوں کا ہوا۔“ سالار نے نرمی سے کہا۔

”میرا کوئی نقصان نہیں ہوا اور امامہ کا بھی نہیں ہوا ہوگا۔ تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہے ہو۔“

جمال نے سلا کے چند کلوے منہ میں ڈالنے ہوئے اطمینان سے کہا۔ سالار اسے دیکھتا رہا۔ وہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے اپنا بات کیسے سمجھتا ہے۔

”میں اس کو دھوڑنے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”مگر میں اسے دھوڑنا نہیں چاہتا۔ شادی مجھے اس سے نہیں کرنی تو پھر دھوڑنے کا فائدہ۔“

سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”آپ جانتے ہیں اس نے کس لئے گھر چھوڑا تھا؟“

”میرے لئے بہر حال نہیں چھوڑا تھا۔“ جمال نے بات کاٹی۔

”آپ کے لئے نہیں چھوڑا تھا۔ مگر جن وجوہات کی بنا پر چھوڑا تھا کیا ایک مسلمان کے طور پر آپ

کو اس کی مدد نہیں کرنی چاہئے جب کہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ لڑکی آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ آپ سے بہت لڑنا پڑا ہے۔“

”میں دیکھا ہوں کوئی واحد مسلمان جس ہوں اور نہ ہی مجھ پر یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ میں اس کی مدد ضرور کروں۔ میری ایک ہی زندگی ہے اور میں اس کسی دوسرے کی وجہ سے تو خراب نہیں کر سکتا اور پھر تم بھی مسلمان ہو، تم کیوں نہیں شادی کرتے اس سے؟ میں نے تو تب بھی تم سے کہا تھا کہ تم اس سے شادی کر لو۔ تم ایسے بھی اس کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہو۔“

جمال انصر نے قدرے پیچھے ہٹے ہوئے انداز میں کہا۔ سالار اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ اس سے شادی کر چکا ہے۔

”شادی۔۔۔؟ وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔“ اس نے کہا۔

”میں اس مسئلے میں اسے سمجھا سکتا ہوں۔ تم میرا اس سے رابطہ کرو اور وہ تو میں اسے تم سے شادی پر تیار کر لوں گا۔“ اچھے آدمی ہو تم۔۔۔ اور خاندان وغیرہ بھی ٹھیک ہی ہو گا تمہارا کار تو زیادہ سال پہلے

بھی یونی شاد اور بھی ہوئی تھی تم نے۔ اس کا مطلب ہے روپیہ وغیرہ ہو گا تمہارے پاس۔ ویسے یہاں کس لئے ہو؟“

”ایم کی اے کر رہا ہوں۔“

”پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ جاب تمہیں مل جائے گی۔ روپیہ ویسے بھی تمہارے پاس ہے۔ لڑکیوں کو اور کیا چاہئے۔ امامہ تو ویسے بھی تمہیں جانتی ہے۔“ جمال نے دھکی جھاتے مسئلہ حل کیا تھا۔

”سارا مسئلہ تو اسی “جانتے” نے ہی پیدا کیا ہے۔ وہ مجھے ضرورت سے زیادہ جانتی ہے۔“ سالار نے جمال کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

”وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔“ سالار نے جیسے اسے یاد دلایا۔

”اب اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ لڑکیاں زیادہ زیادہ جذباتی ہوتی ہیں اس معاملے میں۔“

جمال نے قدرے ہزارہی سے کہا۔

”یہ وہ سائڈ ڈو لو ایئر تو نہیں ہوگا۔ آپ کسی نہ کسی حد تک اس میں انولو تو ضرور ہوں گے۔“

سالار نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں تو زیادہ بہت انولو تھا، مگر وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ توجہات بھی بدلتی رہتی ہیں انسان کی۔“

”اگر آپ کو وقت اور حالات کے ساتھ اپنی ترجیحات بدلتی تھیں تو آپ کو اس کے بارے میں امامہ کو انولو ہوتے ہوئے بتا دینا چاہئے تھا۔ کم از کم اس سے یہ ہوتا کہ وہ آپ سے مدد کی توقع رکھتی نہ

ہی آپ پر اس قدر انحصار کرتی۔ میں امید کرتا ہوں آپ یہ تو نہیں کہیں گے کہ آپ نے اس سے شادی کے حوالے سے کبھی کوئی بات یا وعدہ کیا ہی نہیں تھا۔

جلال کچھ کہنے کے بجائے خشک آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

”تم مجھے کیا جانتا ہے اور بتانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اس نے چند لمحوں کے بعد اکڑے ہوئے انداز میں اس سے کیا۔

”اس نے جب مجھ سے پہلی بار ایلے کیا تھا تو آپ کا فون خبردار ایڈر لیں دے کر اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے پوچھوں آپ نے اپنے عزیز سے شادی کی بات کر لی ہے۔ میں نے اسے اپنا فون دیا تھا کہ وہ آپ سے یہ بات خود پوچھے۔ یقیناً اسلام آباد آنے سے پہلے آپ نے اس سے یہ کہا ہو گا کہ آپ اس سے شادی کے لئے اپنے فریڈ سے بات کریں گے۔ آپ نے یقیناً پہلے محبت وغیرہ کے اظہار کے بعد اسے پر وچ دیا ہو گا۔“

جلال نے کچھ برہمی سے اس کی بات کاٹی۔ ”میں نے اسے پر وچ نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھ سے پر وچ کیا تھا۔“

”مان لیتا ہوں اس نے پر وچ نہ کیا۔ آپ نے کیا کیا؟ انکار کر دیا؟“ وہ چٹخ کر نے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”انکار نہیں کیا ہو گا۔“ سالار عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

”اس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نعمت بہت اچھی دیتے ہیں اور آپ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی بہت محبت ہے۔ آپ کو کبھی بتایا ہو گا اس نے کہ وہ آپ سے محبت کیوں کرتی تھی مگر آپ سے مل کر اور آپ کو جان کر مجھے بہت ناچیز ہوئی۔ آپ نعمت بہت اچھی دیتے ہیں مگر جہاں تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا تعلق ہے میں نہیں سمجھتا وہ آپ کو ہے۔ میں خود کوئی بہت اچھا آدمی نہیں ہوں اور محبت کے بارے میں زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر اللہ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے بارے میں مگر اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ جو شخص اللہ یا اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرے وہ کسی کو تباہ یا گنو گویہ امپریشن دیتا پھر تا ہے وہ مدد کے لئے پہلے ہوئے ہاتھ کو نہیں جھٹک سکتا نہ ہی وہ کسی کو مدد کا اور فریب دے گا۔“ سالار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اور میں تو آپ سے ریکوریٹ کر رہا ہوں اس کی مدد کے لئے۔ وہ سکتا ہے اس نے بھی ڈیڑھ سال پہلے کی ہو پھر بھی اگر آپ انکار پر مصر ہیں تو۔۔۔ میں یا کوئی آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتا مگر آپ سے مل کر اور آپ سے بات کر کے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔“

اس نے الوداعی مصافحہ کے لئے جلال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جلال نے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا، وہ

خفخفہ بھرے انداز میں ماتھے پر ہل لے اسے دیکھتا رہا۔

”خدا حافظ۔“ سالار نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ جلال اسی انداز میں اسے جانتا دیکھتا رہا اور پھر اس نے خود دکلائی کی۔ ”It's really an idiot's world out there.“

وہ وہ بارہ بج کرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا موڈ اب حد آف ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

جلال العصر سے ملاقات کے بعد وہ اپنے احساسات کو کوئی نام دینے میں ناکام ہو رہا تھا۔ کیا اسے اپنے بچپن سے آزاد ہو جانا چاہئے؟ کیونکہ جلال نے یہ کہا تھا کہ سالار علی میں نہ آتا تو بھی وہ امام سے شادی نہیں کرتا اور جلال العصر سے بات کرنے کے بعد اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ امام کے لئے اس کے احساسات میں کوئی گہرائی نہیں تھی مگر یہ شاید اس کے لئے بہت سے نئے سوال پیدا کر رہا تھا۔ وہ جلال سے آج ملا تھا، ڈیڑھ سال پہلے اس نے جلال کے ساتھ اس طرح بات کی ہوتی تو شاید اس پر ہونے والا اثر مختلف ہوتا۔ جب امام کے لئے اس کے احساسات کا پیمانہ مختلف ہو تا اور شاید ڈیڑھ سال پہلے وہ امام کے بارے میں اس بے حسی کا مظاہرہ نہ کرتا جس کا مظاہرہ وہ اس نے آج کیا تھا وہ ایک ذہنی رد میں اپنے کندھوں سے بوجھ ہٹا ہوا محسوس کرتا اور اگلی ذہنی رد اسے پھر الجھن کا شکار کر دیتی۔

☆.....☆.....☆

ایم بی اے کا دوسرا سال بہت پرسکون گزرا تھا۔ پڑھائی کے علاوہ اس کی زندگی میں اور کوئی سرگرمی نہیں رہی تھی۔ وہ گیمز پر صرف پزیراؤ میں ہی اپنے نکاح فیروز کے ساتھ گفتگو کرنا یا پھر گزرب پر وچٹلس کے سلسلے میں ان کے ساتھ وقت گزارتا۔ باقی کا سارا وقت وہ لاہور میں گزرا دیتا۔ ویک اینڈ پر اس کی واحد سرگرمی اسلامک سینٹر جانا تھا جہاں وہ ایک عرب سے قرآن پاک تلاوت کرتا سیکھا کرتا تھا پھر وہ قرآن پاک کے ان اسباق کو دہر لیا کرتا پھر اسی عرب سے اس نے عربی زبان سیکھنا شروع کر دی۔

خالد عبدالرحمن نامی وہ عرب بنیادی طور پر ایک میڈیکل ٹیکنیشن تھا اور ایک ہاسٹل سے وابستہ تھا۔ وہ ویک اینڈ پر وہیں آکر عربی زبان اور قرآن پاک کی کلاسز لیا کرتا تھا۔ وہ اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیا کرتا تھا بلکہ اسلامک سینٹر کی لاہور میں موجود کتابوں کی ایک بڑی تعداد بھی اسی کے دوستوں اور رشتہ داروں کی طرف سے ہی عطیہ کی گئی تھی۔

قرآن پاک کی ان ہی کلاسز کے دوران ایک دن اس نے سالار سے کہا۔

”تم قرآن پاک حفظ کیوں نہیں کرتے؟“ سالار اس کے اس تجویز نامہ سوال پر کچھ دیر حیرانی سے

اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"میں..... میں کیسے کر سکتا ہوں؟"

"کیوں..... تم کیوں نہیں کر سکتے؟" خالد نے جواب اس سے پوچھا۔

"یہ بہت مشکل ہے اور پھر میرے جیسا آدمی، جنہیں میں نہیں کر سکتا۔" سالار نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

"تمہارا ذہن بہت اچھا ہے بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ میں نے اپنی آنکھ تک کی زندگی میں تم سے زیادہ ذہین آدمی نہیں دیکھا جتنی نیزہ زرداری سے تم نے اتنے مختصر عرصہ میں اتنی چھوٹی بڑی سورتیں یاد کی ہیں کوئی اور نہیں کر سکا اور جتنی نیزہ زرداری سے تم نے قہریلے طور پر وہیں اس پر بھی حیران ہوں جب ذہن اس قدر زبردست ہو اور دنیا کی ہر چیز سیکھ لینے اور یاد رکھنے کی خواہش ہو تو قرآن پاک کیوں نہیں۔ تمہارے ذہن پر اللہ کا بھی حق ہے۔" خالد نے کہا۔

"آپ میری بات نہیں سمجھتے۔ مجھے سمجھنے پر کوئی اعتراض نہیں مگر یہ بہت مشکل ہے۔ میں اس عمر میں یہ نہیں سیکھ سکتا۔" سالار نے وضاحت کی۔

"جب کہ میرا خیال ہے کہ جنہیں قرآن پاک حفظ کرنے میں بہت آسانی ہوگی۔ تم ایک بار اسے حفظ کرنا شروع کرو، میں کسی اور کے بارے میں تو یہ دعویٰ نہ کرنا مگر تمہارے بارے میں میں دعویٰ سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم نہ صرف بہت آسانی سے اسے حفظ کر لو گے بلکہ بہت کم عرصے میں۔"

سالار نے اس دن اس موضوع کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں کی۔ مگر اس رات اپنے پارٹنر پر واپس آنے کے بعد وہ خالد عبدالرحمان کی باتوں کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ اس کا خیال تھا خالد عبدالرحمان وہ بارہواں اس کے بارے میں اس سے بات نہیں کرے گا۔ مگر اگلے دن خالد عبدالرحمان نے ایک بار پھر اس سے یہی سوال کیا۔

سالار بہت دیر پہلے چاہے وہ دیکھ کر یا پھر اس نے صدمہ آواز میں خالد سے کہا۔

"مجھے خوف آتا ہے۔"

"کس چیز سے؟"

"قرآن پاک حفظ کرنے سے؟" خالد نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

سالار نے انہماک میں سر ہلادیا۔

"کیوں.....؟ وہ بہت دیر خاموش رہا پھر کارپٹ پر اپنی انگلی سے گھیریں کھینچنے اور انہیں دیکھتے ہوئے اس نے خالد سے کہا۔

"میں بہت گناہ کر چکا ہوں، اتنے گناہ کہ مجھے انہیں گناہ میں مشکل ہو جائے گا۔ صغیر، بکیر، ہر گناہ جو انسان سوچ سکتا ہے یا کر سکتا ہے۔ میں اس کتاب کو اپنے سینے یاد بن میں محفوظ کرنے کا سوچ بھی نہیں

سکتا۔ میرا سینہ اور ذہن پاک تو نہیں ہے۔ میرے جیسے لوگ اسے..... اسے حفظ کرنے کے لائق نہیں ہوتے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس کی آواز ہزار گونگی۔

خالد کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "ابھی بھی گناہ کرتے ہو؟" سالار نے نفی میں سر ہلادیا۔ "تو پھر کس چیز کا خوف ہے تم اگر قرآن پاک کی تلاوت کر سکتے ہو، اپنے ان سارے گناہوں کے باوجود تو پھر اسے حفظ بھی کر سکتے ہو اور پھر تم نے گناہ کئے مگر تم اب گناہ نہیں کرتے۔ یہ کافی ہے۔ اگر اللہ یہ نہیں چاہے گا کہ تم اسے حفظ کرو تو تم اسے حفظ نہیں کر سکو گے چاہے تم لاکھ کوشش کر لو اور اگر تم خوش قسمت ہو گے تو تم اسے حفظ کر لو گے۔" خالد نے ہنسی بجاتے ہوئے جیسے یہ مسئلہ حل کر دیا تھا۔

سالار اس رات جاگنا رہا، آدمی رات کے بعد اس نے پیلا پارہ کھول کر کا پیتے کا تھون اور زبان کے ساتھ حفظ کرنا شروع کیا۔ اسے حفظ کرتے ہوئے اسے احساس ہونے لگا کہ خالد عبدالرحمان ٹھیک کہتا تھا۔ اسے قرآن پاک کا بہت سا حصہ پہلے ہی یاد تھا۔ خوف کی وہ کیفیت جو اس نے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کرتے ہوئے محسوس کی تھی وہ زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔ اس کے دل کو نہیں اسے استقامت مل رہی تھی۔ کہاں سے؟ کوئی اس کی زبان کی لٹکڑا بہت دور کر رہا تھا، کوئی.....؟ کوئی اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ختم کر رہا تھا کیوں؟

جبر کی نماز سے کچھ دیر پہلے وہ اس وقت سبے تھا شام رہا جب اس نے پچھلے پانچ گھنٹے میں یاد کئے ہوئے سبق کو پہلی بار مکمل طور پر دہرایا۔ وہ نہیں نہیں اٹکا تھا۔ وہ کچھ نہیں بھولا تھا۔ زیر زبانی کوئی غلطی نہیں، آخری چند جملوں پر اس کی زبان پہلی بار کپکپاہٹ لگی تھی۔ آخری چند جملے ادا کرتے ہوئے اسے وقت ہوئی تھی کیونکہ وہ اس وقت آٹھ گھنٹوں سے دور تھا۔

"اگر اللہ یہ چاہے گا اور تم خوش قسمت ہو گے تو تم قرآن پاک حفظ کر لو گے ورنہ کچھ بھی کر لو، نہیں کر پاؤ گے۔" اسے خالد عبدالرحمان کی بات یاد آ رہی تھی۔

جبر کی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے کیسٹ پر اپنی زندگی کے اس پہلے سبق کو دیکھا تھا۔ ایک بار پھر اسے کسی وقت کا سنا نہیں کر پڑا تھا۔ اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ روائی اور جیسے میں پہلے سے زیادہ فصاحت تھی۔

اس کی زندگی میں ایک ہی چیز شامل ہو گئی تھی۔ اس پر ایک اور احسان کر دیا گیا تھا مگر اس کا ذہن بشن ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ رات کو سلیپنگ کلو کے بغیر نیند کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور سلیپنگ کلو پائے کے باوجود وہ کبھی اپنے کمرے کی لائٹس آف نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تاریکی سے خوف کھاتا تھا۔

یہ پھر خالد عبدالرحمان ہی تھا جس نے ایک دن اس سے کہا تھا۔ وہ اسے قرآن پاک کا سبق زبانی ظاہر ہوا تھا اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ خالد عبدالرحمان مسلسل اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے تھا

جب اس نے اپنا سبق ختم کیا اور پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگایا تو اس نے خالد کو کہتے سنا۔

”میں نے کل رات تمہیں خواب میں جرج کر تے دیکھا ہے۔“

سالار منہ میں لے جانے والا پانی حلق سے اُتار نہیں سکا۔ گلاس پیچھے رکھتے ہوئے خالد کو دیکھنے لگا۔

”اس سال تمہارا ایم بی اے ہو جائے گا۔ اگلے سال تیرا ترح کر لو۔“

خالد کا بہت عجیب رویہ تھا۔ سالار نے منہ میں موجود پانی غیر محسوس انداز میں حلق سے نیچے اُتار لیا۔

وہ اس دن اس سے کوئی سوال جواب نہیں کر سکا تھا۔ اس کے پاس کوئی سوال تھا ہی نہیں۔

ایم بی اے کے فائنل سسٹر سے دو ہفتے پہلے اس نے قرآن پاک کی پہلی پار حفظ کر لیا تھا۔ فائنل سسٹر

کے چار ہفتے کے بعد سالار سے تیس سال کی عمر میں اسے اپنی زندگی کا پہلا چرچ کیا تھا۔ وہاں جاتے ہوئے

وہاں سے آتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی تنکیر، کوئی نظر، کوئی رشتہ کچھ بھی

نہیں۔ اس کے ساتھ پاکستانی کپ میں ساتھ جاتے والے شاید وہ لوگ ہوں گے جو خوش قسمت ہوں

گے۔ انہیں ان کی نیکیوں کے عوض وہاں ملا دیا گیا تھا۔ وہ اپنے نامہ اعمال سے واقف تھا۔ اسے صرف

صفائی اور وضاحتوں کے لئے بلایا گیا تھا۔ وہ قرآن پاک حفظ کر رہا ہو تا تو ج کرنے کا سوچا بھی نہیں۔

جو شخص حرم شریف سے دور اللہ کا سامنا کرتے کی ہمت نہ رکھتا ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کپ کے

سامنے پہنچ کر اللہ کا سامنا کر لے گا وہ ہر جگہ ہو جاتا ہو مگر خانہ کعبہ جانے کی جرأت نہیں کر

سکتا تھا۔

مگر خالد عبدالرحمان کے ایک بار کہنے پر اس نے جیسے گھٹنے ٹیتے ہوئے جرج پر جانے کے لئے ہنسنے

مجبور کر دیا ہے تھے۔

لوگوں کو جرج پر جانے کا موقع جب ملتا تھا جب ان کے پاس گناہ نہیں ہوتے۔ نیکیوں کا ہی انبار ہوتا

ہے۔ سالار سکندر کو یہ موقع جب ملا تھا جب اس کے پاس گناہوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے، اگر میں گناہ کرنے سے خوف نہیں کھاتا رہا تو پھر مجھے اللہ کے سامنے جانے

اور معذرت کرنے سے بھی خوف نہیں کھانا چاہئے۔ صرف یہی ہے تاکہ میں وہاں سر نہیں اٹھا سکوں گا۔

نظر میں اوپر نہیں کر سکوں گا۔ منہ سے معافی کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں نکال سکوں گا تو ٹھیک ہے مجھے یہ

سزا بھی ملنی چاہئے۔ میں تو اس سے زیادہ شرمندہ کی اور بے عزتی کا مستحق ہوں۔ ہر بار جرج پر کوئی نہ کوئی

شخص ایسا آتا ہو گا، جس کے پاس گناہوں کے علاوہ اور کچھ ہو گا ہی نہیں۔ اس بار وہ شخص میں سکا، سالار

سکندر ہی سکی۔“ اس نے سوچا تھا۔

☆.....☆.....☆

گناہ کا بوجھ کیا ہوتا ہے اور آدمی اپنے گناہ کے بوجھ کو کس طرح قیامت کے دن اپنی پشت سے اُتار

پھینکنا چاہے گا کس طرح اس سے دور بھاگنا چاہے گا کس طرح اسے دوسرے کے کندھے پر ڈال دینا

چاہے گا۔ یہ اس کی سمجھ میں حرم شریف میں پہنچ کر ہی آیا تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر وہ اپنے پاس موجود اور

آنے والی ساری زندگی کی دولت کے عوض کسی بھی کو وہ گناہ بیچنا چاہتا تو کوئی یہ تجارت نہ کرتا۔ کاش

آدمی کسی مال کے عوض اپنے گناہ کی جگہ سیکھ سکتا۔ کسی اجرت کے طور پر دوسروں کی نیکیاں مانگنے کا حق رکھتا۔

لاکھوں لوگوں کے اس جہوم میں دو سفید چادریں اوڑھے کون جاتا تھا سالار سکندر کون تھا؟ اس

کا آئی کی لیول کیا تھا، کسے پر واقعی۔ اس کے پاس کون سی اور کہاں کی ڈگری تھی، کسے ہوش تھا۔ اس نے

زندگی کے میدان میں کتنے تعلیمی ریکارڈ توڑے اور بنائے تھے، کسے خبر تھی وہ اپنے ذہن سے کون سے

میدان نصیر کرنے والا تھا، کون رشتہ کرنے والا تھا۔

وہ وہاں اس جہوم میں شوکر کھا کر گرتا۔ بھگدڑ میں روند جاتا۔ اس کے اوپر سے گزرنے والی

خلقت میں سے کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ انہوں نے کیسے دماغ کو سکھوایا تھا۔ کس آئی کی لیول کے تالیف

آدمی کو کس طرح ختم کر دیا تھا۔

اسے دنیا میں اپنی اوقات، اپنی اہمیت کا پتا چل گیا تھا۔ اگر کچھ مفادہ دہی گیا تھا تو اب ختم ہو گیا

تھا۔ اگر کچھ شہ باقی تھا تو اب دور ہو گیا تھا۔

فخر، تنکیر، رشتہ، انا، خود پسندی، خود ستائشی کے ہر پتے ہوئے ٹکڑے کو چھوڑ کر اس کے اندر سے

پھینک دیا گیا تھا۔ وہ ان ہی آلائشوں کو دور کر دے کر دانے کے لئے وہاں آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایم بی اے میں اس کی شاندار کامیابی کسی کے لئے بھی حیران کن نہیں تھی۔ اس کے ڈیپارٹمنٹ

میں ہر ایک کو پہلے سے ہی اس کا اندازہ تھا۔ اس کے اور اس کے کلاس فیلوز کے پروفیسر اور اس کے محنت

میں اتنا فرق ہوتا تھا کہ اس کے پروفیسر کو یہ ماننے میں کوئی عار نہیں تھا۔ وہ مقابلے کی اس دوڑ میں دس

گزر آگے دوڑ رہا تھا اور ایم بی اے کے دوسرے سال میں اس نے اس فاصلے کو اور بڑھا دیا تھا۔

اس نے اتنا زور شپ اقوام متحدہ کی ایک ایجنسی میں کی تھی اور اس کا ایم بی اے مکمل ہونے سے پہلے

ہی اس ایجنسی کے علاوہ اس کے پاس سات مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرف سے آفرز موجود تھیں۔

”تم اب آگے کیا کرنا چاہتے ہو؟“ اس کے رزلٹ کے متعلق جاننے کے بعد سکندر عثمان نے اپنے

پاس جا کر پوچھا تھا۔

”میں واپس امریکہ جا رہا ہوں۔ میں یونیورسٹی شپ کے ساتھ ہی کام کرنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا بزنس شروع کر دیا میرے بزنس میں شامل ہو جاؤ۔“ سکندر عثمان

نے اس سے کہا۔

"پلیا میں بزنس نہیں کر سکتا۔ بزنس والا اینفرا سٹرکچر نہیں ہے میرا۔ میں جاب کرنا چاہتا ہوں اور میں پاکستان میں رہنا بھی نہیں چاہتا۔" سکندر رحمان حیران ہوئے۔ "تم نے پہلے بھی ذکر نہیں کیا کہ تم پاکستان میں رہنا نہیں چاہتے۔ تم مستقل طور پر امریکہ میں سیٹل ہونا چاہتے ہو؟"

"پہلے میں نے امریکہ میں سیٹل ہونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن اب میں وہاں رہنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

وہ ان سے یہ کہنا نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان میں اس کا ڈپریشن بڑھ جاتا ہے۔ وہ مسلسل امامہ کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ وہاں پر جج اسے امامہ کی یاد دلاتی تھی۔ اس کے کچھ بھائیوں اور احساس جرم میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

"میں یہاں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا۔" سکندر عثمان کچھ دیر اسے دیکھتے رہے۔

"حالانکہ میرا خیال ہے تم ایڈجسٹ ہو سکتے ہو۔"

سالار چاہتا تھا ان کا اشارہ کسی طرف تھا مگر وہ خاموش رہا۔

"جاب کرنا چاہتے ہو؟ ٹھیک ہے، چند سال جاب کر لو لیکن اس کے بعد آکر میرے بزنس کو دیکھو۔ یہ سب کچھ تم کو لوگوں کے لئے ایسپلن کر رہا ہوں، دوسروں کے لئے نہیں۔"

وہ کچھ دیر اسے سمجھاتے رہے، سالار خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتے کے بعد وہ دوبارہ امریکہ آیا تھا اور اس کے چند ہفتے کے بعد اس نے یو سی بیٹ میں جاب شروع کر دی۔ وہ نئے ہونے سے نیو یارک چلا گیا تھا۔ یہ ایک نئی زندگی کا آغاز تھا اور وہاں آنے کے چند ہفتے بعد اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ کبیں فرار حاصل نہیں کر سکتا تھا وہ اسے وہاں بھی اسی طرح یاد آ رہی تھی، اس کا احساس جرم وہاں بھی اس کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

وہ سولہ سے اٹھارہ گھنٹے تک کام کرتا لگا۔ وہ ایک دن بھی تین دن چھینے سے زیادہ کبھی نہیں سوچا اور دن رات کی اس میں مصروفیت نے اسے بڑی حد تک باطل کر دیا تھا اور ایک طرف کام کے اس انبار نے اس کے ڈپریشن میں کمی کی تھی تو دوسری طرف وہ اپنے اوپر اسے کم نمایاں ترین دور کر رہا تھا۔ وہ نئے لگا تھا۔ یو سی بیٹ کے مختلف پریوینٹس کے سلسلے میں وہ ایڈیا، آفریقہ اور اٹلی امریکہ کے ممالک جانے لگا۔ غربت اور بیماری کو وہ پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے، اسے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ پورٹس اور اخباروں میں چھپنے والے حقائق میں اور ان حقائق کو اپنی تمام ہولناکی کے ساتھ کھلی آنکھ سے دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے اور یہ فرق اسے اس جاب میں ہی سمجھ میں آیا تھا۔ ہر روز بھوکے سونے والے لوگوں کی تعداد کروڑوں

میں تھی۔ ہر رات ہیپٹ بھر کر ضرورت سے زیادہ کھا لینے والوں کی تعداد بھی کروڑوں میں تھی۔ صرف تین وقت کا کھانا، سر پر پھٹتے اور جسم پر لباس بھی کتنی بڑی لٹینیں تھیں، اسے تب کبھ میں آیا تھا۔ وہ یو سی بیٹ کی ٹیم کے ساتھ چار غریب طبقوں میں سفر کرتے ہوئے اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا۔ اس نے زندگی میں ایسے کون سے کارنامے انجام دیئے تھے کہ اسے وہ بے احساس زندگی دی گئی تھی جو وہ گزار رہا تھا اور ان لوگوں سے کیا گناہ ہوئے تھے کہ وہ زندگی کی تمام بنیادی ضروریات سے محروم صرف زندہ رہنے کی خواہش میں خوراک کے ان ٹیکس کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے۔

وہ ساری ساری رات جاگ کر اپنے اوپر اس کے لئے ممکن اسٹیمیں اور پلان بنا رہا تھا۔ کہاں خوراک کی ڈسٹری بیوٹن کیسے ہو سکتی ہے، کہاں ہیڈریٹ لائی جاسکتی ہے، کہاں مزید امداد کی ضرورت ہے، کن علاقوں میں کس طرح کے پریوینٹس رکھا جائے، وہ بعض دفعہ اڑتا نہیں گھٹے بغیر سوئے کام کر جاتا تھا۔

اس کے بنائے ہوئے پروجیکٹ اور پورے ٹیم کی لحاظ سے اسے مربوط ہوتے تھے کہ ان میں کوئی غلطی یا غور نہ ہو تاکہ اس کے لئے ممکن نہیں رہتا تھا اور اس کی یہ خصوصیات، اس کی سادگی اور نام کو اور بھی معلوم کرتی جا رہی تھیں اگر مجھے اللہ نے دوسروں سے بہتر ذہن اور صلاحیتیں دی ہیں تو مجھے ان صلاحیتوں کو دوسروں کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ اس طرح استعمال کرنا چاہئے کہ میں دوسروں کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ آسانی لاسکوں، دوسروں کی زندگی کو بہتر کر سکوں۔ وہ کام کرتے ہوئے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچتا تھا۔

یو سی بیٹ کے لئے کام کرنے کے دوران ہی اس نے ایم فل کرنے کا سوچا تھا اور پھر اس نے ایم فل میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اب تک کامس کو جان کر تے ہوئے اسے قطعاً کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک باپر ضرورت سے زیادہ مصروف کر رہا تھا مگر اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ کام کا ان دنوں پکا تھا یا شاید اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر ایک مشن۔

☆.....☆.....☆

فرقان سے سالار کی پہلی ملاقات امریکہ سے پاکستان آتے ہوئے فلائٹ کے دوران ہوئی۔ وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ امریکہ میں ڈاکٹری کی کسی کانفرنس میں شرکت کر کے وہاں آ رہا تھا جبکہ سالار سکندر راہی، مبینہ انتہائی شادی میں شرکت کے لئے پاکستان آ رہا تھا۔ اس لمبی فلائٹ کے دوران دونوں کے درمیان ابتدائی تعارف کے بعد گفتگو کا سلسلہ تھا۔

فرقان، عمر میں سالار سے کافی بڑا تھا وہ پچیس سال کا تھا۔ ان کا تعلق انڈین نیشنل پارٹی سے تھا۔ وہ پاکستان آیا تھا اور وہاں ایک بائیس میں کام کر رہا تھا۔ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ چند گھنٹے آپس میں گفتگو کرتے رہنے کے بعد فرقان اور وہ سنے کی تیاری کرنے لگے۔ سالار نے

معمول کے مطابق اپنے بریف کیس سے سلپنگ جاکے ایک گولی پانی کے ساتھ نگلی۔ فرقان نے اس کی اس تمام کاروائی کو خاموشی سے دیکھا۔ جب اس نے بریف کیس بند کر کے دوپارہ کو دیا تو فرقان نے کہا۔

”آخر لوگ غلات کے دوران سلپنگ جاکے بغیر نہیں سو سکتے۔“

سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور کہا۔

”میں سلپنگ جاکے بغیر نہیں سو سکتا۔ غلات میں ہوں یا نہ ہوں، اس سے فرق نہیں پڑتا۔“

”سو نے میں مشکل پیش آتی ہے؟“ فرقان کو ایک دم کچھ تجسس ہوا۔

”مشکل؟“ سالار مسکرایا۔ ”میں سر سے سوئی نہیں سکتا۔ میں سلپنگ جاکے لیتا ہوں اور تین چار گھنٹے سو لیتا ہوں۔“

”اسو میٹا؟“ فرقان نے پوچھا۔

”شاید، میں نے ڈاکٹر سے چیک اپ نہیں کروایا مگر شاید یہ وہی ہے۔“ سالار نے قدرے لاپرواہی سے کہا۔

”تمہیں چیک اپ کروانا چاہیے تھا، اس عمر میں اسو میٹا۔۔۔۔۔ کوئی بہت صحت مند علامت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تم کام کے پیچھے جنونی ہو چکے ہو اور اسی وجہ سے تم نے اپنی سونے کی نازل روٹین کو خراب کر لیا ہے۔“

فرقان اب کسی ڈاکٹر کی طرح بول رہا تھا۔ سالار مسکراتے ہوئے ستارہ ہوا سے نہیں تاسکتا تھا کہ

وہ اگر رات دن مسلسل کام نہ کرے تو وہ اس احساسِ جرم کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا تھا جسے وہ محسوس کر رہا ہے۔ وہ اسے یہ بھی نہیں تاسکتا تھا کہ وہ سلپنگ جاکے بغیر سونے کی کوشش کرے تو وہ امامہ کے

پارے میں سو پتے لگتا ہے۔ اس حد تک کہ اسے اپنا سر دور سے پھٹکا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔

”تھکے گھٹے کام کرتے ہو ایک دن میں؟“ فرقان اب پوچھ رہا تھا۔

”اٹھارہ گھنٹے، بعض دفعہ تین۔“

”مائی گڈ نیس! اور کب ہے؟“

”دو تین سال۔“

”اور تب ہی سے نیند کا مسئلہ ہو گا تمہیں، میں نے تمہیک اندازہ لگا دیا۔ تم نے خود اپنی رہ نمائی خراب کر لی ہے۔“ فرقان نے اس سے کہا۔ ”ورنہ اسنے گھٹے کام کرنے والے آدمی کو تو ذہنی شکنجہ ہی ایک لمبی

اور پر سکون نیند سلا رہی ہے۔“

”یہ میرے ساتھ نہیں ہوتا۔“ سالار نے دم بجھ لیے۔

”جی تو تمہیں جاننے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اگر یہ تمہارے ساتھ نہیں ہوتا تو کیوں نہیں ہوتا۔“ سالار اس سے یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ دجہ جاتا ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد فرقان نے اس سے کہا۔

”میں اگر تمہیں کچھ آہستہ بتاؤں رات کو سونے سے پہلے، تو تم پڑھ کر سو گے؟“

”کیوں نہیں پڑھ سکوں گا۔“ سالار نے گردن موڑ کر اس سے کہا۔

”نہیں، اصل میں تمہارے اور میرے جیسے لوگ جو زیادہ پڑھ لیتے ہیں اور خاص طور پر تعظیم مغرب میں حاصل کرتے ہیں وہ ایسی چیزوں پر یقین نہیں رکھتے یا انہیں پرکھ چکے ہیں۔“ فرقان نے وضاحت کی۔

”فرقان! میں حافظ قرآن ہوں۔“ سالار نے اسی طرح لینے ہوئے پر سکون آواز میں کہا۔

فرقان کو جیسے کرسمس لگا۔

”میں روز رات کو سونے سے پہلے ایک سپارہ پڑھ کر سوتا ہوں، میرے ساتھ یقیناً یا امتداد کو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ سالار نے بات جاری رکھی۔

”میں بھی حافظ قرآن ہوں۔“

فرقان نے بتایا۔ سالار نے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ یہ یقیناً ایک خوشگوار اتفاق تھا۔ اگرچہ فرقان نے ڈاکٹر کی بھی نگر سالار کو پھر بھی یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ وہ حافظ

قرآن ہے۔

”پھر تو تمہیں اس طرح کا کوئی مسئلہ ہونا ہی نہیں چاہئے۔ قرآن پاک کی تلاوت کر کے سونے والے انسان کو نیند نہ آئے، یہ مجھے کچھ عجیب لگتا ہے۔“

سالار نے فرقان کو بڑبڑاتے سنا۔ وہ اب اپنے حواس کو ہلکا ہلکا مفلوج پارہا تھا۔ نیند اس پر غلبہ پاری

تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”تمہیں کوئی پریشانی ہے؟“ اس نے فرقان کی آواز سنی۔ وہ نیند کی گولیوں کے زیر اثر نہ ہوتا تو

انکرا کر انکار کر دیتا مگر وہ جس حالت میں تھا اس میں وہ انکار نہیں کر سکا۔

”ہاں، مجھے بہت زیادہ پریشانی ہیں۔ مجھے سکون نہیں ہے، مجھے لگتا ہے میں مسلسل کسی صحرا میں

سفر کر رہا ہوں، پہچانتے ہو، احساسِ جرم مجھے چھوڑنے ہی نہیں دیتا۔ مجھے۔۔۔ مجھے کسی حد تک کافی کی تلاش ہے، جو مجھے اس تکلیف سے نکال دے، اور مجھے میری زندگی کا راستہ دکھائے۔“

فرقان دم بخود اس کاچرہ دیکھ رہا تھا۔ سالار کی آنکھیں بند تھیں، مگر وہ اس کی آنکھوں کے کونوں

نے لگتی نمی کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آواز میں بھی بے رہی اور لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ اس وقت لاشعوری طور

پہلے چنگ پلا کے زیر اثر قبول رہا تھا۔

وہ اب خاموش ہو چکا تھا۔ فرقان نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ بہت ہموار انداز میں چلنے والی اس کی سانس بٹار ہی تھی کہ وہ نیند میں جا چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

جہاز میں ہونے والی وہ ملاقات وہیں ختم نہیں ہوئی۔ وہ دونوں جاگنے کے بعد بھی گفتگو کرتے رہے۔ فرقان نے سالار سے ان چند جملوں کے بارے میں نہیں پوچھا تھا، جو اس نے نیند کی آغوش میں سماتے ہوئے بولے تھے۔ خود سالار کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس نے سونے سے پہلے اس سے کچھ کہا تھا کہ کہا تھا تو کیا کہا تھا۔

سفر ختم ہونے سے پہلے ان دونوں نے آپس میں کٹکٹ نبر زور ایلے میں کا تبادلہ کیا پھر سالار نے اسے انتہائی شادی پر انوائٹ کیا۔ فرقان نے آنے کا وعدہ کیا مگر سالار کو اس کا یقین نہیں تھا۔ ان دونوں کی خلافت کر لپٹی تک حتیٰ پھر سالار کو اسلام آباد کی خلافت ملنی تھی جبکہ فرقان کو لاہور کی۔

اگر پورٹ پر فرقان نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس سے الوداعی مصافحہ کیا۔

انتہائی شادی عین دن بعد تھی اور سالار کے پاس ان تین دنوں کے لئے بھی بہت سے کام تھے۔

کچھ شادی کی مصروفیات اور کچھ اس کے اپنے مسئلے۔

وہ اگلے دن شام کو اس وقت حیران ہوا جب فرقان نے اسے فون کیا۔ دس پندرہ منٹ دونوں کی گفتگو ہوئی رہی۔ فون بند کرنے سے پہلے سالار نے ایک بار پھر اسے انتہائی شادی کے بارے میں یاد دلایا۔

”یہ کوئی یاد دلانے والی بات نہیں ہے، مجھے ابھی طرح یاد ہے۔ میں ویسے بھی اس ویک اینڈ پر اسلام آباد میں ہی ہوں گا۔“ فرقان نے جواب کیا۔

”وہاں مجھے اپنے گاؤں میں اپنا اسکول دیکھنے بھی جانا ہے۔ اس کی بلڈنگ میں کچھ اضافی تعمیر ہو رہی ہے وہی سلسلے میں۔ تو اسلام آباد میں اس بار میرا قیام کچھ لمبا ہی ہوگا۔“ سالار نے اس کی بات کو کچھ دھکیلا سے سنا۔

”اچھا..... اسکول..... کیا مطلب؟“

”ایک اسکول چلا رہا ہوں میں وہاں، اپنے گاؤں میں۔“ فرقان نے اسلام آباد کے قومی ملاقاتوں

میں سے ایک کام لیا۔ ”جگہ کئی سالوں سے۔“

”کس لئے؟“

”فرقان کو اس کے سوال نے حیران کیا۔ ”لوگوں کی مدد کے لئے اور کس لئے۔“

”تجربہ دار کب ہے؟“

”نہیں، تجربہ کار اور کب نہیں ہے۔ یہ میرا فرض ہے۔ یہ کسی پر کوئی احسان نہیں ہے۔“ فرقان نے

ہاتھ کرتے موضوع بدل دیا۔ اسکول کے بارے میں مزید گفتگو نہیں ہوئی اور فون بند ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

فرقان انتہائی شادی پر واقعی آ گیا تھا۔ وہ خاصی دیر وہاں زکا مگر سالار کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ حیران تھا۔

”جہاز ہی جلیبی تو خاصا مغرب زدہ ہے۔“

سالار کو یک دم اس کی انہیں اور حیرانی کی وجہ سمجھ میں آئی۔

”میرا خیال تھا کہ جہاز ہی جلیبی کچھ کمزور بیوی ہوگی کیونکہ تم نے بتایا تھا کہ تم حافظہ قرآن ہو اور جہاز انائف اسٹائل مجھے کچھ سادہ سا لگا کر میراں آکر مجھے حیرانی ہوئی۔ تم اور جہاز ہی جلیبی میں بہت فرق ہے۔“ I think you are the odd one out

وہ اپنے آخری جملے پر خود ہی مسکرایا۔ وہ دونوں اب فرقان کی گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

”میں نے صرف دو سال پہلے قرآن پاک حفظ کیا اور دو تین سال سے ہی میں odd one out ہوا ہوں۔“

پہلے میں اپنی جلیبی سے بھی زیادہ مغرب زدہ تھا۔ ”اس نے فرقان کو بتایا۔

”دو سال پہلے قرآن پاک حفظ کیا۔ امریکہ میں اپنی اسٹڈی کے دوران، مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

فرقان نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

”کتنے عرصے میں کیا؟“

”تقریباً آٹھ ماہ میں۔“

فرقان بہت دیر تک کچھ نہیں کہہ سکا، وہ صرف اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر اس نے ایک گہرا سانس

لے کر سٹائٹھی نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم پر کوئی اللہ کا خاص ہی کرم ہے، ورنہ جو کچھ تم مجھے بتا رہے ہو یہ آسان کام نہیں ہے۔ میں

خلافت میں بھی جہاز کے کارناموں سے بڑا متاثر ہوا تھا، کیونکہ جس عمر میں یہ نیکو میں جس سیٹ پر تم کام

کر رہے ہو ہر کوئی نہیں کر سکتا۔“

اس نے ایک بار پھر بڑی گرم جوشی کے ساتھ سالار سے ہاتھ ملایا۔ چند لمحوں کے لئے سالار کے

چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔

”اللہ کا خاص کرم اگر میں اسے یہ بتا دوں کہ میں ساری زندگی کیا کر چاہا ہوں تو یہ.....“ سالار

نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سوچا۔

”تم پر سو کسی اسکول کی بات کر رہے تھے۔“ سالار نے دانستہ طور پر موضوع بدلا۔

”تم اسلام آباد میں نہیں رہتے؟“

"نہیں، میں اسلام آباد میں رہتا ہوں مگر میرا ایک گاؤں ہے۔ آپاٹی گاؤں، وہاں ہماری کچھ زمین ہے، ایک گھر بھی تھا۔" فرقان اسے تفصیل بتانے لگا۔ "کئی سال پہلے میرے والدین اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ میرے والد نے فیڈرل سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہاں اپنی زمینوں پر ایک اسکول بنالیا۔ اس گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ انہوں نے پرائمری اسکول بنوایا تھا۔ سات آٹھ سال سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ اب وہ سینکڑی اسکول بن چکا ہے۔ چار سال پہلے میں نے وہاں ایک ڈپنٹری بھی ڈوائی۔ تم اس ڈپنٹری کو کچھ کر جان رہ جاؤ گے۔ بہت چہرہ سامان ہے اس میں۔ میرے ایک دوست نے ایک ایجوکیشنل بھی گفٹ کی ہے اور اب صرف میرے گاؤں کے ہی نہیں بلکہ ارد گرد کے بہت سارے گاؤں کے لوگ بھی اسکول اور ڈپنٹری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

سالدار اس کی باتیں سنانے پر حیران رہا۔

"مگر تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو۔ تم ایک مرجن ہو، تم یہ سب کیسے کر لیتے ہو اور اس کے لئے بہت پیسے کی ضرورت ہے۔"

"کیوں کر رہا ہوں۔ یہ تو میں نے اپنے آپ سے کبھی نہیں پرچھا۔ میرے گاؤں میں اتنی غربت تھی کہ یہ سوال پوچھنے کی جگہ بھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہم لوگ بچپن میں کبھی بیکار اپنے گاؤں جایا کرتے تھے۔ یہ ہمارے لئے تفریح تھی۔ ہماری چوٹی کے علاوہ گاؤں کا کوئی مکان بچا نہیں تھا اور سڑک کا نو سوال ہی پیدا نہیں ہو تا۔ ہم سب کو یوں لگا تھا جیسے ہم جنگل میں آگے ہیں، اب اگر ہم جانور ہوتے تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شہر کی طرح ہم جنگل میں دوڑتے پھرتے۔ یہی سوچ کر کہ سب، ہم سب سے مرعوب ہیں اور کوئی بھی ہمارے جیسا نہیں نہ کوئی ہماری طرح رہتا ہے، نہ ہمارے جیسا کھاتا ہے۔ نہ ہمارے جیسا پینتا ہے مگر انسان ہو کر یہ برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہمارے ارد گرد کے انسان جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ انسانوں کو اس سے خوشی محسوس ہوتی ہو کہ انہیں ہر نعمت میرے اور باقی سب ترس رہے ہیں مگر ہمارا اثر ایسے انسانوں میں نہیں ہوتا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میرے پاس کوئی چادری چھڑی تو تھی نہیں کہ میں اسے جلاتا اور سب کچھ بدل دیتا، نہ ہی بے شمار وسائل۔ جنہیں میں نے بنایا ہے تاکہ میرے والد سول سروس تھے، ایمان دار قسم کے سول سروس۔ میں اور میرا بھائی دونوں شروع سے ہی اسکالر شپ پر پڑتے رہے، اس لئے ہم پر ہمارے والدین کو زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ خود وہ بھی کوئی فنون خرچ نہیں تھے، اس لئے تھوڑی بہت بچت ہوتی رہی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میرے والد نے سوچا کہ لاہور یا اسلام آباد کے کسی گھر میں اخبار پڑھ کر، دوک کر کے یا کسی وی کچھ کر زندگی گزارنے کے بجائے، انہیں اپنے گاؤں جانا چاہئے۔ وہاں کچھ بہتری لانے کی کوشش کرنا چاہئے۔"

دو دونوں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔

"مشکلات کم اندازہ نہیں کر سکتے گاؤں میں نہ بجلی تھی، نہ صاف پانی، کچھ بھی نہیں تھا۔ بابائے پتا نہیں کہاں کہاں بھاگ کر یہ ساری چیزیں منظور کروائیں۔ جب وہاں پرائمری اسکول بن گیا، ایک سڑک بھی آگئی، بجلی اور پانی بھی ہوتیں بھی آگئیں تو گورنمنٹ کو اپنا کچھ وہاں ایک اسکول بنانے کا خیال آیا۔ میرے والدین کی خواہش تھی کہ گورنمنٹ ان کے اسکول کو اپنی زیر نگرانی لے لے۔ اس میں اپنے تجربہ بھجوائے اور کچھ عرصے کے بعد اس اسکول کو اپ گریڈ کر دے، مگر نگرانی تعلیم کے ساتھ چند اہلوس میں ہی بابا کو اندازہ ہو گیا کہ ایسا ہونے کی صورت میں ان کی ساری محنت پر پانی بھر جائے گا۔ بابا وہاں بچوں کو سب کچھ دیتے تھے۔ کتابیں، کاپیاں، بیاقلام اور ایسی کچھ دوسری چیزیں۔ انہوں نے باقاعدہ اس کے فنڈز رکھے ہوئے تھے، مگر تم اندازہ کر سکتے ہو کہ گورنمنٹ کے پاس چلے جانے کے بعد اس اسکول کا کیا حشر ہو تا۔ سب سے پہلے وہ فنڈز جاتے پھر باقی سب کچھ۔ اس لئے بابا خود ہی اسکول کو چلاتے رہے۔

محمود تعلیم نے وہاں اسکول پھر بھی کھولا مگر وہاں ایک بچہ بھی نہیں گیا پھر بارہانہ کر انہوں نے دو اسکول بند کر دیار ہمارے اسکول کو اپ گریڈ کر دیا۔ بابا کے کچھ دوستوں نے اس سلسلے میں ان کی مدد کی، اسی طرح اس کی اپ گریڈنگ ہوئی تھی۔ میں ان دنوں لندن میں پڑھتا تھا اور میں روپے بچا بچا کر بھیجا کرتا تھا۔ ابھی بھی ہم اس کو اور ترقی دے رہے ہیں، آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی اپنے بچوں کو ہمارے پاس بھجواتے ہیں۔ جس میں پاکستان واپس آیا تو میں نے وہاں ایک باضابطہ قسم کی ڈپنٹری قائم کی۔ گاؤں کی آبادی بھی اب بہت بڑھ چکی ہے لیکن گاؤں میں غربت ابھی بھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ تعلیم سے انکشاف ہوا ہے کہ گاؤں کے کچھ بچے باہر شہر میں آگے پڑنے کے لئے جاتے گئے ہیں۔ کچھ مختلف ہنر سیکھ رہے ہیں۔ جو غربت کا ایک پتھر تھا وہ ختم ہو رہا ہے۔ ان کی یہ سلیس نہیں تو واقعی سلیس شاید جہاں سے اور میرے جیسے تعلیمی اداروں سے اعلیٰ ذکر کرنے کے کر نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں براہِ دیکھ ایک اینڈر گاؤں جاتا ہوں، وہاں دو کیا ڈاکٹر ہیں مگر کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ ایک ایک اینڈر میں وہاں جاتا ہوں، باقی ٹوئک اینڈر پر بھی کسی نہ کسی کو وہاں بھجوا دیتے ہیں پھر میں وہاں ہر زمین ہا بعد ایک میڈیکل کیمپ لگواتا ہوں۔"

"اور اس سب کے لئے وہ جہاں سے آتا ہے۔"

"شروع میں تو یہ بابا کا رہا تھا۔ ان کی زمین پر اسکول بنانا، ان کی گرجیوں سے اس کی تعمیر ہوتی۔ میری امی نے بھی اپنے پاس موجود رقم سے ان کی مدد کی، پھر بابا کے کچھ دوست بھی مالی امداد

کرتے لگے۔ اس کے بعد میں اور میراں بھی اس میں شامل ہو گئے پھر میرے کچھ دوست بھی۔ میں اپنی انکم کا ایک خاص حصہ ہر ماہ گاؤں بھجوا دیتا ہوں۔ اس سے ڈیپنٹری بڑے آرام سے چلتی رہتی ہے، جو ڈاکٹر وہاں مینے کے تین دیک ایڈز پر جاتے ہیں وہ کچھ چارج نہیں کرتے۔ ان کے لئے یہ سوشل ورک ہے۔ میڈیکل کیسوں بھی اسی طرح کے لگ جاتے ہیں اور اسکول کے پاس اپنے اپنے کلسڈ ڈیپارٹمنٹ ہو چکے ہیں کہ ان سے آنے والی رقم نیچر ڈی کونوا اور دوسرے اخراجات کے لئے کافی ہوتی ہے۔ ہم چند سالوں میں وہاں میڈیکل ایجوکیشن کے لئے بھی کچھ کام کرنا چاہتے ہیں۔

”تم کب چارہ ہو وہاں؟“

”میں تو سب کھل رہا ہوں۔“

”اگر میں تمہارے ساتھ جانا چاہوں؟“ سارا نے کہا۔

”موسٹ ویٹر۔ کنٹرول کو ویٹر ہو گا، تم یہاں مصروف ہو گے۔“ فرحان نے اسے یاد دلایا۔

”ویٹر تو رات کو ہے، سارا دن تو میں فارمی ہوں گا۔ کپار ات تک واپس پہنچنا مشکل ہو گا؟“

”نہیں، ہاؤس بھی نہیں۔ تم بہت آسانی سے واپس پہنچ سکتے ہو۔ صرف صبح کچھ جلدی لگانا پڑے گا۔ اگر تم واقعی وہاں چند گھنٹے گزارنا چاہتے ہو تو درنہ پھر تم واپس آکر خاصے تھک جاؤ گے۔“ فرحان نے اس سے کہا۔

”میں نہیں تنھوں گا، میں ویسہف کی ٹیز کے ساتھ کیسے ملے گا توں میں کتنا لہا سز کر رہا ہوں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں فجر کے بعد تیار ہوں گا، تم مجھے وقت بتا دو۔“

”ساز صے پانچ۔“

”اوکے، تم کھر سے نکلتے ہوئے مجھے ایک بار موپائل پر کال کر لینا اور دو تین بار بارن دینا یہاں آ کر، میں کھل آؤں گا۔“

اس نے فرحان سے کہا اور پھر خدا حافظ کہتا ہوا اندر مڑ گیا۔

اگلی صبح فرحان ٹھیک ساڑھے پانچ بجے اس کے گیٹ پر بارن دے رہا تھا اور سارا پہلے ہی بارن پر باہر تھا۔

”تم واپس پاکستان کیوں آ گئے؟ تم انگلینڈ میں بہت آگے جا سکتے تھے؟“ گاڑی شہر سے باہر والی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ انہیں سفر کرتے آواہنگ نہ ہو کیا تھا، جب سارا سے اچانک اس نے پوچھا۔

”انگلینڈ کو میری ضرورت نہیں تھی پاکستان کو تھی، اس لئے میں پاکستان آ گیا۔“ فرحان نے بڑے نارمل انداز میں کہا۔

”وہاں ایک ڈاکٹر فرحان کے نہ ہونے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں ایک ڈاکٹر فرحان کے نہ

ہونے سے بہت فرق پڑ جاتا۔ یہاں میری خدمات کی ضرورت ہے۔“ اس نے اپنے آخری جملے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”مگر وہاں اتنے سالوں میں تم بہت آگے جا سکتے تھے پھر پروفیشنل بھی تم بہت کچھ سیکھتے۔ فنانسلی بھی تم اس پر وجہیت کے لئے زیادہ روپیہ حاصل کر سکتے تھے، جو تم نے شروع کیا ہوا ہے۔ آخر آل، پاکستان میں تم اتنے کامیاب نہیں ہو سکتے۔“ سارا نے کہا۔

”اگر کامیابی سے تمہاری مراد پانڈز کی تعداد اور سہولتوں سے ہے تو ہاں، دونوں جگہوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے لیکن اگر تمہارا اشارہ علاج کی طرف ہے تو میں یہاں زیادہ لوگوں کو زندگی بانت رہا ہوں جو اطمینان ڈاکٹر اپنے صحت یاب ہونے والے مریض کو دیکھ کر حاصل کرتا ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ انگلینڈ یا کوکلو جسٹ سے بھرا ہوا ہے پاکستان میں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ میں وہاں رہ کر روپے کا ذخیرہ بھی یہاں بھجوا دیتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ جہاں ایک فرد کی کمی ہوتی ہے وہاں اس فرد سے ہی دو کمی پوری ہوتی ہے۔ روپیہ یا دوسری کوئی چیز اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ میں بہت قانع ہوں سارا! میری پوری جیلتی بہت قانع ہے۔ اگر میں نے کوئی چیز سیکھی ہے تو وہ سب سے پہلے میرے اپنے لوگوں کے کام آتی چاہئے۔ میں اپنے لوگوں کو مرنا چھوڑ کر دوسرے لوگوں کی زندگی نہیں بچا سکتا۔ پاکستان میں کچھ بھی نہیں ہے، سب کچھ خراب ہے، کچھ بھی ٹھیک نہیں۔ سہولتوں سے خالی ہاتھوں اور حد سے زیادہ برادری اور کرپٹ سٹیٹ سسٹم۔ جس برائی اور خالی کا سوچو وہ یہاں ہے مگر میں اس جگہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ان لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر میرے ہاتھ میں شفا ہے تو پھر سب سے پہلے یہ شفا میرے اپنے لوگوں کے حصے میں آتی چاہئے۔“

سارا بہت دیر تک کچھ نہیں بول سکا۔ گاڑی میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔

”تم نے مجھ سے تو یہ سوال پوچھ لیا کہ میں پاکستان کیوں آ گیا، کیا اب میں تم سے یہ سوال پوچھوں کہ تم پاکستان کیوں نہیں آ جاتے؟“ فرحان نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں یہاں نہیں رہ سکتا۔“ سارا نے بے اختیار کہا۔

”تم چہیے اور سہولتوں کی وجہ سے یہ کہہ رہے ہو؟“

”نہیں، چونکہ ہاں سہولتیں میرا مسئلہ نہیں ہیں، نہ اب، نہ ہی پہلے کبھی۔ تم میرا فیملی ایک گراؤڈ جان چکے ہو۔“

”پھر؟“

”پھر..... کچھ بھی نہیں۔ بس میں یہاں نہیں آ سکتا۔“ اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

”یہاں تمہاری ضرورت ہے۔“

”کس کو؟“

”اس ملک کو۔“

سالار نے افسانہ سن کر کہا۔ ”میں تمہاری طرح کی حب الوطنی نہیں رکھتا۔ میرے بغیر بھی سب کچھ ٹھیک ہے یہاں۔ ایک ڈاکٹری اور بات ہے مگر ایک کانوٹسٹ تو کسی کو زندگی اور موت نہیں دے سکتا۔“

باب ۶

”تم جو سردار وہاں دے رہے ہو، وہ یہاں کے اداروں کو دے سکتے ہو جو کچھ اپنے چمچر زمین وہاں کی یونیورسٹیز میں سکھ رہے ہو، یہاں کی یونیورسٹیز میں سکھائے ہو۔“

اس کا دل چاہا، وہ فرقان سے کہے کہ وہ یہاں آکر کچھ بھی سکھانے کے قابل نہیں رہ سکے گا، مگر وہ خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

”تم نے افریقہ کی غربت، بھوک اور بیماری دیکھی ہے۔ تم یہاں کی غربت، بھوک اور بیماری دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔“

”یہاں صورت حال ان ملکوں کی طرح خراب نہیں ہے فرقان ایساں اتنی پسماندگی نہیں ہے۔“

”اسلام آباد کے جس سیکٹر میں تم چلے بڑھے ہو وہاں رہ کر ارد گرد کی زندگی کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ تم اسلام آباد کے قریبی گاؤں میں چلے جاؤ تو جہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ ملک کتنا

خوشحال ہے۔"

"فرقان! میں تمہارے اس پروینکٹ میں کچھ کنٹری بیوشن کرنا چاہتا ہوں۔" سالار نے یک دم بات کا موضوع بدلتا چاہا۔

"سالار! میرے اس پروینکٹ کوئی احوال کسی حد کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر ایسا کوئی کام کرنا چاہتے ہو تو تم خود ایسے ہی کسی گاؤں میں اس طرح کا کام شروع کرو، تمہارے پاس فنڈز کی کمی نہیں ہوگی۔" "میرے پاس وقت نہیں ہے، میں امریکا میں بیٹھ کر یہ سب کچھ نہیں چلا سکتا۔ تم اگر یہ چاہتے ہو تو کہ کسی دوسرے گاؤں میں بھی کوئی اسکول قائم کیا جائے تو میں اسے سپورٹ کرنے کو تیار ہوں۔ میرے لئے ذاتی طور پر وقت دینا مشکل ہے۔"

فرقان اس بار خاموش رہا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سالار اب اس کے اس اصرار پر کچھ بھیجنا رہا تھا۔ بات کا موضوع ایک بار پھر فرقان کے گاؤں کی طرف مڑ گیا۔

وہ دن سالار کی زندگی کے یادگار ترین دنوں میں سے ایک تھا۔ وہ اس اسکول کو دیکھ کر واقعی بہت متاثر ہوا تھا مگر اس سے بھی زیادہ متاثر وہ اس پسنہری کو دیکھ کر ہوا تھا جہاں وہ گیا تھا۔ اسے ایک چھوٹا ہاسٹل گہنا زیادہ بہتر تھا۔ ڈاکٹر کے نہ ہونے کے باوجود وہ بڑے منظم طریقے سے چلایا جا رہا تھا۔ اس دن فرقان کی آمد متوقع تھی اور اس کے انتظار میں مرلیٹوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی فرقان آتے ہی مصروف ہو گیا۔ ہاسٹل کا احاطہ مرلیٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں ہر مرد اور ہر طرح کے مرلیٹ تھے۔ نو ذائیدہ بچے، عورتیں، بوڑھے، نوجوان۔

سالار احاطے میں داخلہ لے گا۔ وہاں موجود چند لوگوں نے اسے بھی ڈاکٹر سمجھا اور اس کے قریب چلے آئے۔ سالار ان سے بات چیت کرنے لگا۔

زندگی میں پہلی بار وہ کنسر کے ایک اسپیشلسٹ کو ایک فریویشن کے طور پر چیک اپ کرتے اور فیس لکھتے دیکھ کر ہوا تھا اور اس نے اعتراف کیا۔ اس نے زندگی میں فرقان سے اچھا ڈاکٹر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے حد پروفیشنل اور بے حد نرم مزاج تھا۔ اس تمام عمل میں اس کے چہرے کی متحرکات ایک لمحہ کے لئے بھی عائب نہیں ہوئی تھی۔ سالار کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو کسی چیز کے ساتھ پیچھا کیا ہو تھا، کچھ وقت گزرنے کے بعد اس نے سالار کو ایک آدمی کے ساتھ اسکول بھیجا دیا تھا، وہ وہاں اس کے والدین سے ملا۔

وہ اس کی آمد سے پہلے ہی باخبر تھے، یقیناً فرقان نے ان کو فون پر بتا دیا تھا وہ ان کے ساتھ اسکول میں پھر تارہا۔ اسکول کی عمارت اس کی تو قعات کے برعکس بہت وسیع اور بہت اچھی بنی ہوئی تھی۔ اسے وہاں موجود بچوں کی تعداد دیکھ کر بھی حیرت ہو رہی تھی۔

وہاں کچھ کھنے ڈرنے کے بعد وہ ان دونوں کے ساتھ ان کی حویلی میں آ گیا، حویلی کے چروٹی کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی بے اختیار اس کا دل خوش ہوا تھا۔ اسے اس گاؤں میں اس قسم کے شاندار ان کی توقع نہیں تھی۔ وہاں پودوں کی بھرمار تھی مگر بے ترتیب نہیں تھی۔

"بہت شاندار ان ہے، بہت آرٹسٹک۔" وہ تعریف کے بغیر نہیں رہ سکا۔

"یہ نکلیں صاحب کا شوق ہے۔" فرقان کی اسی نے کہا۔

"میرا اور نوشین کا۔" فرقان کے والد نے اضافہ کیا۔

"نوشین؟" سالار نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"فرقان کی بیوی۔" آرٹسٹک بچہ اسی کا ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فرقان نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی فیملی لاہور میں ہوئی ہے۔" سالار کو یاد تھا۔

"ہاں، وہ لوگ لاہور میں ہی ہوتے ہیں مگر فرقان سینے میں ایک وینڈ یہاں گزارتا ہے پھر وہ اپنی فیملی بھی یہاں لاتا ہے۔ یہ سلائیڈز اس کے بچوں کے لئے لگوائی ہیں۔ نوشین بھی ڈاکٹر ہے۔ ابھی بچے چھوٹے ہیں، اس لئے پیکٹس نہیں کرتی مگر جب یہاں آتی ہے تو فرقان کے ساتھ ڈسپنری جاتی ہے۔ اس بار وہ اپنے بھائی کی شادی میں مصروف تھی، اس لئے فرقان کے ساتھ نہیں آ سکی۔" وہ ادھر اُدھر نظر سے دوڑاتا ان کی باتیں سنتا رہا۔

وہ ان کے ساتھ بچنے کرنے کے لئے گھر آ گیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ کچھ دیر تک فرقان بھی آ جائے گا مگر جب کھانا لگنا شروع ہو گیا تو اس نے فرقان کے بارے میں پوچھا۔

"وہ وہاں کھانا یہاں نہیں کھاتا۔ صرف ایک سینڈوچ اور چائے کا کپ لیتا ہے۔ اس میں بھی پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگتے۔ اس کے پاس مرلیٹ اسے ہوتے ہیں کہ وہ شام تک بالکل فارغ نہیں ہوتا۔ کھانا دانا بالکل بھول جاتا ہے۔"

فرقان کی اسی نے اس سے کہا۔ وہ ان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کھانا کھانے لگا۔ فرقان کے والد فائنس ڈویژن میں ہی کام کرتے رہے تھے اور میسجریں گریڈ میں ریٹائر ہوئے تھے۔ یہ جان کر کہ سالار کا تعلق بھی فائنس سے تھا۔ ان کے جوش میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ سالار کو ان سے باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔ سالار نے ان سے اس اسکول کے حوالے سے بات کی۔

"اسکول کے لئے ہمیں فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس خاصے فنڈز ہیں۔ فرقان کا ایک دوست ایک نیا کلا بھی بنا رہا ہے بلکہ ہمیں ہی چاہا ہے، تم نے تو دیکھا ہے۔ ہاں، تم اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو ڈسپنری کے لئے کرو۔ ہمیں ایک مستقل ڈاکٹر کی ضرورت ہے اور ہم اس کے لئے ایلیٹ مسٹری میں بہت وفد درخواستیں دے چکے ہیں۔ فرقان نے اپنے تعلقات بھی استعمال کئے ہیں مگر

کوئی بھی ڈاکٹر یہاں مستقل طور پر آکر رہنے کو تیار نہیں اور ہمیں ایک ڈاکٹر کی اشد ضرورت ہے۔ تم نے مریضوں کی تعداد تو دیکھی ہی ہوگی۔ ایک قریبی گاؤں میں ایک ڈاکٹر آتا ہے، مگر ڈاکٹر مستقل پہنچی ہوئے اور انکا ڈاکٹر بھی آئے سے پہلے ہی پہنچی ہو چلا جاتا ہے۔"

"میں اس مسئلے میں جو کچھ کر سکا ضرور کروں گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اسکول کے لئے بھی کچھ کروں۔ میں واپس جانے کے بعد کوشش کروں گا کہ آپ کو پینسکو کی طرف سے کسی این پی او کے ذریعے پچھ سال کچھ گرانٹ بھی ملتی رہے۔"

"لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب کچھ جو تم نے دیکھا ہے یہ سب ہم لوگوں نے خود کیا ہے۔ ہماری فیکلٹی نے، رشتہ داروں نے، فیکلٹی فرینڈز نے، میرے واقف کاروں نے، میرے بچوں کے دوستوں نے۔ ہمیں کبھی کسی حکومتی یا بین الاقوامی ایجنسی کی گرانٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ کب تک یو نینسکو آکر ہمارے لوگوں کی جوگ، بجات اور بیماری فتم کرتی رہے گی۔ جو کام ہم اپنے وسائل سے کر سکتے ہیں وہ ہمیں اپنے وسائل سے ہی کرنے چاہئیں۔"

"میں صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ اس پروجیکٹ کو اور بڑھائیں۔" سالار بے اختیار بولتے ہوئے لڑکھڑکیا۔

"یہ بہت بڑا جانے گا، تم ہیں ۴۰ سال بعد یہاں آکر دیکھو تو یہ گاؤں جہیں ایک مختلف گاؤں ملے گا۔ جتنی غربت تم نے آج یہاں دیکھی ہے وہ تب نہیں ہوگی۔ ان کا کل "آج سے مختلف ہوگا۔"

فرقان کے والد نے بے حد اعتماد سے کہا۔ سالار چیپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

سیر کے قریب اسے فرقان نے ڈاکٹر کی فون کیا۔ کچھ دیر دیکھو کے بعد اس نے سالار سے کہا۔

"اب تمہیں واپس اسلام آباد کے لئے نکل جانا چاہئے۔ میں چاہتا تھا کہ خود تمہیں واپس چھوڑ کر آؤں مگر یہاں بہت دش ہے جو لوگ دوسرے گاؤں سے آتے ہیں اگر میں انہیں آج چیک نہیں کر سکا تو انہیں بہت زحمت ہوگی، اس لئے میں اپنے ڈاکٹر کو بھجوا رہا ہوں۔ وہ گاڑی میں تمہیں اسلام آباد چھوڑ آئے گا۔" اس نے پھر دگرما ملے کیا۔

"اوکے۔" سالار نے کہا۔

"جانے سے پہلے ڈاکٹر آکر مجھ سے مل لینا۔" اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

سالار نے ایک بار پھر فرقان کے والدین کے ساتھ چائے پی۔ گاڑی تک وہاں آچکی تھی، پھر وہ وہاں سے گاڑی میں فرقان کے پاس چلا گیا۔ صبح والی بمبیلر اب کم ہو چکی تھی۔ وہاں اب صرف بچیں تھیں کے قریب لوگ تھے۔ فرقان ایک بوڑھے آدمی کا معائنہ کر رہا تھا۔ سالار کو کچھ کر سکرایا۔

"میں دو منٹ میں انہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔"

اس نے مریض سے کہا اور پھر آنکھ کرکڑا ہوا گیا۔ سالار کے ساتھ چلے ہوا وہاں گاڑی تک آیا۔

"تم کب تک پاکستان میں ہو؟" اس نے سالار سے پوچھا۔

"ڈیڑھ ہفتہ۔"

"پھر تو دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکے گی تم سے کیونکہ میں تو اب اگلے ہی ماہ اسلام آباد اور یہاں آؤں گا لیکن میں تمہیں فون کروں گا، تمہاری فائنل کب ہے؟"

سالار نے اس کے سوال کو نظر انداز کیا۔

"ملاقات کیوں نہیں ہو سکتی، میں لاہور آ سکتا ہوں، اگر تم اوقات کرو۔" فرقان کچھ حیران انداز میں مسکرایا۔

سالار اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

سالار نہیں جانتا تھا کہ کون سی چیز اس طرح چانک فرقان کے اس قریب لے آئی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ فرقان کو کیوں اتنا پسند کر رہا تھا۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

فرقان کے ساتھ اس کا گاؤں دیکھنے کے چار دن بعد دولاہور گیا۔ وہ وہاں ایک دن کے لئے گیا

تھا اور اس نے فرقان کو فون پر اس کی اطلاع دی۔ فرقان نے اسے انٹرپرائٹ پر پک کرنے اور اپنے ساتھ رہنے کی آفری، مگر اس نے انکار کر دیا۔

وہ فرقان سے ملے شدہ پھر دگرما ملے کے مطابق چار بجے کے قریب اس کے گھر پہنچا۔ وہ ایک اچھے

علاقے میں ایک عمارت کے گراؤنڈ فلور کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ دروازے کے ساتھ موجود تیل دا

کر وہ خاموشی سے کھڑا ہوا گیا۔ اندر سے یک دم کسی بچے کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک چارپائی سال کی

بچی دو درجین کی وجہ سے دروازے میں آنے والی بھری تھی اس کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" سالار اسے دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرایا تھا مگر اس بچی کے چہرے

پر کوئی مسکراہٹ نہیں آئی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سالار سے پوچھ رہی تھی۔

"بیٹا! مجھے آپ کے پیپا سے ملنا ہے۔"

اس بچی اور فرقان کے چہرے میں اتنی مماثلت تھی کہ اس کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ

وہ فرقان کی بیٹی تھی۔

"پاپا! اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔" اسے بڑی سنجیدگی سے اطلاع دی گئی۔

"مجھ سے مل لیں گے۔" سالار نے قدر سے معقولہ ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ سے کیوں مل لیں گے؟" فوراً جواب آیا۔

"یہ تو میں نہیں راستے میں ہی بتاؤں گا۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

☆.....☆.....☆

"میں وہاں جا کر کروں گا کیا؟" سالار نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے فرقان سے پوچھا۔

"وہی جو میں کرتا ہوں۔" وہ سکتل پر گاڑی روکنے ہوئے بولا۔

"اور تم وہاں کیا کرتے ہو؟"

"یہ تم وہاں پہنچ کر دیکھ لیجئے۔"

فرقان اسے کسی ڈاکٹر سید سید علی کے پاس لے کر جا رہا تھا جس کے پاس وہ خود بھی جایا کرتا تھا۔

وہ کوئی مذہبی عالم تھے اور سالار کو مذہبی علماء سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پچھلے چند سالوں میں اتنے مذہبی

علماء کے اصلی چہرے دیکھ چکا تھا کہ وہ اب مزید ان نگہوں پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"خدا کی تعریف فرقان! میں اس ناپاک کا ہوں نہیں جس ناپاک کا تم مجھے رہے ہو۔" اس نے

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فرقان کو مخاطب کیا۔

"کس ناپاک کے؟" فرقان نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"جی ہر ہی میری۔" بے نیابت و غیرہ۔" یا جو بھی تم سمجھ لو۔" اس نے قدرے صاف گوئی سے کہا۔

"اسی لئے تو میں نہیں وہاں لے جا رہا ہوں، تمہیں مدد کی ضرورت ہے؟" سالار نے چونک کر

اسے دیکھا۔ وہ سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

"کیسی مدد؟"

"اگر کوئی حافظہ قرآن رات کو ایک پارہ پڑھے اور پھر بھی نیند لانے کے لئے اسے نیند کی گولیاں

کھانی پڑیں تو پھر کہیں نہ کھیں کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہے۔ کئی سال پہلے مجھے بھی ایک پارہ بہت ڈپریشن ہوا

تھا۔ میرا ذہن بھی بہت اچھل گیا تھا پھر کوئی مجھے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر گیا تھا۔ آٹھ دس سال ہو

گئے ہیں مجھے اب وہاں جاتے۔ تم سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ تمہیں بھی میری طرف سے کسی کی مدد کی

ضرورت ہے، رہنمائی کی ضرورت ہے۔" فرقان نے نرم لہجے میں کہا۔

"تم کیوں میری مدد کرنا چاہتے ہو؟"

"کیونکہ دین کہتا ہے کہ تم میرے بھائی ہو۔" اس نے موڑ موڑتے ہوئے کہا۔ سالار نے گردن

سیدھی کر لی۔ وہ اس سے مزید کیا پوچھتا۔

اسے مذہبی علماء سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہر عالم اپنے فرشتے کی تعریف میں زمین اور آسمان کے

تلاپے ملائے میں ماہر تھا۔ ہر عالم کو اپنے علم پر غرور تھا۔ ہر عالم کا لب لباب یہی ہوتا تھا۔ میں اچھا ہوں،

باقی سب برے ہیں۔ میں کامل ہوں، باقی سب ناکمل ہیں۔ ہر عالم کو دیکھ کر لگتا اس نے علم کتابوں سے

نہیں، برادر راستہ وحی کے ذریعے حاصل کیا ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس نے آج تک ایسا عالم نہیں دیکھا تھا جو اپنے اوپر تنقید سے اور برداشت بھی کرے۔

سالار خود اہل سنت مسلک سے تعلق رکھتا تھا مگر جو آخری چیز وہ کسی سے ڈکس کرنا چاہتا تھا وہ

مسلک اور فرقہ تھا اور ان مذہبی علماء کے پاس ڈکس کرنے کے لئے سب سے پہلی چیز مسلک اور فرقہ ہی

تھا۔ ان علماء کے پاس جاتے جاتے دور رفتہ رفتہ ان سے رشتہ ہو گیا تھا۔ ان کی پوچھی میں صرف علم بھرا ہوا

تھا، عمل نہیں۔ وہ "نہایت ایک گناہ" پر لمبا چڑھا لیکن دیتے، قرآنی آیات اور احادیث کے حوالے دیتے

اور انکی ہی سانس میں وہ اپنے کسی ہم عصر عالم کا نام لے کر اس کا مذاق اڑاتے، اس کی علمی حیثیت کو عبادت

کرنے کی کوشش کرتے۔

وہ اپنے پاس آنے والے ہر ایک کا پورا پورا بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ

مطالوں اور مضامین کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا اور اس بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ بیوہ

کرنے کے لئے بھی استعمال کرتے کہ ان کے پاس کس وقت، کون آیا تھا۔ کس طرح کون ان کے علم سے

فیض یاب ہوا تھا۔ کون بڑا آدمی ہر وقت ان کی جوتیاں سیدھی کرتے رہنے کو تیار رہتا ہے۔ کس نے

انہیں گھر پایا اور کس طرح خدمت کی۔ وہ اب تک جن علموں کے پاس ایک پارہ تھا وہ پارہ نہیں کیا اور

اب فرقان اسے پھر ایک عالم کے پاس لے کر جا رہا تھا۔

وہ شہر کے اچھے علاقوں میں سے ایک میں جا پہنچے تھے۔ وہ علاقہ اچھا تھا، مگر بہت پوش نہیں تھا۔

اس سڑک پر پہلے بھی بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ فرقان نے بھی ایک مناسب جگہ پر گاڑی سڑک کے

کنارے پارک کر دی، پھر دو گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ سالار نے اس کی پیروی کی۔ تین چار منٹ چلتے، پہنچے

کے بعد وہ ان نگہوں میں سے ایک نہایت سادہ مگر پروقار اور چھوٹے بنگلے کے سامنے پہنچ گئے۔ نیم پلیٹ پر

ڈاکٹر سید سید علی کا نام تحریر تھا۔ فرقان بلا جھجک اندر داخل ہو گیا۔ سالار نے اس کی پیروی کی۔

بنگلے کے اندر موجود چھوٹے سے لان میں ایک بالی اپنے کام میں مصروف تھا۔ فرقان نے مہربانی

میں ایک ملازم کے ساتھ وہ سالار کا ہاتھ لیا پھر وہ مزید کچھ آگے چلتا ہوا ایک دروازے کے سامنے

پہنچ گیا اور وہاں اس نے اپنا جو تاہر دیا۔ وہاں پہلے بھی بہت سے جوڑے چلتے تھے۔ اندر سے باتوں کی

آواز سنائی دے رہی تھی۔ سالار نے بھی دیکھا دیکھی اپنے جوڑے آواز دیئے۔ سالار نے ایک قدم اس

کے پیچھے اندر رکھتے ہوئے ایک ہی آنکھ میں پوچھ کرے گا جائزہ لے لیا۔ وہ ایک کشادہ کمرے میں تھا

جس کے فرش پر کارپٹ بچھا ہوا تھا اور بہت سے فلور کٹنگز بھی پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں فریج کے

نام پر صرف چند معمولی سی چیزیں تھیں اور دو پاروں پر کچھ قرآنی آیات کی گرائی کی صورت میں لگی ہوئی

تھیں۔ کمرے میں بیٹیں بچیوں کے قریب مردھے جو آپس میں گفتگو میں مصروف تھے۔ فرقان نے اندر

"کیونکہ میں ان کا دوست ہوں، آپ انہیں چاکر تاجمیں گی کہ سالارا نکل آئے ہیں تو دو مجھ سے مل لیں گے۔" سالار نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی مسکراہٹ سے متاثر نہیں ہوئی۔

"لیکن آپ میرے انکل تو نہیں ہیں۔"

سالار کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"آپ نہ ہنسیں۔" وہ بے اختیار بگڑی۔ سالار بچوں کے بل اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"اچھا میں نہیں ہنستا۔" اس نے چہرے کی مسکراہٹ کو چھپایا۔

"آپ اس فراک میں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" وہ اب کچھ قریب سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ اس کی تعریف نے دروازے کی جھری میں سے جھانکتی ہوئی تھمتھ کے تاثرات اور موڈ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

"لیکن آپ مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

اس کے بیٹے نے زیادہ اس کے تاثرات نے سالار کو محفوظ کیا۔ وہ اب کچھ دور سے قلیٹ کے اندر کسی کے قدموں کی آواز سن رہا تھا۔ کوئی دروازے کی طرف سی آ رہا تھا۔

"کیوں، میں کیوں اچھا نہیں لگا؟" اس نے مسکراتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔

"بس نہیں اچھے لگتے۔" اس نے ناگوار سی سرگرمی کو چھٹکا۔

"نام کیا ہے آپ کا؟" وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

"امام۔" سالار کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے دروازے کی جھری میں سے امام کے عقب میں فرقان کو دیکھا۔ وہ امام کو گھاتے ہوئے دروازہ کھول رہا تھا۔

سالار کھڑا ہو گیا۔ فرقان نہا کر نکلا تھا، اس کے بال کھلے اور بے ترتیب تھے۔ سالار نے مسکرائے کی کوشش کی وہ فوری طور پر کامیاب نہیں ہو سکا۔ فرقان نے اس سے ہاتھ ملایا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" وہ اس کے ساتھ اندر جاتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں اب ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے تھے۔

امام، فرقان کی گود میں چڑھی ہوئی تھی اور اسے مسلسل کان میں کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی، جسے فرقان مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔

"انکل سالار نے ملی ہیں آپ؟" فرقان نے سالار کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے امام سے پوچھا۔

وہ اب خود بھی صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔

"یہ مجھے اچھے نہیں لگتے۔" اس نے اب تک اپنی ناپسندیدگی کی پچھائی۔

"بہت بری بات ہے امام! ایسے نہیں کہتے۔" فرقان نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

"آپ انکل کے پاس جائیں اور ان سے ہاتھ ملائیں۔"

اس نے امام کو نیچے آکر دیا۔ وہ سالار کی طرف جانے کے بجائے یک دم بھاگتے ہوئے باہر چلی گئی۔

"حیرانی کی بات ہے کہ اسے تم اچھے نہیں لگے، ورنہ اس کو میرا بہرہ دوست اچھا لگتا ہے۔ آج اس کا موڈ بھی کچھ آف ہے۔" فرقان نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔

"یہ نام کاثر ہے مجھے جانتی ہوئی اگر اسے میں اچھا لگتا۔" سالار نے سوچا۔

چائے پیٹے ہوئے وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور باتوں کے دوران سالار نے اس سے کہا۔

"ایک دو ہفتے تک تم لوگوں کی ڈیپنری میں ڈاکٹر آجائے گا۔" اس نے سرسری انداز میں کہا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔" فرقان یک دم خوش ہوا۔

"اور اس بار دو ڈاکٹر وہاں رہے گا۔ اگر نہ رہے تو مجھے بتانا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا میں تمہارا شکر یہ کیسے ادا کروں۔ ڈیپنری میں ایک ڈاکٹر کی دستیابی سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ رکا۔ "وہاں جانے سے پہلے مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اور تمہاری فیملی اس کام کو اس اسکیل پر اور اتنے آگے نہ لے جاؤ گے۔ تم لوگوں کے کام سے درحقیقت بہت متاثر ہوا ہوں اور میری آخر بھی بھی وہی ہے۔ میں اس پر وینکٹ کے سلسلے میں تمہاری مدد کرنا چاہوں گا۔"

اس نے سنجیدگی سے فرقان سے کہا۔

"سالار! میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے کہ میں چاہوں گا، تم اسی طرح کا کوئی پروینکٹ وہاں کسی دوسرے گاؤں میں شروع کرو۔ تمہارے پاس مجھ سے زیادہ ذرا ہیں اور تم مجھ سے زیادہ اچھے طریقے سے یہ پروینکٹ چلا سکتے ہو۔"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا میرا مسئلہ وقت ہے، میں تمہارے بتاؤقت نہیں دے سکتا اور پھر میں پاکستان میں رہ بھی نہیں سکتا۔ تمہاری طرح میرے فیملی ممبرز بھی اس معاملے میں میری مدد نہیں کر سکتے۔" سالار نے اسے اپنا مسئلہ بتایا۔

"چلو اس پر بعد میں بات کریں گے، ابھی تو تم چائے پی پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر چاؤں گا۔" فرقان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟"

داخل ہوتے ہی بلند آواز میں سلام کیا اور پھر چند لوگوں کے ساتھ کچھ خیر مقدمی کلمات کا تبادلہ کیا پھر وہ ایک خالی کونے میں بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹر سید سید علی کہاں ہیں؟" سالار نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے دہم آواز میں پوچھا۔
 "آٹھ بیٹھے ہی وہ اندر آ جائیں گے، ابھی تو صرف سات بیٹھیں ہوئے ہیں۔" فرقان نے اس سے کہا۔

سالار گردن ہلا کر سرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں ہر عمر کے افراد تھے۔ چند عین اوج لڑکے، اس کے ہم عمر افراد، فرقان کی عمر کے لوگ، اور دیگر عمر۔۔۔ اور کچھ عمر رسیدہ بھی۔ فرقان اپنی دائیں طرف بیٹھے کسی آدمی کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔

فلک آٹھ بیٹے اس نے ساتھ بیٹھنے سال کے ایک آدمی کو ایک اندرونی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی توقع کے برعکس وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی بھی استقبال کے لئے اٹھنا کھڑا نہیں ہوا۔ آنے والے نے ہی سلام میں پہل کی تھی جس کا جواب وہاں موجود لوگوں نے دیا۔ آنے والے کے احترام میں کھڑا نہ ہونے کے باوجود سالار اب اچانک وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نشست کے انداز میں احترام دیکھ رہا تھا۔ وہ سب یکدم بہت چپکے اور محتاط نظر آنے لگے تھے۔

آنے والے یقیناً ڈاکٹر سید سید علی تھے۔ وہ کمرے کی ایک دیوار کے سامنے اس مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے جنہیں شاید ان ہی کے لئے چھوڑا گیا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔ ان کی رنگت سرخ و سفید تھی اور یقیناً جوانی میں وہ بہت خوبصورت ہوں گے۔ ان کے چہرے پر موجود داڑھی بہت لمبی نہیں تھی مگر بہت کھنی اور نفاست سے تراشی گئی تھی۔ داڑھی مکمل طور پر سفید نہیں ہوئی تھی اور کچھ لمبی حال ان کے سر کے بالوں کا بھی تھا۔ سفید اور سیاہ کے امتزاج نے ان کے چہرے اور سر پر موجود بالوں کو بہت ہادقار کر دیا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر دائیں طرف موجود کسی آدمی کا حال دریافت کر رہے تھے۔ شاید وہ کسی بیماری سے آٹھ کر آیا تھا۔ سالار نے چند ہی لمحوں میں ان کے سر آپے کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ اور فرقان باقی لوگوں کے عصب میں دیر کے ساتھ فلک لگے بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر سید علی نے اپنے پیچھے کا آغاز کیا۔ ان کا لب و لہجہ سبب حد شائستہ تھا اور انداز دہشیا تھا۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا، وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ سالار کو ان کے ابتدائی چند جملوں سے ہی اندازہ ہو گیا تھا وہ ایک غیر معمولی عالم کے سامنے تھا۔

ڈاکٹر سید سید علی شمر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

"انسان اپنی زندگی میں بہت سے خلیب و فراز سے گزرتا ہے۔ کبھی کمال کی بلندیوں کو چاچھوتا ہے، کبھی زوال کی گہرائیوں تک جا پہنچتا ہے۔ ساری زندگی وہ ان ہی دونوں انتہاؤں کے درمیان سُر

کر چار ہوتا ہے اور جس راستے پر وہ سفر کرتا ہے، وہ شکر کا ہو چاہے یا شکر کی کا۔ کچھ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ زوال کی طرف جائیں یا کمال کی طرف، وہ صرف شکر کے راستے پر ہی سفر کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو صرف ناشکری کے راستے پر سفر کرتے ہیں، چاہے وہ زوال حاصل کریں یا کمال اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ان دونوں راستوں پر سفر کرتے ہیں۔ کمال کی طرف جاتے ہوئے شکر کے اور زوال کی طرف جاتے ہوئے ناشکری کے۔ انسان اللہ کی ان گنت مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ اشرف مخلوقات ہے مگر مخلوق ہی ہے۔ وہ اپنے خالق پر کوئی حق نہیں رکھتا، صرف فرض رکھتا ہے۔ وہ زمین پر ایسے کسی ترکیب پر ایذا کے ساتھ نہیں آتا، اگر کیا کہ وہ اللہ سے کسی بھی چیز کو اپنا حق سمجھ کر مطالبہ کر سکے مگر اس کے باوجود اس پر اللہ نے اپنی رحمت کا آغاز جنت سے کیا، اس پر نعمتوں کی بارش کر دی تھی اور اس سب کے بدلے اس سے صرف ایک چیز کا مطالبہ کیا گیا شکر کا۔ کیا محسوس کرتے ہیں آپ اگر آپ کبھی زندگی میں کسی پر کوئی احسان کریں اور وہ شخص اس احسان کو یاد رکھے اور آپ کا احسان مند ہونے کے بجائے آپ کو ان مواقع کی یاد دلائے، جب آپ نے اس پر احسان نہیں کیا تھا آپ کو یہ بتائے کہ آپ کا احسان اس کے لئے کافی نہیں تھا۔ اگر آپ اس کے لئے" کہہ دیتے یا" وہ" کہہ دیتے تو زیادہ خوش ہوتا۔ کیا کریں گے آپ ایسے شخص کے ساتھ؟ وہ بارہ احسان کرنا تو ایک طرف، آپ تو شاید اس سے متعلق رکھنا تک پسند نہ کریں۔ ہم اللہ کے ساتھ یہی کرتے ہیں۔ اس کی نعمتوں اور رحمتوں پر اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے ہم ان چیزوں کے نہ ملنے پر کڑے رہتے ہیں، جنہیں ہم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اللہ بھر بھی بخیر ہے، وہ ہم پر اپنی نعمتیں نازل کرتا رہتا ہے۔ ان کی تعداد اس کے اعمال کے مطابق کی جاتی کرتا رہتا ہے کہ ان کے سلسلہ بھی کسی مکمل طور پر منقطع نہیں کرتا۔"

سالار ٹپکٹیں چمکاتے بغیر ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"شکر ادا نہ کرنا بھی ایک بیماری ہوتی ہے، ایسی بیماری جو ہمارے دلوں کو روز پر روز کشادگی سے ختمی کی طرف لے جاتی ہے جو ہماری زبان پر شکوہ کے علاوہ اور کچھ آتے ہی نہیں دیتی۔ اگر ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت نہ ہو تو ہمیں انسانوں کا شکر یہ ادا کرنے کی بھی عادت نہیں پڑتی۔ اگر ہمیں خالق کے احسانوں کو یاد رکھنے کی عادت نہ ہو تو ہم کسی مخلوق کے احسان کو بھی یاد رکھنے کی عادت نہیں سمجھ سکتے۔"

سالار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ناشکری کیا ہوتی ہے، کوئی اس سے زیادہ اچھی طرح نہیں جان سکتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھول کر ڈاکٹر سید سید علی کو دیکھا۔

پورے ایک گھنٹے کے بعد انہوں نے اپنا پیچہ ختم کیا، کچھ لوگوں نے ان سے سوال کے پھر لوگ

باری باری آٹھ کر جانے لگے۔

باہر سڑک پر لوگ اپنی گاڑیوں پر بیٹھ رہے تھے، وہ بھی اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ رات اب

گہری ہو رہی تھی۔ سالار کے کانوں میں ابھی بھی ڈاکٹر سیٹھ علی کی باتیں گونج رہی تھیں۔ فرقان گاڑی اشارت کر کے واپسی کا سفر شروع کر چکا تھا۔

سات دن پہلے وہ فرقان نامی کسی شخص سے واقف تک نہیں تھا اور سات دن میں اس نے اس کے ساتھ تعلقات کی بہت سی بیڑھیں بن گئی تھیں۔ اسے حیرت تھی وہ لوگوں کا عادی نہیں تھا۔ کچھ تعلقات اور روابط ابھی ابھی بن گئے تھے۔ کس وقت... کون کے... کہاں... کس لئے... گا اور زندگی میں کیا تبدیلی لے آئے گا یہ سب۔

وہ صرف ایک دن کے لئے لاہور آیا تھا، مگر وہ پاکستان میں اپنے قیام کے باقی دن اسلام آباد کے بجائے لاہور میں ہی گزار دیا تھا۔ اس دن وہ برسرِ روز فرقان کے ساتھ ڈاکٹر سیٹھ علی کے پاس جا ہوا۔ وہ ایک دن ابھی اس سے براہِ راست نہیں ملا۔ صرف ان کا نیچر سنٹا اور آٹھ کر آ جاتا۔

ڈاکٹر سیٹھ علی کی زندگی کا بڑا حصہ مختلف یورپی ممالک کی یونیورسٹیوں میں اسٹاک انٹیلیجنس اور اسلامک پریسز کی تعلیم دینے گزارا تھا۔ چھتیس برس پہلے وہ پاکستان میں یہاں کی ایک یونیورسٹی سے وابستہ تھے اور فرقان تقریباً پچاس سال سے اس عرصے سے انہیں جانتا تھا۔

جس دن اسے لاہور سے اسلام آباد اور پھر وہاں سے واپس واپس جانا تھا اس رات پہلی بار وہ نیچر کے شمع ہونے کے بعد فرقان کے ساتھ وہاں ٹھہر گیا۔ باری باری تمام لوگ کمرے سے نکل رہے تھے۔ ڈاکٹر سیٹھ علی کمرے سے اور کچھ لوگوں سے الوداعی مصافحہ کر رہے تھے۔

فرقان اس کے ساتھ ڈاکٹر سیٹھ علی کی طرف بڑھ آیا۔
ڈاکٹر سیٹھ علی کے چہرے پر فرقان کو دیکھ کر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں موجود آخری آدمی کو رخصت کر رہے تھے۔

”کیسے ہیں آپ فرقان صاحب!“ انہوں نے فرقان کو مخاطب کیا۔ ”بڑے دنوں کے بعد ڈکے آپ یہاں پر۔“

فرقان نے کوئی وضاحت دی پھر سالار کا تعارف کروایا۔

”یہ سالار سکندر ہیں، میرے دوست ہیں۔“

سالار نے اپنا نام سننے پر انہیں یک دم چونکے دیکھا اور پھر وہ کچھ حیران ہوئے مگر اگلے ہی لمحہ ان کے چہرے پر ایک بار پھر پہلے والی مسکراہٹ تھی۔ فرقان اب اس کا شخصی تعارف کر دیا تھا۔

”آئیے بیٹھے۔“ ڈاکٹر سیٹھ علی نے فرشی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ فرقان اور وہ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ وہ فرقان کے ساتھ اس کے پرہیزگار کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ سالار خاموشی سے باری باری ان دونوں کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ گفتگو کے دوران ہی ان کا ملازم اندر

آیا اور انہوں نے اسے کھانا لانے کے لئے کہا۔

ملازم نے اس کمرے میں دسرخوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ فرقان یقیناً پہلے بھی وہاں کئی بار کھانا کھاتا رہا تھا۔

وہ جب ہاتھ دھو کر کھانا کھانے کے لئے واپس کمرے میں پہنچا اور دسرخوان پر بیٹھا تو ڈاکٹر سیٹھ علی نے اچانک اسے مخاطب کیا۔

”آپ مسکراتے نہیں ہیں سالار؟“ وہ ان کے سوال سے زیادہ سوال کی نوعیت پر گزربوایا۔ کچھ ہونے لگا سا وہ انہیں دیکھتا رہا۔

”اس عمر میں اتنی سنجیدگی تو کوئی بہت مناسب بات نہیں۔“ سالار کچھ حیرانی سے مسکرایا، پھر وہ جبین صفت کی ملاقات میں وہ یہ کیسے جان گئے تھے کہ وہ مسکرانے کا عادی نہیں رہا تھا۔ وہ فرقان کی طرف دیکھ کر کچھ جھینپا، پھر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ یہ آسان کام؟ ہرگز نہیں ہوا۔

”کیا میرا چہرہ میرے ہر احساس کو ظاہر کرنے لگا ہے کہ پہلے فرقان اور اب ڈاکٹر سیٹھ علی مجھ سے میری سنجیدگی کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔“ اس نے سوچا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اتنا سنجیدہ نہیں ہوں۔“ اس نے ڈاکٹر سیٹھ علی سے زیادہ جیسے خود کو بتایا۔

”تمکن ہے ایسا ہی ہو۔“ ڈاکٹر سیٹھ علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد دونوں کو رخصت کرنے سے پہلے وہ اندر گئے۔ واپسی پر ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی وہ آپ انہوں نے سالار کی طرف بڑھا دی۔

”آپ کا تعلق معاشیات سے ہے، کچھ عرصے پہلے میں نے اسلامی اقتصادیات کے بارے میں یہ کتاب لکھی ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اسے پڑھیں تاکہ آپ کو اسلامی اقتصادی نظام کے بارے میں کچھ دیکھوا حقیقت حاصل ہو۔“

سالار نے کتاب ان کے ہاتھ سے پکڑ لی، کتاب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے دم آواز میں ڈاکٹر سیٹھ علی سے کہا۔

”میں واپس جا کر بھی آپ سے رابطہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے صرف اقتصادیات کے بارے میں نہیں سیکھنا چاہتا اور میری بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں۔“ ڈاکٹر سیٹھ علی نے نرمی سے اس کا کندھا چھو چھوایا۔

☆☆☆☆

”ڈاکٹر سیٹھ علی صاحب کے پاس جتنے کوئی بھی آتے ہیں وہ کسی نہ کسی حوالے سے کیونٹی ورک سے وابستہ ہیں۔ کچھ پہلے ہی اس کام میں انوالو ہوتے ہیں اور جو پہلے نہیں ہوتے وہ بعد میں ہو جاتے ہیں۔“

ڈاکٹر سید علی سے پہلی ملاقات کے بعد فرقان نے اسے بتایا۔

”ان کے پاس آنے والے زیادہ تر لوگ بہت گالیغالی ہیں۔ بڑے بڑے اداواروں سے وابستہ ہیں۔ میں بھی اتفاقاً ہی ان کے پاس جانا شروع ہوا۔ لندن میں ایک بار ان کا ایک پیچہ سنے کا اتفاق ہوا پھر پاکستان آنے پر ایک دوست کے توسط سے ان سے ملنے کا موقع ملا اور اس کے بعد سے میں ان کے پاس جا رہا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں میرے نظریات پہلے کی نسبت اب بہت صاف اور واضح ہیں۔ ذہنی طور پر بھی میں پہلے کی نسبت اب زیادہ مضبوط ہو گیا ہوں تم اس پر وینکٹ کے بارے میں پچھ رہے تھے۔ اس پر وینکٹ میں میری بہت زیادہ مدد ڈاکٹر سید علی کے پاس آنے والے لوگوں نے بھی کی۔ بہت ساری سہولیات انہیں لوگوں نے فراہم کیں اور میں یہاں اس قسم کے پروینکٹ پر کام کرنے والا واحد شخص ہوں اور ہم ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ اس مدد کی نعمت مختلف ہوتی ہے، مگر معتقد ایک ہی ہوتا ہے۔ ہم اس ملک کو تہذیب کرنا چاہتے ہیں۔“

سالار نے اس کے آخری جملے پر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”یہ اتنا آسان تو نہیں ہے۔“
”ہاں ہم جانتے ہیں یہ آسان کام نہیں ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں یہ سب ہماری زندگیوں میں نہیں ہو گا مگر ہم یہ بنیاد ضرور فراہم کر دینا چاہتے ہیں، جن پر ہمارے بیٹے اور ان کے بعد والی نسل تعمیر کرتی رہے۔ وہ انہی سے میں ٹانگہ کو نیاں نہارتی رہے۔ کم از کم مرتے ہوئے ہم لوگوں کو یہ احساس تو نہیں ہو گا کہ ہم لوگوں نے کتنا شائیں بھی زندگی گزار دی۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح ہم بھی صرف تخیل کرتے رہے۔ خرابیوں پر اٹھائیں اٹھاتے رہے۔ اسلام کو صرف مہدی کی حد تک ہی محدود کر کے بیٹھے رہے۔ اپنے اور دوسروں کی زندگیوں میں ہم نے کوئی تہذیب لانے کی کوشش نہیں کی۔“

وہ نرالی سے فرقان کا چہرہ دیکھتا ہوا تھا۔ امام باقر، جلال العصر، سعد کے بعد وہ ایک اور مسلمان کو دیکھ رہا تھا۔ ایک اور پرنیکٹ مسلمان کو وہ مسلمانوں کی ایک اور قسم سے آگاہ ہو رہا تھا۔ وہ مسلمان جو دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے، جو دونوں انتہاؤں کے بیچ کے راستے کو پیچھا سکتے تھے اور ان پر چلنے کا طریقہ جانتے تھے وہ بری طرح اٹھتا۔

”تم نے میری آفر کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ اس نے فرقان سے کہا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا میں تم سے کیا چاہتا ہوں۔ تمہاری ضرورت ہے اس ملک کو۔ یہاں کے لوگوں کو، یہاں کے اداواروں کو، جنہیں یہاں آکر کام کرنا چاہئے۔“

سالار اس بات پر ہلکے سے ہنسا ”تم بھی اس ٹانگہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اچھا میں اس پر سوچوں گا۔

پھر تم میری آفر کے بارے میں کیا کہو گے۔“

”میرے گاؤں کے قریب ہی ایک اور گاؤں ہے۔ اسی حالت میں جس حالت میں دس پندرہ

سال پہلے میرا گاؤں تھا۔ میں آج کل کوشش کر رہا تھا کہ کوئی وہاں پر اسکول بنادے۔ پر انگری اسکول تو گورنمنٹ کا وہاں ہے مگر آگے کچھ نہیں ہے۔ اگر تم وہاں اسکول شروع کرو تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔ میں اور میری جلیبی قہاری غیر موجودگی میں اسے دیکھیں گے۔ ہم اسے قائم کرنے میں بھی قہاری مدد کریں گے مگر پھر جنہیں خودی اسے چلانا ہو گا۔ صرف روپیہ فراہم کر دینا کافی نہیں ہو گا۔“ فرقان نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

”کل چل سکتے ہو۔ میرے ساتھ وہاں؟“ سالار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”قہاری تو فائنل ہے کل صبح۔“

”نہیں میں دو دن کے بعد چلا جاؤں گا۔ ایک بار میں چلا گیا تو فوری طور پر میرے لئے واپس آنا ممکن نہیں رہے گا اور میں جانے سے پہلے یہ کام شروع کر دینا چاہتا ہوں۔“

اس نے فرقان سے کہا۔ فرقان نے سر ہلادیا۔

☆.....☆.....☆

وہ اس رات کی فائنل سے اسلام آباد کے اور پھر رات کو ہی فرقان کے گاؤں چلے گئے۔ رات وہاں قیام کرنے کے بعد صبح فجر کے وقت فرقان کے ساتھ وہ اس گاؤں میں گیا۔ وہ پہر بارہ بجے تک وہ اس گاؤں کے لوگوں سے ملنے اور وہاں پھرتے رہے۔ وہاں موجود ہر انگری اسکول کو دیکھ کر سالار کو یقین نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی حالت سے کچھ بھی گت تھا مگر اسکول نہیں۔ فرقان کو اس کی طرح کوئی شک نہیں لگا تھا، وہ وہاں کے حالات سے پہلے ہی بہت اچھی طرح باخبر تھا۔ وہ سال میں تین چار مرتبہ مختلف دیہات میں میڈیکل کیس پس لگایا کرتا تھا اور وہ دیہات کی زندگی اور وہاں کی حالت سے سالار کی نسبت بہت اچھی طرح واقف تھا۔ فرقان کو شام کی فائنل سے واپس لاہور چاہتا تھا۔ وہ لوگ دوپہے کے قریب وہاں سے اسلام آباد جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

اسکول کے اس پروینکٹ کو شروع کرنے سے پہلے سکندر عثمان سے اس کی بات ہوئی تھی۔ اس نے مختصر افراط میں انہیں اس پروینکٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ کسی مدخلت کے بغیر اس کی بات سننے رہے پھر انہوں نے بڑی بے بندیگی سے اس سے کہا۔

”یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو تم؟“

”پاپا! میں اس کام کی ضرورت محسوس کرتا ہوں لوگوں کو۔“ انہوں نے سالار کی بات کاٹ دی۔

”میں اسکول کی بات نہیں کر رہا۔“

”پھر آپ کس چیز کی بات کر رہے ہیں؟“ وہ حیران ہوا۔

"میں تمہارے لائف اسٹائل کی بات کر رہا ہوں۔"

"میرے لائف اسٹائل کو کیا ہوگا؟" وہ چونکا۔ سکندر عثمان اسے دیکھتے رہے۔

"تم نے قرآن پاک حفظ کرنے کے بارے میں ہمیں اس وقت بتایا جب تم حفظ کر چکے تھے، اوکے فائن، میں نے کچھ نہیں کہا۔ تم حج پر جانا چاہتے تھے میرے اس سلسلے میں کچھ تحفظات تھے عمر میں نے تمہیں نہیں روکا۔ تم نے ہر طرح کی سوشل لائف ختم کر دی۔ میں نے اعتراض نہیں کیا۔ تم مذہب میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگے، نماز شروع کر دی وہ بھی مسجد میں۔ میں نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔ تم نے بڑس کر کے مجھے اب تک کہنا چاہا ہے وہ بھی یہاں نہیں امریکہ میں۔ میں نے تمہیں کرنے دی۔ اب تم ایک اسکول کھولنا چاہ رہے ہو۔ اب ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس تمام معاملے پر کچھ تجویز کیے سے بات کر لیں۔" سکندر عثمان بے حد مجیدہ تھے۔

"جہیں اندازہ ہے کہ تمہارا یہ لائف اسٹائل تمہیں ہمارے سوشل سرکل کے لئے ناقابل قبول بنا دے گا۔ پہلے تم ایک انتہا پر تھے اب تم دوسری انتہا پر ہو۔ بچیوں، چھتیس سال کی عمر میں جن کاموں میں تم اپنے آپ کو اٹھا کر رہے ہو وہ غیر ضروری ہیں۔ تمہیں اپنے کیریئر پر دھیان دینا چاہئے اور اپنے لائف اسٹائل میں تبدیلی لانی چاہئے۔

ہم جس کا اس سے تعلق رکھتے ہیں وہاں مذہب سے ایسی وابستگی بہت سے مسائل پیدا کر دیتی ہے۔" وہ سر جھکانے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

"اور صرف تمہارے لئے ہی نہیں، ہمارے لئے بھی بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ تم خود سوچو تم لوگوں کو کیا امپریشن دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ کل کو ہم یا تم خود جب اپنی نکاح کی کسی اچھی فیملی کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہو گے تو تمہاری بے مذہبی وابستگی تمہارے لئے کتنے مسائل پیدا کرے گی جہیں اندازہ ہے۔ کوئی بھی فیملی سکندر عثمان کا نام دیکھ کر تمہاری کوالیفیکیشنز دیکھ کر اپنی بیٹی کی شادی تم سے نہیں کر دے گی۔ اوپر سے تم نے اس عمر میں سوشل ورک شروع کرنے کی ضمان لی ہے جب تمہاری عمر کے لوگ اپنے کیریئر کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں تو تم بے کیفیت میں بہت سوشل ورک کرتے رہے ہو اتنا کافی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ تم یہ سب کچھ اپنی پرسل لائف میں بھی شروع کر دو۔ جو چیز تم اس اسکول کے لئے محفوظ کرو۔ انہیں آسائش دینے کے لئے شائع کرو گے اسے تم اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرو۔ انہیں آسائش دینے کے لئے ایک آرام دہ لائف اسٹائل دینے کے لئے۔ اپنے آپ پر خرچ کرو، تین سو سال کی زندگی نہیں ہے تمہاری، پھر اچھی سی عمر میں بڑھاپے کو کیوں سوار کر لیا ہے تم نے اپنے اعصاب پر۔ ایک حادثہ ہو رہا ہو۔ تم نے سبق سیکھا۔ بہت اچھا کیا۔ بس اتنا کافی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اس عمر میں فیصلہ کر لو۔" وہ زور سے۔ "کیا میری بات کو

کچھ رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"پاپا! میں نے فیصلہ نہیں کیڑی ہے۔" سالار نے ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "آپ نے زندگی میں توازن رکھنے کی بات کی میں وہ توازن ہی رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے کیریئر میں کہاں پر کھڑا ہوں آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ میری کارکردگی سے آپ واقف ہیں۔" "میں واقف ہوں اور اسی لئے تم سے کہہ رہا ہوں کہ اگر تم اس طرح کی سرگرمیوں میں خود کو اتار دو تو تم بہت آگے جا سکتے ہو۔" سکندر نے کہا۔

"میں کہیں نہیں جا سکتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہ سب کچھ چھوڑ دوں تو کیریئر کی کسی ماڈٹت اور سب تک پہنچ جاؤں گا، تو ایسا نہیں ہے۔" اس نے توقف کیا۔ "تم اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچو۔ اپنی شادی کے بارے میں، ایسی اپروچ رکھو کہ تم کو کہاں قبول کیا جائے گا۔"

"میں نے سوچا ہے پاپا! میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔" سکندر فحشے۔ "بچکانہ سوچ ہے۔ ہر ایک یہی کہتا ہے۔ تمہیں تو اپنا "ایڈوکیٹر" یاد رکھنا چاہئے۔" ان کا اشارہ کس طرف تھا وہ جانتا تھا وہ بہت دیر کچھ نہیں کہہ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ وہ اس ایڈوکیٹر کی وجہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے یاد ہے۔" بہت دیر بعد اس نے دم آواز میں کہا۔ "میں آپ کے سوشل سرکل میں بہت پہلے ہی کسی فنٹ ہو چکا ہوں اور میں یہاں جگہ بنانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے اس سوشل سرکل میں کوئی نیا تعلق پارشہ بھی قائم نہیں کرنا۔ مجھے پروا نہیں کہ لوگ، میرے بہن بھائی، میرا مذاق اڑائیں گے یا مجھ پر ہنسیں گے۔ میں اس سب کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوں۔ جہاں تک سوال اس پر وجہت کا ہے۔ پاپا مجھے اسے شروع کرنے دیں۔ میرے پاس بہت چیز ہے۔ اس پر وجہت کو شروع کرنے کے بعد مجھے فیصلہ فٹ چھ پر رہنا نہیں پڑے گا۔ کچھ لوگوں کو جسم کی بیماری ہوتی ہے، کچھ کو روح کی۔ جسم کی بیماری کے لئے لوگ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ روح کی بیماری کے لئے لوگ وہی کرتے ہیں جو میں کر رہا ہوں۔ جو میں چیک کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس پیسے سے سب کچھ خرید سکتا ہوں صرف سکون نہیں خرید سکتا۔ زندگی میں جیکل ہا میں سکون حاصل کرنے کے لئے اس پیسے کو انویسٹ کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے سکون مل جائے۔" سکندر عثمان کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے کیا کہیں۔

والیس وہاں تفتیش پہنچ کر وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح مصروف ہو گیا تھا مگر اس بار فرق یہ تھا کہ وہ مسلسل پاکستان میں فرغانہ اور ڈاکٹر سید علی کے ساتھ رابطے میں تھا۔ فرغانہ اسے اسکول کے بارے میں ہونے والی تصدیقات سے آگاہ کر جا رہا تھا۔

یو سیف میں اس طرح کا کام اس کی جاب کا حصہ تھا۔ اسے اس کام کے لئے بہت اچھا معاوضہ دیا جاتا تھا مگر پاکستان کے اس گاؤں میں اس طرح کے کام کا آغاز اور وہ بھی اپنے وصال سے۔ چند سال پہلے کے سالار سکندر کو جاننے والے بھی ابھی اس بات پر یقین نہیں کرتے۔ خود اسے بھی یقین نہیں آتا تھا کہ وہ بھی اس طرح کا کام کرنے کا موقع ملتا تھا مگر یہ صرف اس پر وجہ کے لئے اپنے اکاؤنٹ سے پیسہ لگا لے ہونے سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے لئے یہ پروجنیکٹ کم از کم مالی لحاظ سے مشکل نہیں تھا۔

پچھلے تین سال میں اس کے اخراجات میں بہت کمی آگئی تھی۔ بہت ساری وہ چیزیں اس کی زندگی سے اٹھ گئی تھیں جن پر وہ عوامی حد پیسہ خرچ کرتا تھا۔ وہ اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع رقم جان کر حیران ہو گیا تھا۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا جس سے پیسہ جمع کرنے کی توقع کی جاسکتی، ایم فل کے لئے اس کے پاس اسکالرشپ تھا۔ اسے کم از کم اس کے لئے اپنے پاس سے کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس دن اپنے پارٹنرٹ میں چلنے پھرنے اس نے پہلی بار وہاں موجود تمام چیزوں کو غور سے دیکھا تھا۔ اس کے پارٹنرٹ میں کہیں بھی کوئی بھی بھیجی چیز نہیں تھی بلکہ سامان بھی بہت محدود تھا۔ اس کا جتن بھی کھانے پینے کی چیزوں سے تقریباً خالی تھا۔ کافی چائے، دو دو اور اسی طرح کی چند دوسری چیزیں۔ اس کا اپنے پارٹنرٹ میں بہت کم وقت گزرتا تھا جو وقت گزرتا تھا وہ سونے میں گزارتا۔

یو سیف میں اپنی جاب پر جاتے ہوئے بھی اس کے پاس پہلے سے موجود کپڑوں اور دوسری اشیاء کا اتنا انبار موجود تھا کہ وہ اس معاملے میں بھی لاپرواہی پر تیار رہا۔ اسے ابھی طرح یاد تھا کہ اس نے آخری بار اس طرح کی کوئی چیز کب خریدی تھی۔ اپنے ساتھ کام کرنے والوں اور پینڈرٹش میں اپنے کچھ کلاس فیلوز کے علاوہ وہ نیویارک میں کسی کو نہیں جانتا تھا پھر وائس طور پر اس نے خود کو ایک محدود سرکل میں رکھا تھا اور ان لوگوں کے ساتھ بھی اس کی دوستی بہت دور کی تھی۔

واحد چیز جس پر وہ رقم خرچ کرتا تھا وہاں کتابیں تھیں۔ اس کا لائف اسٹائل کے ساتھ اگر اس کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع ہو گئی تھی تو یہ کوئی خلاف توقع بات نہیں تھی۔ آفس، یہ نیو یارک، فلیٹ۔ اس کی زندگی کے معمولات میں چوتھی چیز کوئی نہیں تھی۔

☆☆☆

ایم فل کے دور ان سالار نے یو سیف چھوڑ کر پینیکو جوائن کر لیا۔

ایم فل کرنے کے بعد سالار کی پستنگ جیس میں ہو گئی۔ اس سے پہلے وہ ایک فیلڈ آفس میں کام

کر رہا تھا مگر اب اسے پینیکو کے بیٹے کو اس میں کام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ وہ گذشتہ سالوں میں وقتاً فوقتاً چھوٹے موٹے پرائیکٹس کے سلسلے میں جیس جاتا رہا تھا مگر اس بار وہ پہلی دفعہ ایک لمبے عرصے کے لئے وہاں جا رہا تھا۔ ایک آشنایا سے آشنایا نہیں، اس دنیا میں جہاں وہ زبان تک سے واقف نہیں تھا۔ نیویارک میں اس کے بہت سے دوست تھے، یہاں پر ایسا کوئی بھی نہیں تھا جسے وہ بہت اچھی طرح جانتا ہو۔

یو سیف میں کسے جانے والے ان تھک کام کی طرح وہ یہاں آکر ایک بار پھر اسی طرح کام کرنے لگا تھا مگر اسلام آباد کے قومی علاقے میں شروع کیا جانے والا وہ اسکول یہاں بھی اس کے ذہن سے نحو نہیں ہوا تھا۔ بعض دفعہ اسے حیرت ہوتی کہ اپنی جاب میں تعلیم سے اتنا کھرا تعلق ہونے کے باوجود آخر اسے کبھی فرغانہ کی طرح وہ اسکول کھولنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اگر اس اسکول کے بارے میں وہ کئی سال پہلے سوچ لیتا تو شاید آج یہ اسکول بہت عظیم بنیادوں پر کھڑا ہوتا۔

”مجھے پاکستان سے زیادہ محبت تھیں، یہ سبھی اس کے لئے میں کوئی گہری اہمیت نہ رکھتا ہوں۔“ اس نے شروع کی خاقات میں ایک بار فرغانہ سے کہا تھا۔

”کیوں؟“ فرغانہ نے پوچھا تھا۔

”کیوں کا جواب تو میں نہیں دے سکتا، بس پاکستان کے لئے کوئی خاص احساسات میرے دل میں نہیں ہیں۔“ اس نے کندھے سے اچکا کر کہا تھا۔

”یہ جاننے کے باوجود کہ یہ تمہارا ملک ہے؟“

”ہاں، یہ جاننے کے باوجود۔“

”امریکہ کے لئے خاص احساسات ہیں، امریکہ سے محبت ہے؟“ فرغانہ نے پوچھا۔

”نہیں، اس کے لئے بھی میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

فرغانہ نے اس بار جرات سے اسے دیکھا۔ ”دراصل میں وطنیت پر یقین نہیں رکھتا۔“ اس نے فرغانہ کو حیران رکھ کر وضاحت کی۔

”یہ پھر بیان عینکوں کے لئے محبت پیدا کرنے میں وقت محسوس ہوتی ہے، جہاں میں رہتا ہوں۔ میں کبھی گل تیسرے ملک میں رہنے لگوں گا تو امریکہ کو بھی یاد نہیں کروں گا۔“

”تم بڑے عجیب آدمی ہو سالار!“ فرغانہ نے بے اختیار کہا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنے ملک کے لئے پاس جگہ کے لئے کوئی خاص احساسات ہی نہ رکھے جسے دور ہوتا ہے۔“

فرغانہ کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا مگر اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ جس آنے کے بعد اسے نیویارک کی کوئی چیز یاد نہیں آئی تھی۔ نیویارک آتے ہوئے بھی اسے وہاں اپنے جیشنٹ کا

کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ وہ ہریانہ کی پچھلی تھا۔

☆.....☆

وہ ان دنوں یونائیٹڈ نیشنز کے زیر اہتمام ہونے والی کسی ریجنل کانفرنس کے سلسلے میں پاکستان آیا ہوا تھا۔ دوپہل کا نئی نیشنل میں ضمیرا ہوا تھا۔ اسے وہاں ایک بڑی شہرت کے ادارے میں کچھ میچرز دینے تھے اور فرقان کے ساتھ اپنے اسکول کے سلسلے میں کچھ امور کو بھی طے کرنا تھا۔

وہ لاہور میں اس کے قیام کا تیسرا دن تھا۔ اس نے رات کا کھانا کچھ جلدی کھا لیا اور اس کے بعد وہ کسی ضروری کام سے ہوئی ہے باہر نکل آیا۔ شام کے ساڑھے سات ہو رہے تھے۔ رات رواں چا جاتے ہوئے اچانک اس کی گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا۔ ڈرائیور گاڑی سے اتر کر ٹائر کو دیکھنے لگا۔ چند منٹوں کے بعد اس نے سالار کی کھڑکی کے پاس آکر کہا۔

”سر گاڑی میں دوسرا ٹائر موجود نہیں ہے۔ میں آپ کے لئے کوئی ٹیکسی لاتا ہوں۔ آپ اس پر چلے جائیں۔“ سالار نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

”نہیں، میں خود ٹیکسی روک لیتا ہوں۔“ وہ کہتا ہوا آؤٹر کی کچھ دور ایک پارکنگ میں کچھ ٹیکسیاں نظر آ رہی تھیں۔ سالار کا رخ اسی طرف تھا جب ایک کار نے یک دم اس کے پاس آکر بریک لگائی۔ گاڑی سامنے سے آئی تھی اور اس کے رکنے پر سالار نے فٹ پاتھ پر چلے ہوئے اس میں پیشہ شخص کو ایک نظر میں ہی پہچان لیا۔

وہ عارف تھا۔ وہ اب گاڑی کی ڈرائیوگ بیٹھ سے اتر رہا تھا۔ لاہور میں کچھ سال پہلے اس کی سرگرمیوں کا وہ ایک مرکزی کردار تھا۔ عارف اور اکمل۔ وہ ان ہی دنوں کے ساتھ اپنا زیادہ وقت گزارا کرتا تھا اور اس سے سالار کی دو پاروہا کات کئی سالوں کے بعد ہو رہی تھی۔ وہ ان سب کو چھوڑ چکا تھا۔ پاکستان یا لاہور آنے پر بھی اس نے کبھی ان کے ساتھ رہا رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان لوگوں نے چھپتے کئی سالوں میں بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کی کوششوں کے باوجود سالار ان سے بچنے کی کوششوں میں کامیاب رہا تھا۔

اور اب اتنے سالوں کے بعد وہ یک دم اس طرح اچانک اس کے سامنے آ گیا تھا۔ سالار کے اعصاب یک دم تن گئے۔ عارف بڑے جوش و خروش کے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔

”سالار! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ تم ہو۔۔۔۔۔ کہاں عارف تھے اتنے سالوں سے؟ تم تو کدو سے کے سر سے سینک کی طرح عائب ہو گئے تھے۔ کہاں تھے بار بار اور اب یہاں کیا کر رہے ہو۔ علیہ ہی بدل لیا ہے، کہاں گئے وہ بال، لاہور میں کب آئے ہو، آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“

اس نے یکے بعد دیگرے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے سالار کے انداز میں جھٹکنے والی

سر دھری پر غور نہیں کیا تھا۔ سالار کے جواب دینے سے پہلے ہی عارف نے دوبارہ پوچھا۔

”یہاں سال پر کیا کر رہے ہو؟“

”گاڑی خراب ہو گئی تھی، میں ٹیکسی کی طرف جا رہا تھا۔“ سالار نے کہا۔

”کہاں جا رہے ہو، میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ عارف نے بے تکلفی سے کہا۔

”نہیں، میں چلا جاؤں۔ ٹیکسی پاس ہی ہے۔“ سالار نے تیزی سے کہا۔

عارف نے اس کی بات کی ان سنی کر دی۔

”چلو اور بیٹھو۔“ اس نے بازو پکڑ کر بھیج لیا۔ سالار شیشا لین اس کی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا موڈ اب بہت خراب ہوئے لگا تھا۔

”تم تو ٹیلیفون پڑھنے چلے گئے تھے اور پھر مجھے بتا چلا کہ تم نے وہاں جا ب کر لی ہے پھر اچانک

پاکستان کیسے؟“ عارف نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا پھنسیاں گزارنے آئے ہو؟“

”ہاں! سالار نے مختصر کہا۔ وہ اس طرح اس سے جان چھڑا سکتا تھا۔

”کیا کر رہے ہو آج کل؟“ عارف نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔

”یونائیٹڈ نیشنز کی ایک ایجنسی میں کام کر رہا ہوں۔“

”یہاں لاہور میں کہاں ٹھہرے ہو؟“

”پٹی سی میں۔“

”اے پی سی میں کیوں ٹھہرے ہو، میرے پاس آتے یا مجھے فون کرتے۔ کب آئے یہاں؟“

عارف نے کہا۔

”کل۔“

”بس تو پھر تم میرے ساتھ، میرے گھر دو گے۔ ضرورت نہیں ہے ہوٹل میں رہنے کی۔“

”نہیں، میں کل صبح اسلام آباد واپس جا رہا ہوں۔“ سالار نے روانی سے جھوٹ بولا۔ وہ عارف

سے ہر قیمت پر جان چھڑا لیتا چاہتا تھا۔ اسے اس نے ابھنچن ہو رہی تھی یا شاید یہ اس کے ساتھ گزارا

جاننے والا ماضی تھا جو اسے تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔

”اگر کل اسلام آباد واپس جا رہے ہو تو پھر آج میرے ساتھ رہو۔ کھانا کھاؤ میرے ساتھ گھر

چل کر۔“ عارف نے آخر کی۔

”کھانا دس منٹ پہلے ہی کھا کر نکلا ہوں۔“

”پھر بھی میرے ساتھ گھر چلو۔ تمہیں اپنی بیوی سے ملاؤں گا۔“

”شادی ہو گئی تمہاری؟“

"ہاں، تین سال ہوئے۔" عارف نے کہا۔ پھر پوچھا۔
 "اور تم... تم نے شادی کر لی؟"
 "نہیں۔"
 "کیوں؟"

"بس کچھ مصروفیت تھی اس لئے۔" سالار نے کہا۔

"اٹل ابھی آزاد ہی پھر رہے ہو۔" عارف نے ایک گہرا سانس لیا۔ "خوش قسمت ہو۔" سالار نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ عارف نے اس سے بات کرتے ہوئے گلوکپارمنٹ کھول کر اندر سے ایک کیسٹ نکالی چائی۔ اس کا حصان زرا پھٹکا اور کیسٹ نکالتے نکالتے گلوکپارمنٹ سے بہت سی جج جی سالار کی گود اور پیچھے اس کے پیروں میں گر پڑیں۔

"too bad" عارف نے بے اختیار کہا۔ سالار جھک کر پیڑیں اٹھانے لگا۔ عارف نے گاڑی کے اندر کی لائٹ جلادی۔ وہ ان پیڑوں کو سیٹ پر گلوکپارمنٹ میں رکھنے لگا تھا جب وہ ٹھک گیا کسی نے اس کے جسم میں جیسے کرنٹ سا دوڑا دیا۔ گلوکپارمنٹ کے ایک کونے میں وہ ایرنگز پڑے تھے۔ سالار کے ہاتھوں میں بے اختیار لرزش آگئی۔ پایاں ہاتھ بڑھا کر اس نے ان ایرنگز کو پا کر نکال لیا۔ وہ اب اس کے ہاتھ کی پتلی پر گاڑی کے اندر ملتی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ بہت سال پہلے اس نے ان ایرنگز کو کسی کے کالوں میں دیکھا تھا۔ ایک بار... دو بار... تین بار... چوتھی بار وہ انہیں اب دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ ابام ہاشم کے ایرنگز تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے کانڈ پر ان کا زیر امان اتار سکتا تھا۔ ہر بیچ وہ تم کو... عارف نے اس کی پتلی سے وہ ایرنگز اٹھا لئے۔ کسی نے جیسے سالار کا سکتہ توڑ دیا تھا۔ عارف ان ایرنگز کو ایک بار پھر گلوکپارمنٹ میں رکھ رہا تھا۔

"یہ ایرنگز..." وہ آنکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہاری بیوی کے ہیں؟" سالار نے اپنے سوال کو مکمل کیا۔

"بیوی کے؟" عارف ہنسا۔ "تم آن پڑا بیوی کے ہوتے تو میں یہاں رکھتا۔" سالار پچلیں بچکے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

"پھر؟" اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

"پارے ایک گرل فرینڈ میری، کچھ رات میرے ساتھ تھی۔ یہ ایرنگز میرے بیڈ روم میں چھوڑ دی۔ کچھ ایمرجنسی میں ہی جانا پڑا اسے کیونکہ وہ اپنا ہسپتال آگئی تھی۔ میں نے یہ ایرنگز لا کر گاڑی میں رکھ دیے کیونکہ آج میرا اس کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔" عارف بڑی بے تکلفی سے اسے بتا رہا تھا۔

"گرل فرینڈ؟" سالار کے حلق میں جیسے پھنسا لگا۔

"ہاں، گرل فرینڈ۔ ریڈ لائٹ ایریا کی ایک لڑکی ہے۔ اب اوپر ڈینس میں شفت ہو گئی ہے۔"
 "کیا... کیا تم سے اس کا... ابام ریڈ لائٹ ایریا کی لڑکی تو کبھی نہیں ہو سکتی۔ یقیناً مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے عارف کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"صوبہ..." عارف نے اس کا نام بتایا۔ سالار نے چہرہ موڑ کر ہاتھ میں بکڑی چیزیں گلوکپارمنٹ میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ اسے وہ علاقہ فہمی ہوئی تھی۔ عارف گاڑی کی لائٹ آف کر چکا تھا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سالار نے گہرا سانس لیا۔

"مگر یہ اس کا اصلی نام نہیں ہے۔" عارف نے بات جاری رکھی۔ "اصلی نام اس کا ابام ہے۔" سالار کے کالوں میں کوئی دھماکا ہوا تھا یا پھر یہ پھلکا ہوا سیسہ تھا جو کسی نے اس کے کالوں میں اڑھیل دیا تھا۔

عارف اب اسٹیرنگ پر تھوڑا آگے جھکے ہوئے کالوں میں دوسرا سیٹ لائٹ سے جارا ہوا تھا۔

"تم نے... تم نے... کیا کہا؟" سالار کی آواز میں لرزش تھی۔

"کیا کہا؟" عارف نے سر ہٹ کاٹش لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

"نام بتا رہے تھے تم اس کا؟"

"ہاں، ابام... تم جانتے ہو اسے؟" عارف نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ سالار کو دیکھا۔ کڑکی کا شیشہ اب نے کھول دیا تھا۔ سالار یک ٹک اسے دیکھتا رہا یوں جیسے وہ عارف کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ایرنگز اب اس کی مٹھی کی گرفت میں تھیں۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں یا تم جانتے ہو اسے؟"

عارف نے ہونٹوں سے مسکراہٹ اگلیوں میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"میں... میں..." سالار نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ اپنی آواز اسے کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔ ریڈ لائٹ ایریا وہ آخری جگہ تھی جہاں اس نے کبھی ابام سے ہونے کا تصور کیا تھا۔

گاڑی کے اندر چلتے دہلی روشنی میں عارف نے بہت غور سے دیکھا۔ اس کے زرد پڑے ہوئے چہرے کو اس کے ہاتھ کی بند مٹھی کو اس کے کپکپاتے ہونٹوں کو اس کے بے ربط، بے معنی انکسوں کو۔ عارف مسکرایا۔ اس نے اس کے کندھے پر تسلی آمیز انداز میں جھکی دی۔

"ذمت داری یا ریکارڈ گھر ابام ہے، وہ صرف گرل فرینڈ ہے میری۔ اگر تمہارے اور اس کے درمیان بھی کچھ ہے تو کوئی بات نہیں، ہم تو پہلے ہی بہت کچھ شیئر کیا کرتے تھے، یاد ہے تمہیں۔" عارف نے قہقہہ لگایا پھر اس نے بارود میں تلپتی جھکی۔

”یہ تو پھر لڑکی ہے۔“

مال روڈ پر کشادہ تھا۔ عارف سنبھری رہا کہ گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ دونوں کے ساتھ ساتھ سالار نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اسٹیبلش پر موجود شخص پر جھپٹنے کی صورت میں خود اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے لمبے لمبے میں عارف کو ٹھکے سے بکڑ لیا۔ عارف گاڑی کاؤس سے اختیار پر یک پر آیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے لڑی۔ دودھوں پوری قوت سے ڈرائیو بورڈ سے ٹکرائے۔ سالار نے اس کے کار کو نہیں چھوڑا۔ عارف خود اس بات کی حالت میں چلا۔

”کیا کر رہے ہو تم؟“ اس نے سالار کے ہاتھوں سے اپنا لگا چھڑانے کی کوشش میں اسے دہرائے کی کوشش کی۔ ”پاگل ہو گئے ہو؟“

"How dare you talk like that."

سالار جواباً فرمایا: اس کے ہاتھ ایک بار پھر عارف کی گردن پر تھے۔ عارف کا سانس رُک گیا۔ اس نے کچھ ٹپٹپے اور کچھ حواس باطنی کے عالم میں سالار کے من پر مکا مارا۔ سالار بے اختیار ہچکچاتا کر پچھنے ہوتا۔ اس کے دونوں ہاتھ اب اپنے من پر تھے۔ عارف کی گاڑی کے پیچھے موجود گاڑیاں باران پر بارن سے رہی تھیں۔ وہ سڑک کے وسط میں کھڑے تھے اور یہ ان دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس طرح ایک ایک گاڑی رُکنے پر پہنچے آئے وہی گاڑی ان سے نہیں گزرتی تھی۔

سالار دونوں ہاتھوں سے اپنا جہاز اچکا رہے ہوئے اپنی سیٹ پر دیر اترے ہوا تھا۔ مائکف نے اپنے ہوش و
خواس کو قابو میں رکھتے ہوئے گاڑی کو پیچھے آگے ایک سستان و فیلی سڑک پر موڑنے ہی ایک طرف
روک لیا۔ سالار جب تک سیدھا چلا چکا تھا اور اپنی ایک ہاتھ کی پتیلی سے دونوں اور جہزے کو دبا رہے
وہ نظر اُسکریں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے کا اشتعال اب غائب ہو چکا تھا۔

مالک نے گاڑی روکی۔ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کی طرف مڑا اور کہا "کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔ میرے گلے کیوں پڑ رہے تھے، میں نے کیا کیا ہے؟"

بلند آواز میں بات کرتے کرتے اس نے ڈیڑھ گھنٹے سے ٹشو پائپس کا اٹھا کر سالار کی طرف پڑھایا۔ اس نے سالار کی شرٹ پر خون کے چند قطرے دیکھ لئے تھے۔ سالار نے یکے بعد دیگرے دو ٹشو لٹال لئے اور ہونٹ کے اس کونے کو صاف کرنے لگا جہاں سے خون ریس رہا تھا۔

”کلاسیک ایکٹیوٹ ہو جاتا ابھی۔“ عارف نے کہا۔ سالار کو ہاتھ صاف کرتے ہوئے دو بارہ ابرو غمزہ خیال آیا۔ اس نے نیک دم جبکہ کرپانیان میں ابرو غمزہ صوفیانا شروع کر دیا۔

"فٹ یا تم پر گاڑی چڑھ جاتی ہے۔"

عاکف بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”گھاڑھوٹھرے ہو؟“

”وہا پر رگنرز۔“ سالار نے مختصر کہا۔

عالم ہے اختیار جھٹایا۔

”کیا پر اہلم ہے سالار امیری گول فریڈ ہے، اس کے ایر رنگر ہیں، میرا پر اہلم ہے یہ ایر رنگر کیا اس کا پر اہلم ہے تمہارا نہیں۔“ سالار دم رنگ گیا۔ اسے اپنی ناقص حرکت کا احساس ہوا۔ وہ مسدود ہوا۔ گول فریڈ گیا۔ لشکر کو کڑی سے باہر پھینکتے ہوئے اسے دم ٹھٹھا محسوس ہو رہا تھا۔

عاکف ماتھے پر ہل لئے اس کو دیکھ رہا تھا۔

”تمہارا اور منور کا کوئی.....“ عا کلف بات کرتے کرتے تھکا ہوا انداز میں رک گیا۔ وہ اندازہ نہیں کر پاتا تھا کہ کچیل پر اس کے جملے میں ایسا کون سا لفظ تھا جس نے اسے مشتعل کیا تھا۔ وہ دوبارہ لفظی ڈھیرانا نہیں چاہتا تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ سالار نے اس کے زکے پر کہا۔

”لو کے فائن۔“ عاکف کچھ مطمئن ہوا۔ ”تم اور صنوبر۔“ وہ پھر رُک گیا۔

”تم نے کیا قصدا اس کا نام امام ہے۔“ سالار نے گروں کو مود کر اس کا چہرہ دیکھا۔ عاکفہ کو بے اختیار اس کی آنکھوں سے خوف آیا۔ وہ کسی پرتل شخص کی آنکھیں نہیں تھیں۔ وحشت... بے جا رگی... خوف... وہ ہر تار نے ہوئے تھیں۔

”ہاں، اس نے ایک بار مجھے بتایا۔“

" 472

”اس کا طلیہ بتا سکتے ہو مجھے؟“ سالار نے موہوم سی اُمید کے ساتھ کہا۔

”ہاں، کیوں نہیں۔“ عارف گز بڑلا۔ ”بہت خوب صورت ہے۔“ fair..... tall ”عارف اب
 اٹھنے لگا۔ ”کھانی آگئیں ہیں، ہاں بھی کچلے کٹے آپ ڈالنی کئے ہوئے ہیں اس نے اور کیا بتاؤں۔“
 زنجی ہوا۔

سالار نے آنکھیں بند کر کے وٹہ اسکرین کی طرف چہرہ کر لیا۔ تھکن سیکھ اور بڑھ گئی تھی۔

”امام ہاشم ہے اس کا نام ؟“ وہ غڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”پتا نہیں، باپ کا نام تو نہیں بتایا اس نے۔ نہ ہی میں نے پوچھا۔“ عاکف نے کہا۔

”امام باقر علیہ السلام ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ”یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں ذمہ دار ہوں اس سب کچھ کا۔“

”کس چیز کے ذمہ دار ہو تم؟“ عاکف کو تجسس

"صاحب! میرے ساتھ چلو، ہر عمر کی لڑکی ہے میرے پاس۔ اس علاقے کی سب سے اچھی لڑکیاں۔ قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔" اس کے ساتھ ایک آدمی چلتے نکلا۔

"میں اس لئے یہاں نہیں آیا ہوں۔" سالار نے دم آواز میں اس پر نظر ڈالے بغیر کہا۔

"کوئی ایک چاہئے، کوئی ڈرگ، میں سب کچھ سپائی کر سکتا ہوں۔"

حاکم نے یک دم قدم روک کر قدرے اکڑے ہوئے انداز میں اس آدمی سے کہا۔ "تمہیں ایک بار کہا ہے تاکہ ضرورت نہیں پھر پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔"

اس آدمی کے قدم ختم گئے۔ سالار خاموشی سے چلا رہا۔ اس کا ذہن کسی آمدنی کی زد میں آیا ہوا تھا۔ امام باشم وہاں کب، کیسے آگئی تھی۔ باشمی ایک قلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے آیا تھا۔

"پلیز، تم ایک بار۔۔۔ ایک بار اس کو جا کر میرے بارے میں سب کچھ بتاؤ، اس سے کہو مجھ سے شادی کر لے۔ اس سے کہو، مجھے کسی سچی کی ضرورت نہیں ہے، صرف ایک ہم ہے۔ اس کو تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ دو گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ وہ اتنی محبت کرتا ہے ان کے لئے۔"

اس نے بہت سال پہلے اپنے بیٹے پر شہ دراز جیپس کھاتے ہوئے موہاں خوں پر بڑے اطمینان کے ساتھ اس کو جھٹکتے سنا تھا۔

"ہاں، اوہ، تم امام کے کیا جانتے ہو؟"

"میں۔۔۔؟ میں اور امام بہت گہرے اور پرانے فریڈز ہیں۔" جلال انصر کے ماتھے پر ہل پڑ گئے تھے۔ سالار نے عجیب سی سرشاری محسوس کی۔ جلال اس وقت امام اور اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہو گا۔ وہ اچھی طرح اندازہ کر سکتا تھا۔

"اس سے جا کر صاف صاف کہہ دو کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔"

وہ جلال انصر کا یہ پیغام سننے ہوئے امام باشم کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے جھوگم کے تہل بناتے ہوئے امام کو موہاں پر خردی تھی۔

"تم نے مجھ پر اتنے احسان کئے ہیں، ایک احسان اور کرو۔ مجھے طلاق دے دو۔" وہ فون پر گڑ گڑاتی تھی۔

"نہیں، میں تم پر احسان کرتے کرتے تھک گیا ہوں، اب اور احسان نہیں کر سکتا اور یہ والا احسان۔۔۔ یہ تو ناممکن ہے۔" اس نے جراہ کیا تھا۔

"تم طلاق چاہتی ہو، گوہر میں جا کر لے لو مگر میں تو جیپس طلاق نہیں دوں گا۔"

سالار کے حلق میں پھندے لگتے گئے۔

"ہاں، میں نے یہ سب کچھ کیا تھا لیکن میں نے، میں نے جلال انصر کی تلاطمی گوہر کر دیا تھا۔ میں

نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا، کچھ بھی نہیں چھپایا۔ میں نے صرف ایک مذاق کیا تھا، ایک پریکٹیکل جوک۔ میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ امام کے ساتھ یہ سب کچھ ہو۔" وہ پیسے کسی عدالت میں اس کڑا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی اسے طلاق نہیں دے کر۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ میں نے پھر بھی یہ خواہش تو نہیں کی تھی کہ وہ یہاں آجیتے۔ میں نے۔۔۔ میں نے اسے گھر چھوڑنے سے روکا تھا،

میں نے مذاق میں ہی اسکی گمراہی دہ کی آخر بھی کی تھی۔ میں تو اس کو یہاں لے کر نہیں آیا تھا۔ کوئی مجھے تو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا اس سب کا۔"

وہ بے رہا جھولوں میں وضاحتیں دے رہا تھا۔ اس کے سر میں سلسلہات ہوئے تھے قلمی۔ درد کی ایک تیز مگر مانوس سی لہر تیر گئی (آدھے سر کا درد کا ایک اور ایک۔ وہ چلتے چلتے زکا، ہوت تھپتھپے ہوئے اس نے بے اختیار اپنی کینٹی کو مسلا، درد کی لہر گزر گئی تھی۔ آکھیں کھول کر اس نے کلمی کے بچہ و خم کو دیکھا۔

وہ انجمنی گئی تھی، کم از کم اس کے لئے اور امام باشم کے لئے۔ اس نے قدم آگے بڑھائے۔ حاکم ایک چوہا سے فرائیگر کے سامنے رک گیا تھا۔ اس نے مڑ کر سالار کو دیکھا۔

"یہی کھر ہے۔" سالار کا چہرہ دیکھ کر درد زدہ ہو گیا۔ قیامت اب اور تھی دور دورہ گئی تھی۔

"اوپر کی منزل پر جانا ہے، صورتہ اوپر ہی ہو گی۔" حاکم کہتے ہوئے ایک طرف موجود تھک اور ٹائریک سی میز حیاں چڑھ گئے۔ سالار کو جھکی میز سی پر ہی غور کر گئی۔ وہ بے اختیار جھکا حاکم نے مڑ کر اسے دیکھا اور رک گیا۔

"احتیاط سے آؤ، میز جیوں کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اوپر سے یہ لوگ بلب لگوانے کے بھی رد اور نہیں۔" سالار سیدھا ہو گیا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر اوپر والی میز پر قدم رکھا۔ میز حیاں

ہل کھا کر گولائی کی صورت میں اوپر جا رہی تھیں اور اتنی تھک تھیں کہ صرف ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ ان کی سینٹ بھی اکڑی ہوئی تھی۔ وہ پوٹ پینے کے باوجود ان کی خستہ حالت کو جانچ

سکتا تھا جس دیوار کا سہارا لے کر وہ میز حیاں چڑھ رہا تھا۔ اس دیوار کی سینٹ بھی اکڑی ہوئی تھی۔ سالار انھوں کی طرح دیوار ٹوٹتے ہوئے میز حیاں چڑھنے لگا۔

بیلی منزل کے ایک دروازے کے کھلے ہوئے پتے سے آنے والی روشنی نے سالار کی رہنمائی کی تھی۔ حاکم وہاں آکھیں نہیں تھا۔ یقیناً وہ دروازہ پار کر کے آگے چلا گیا تھا۔ سالار چند لمحوں کے لئے وہاں

رکا پھر اس نے دبلیز کے بار قدم رکھا۔ وہ اب ایک چوہا بارے میں تھا۔ ایک طرف بہت سے کمروں کے دروازے تھے۔ دوسری طرف نیچے کی نظر آ رہی تھی۔ برآمدے نما لہجہ بارہاں خالی تھا۔ تمام کمروں

کے دروازے اسے وہاں کھڑے بند ہی لگ رہے تھے۔ حاکم کہاں گیا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے بہت جلد انداز میں اپنے قدم آگے بڑھائے۔ یوں پیسے وہ کسی بھوت بھنگے میں آ گیا تھا۔ ابھی کوئی دروازہ

کھٹا اور امام باقرؑ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی۔

”میرے خدا! میں اس کا سامنا یہاں کیسے کروں گا۔“ اس کا دل ڈوبا۔

وہ ان بندہ و ازوؤں پر نظر ڈالنے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ جب اس پر آدھے کے آخری سرے پر ایک دروازے میں سے عارف نکلا۔

”تم کہاں رو گئے ہو۔“ وہ جیس سے چند آواز میں بولا۔ ”یہاں آؤ۔“

سالار کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ سالار دروازے تک پہنچنے سے پہلے چند لمبے کے لئے رُک گیا۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن کی آواز باہر تک سن رہا تھا پھر آنکھیں بند کر کے سر دھاتوں کی مٹھائیں بچھتے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں عارف ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ ایک لڑکی اپنے بالوں پر برش کرتے ہوئے عارف سے باتیں کر رہی تھی۔

”یہ امام نہیں ہے۔“ بے اختیار سالار کے منہ سے نکلا۔

”ہاں، یہ امام نہیں ہے۔ وہ اندر ہے۔ آؤ۔“ عارف نے اُٹھتے ہوئے ایک اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ سالار غیر ہواد قدموں سے اس کے پیچھے گیا۔ عارف اگلے کمرے کو بھی پا کر گیا اور ایک اور دروازہ کھول کر ایک دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”بیٹو صوبہ!“ سالار نے دور سے عارف کو کہتے ہوئے سنا۔ اس کا دل اچھل کر قلع میں آ گیا۔ ایک لمبے کے لئے اس کا جی چاہا وہ پاں سے بھاگ جائے۔ ابھی اسی وقت..... سر پہ..... ادھر ادھر دیکھے بغیر..... اس کمرے..... اس علاقے سے..... اس شہر سے..... اس ملک سے..... دوبارہ کبھی وہاں کا رخ تک نہ کرے..... اس نے گردن موڑ کر اپنے عقب میں موجود دروازے کو دیکھا۔

”آؤ سالار!“ عارف نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اب گردن موڑے اندر کسی لڑکی سے معروف گفتگو تھا۔ سالار نے تھوک لگایا، اس کا قلع کا نٹوں کا جنگل بن گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ عارف نے اپنی پشت پر اس کے قدموں کی آواز سنی تو دروازے سے ہٹ گیا۔ سالار دروازے میں تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

”یہ ہے صوبہ۔“ عارف نے عارف کو دیا۔ سالار اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ وہ بھی اس پر نظریں ہٹائے ہوئے تھی۔

”امام؟“ وہ بے حس و حرکت اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”ہاں امام!“ عارف نے تصدیق کی۔

سالار ٹھٹھوں کے بل زمین پر گر پڑا۔ عارف گھبرا گیا۔

”کیا ہوا کیا ہوا؟“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے جبکہ میں تھا۔ وہ ایک طوائف کے

کوٹھے پر سجدے میں گرنے والا پہلا مرد تھا۔

عارف بچوں کے بل بیٹھا اسے کندھے سے پکڑے ہار رہا تھا۔ سالار سجدے میں بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

”پانی..... پانی لاؤں؟“ صوبہ گھبراتے ہوئے تیزی سے بیٹے کے سر ہانے پڑے جبکہ اس کی طرف گئی اور گلاس میں لے کر سالار کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”سالار صاحب! آپ پانی پیئیں۔“

سالار ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا یوں بیٹے اسے کرٹ لگا ہوا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بیگا ہوا تھا۔ کچھ کے بغیر اس نے اپنی جھڑکی جبب سے والٹ نکالا اور پانکوں کی طرح اس میں سے کرسی ٹوٹ نکال کر صوبہ کے سامنے رکھ دیا اس نے والٹ چند سینکڑوں میں خالی کر دیا تھا۔ اس میں کریٹ کارڈز کے علاوہ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ پھر وہ کچھ کے بغیر اٹھ کھڑا ہوا اور آلے قدموں دروازے کی دہلیز سے شوکر نکلتا ہوا باہر نکل گیا۔ عارف بکا بکا اس کے پیچھے آیا۔

”سالار! سالار! کیا ہوا ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟“

اس نے سالار کو کندھے سے پکڑ کر دوڑنے کی کوشش کی۔ سالار وحشت زدہ اس سے اپنے آپ کو چھڑانے لگا۔

”چھوڑو مجھے۔ ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے جانے دو۔“

وہ بلند آواز میں روتے ہوئے جہاں انداز میں چلا گیا۔

”امام سے ملنا تھا تمہیں۔“ عارف نے اسے یاد دلایا۔

”یہ امام نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے امام باقر۔“

”تو ٹھیک ہے۔ مگر میرے ساتھ جانا ہے تمہیں۔“

”میں چلا جاؤں گا۔ میں چلا جاؤں گا۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“ وہ آلے قدموں اپنا کندھا اس سے چھڑا کر بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ عارف زبردست کچھ بڑبڑایا۔ اس کا موڈ آگے ہو گیا تھا۔ مگر کمرہ صوبہ کے کمرے میں گھس گیا جو اب بھی جبرانی سے لوٹوں کے ڈھیر کو دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

سیڑھیاں اب بھی اسی طرح تاریک تھیں مگر اس بار وہ جس ذہنی حالت میں تھا اسے کسی دیوار، کسی سہارے، کسی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اندھا حدن ان تاریک سیڑھیوں سے نیچے بھاگا اور بری طرح گر گیا۔ اگر سیڑھیاں سیدھی ہوتیں تو وہ سیدھا نیچے جا کر گرنا مگر سیڑھیوں کی گولائی نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ اندھیرے میں ایک بار بچھا۔ ٹھٹھوں اور ٹھٹھوں میں اُٹھنے والی ٹھٹھوں سے بے پروا اس نے

دوبارہ اسی طرح بھاگے ہوئے سیز حیاں اترنے کی کوشش کی۔ چند سیز حیاں اترنے کے بعد لٹائی جانے والی چٹانگ نے اسے بجز زمین ہوس کیا تھا۔ اس بار اس کا سر بھی دوبارہ سے ٹکرایا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اس کی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ شاید سیز حیاں کی تعداد زیادہ ہوئی تو وہ پھر تیسری بار اٹھ کر اس طرح سیز حیاں اترنے کی کوشش کر تا تھا۔ دوسری بار سیز حیاں سے گرنے کے بعد وہ نیچے والی سیز حیاں پر آ گیا تھا۔ سامنے لٹکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ سیز حیاں سے ٹکل آیا مگر اسے نہیں جاسکا۔ چند قدم آگے چل کر اس گھر کے باہر تھوڑے پر پڑ گیا۔ اسے تھکی محسوس ہو رہی تھی۔ سر کو تھامتے ہوئے بے اختیار اسے اپائی آئی دو تھوڑے پر بیٹھے بیٹھے جھک گیا، وہاں کیاں کرتے ہوئے بھی اسی طرح رو رہا تھا۔ گلی میں سے گزرنے والے لوگوں کے لئے یہ عین ناخوشی تھا۔ یہاں بہت سے شرابی اور لٹکی ضرورت سے زیادہ نشہ استعمال کرنے کے بعد یہیں سب کچھ کیا کرتے تھے۔ صرف سالار کا لباس اور طیلہ تھا جو اسے کچھ مہذب و حکمران تھا اور اس کے آسواہ اور دیوار کسی طرف اٹک کی بے وفائی کا نتیجہ تھا شاید وہاں کی بارش کی مراد واپس ہی مہذب اور معزز نظر آنے والے مرد و اسی طرح روتے ہوئے جاتے تھے۔ طوائف کا گھارہا ہر کسی کو اس نہیں آتا۔ گزرنے والے طرے مکر اہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ اس بار میں حال احوال جاننے کا رواج نہیں تھا۔

حاکم پہنچے نہیں آیا تھا۔ آج تو شاید سالار کے پاس ٹک جاتا۔ امام باہم نہیں تھیں تھیں۔ صورت پر امام باہم نہیں تھی۔ کتابا بوجہ اس کے کندھوں سے اٹھا لیا گیا تھا، کبھی لڑتے سے اسے چٹایا گیا تھا۔ تکلیف دے کر اسے آگئی نہیں دی گئی۔ صرف تکلیف کا احساس دے کر اسے آگئی سے شیارا کر دیا گیا تھا۔ اسے وہاں نہ دیکھ کر وہاں حالت میں جا پہنچا تھا۔ وہاں وہاں دیکھ لیتا تو اس پر کیا کرتی تھی۔ اسے اللہ سے خوف آ رہا تھا بے پناہ خوف۔ وہ کسی قدر نا طور تھا کیا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی قدر مہربان تھا۔ کیا نہیں کرتا تھا۔ انسان کو انسان رکھنا اسے آتا تھا۔ کبھی غصہ نہیں، کبھی احسان نہیں۔ وہ اس کے دواڑے میں ہی رہتا تھا۔

اسے کبھی اپنی زندگی کے اس سیاہ باب پر اتنا کچھتاؤ، اتنی غرت نہیں ہوئی جتنی اس وقت ہو
سکتی تھی۔

”کیوں؟ کیوں؟..... کیوں آتا تھا میں یہاں پر؟..... کیوں خریدتا تھا میں ان عورتوں کو.....؟ کیوں لگاؤ کا احساس میرے اندر نہیں جاتا تھا؟“ وہ چپوڑے پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے ہلکے ہاتھ۔

”اور اب..... اب جب میں یہ سب کچھ چھوڑ چکا ہوں تو اب..... اب کیوں..... یہ
 (کلیف) یہ جیسا ہو رہی ہے مجھے۔ میں جانتا ہوں۔ جانتا ہوں مجھے اپنے ہر عمل کے لئے جواب دہ ہونا

ہے، مگر یہ حساب یہاں اس طرح نہ لے۔ جس عورت سے میں محبت کرتا ہوں اسے کبھی اس بازار میں نہ پھینک۔“

وہ روتے روتے رُککا۔ کون سا انکشاف کہاں ہو رہا تھا۔

”محبت؟“ دوکلی سے گزرتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے بے یقینی سے بڑبڑایا۔

”کیا میں..... میں اس سے محبت کرتا ہوں؟“ کوئی لہر اس کے سر سے پیروں تک کڑی تھی۔

”کیا یہ تکلیف صرف اس لئے ہو رہی ہے مجھے کہ میں اس سے اس کے چہرے پر سائے

لہرائے تھے۔ "کیا دو میرا بچتا و انہیں ہے۔ کچھ اور ہے.....؟"

اسے لگا دو وہاں سے بھی اُنھ نہیں پائے گا۔

”تو یہ چچھتا، انہیں محبت ہے، جس کے پیچھے میں بھاگتا پھر رہا ہوں۔“ اسے اپنا قسم دیتے کہ جتنا

-6127

”امامہ پھانس نہیں ہے روگ ہے؟“ آنسو اب بھی اس کے گالوں پر بہ رہے تھے۔

”اور اس بازار میں اس عورت کی تلاش میں اُچھٹے میرے قدموں میں لرز اس نے کسی یونانی

میں نے اسے اپنے دل کے بہت اندر نہیں بہت اونچی جگہ پر رکھا تھا۔ وہاں، جہاں خود میں ہی اس کو

از تانیا تھا۔

کسی نے ہلکا سا قبضہ لگایا پھر کچھ کہا۔ ایک دوسری آواز نے جواب کچھ کہا۔ سالار سکندر کے حواس آہستہ آہستہ کام کرنے لگے تھے۔ متضاح صحن زدہ۔ مگر آوازوں کو شناخت کرنا ہوا تو بہن۔

بہت آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اسے حیرانی نہیں ہوئی۔ اسے سنیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ بائبل یا کسی فلینک کے ایک کمرے میں ایک بیل پر تھا۔ بے حد نرم اور آرام دہ بیڈ، اس سے کچھ فاصلے پر فرقان کسی دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ کھڑا بجلی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔ فرقان اور دوسرے ڈاکٹر نے گردن موڑ کر باتیں کرتے اسے دیکھا جو دو دونوں اس کی طرف چلے آئے۔ سالار نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں کھار کھانا سے مشکل لگ رہا تھا۔ فرقان نے پاس آکر نرمی سے اس کے سینے کو تھپتھپایا۔

”کیسے ہو اب سالار؟“

سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے مسکراتے کی کوشش نہیں کی۔ صرف چہرے غالی اللہ بنی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔

”فان۔“ اس نے کہا۔

دوسرا ڈاکٹر اس کی نبض دیکھنے میں مصروف تھا۔

سالار نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ فرقان اور دوسرا ڈاکٹر آپس میں ایک بار پھر گفتگو میں مصروف تھے۔ اسے اس گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے کسی بھی چیز میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ احساسِ جرم، پچھتاوا، عافیت، مسخیر۔ امام۔ ریلے لائٹ ایریا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اس کا دل چاہا کاش وہ اب بھی ہوش میں نہ آتا۔

”تو سالار صاحب۔! اب کچھ تشہیل گفتگو ہو جائے آپ کے ساتھ۔“ اس نے فرقان کی آواز پر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس کے بیڈ کے بالکل قریب ایک اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر باہر چاچکا تھا۔ سالار نے اپنی ناگوں کو سینے کی کوشش کی۔ اس کے منہ سے کراہ اٹھی۔ اس کے نغنے اور گھٹنوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر کھل قہارہ نہیں دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس کو اندازہ تھا کہ اس کے نغنے اور گھٹنے پر کچھ لینا ہوا تھا۔ وہ اپنے کپڑوں میں بھی نہیں تھا بلکہ مریضوں کے لئے مخصوص لباس میں تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ سالار نے بے اختیار کراہ کر ناگ سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

”sprained ankle دو دونوں گھٹنوں اور calf پر کچھ خراشیں اور سوجن مگر خوش قسمتی سے کوئی فریکچر نہیں۔ بازوؤں اور کندھوں پر بھی کچھ Bruises خوش قسمتی سے پھر کوئی فریکچر نہیں۔ سر کے ہائیں پچھلے حصے میں چھوٹا سا ٹکڑی سی بلینڈنگ، مگر سی ٹی اسکین کے مطابق کوئی سیریس انجری نہیں۔ سینے

پر بھی رگڑی وجہ سے معمولی خراشیں مگر جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے کہ کیا ہوا ہے؟ تو یہ تم بتاؤ کہ کیا ہوا ہے؟“

فرقان کسی باہر ڈاکٹر کی طرح بات کرتے کرتے بولا۔ سالار چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

”میں پہلے سمجھتا رہا کہ میکرین کا ایک اشتادہ یہ کہ تم بے ہوش ہو گئے مگر بعد میں تمہارا چیک اپ کرنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ ایسا نہیں تھا۔ کیا کسی نے حملہ کیا تھا تم پر؟“ وہ اب عجیبہ تھا۔ سالار نے ایک گہرا سانس لینے ہوئے سر کو جھکا۔

”تم مجھ تک کیسے پہنچے بلکہ میں یہاں کیسے پہنچا؟“

”میں تمہارے موبائل پر جنہیں کال کر رہا تھا اور تمہارے بجائے کسی آدمی نے وہ کال ریسیو کی، وہ اس وقت فٹ پاتھ پر تمہارے قریب تھا۔ جنہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے تمہاری حالت کے بارے میں بتایا۔ اچھا آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جنہیں کسی ٹیکسی میں کسی قریبی ہاسٹل لے جائے۔ وہ لے گیا پھر میں وہاں پہنچ گیا اور جنہیں یہاں لے آیا۔“

”ابھی کیا وقت ہے؟“

”صبح کے تھے نہ رہے ہیں۔ سمیر نے جنہیں رات کو بین گھر روئے تھے اسی لئے تم ابھی تک سو رہے تھے۔“

فرقان کو بات کرتے کرتے احساس ہوا کہ وہ دلچسپی نہیں لے رہا۔ اس کی نظروں میں ایک عجیب سی سرد مہری فرقان کو محسوس ہوئی تھی۔ یوں جیسے فرقان اسے کسی تیسرے شخص کی حالت کے بارے میں بتا رہا تھا۔

”تم مجھے دو بارہ۔“ سالار نے اسے خاموش ہوتے ہوئے دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ پھر قدرے آہستہ آہستہ انداز میں رکا۔ آنکھیں بند کیں جیسے ذہن پر زور دے رہا ہو۔

”ہاں۔ کوئی ٹرانکو لائزر دے دو۔ میں بہت لمبی ٹینڈ سوچنا چاہتا ہوں۔“

”سوچنا۔۔۔ گمریے تو بتاؤ۔۔۔ ہو آیا تھا؟“

”کچھ نہیں۔“ سالار نے تیز آواز سے کہا۔

”میکرین۔۔۔ اور میں فٹ پاتھ پر گر پڑا، مگر نے سے چسپ لگ گئیں۔“

فرقان نے اسے غور سے دیکھا۔

”کچھ کھاؤ۔“

سالار نے اس کی بات کاٹی۔ ”نہیں۔۔۔ بھوک۔۔۔ نہیں ہے۔ تم بس مجھے کچھ دو۔۔۔ ٹیبلٹ، انکشن، کچھ بھی، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“

"اسلام آباد تمہارے گھر والوں۔"

سالار نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"نہیں اطلاع مت کرنا۔ میں جب سو کر اٹھوں گا تو اسلام آباد چلا جاؤں گا۔"

"اس حالت میں؟"

"تم نے کہا ہے میں ٹھیک ہوں۔"

"ٹھیک ہو مگر اسے بھی ٹھیک نہیں ہو۔ دو چار دن آرام کرو۔ یہیں رہو لاہور میں، پھر چلے جانا۔"

"اچھا پھر تم پاپا کو پڑی می کو اطلاع مت دینا۔"

فرقان نے کچھ اٹھے ہوئے انداز میں اسے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر چند مل آ گئے۔ "اچھا۔"

اور..... کچھ.....؟

"کریکولائزر....."

فرقان اسے سوچتے ہوئے دیکھنے لگا۔

"میں رہوں تمہارے پاس۔"

"قائدہ.....؟ میں تو ابھی سو جاؤں گا۔ تم جاؤ۔ جب میں آٹھوں گا تو تمہیں کال کروں گا۔"

اس نے بازو کے ساتھ اپنی آنکھیں دھانپ لیں۔ اس کے انداز میں موجود روکے پن اور

سردمیری نے فرقان کو کچھ اور پریشان کیا۔ اس کا رویہ بہت انداز تھا۔

"میں سمیر سے بات کرتا ہوں، مگر کریکولائزر چاہئے تو پہلے تمہیں کچھ کھانا ہو گا۔" فرقان نے

اٹھتے ہوئے دو نوک انداز میں کہا۔ سالار نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا۔

دوبارہ اس کی آنکھ جس وقت کھلی اس وقت شام ہو رہی تھی۔ کمرہ خالی تھا۔ اس کے پاس کوئی بھی

نہیں تھا۔ وہ جسمانی طور پر مٹا سے زیادہ تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اپنی آنکھوں سے کھل کو پرے پھینک کر

اس نے لینے لینے ہائیں لٹے اور گھٹنوں میں اٹھتی ہوئی ٹیٹوں کو ٹھہرا کر دیکھتے ہوئے ناگوں کو سیکڑ لیا۔

اسے اپنے اندر ایک عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی گھٹن جیسے کسی نے اس کے سینے کو جکڑ لیا ہو۔

وہ اسی طرح لینے لینے چھت کو گھورتا رہا پھر پیسے اسے کوئی خیال آیا۔

☆ ☆ ☆

وہ ہوٹل آکر اپنا سامان پیک کر رہا تھا جب فرقان نے دروازے پر دستک دی۔ سالار نے دروازہ

کھول دیا۔ فرقان کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی اس کے پیچھے آجائے گا۔

"عجیب انسان ہو تم سالار....." فرقان اسے دیکھتے ہی ناراضی سے بولنے لگا۔

"میں کسی کو تائے بغیر سمیر کے کلینک سے چلے آئے، مجھے پریشان کر دیا۔ اوپر سے موہاگل کو بھی

آف کر رکھا ہے۔"

سالار نے کچھ نہیں کہا۔ وہ نظر اٹھا ہوا ایک بار پھر اپنے بیگ کے پاس آگیا۔ جس میں دو اپنا چریرا

پیک کر رہا تھا۔

"تم جا رہے ہو؟" فرقان بیگ دیکھ کر چو لگا۔

"ہاں.....! سالار نے ایک لفظی جواب دیا۔

"کہاں.....؟" سالار نے بیگ کی زپ بند کر دی اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"اسلام آباد؟" فرقان اس کے سامنے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔

"نہیں.....؟" سالار نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر.....؟"

"کراچی جا رہا ہوں۔"

"کس لئے؟" فرقان نے حیرانی سے پوچھا۔

"فلائٹ ہے صبری۔"

"صبری کی؟"

"ہاں.....!"

"چار دن بعد ہے تمہاری فلائٹ، ابھی جا کر کیا کر گئے؟" فرقان اسے دیکھنے لگا۔ سمیر کا اندازہ

ٹھیک تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بے حد عجیب تھے۔

"کام ہے مجھے وہاں۔"

"کیا کام ہے؟"

وہ جواب دینے کے بجائے بیڈ پر بیٹھا پلکیں جھپکائے بغیر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ فرقان

سناٹا کو جھٹ نہیں تھا۔ پھر بھی سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی آنکھوں کو پڑھنے میں اسے کوئی مشکل نہیں

ہوئی۔ سالار کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف سردمیری تھی۔ یوں جیسے وہ کسی کو جانتا ہی نہ ہو۔

اسے اور اپنے آپ کو بھی۔ وہ ڈپر پس تھا۔ فرقان کو کوئی شبہ نہیں تھا مگر اس کا ڈپریشن اسے کہاں لے جا

رہا تھا۔ فرقان یہ جاننے سے قاصر تھا۔

"تمہیں آخر کیا پریشانی ہے سالار؟" وہ پوچھتے بغیر نہیں رہ سکا۔

سالار نے توقف کیا۔ پھر کندھے جھٹکے۔

"کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"تو پھر....." سالار نے فرقان کی بات کاٹ دی۔

”تم جانتے ہو مجھے میگرین ہے۔ کبھی کبھار اس طرح ہو جاتا ہے مجھے۔“
 ”میں ڈاکٹر ہوں سالار! فرقان نے جلیبی کی ہے۔“ میگرین کو کوئی مجھ سے زیادہ بہتر نہیں جانتا۔ یہ سب کچھ صرف میگرین کی وجہ سے نہیں تھا۔

”تو تم بتا دو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ سالار نے اُنکاس سے سوال کیا۔
 ”کسی لڑکی کا پر اہلم ہے؟“ سالار ٹکلیں ہنپک نہیں سکا۔ فرقان کہاں جانا چاہتا تھا۔
 ”ہاں۔“ وہ جیسے جانتا اس نے ”نہیں“ کیوں نہیں کہا تھا۔
 ”کسی میں انوالو ہو تم؟“ فرقان کو اپنے اندازے کے صحیح ہونے پر جیسے یقین نہیں آیا۔
 ”ہاں۔“

فرقان بہت دیر چپ بیٹھا۔ لہا لہاں جیسے اپنی بے یقینی پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔
 ”کس کے ساتھ انوالو ہو؟“
 ”تم سے نہیں جانتے۔“

”شادی نہیں ہو سکی تمہاری اس کے ساتھ؟“ سالار اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔
 ”ہو گئی تھی۔“ اس کے لیے میں آجی تھی۔
 ”شادی ہو گئی تھی؟“ فرقان کو پھر یقین نہیں آیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“
 ”پھر۔۔۔۔۔ طلاق ہو گئی؟“ اس نے پوچھا۔
 ”نہیں۔“
 ”تو۔۔۔۔۔“ سالار کے پاس آگے بٹانے کے لئے کچھ نہیں تھا۔
 ”تو جس۔۔۔۔۔“

”بس کیا۔۔۔۔۔؟“ سالار اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی دائیں ہاتھ میں

موجوہ دل کی گھیر پر پھیرتا رہا۔
 ”کیا نام ہے اس کا؟“ فرقان نے دم آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ ایک بار پھر اسی طرح گھیر کو

چھوتے ہوئے بہت دیر خاموش رہا۔ بہت دیر۔۔۔۔۔ پھر اس نے کہا۔
 ”امام باہم۔“ فرقان نے بے اختیار سانس لیا۔ اسے اب کچھ میں آیا کہ وہ اس کی چھوٹی بیٹی کو
 ڈیڑھوں کے حساب سے حقے خائف کیوں دیا کرتا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں جب سے سالار سے اس کی
 شناسائی ہوئی تھی اور سالار کا اس کے گھر آنا جانا شروع ہوا تھا سالار اور امامہ کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ وہ
 پاکستان سے جانے کے بعد بھی اسے وہاں سے کچھ نہ کچھ بجوا تار پٹتا تھا کہ فرقان کو آخر صرف ایک بات

پر چیرائی ہوتی تھی۔ وہ کبھی امامہ کا نام نہیں لیتا تھا اور خود اس سے بات کرتا تو اسے نام کے بغیر مخاطب
 کرتا رہتا۔ فرقان کو چند ایک بات پر یا بہت محسوس ہوتی تھی مگر اس نے اسے نظر انداز کر دیا تھا لیکن اب
 امامہ باہم کا نام سن کر وہ جان گیا تھا کہ وہ کیوں اس کا نام نہیں لیتا تھا۔

وہ اب رک رک کر کبے بارہا جملوں میں، مدھم آواز میں اسے اپنے اور امامہ کے بارے میں بتا رہا
 تھا۔ فرقان دم سادھے سن رہا تھا۔ جب وہ سب کچھ بتانے کے بعد خاموش ہوا تو دیر تک فرقان بھی کچھ
 نہیں بول سکا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ تسلی دے یا پھر کچھ اور کہے۔ کوئی سمجھتے۔
 ”تم سے بھول جاؤ۔“ اس نے ہلکا خر کہا۔ ”سوچ لو کہ وہ جہاں بھی ہے خوش اور محفوظ ہے۔ ضروری
 نہیں اس کے ساتھ کوئی سامنے ہی ہوا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ بالکل محفوظ ہو۔“ فرقان کہہ رہا تھا۔ ”تم نے اس
 کی مدد کی تھی، جس حد تک تم کر سکتے تھے، کیجئے انہوں نے اپنے آپ کو نکال لو۔ اللہ مدد کرتا ہے۔ تمہارے
 بعد ہو سکتا ہے اسے تم سے بہتر کوئی اور مل گیا ہو۔ تم کیوں اس طرح کے رویے لے بیٹھے ہو۔ میں نہیں
 سمجھتا کہ جلال سے اس کی شادی نہ ہونے کی وجہ تم تھے، جو کچھ تم نے مجھے جلال کے بارے میں بتایا ہے
 میرا اندازہ تو یہی ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں امامہ سے شادی نہ کرنا چاہے تم سچ میں آتے نہ آتے۔
 کوشش کرتے نہ کرتے۔ جہاں تک امامہ کو طلاق نہ دینے کا سوال ہے اسے چاہئے تھا وہ تم سے وہ بارہ
 راہبہ کرتی۔ وہ ایسا کرتی تو تم یقیناً اسے طلاق دے دیتے۔ اگر اس معاملے میں تم سے کوئی غلطی ہوئی تھی
 بے تواہدہ جیسا معاف کر دے گا کیونکہ تم پیچھے تار ہے ہو۔ تم اللہ سے معافی بھی مانگتے آ رہے ہو۔ یہ کافی
 ہے مگر اس طرح ڈپریشن کا شکار ہونے سے کیا ہو گا۔ تم اپنے آپ کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کرو۔“
 وہ بڑی دہشتی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ سالار کی خاموشی سے اسے امید بندھی کہ شاید اس کی کوشش
 رنگ لاری تھی مگر ایک لمبی تقریر کے بعد جب وہ خاموش ہوا تو سالار اٹھ کر اپنا ریف کپس کھولنے لگا۔
 ”کیا کر رہے ہو؟“ فرقان نے پوچھا۔

”میری فکارت کا نام ہو رہا ہے۔“ وہ اب اپنے ریف کپس میں سے کچھ بھجڑ نکال رہا تھا۔ فرقان
 کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے کیا کہے۔

☆.....☆.....☆

وہ پچھلے کئی سالوں میں کئی بار پاکستان آتا جاتا رہا تھا اسے کبھی واپس جاتے ہوئے اس قسم کی کیفیات
 کا شکار نہیں ہوا نہ اپنا جس قسم کی کیفیات کا شکار وہاں بارہا ہوا تھا۔ جہاز کے ٹیک آف کے وقت ایک عجیب
 سا غلیظ پن تھا، جو اس نے اپنے اندر اترتے محسوس کیا تھا۔ اس نے جہاز کی کھڑکی سے باہر بھٹکا۔ بہت دور
 تک پھیلے ہوئے اس غلیظ میں نہیں امامہ باہم کا نام کی ایک لہر بھی تھی۔ وہ وہاں رہتا تو کبھی کبھی کسی وقت
 کسی روپ میں وہ اسے نظر آ جاتی۔ اسے لگ جاتی۔ یا کوئی ایسا شخص اسے لگ جاتا جو اس سے واقف ہو تا لیکن

وہ اب جہاں چارہ تھا اس زمین پر امامہ ہاشم نہیں تھیں تھی۔ کوئی اتفاق بھی ان دونوں کو آمنے ناسنے نہیں لاسکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر ایک لمبے عرصے کے لئے "امکان" کو چھوڑ کر چارہ تھا۔ وہ زندگی میں کتنی بار "امکان" کو چھوڑ کر چارہ ہے گا۔

دس منٹ کے بعد پانی سے ٹریکو لا نذر کو نکلتے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی میں کہیں بھی نہیں کھڑا تھا۔ وہ زندگی میں بھی نہیں کھڑا ہوا ہے گا۔ اس کے پیروں کے نیچے زمین بھی نہیں آ سکتی گی۔

ساتویں منزل پر اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ وہاں چاہا نہیں چاہتا تھا وہ کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ کہاں.....؟

اس نے اپارٹمنٹ کے دروازے کو لاگ کیا۔ لاؤنج میں بڑے ٹی وی کو آن کیا۔ سی این این پر نیوز ٹیشن آ رہا تھا۔ اس نے اپنے جوتے اور جینٹ آئینار کو در پینک دیئے۔ پھر ریوٹ لے کر صوفے پر لیٹ گیا۔ خالی ذہنی کے عالم میں وہ جینٹ بدل رہا تھا۔ ایک جینٹ سے گنجی آرزو آواز نے اُسے روک لیا۔ ایک غیر معروف سا گلوکار کوئی غزل گارہا تھا۔

میری زندگی تو فریفتی ہے، وہ ازل سے دل میں کہیں کسی وہ نگاہ شوق سے دور ہیں، رگ جال سے لاکھ قرین کسی اس نے ریوٹ اپنے سینے پر رکھ دیا۔ گلوکار کی آواز بہت خوب صورت تھی یا پھر شاید وہ اس کے جذبات کو الفاظ سے رہا تھا۔

بہنیں جان دیجیے ایک دن وہ کسی طرح وہ کہیں کسی ہمیں آپ سمجھتے دار پر جو نہیں کوئی، تو ہمیں کسی شاعری، کلاسیکل میوزک، پرانی فلمیں، افسرہ بینٹل میوزک اسے ان تمام چیزوں کی worth کا اندازہ کھینچے کچھ سالوں میں ہی بنا شروع ہوا تھا۔ کچھ کچھ سالوں نے اس کی موسیقی کے انتخاب کو بہت اعلیٰ کر دیا تھا اور وہ غزلیں سننے کا تو اس نے بھی خوب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

میرے طور پر، سر حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے وہ بھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ بھی کسی، وہ کہیں کسی

اسے ایک بار پھر امامہ یاد آئی۔ اسے جیٹ وہی یاد آتی تھی۔ پہلے وہ صرف تنہائی میں یاد آتی تھی پھر وہ جہوم میں بھی نظر آنے لگی۔ اور وہ۔ وہ محبت کو کچھتاوا بھرتا ہوا۔

نہ وہ ان ہے جو مرا بس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں میں ان ہی کا تھا، میں ان ہی کا ہوں، وہ میرے نہیں تو نہیں کسی

سالار ایک دم صوفے سے اٹھ کر کڑکیوں کی طرف چلا گیا۔ ساتویں منزل پر کھڑے وہ رات کو روشنیوں کی اوت میں دیکھ سکتا تھا۔ عجیب وحشت جی ہو رہی تھی۔ عجیب عالم تھا جو اندر تھا۔

جو ہو فیصلہ وہ سناہے اسے حشر پر نہ آھاہے جو کریں گے آپ ستم ہاں، وہ ابھی کسی، وہ بہنیں کسی وہاں کھڑے کڑکیوں کے شیشوں کے پار اندھیرے میں عثمانی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے اندر اترنے کی کوشش کی۔

"میں اور کبھی کسی لڑکی سے محبت کروں۔ سوالیہ بیجا نہیں ہوتا۔" بہت سال پہلے اکثر کہا جانے والا جملہ اسے یاد آیا۔ باہر تاریکی کچھ اور بڑھی۔ اندر آوازوں کی پازگفت..... اس نے گھٹت خور وہ انداز میں سر جھکا یا پھر چند لمحوں کے بعد دوبارہ سر اٹھا کر کڑکی سے باہر دیکھا۔ انسان کا اختیار کہاں سے شروع کہاں پر ختم ہوتا ہے؟ اُپر لیٹن کا ایک اور دور، باہر نظر آنے والی عثمانی روشنیاں بھی اب بجھنے لگی تھیں۔

اسے دیکھنے کی جو لو لگی تو فیسر دیکھ ہی لیں گے ہم وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پر وہ فیسں کسی سالار سکندر نے مڑ کر اس کی اسکرین کو دیکھا، گلوکار لپک لپک کر بار بار آخری شعر دہرا رہا تھا۔ کسی معمول کی طرح چلا ہوا وہ صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ سٹیل ٹیبل پر رکھے ہوئے برف کپس کھول کر اس نے اندر سے لیپ ٹاپ نکال لیا۔

اسے دیکھنے کی جو لو لگی تو فیسر دیکھ ہی لیں گے ہم وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پر وہ فیسں کسی گلوکار قطع دہرا رہا تھا۔ سالار کی انگلیاں لیپ ٹاپ پر رقی رقی رہا رہی سے حرکت کرتے ہوئے استغنیٰ لکھنے میں مصروف تھیں۔ کمرے میں موسیقی کی آواز اب وہ جی جی رہا رہی تھی۔ استغنیٰ کی ہر لائن اس کے وجود پر چھائے بود کو ختم کرتی جاری تھی وہ جیسے کسی جاوید کے حصار سے باہر آ رہا تھا۔ کوئی توڑ ہو رہا تھا۔

☆☆.....☆☆☆☆

"اپنے کیریئر کی اس پہلچ پر اس طرح کا امتحان فیصلہ صرف تم ہی کر سکتے تھے۔" وہ فون پر سکندر عثمان کو خاموشی سے سن رہا تھا۔

"آخر آخری اچھی پوسٹ کو کیوں چھوڑ رہے ہو اور وہ بھی اس طرح اچانک اور چلو کر چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر آکر اپنا بزنس کرو۔ بینک میں جانے کی کیا نیکی بنتی ہے۔" وہ اس کے فیصلے پر بری طرح تنقید کر رہے تھے۔

"میں اب پاکستان میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ بس اسی لئے چھوڑ دی۔ بزنس میں نہیں کر سکتا اور بینک کی آفیس میرے پاس بہت عرصے سے تھی۔ وہ مجھے پاکستان پلاسٹک کرنے پر تیار ہیں، اس لئے میں اسے قبول کر رہا ہوں۔" اس نے تمام سوالوں کا اٹھا جواب دیا۔

"پھر بینک کو بھی جو اس وقت مت کرو، میرے ساتھ آکر کام کرو۔"

"میں نہیں کر سکتا! مجھے مجبور نہ کریں۔"

"تو پھر وہیں پر رہو۔ پاکستان آنے کی کیا تکلف ہے؟"

"میں یہاں پر رہ نہیں پارتا۔"

"جب الوطنی کا کوئی دورہ پڑا ہے تبھی؟"

"نہیں۔"

"تو پھر۔۔۔؟"

"میں آپ لوگوں کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے بات بدلی۔

"خیر یہ فیصلہ ازم تک ہماری وجہ سے تو نہیں کیا گیا۔" سکندر عثمان کچھ نرم ہوا۔

سالار خاموش رہا۔ سکندر عثمان بھی کچھ دیر خاموش رہے۔

"فیصلہ تو تم کر ہی چکے ہو۔ میں اب اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کر سکتا۔ ٹھیک ہے آنا چاہتے ہو آ جاؤ۔ کچھ عرصہ بینک میں کام کر کے بھی دیکھ لو لیکن میری خواہش یہی ہے کہ تم میرے ساتھ و میرے بزنس کو دیکھو۔" سکندر عثمان نے جیسے ہتھیار ڈالنے ہوئے کہا۔

"تمہارا تو پی ایچ ڈی کا بھی ارادہ تھا۔ اس کا کیا ہوا؟" سکندر عثمان کو بات ختم کرتے کرتے پھر یاد آیا۔

"فی الحال میں مزید اسٹڈی نہیں کرنا چاہ رہا۔ ہو سکتا ہے کچھ سالوں کے بعد پی ایچ ڈی کے لئے دوبارہ ہار چلا جاؤں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پی ایچ ڈی کروں لیکن۔" سالار نے دم آؤڑ میں کہا۔

"تم اس اسکول کی وجہ سے آ رہے ہو؟" سکندر عثمان نے اچانک کہا۔ "شاید۔۔۔" سالار نے تردید نہیں کی۔ وہ اگر اسکول کو اس کی وجہ نہیں کہہ رہے تھے تو بھی کوئی حرج نہیں تھا۔

"ایک بار پھر سوچ لو سالار۔۔۔" سکندر کہے بغیر نہیں رو سکے۔

"بہت کم لوگوں کو تیر میں اس طرح کا اشارت ملتا ہے جس طرح کا تمہیں ملا ہے۔ تم سن رہے ہو؟"

"جی۔۔۔! اس نے صرف ایک لفظ کہا۔

"باقی تم سمجھ رہا، اپنے فیصلے خود کر سکتے ہو۔" انہوں نے ایک طویل کال کے اختتام پر فون بند

کر سنے سے پہلے کہا۔ سالار نے فون رکھنے کے بعد پلاسٹک کی دیواروں پر ایک نظر دوڑائی۔ اٹھارہ دن کے بعد اسے یہ پلاسٹک ہیٹ کے لئے چھوڑنا تھا۔

☆.....☆.....☆

جس سے وابستگی پر اس کی زندگی کے ایک نئے فیزک کا آغاز ہوا تھا۔ ابتدائی طور پر وہ اسلام آباد میں اس فیزکلی بینک میں کام کرتا رہا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد وہ اسی بینک کی ایک نئی برانچ کے ساتھ لاہور چلا آیا۔ اسے کراچی جانے کا موقع بھی مل رہا تھا مگر اس نے لاہور کا انتخاب کیا تھا۔ اسے یہاں ڈاکٹر سید علی کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔

پاکستان میں اس کی مصروفیات کی نوعیت تبدیل ہو گئی تھی مگر ان میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ یہاں بھی دن رات مصروف رہتا تھا۔ ایک exceptional ماہر معاشیات کے طور پر اس کی شہرت اس کے ساتھ ساتھ سطر کر رہی تھی۔ حکومتی حلقوں کے لئے اس کا نام بنائے ہوئے تھے مگر پاکستان آنے کے بعد فنانس مشنری مختلف مواقع پر وقت فراغت کے تحت آفیسرز کو دینے جانے والے لیگنڈ کے لئے اسے بلوائی رہتی۔ لیگنڈ کا سلسلہ بھی اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ yale میں زیر تعلیم رہنے کے بعد وہ وہاں مختلف کامز کو لیگنڈ بنا رہا تھا یہ سلسلہ بنو پارک منتقل ہو جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ جہاں وہ کو لیا بنو رتھی میں ہیومن ڈیولپمنٹ پر ہونے والے سیمینارز میں حصہ لیتا رہا بعد میں اس کی توجہ ایک بار پھر آکٹائس کی طرف مبذول ہو گئی۔

پاکستان میں بھی بہت جلد وہ ان سیمینارز کے ساتھ انوالو ہو گیا تھا۔ IBA اور FAST جیسے ادارے کو راہ ہے۔ آکٹائس اور ہیومن ڈیولپمنٹ واحد موضوعات تھے جن پر وہ خاموشی اختیار نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ اس کے پسندیدہ موضوع گفتگو تھے اور سیمینارز میں اس کے لیگنڈ کا فیڈ بیک ہمیشہ بہت زیادہ ہوتا تھا۔

وہ صبیحے کا ایک ویک اینڈ گاؤں میں اپنے اسکول میں گزارا کرتا تھا اور وہاں رہنے کے دوران وہ زندگی کے ایک نئے زرخ سے آشنا کی حاصل کر رہا تھا۔

"ہم نے اپنی غربت اپنے دیہات میں پیدا کی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ مٹی کو کارپنٹ کے نیچے پھنسا دیتے ہیں۔"

"اس اسکول کی تعمیر کا آغاز کرتے ہوئے فرقان نے ایک بار اس سے کہا تھا اور وہاں گزارے جانے والے دن اسے اس جملے کی ہولناکی کا احساس دلاتے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں غربت کی موجودگی سے نا آشنا تھا۔ وہ نیو نیٹو اور یو نیٹ سیف میں کام کے دوران دوسرے ایشیائی ممالک کے ساتھ

ساتھ پاکستان کے بارے میں بھی بہت ساری رپورٹس دیکھتا رہا مگر پاکستان میں غربت کی آخری حدوں کو کبھی پار کر جانے والے لوگوں کو وہ پہلی بار ذاتی طور پر دیکھ رہا تھا۔

"پاکستان کے دس پندرہ بڑے شہروں سے نکل جائیں تو احساس ہوتا ہے کہ چھوٹے شہروں میں رہنے والے لوگ تیسری دنیا میں نہیں دسویں بارہویں دنیا میں رہتے ہیں۔ وہاں تو لوگوں کے پاس نہ روڈ گارے، نہ سیکڑیں۔ وہ اپنی آدمی زندگی خواہش میں گزارتے ہیں اور آدمی حسرت میں جھٹا ہو کر کون سی اصلاحات سکا سکتے ہیں آپ احساس کو جس کا دن سبھی روٹی سے شروع ہوتا ہے اور فاقے پر ختم ہو جاتا ہے اور ہم۔ ہم لوگوں کی بھوک مٹانے کے بجائے مسجدوں پر مسجدیں تعمیر کرتے ہیں۔ عالی شان مسجدیں، پر شکوہ مسجدیں، مارلی سے آراستہ مسجدیں۔ بعض دفعہ تو ایک ہی سڑک پر دس دس مسجدیں کھڑی ہوتی ہیں۔ نمازیوں سے خالی مسجدیں۔"

فرقان کئی سے کہتا تھا۔

"اس ملک میں اتنی مسجدیں ہو چکی ہیں کہ اگر ہر پاکستان ایک وقت کی نماز کے لئے مسجدوں میں اکٹھا ہو جائے تو بھی بہت سی مسجدیں خالی رہ جائیں گی۔ میں مسجدیں بنانے پر یقین نہیں رکھتا جہاں لوگ بھوک سے خود کشیاں کرتے پھر رہے ہوں جہاں کچھ خاص طبقوں کی پوری پوری نسل جہالت کے اندھیروں میں پھنسی پھری ہو وہاں مسجد کے بجائے مدرے کی ضرورت ہے۔ اسکول کی ضرورت ہے، تعلیم اور شعور ہو گا اور روزی کمانے کے مواقع تو اللہ سے محبت ہو گی ورنہ صرف شکوہ ہی ہو گا۔"

وہ فرقان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔ اس نے مستقل طور پر گاؤں میں جانا شروع کیا تو اسے اندازہ ہوا فرقان ٹھیک کہتا تھا۔ غربت لوگوں کو کفر تک لے گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتیں ان کے اعصاب پر سوار تھیں اور جو ان معمولی ضرورتوں کو پار کر دیتا وہ جیسے اس کی غلامی کرنے پر تیار ہو جاتے۔ اس نے جس ایک اینڈر گاؤں جانا ہوتا اسکول میں لوگ اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے جمع ہوتے۔ بعض دفعہ لوگوں کی قطاریں ہوتیں۔

"بچے کو شہر کی کسی فیکٹری میں کام پر رکھوا دیں۔ چاہے ہزار روپیہ مل جائے مگر کچھ پیسہ تو آئے۔"

"وہ ہزار روپیہ مل جاتے تو میں اپنی بیٹی کی شادی کر دیتا۔"

"پادشہ نے ساری فصل خراب کر دی۔ اگلی فصل لگانے کے لئے بیج خریدنے تک کے لئے پیسے

نہیں ہیں۔ آپ تھوڑے پیسے قرض کے طور پر دے دیں، میں فصل کٹنے کے بعد دے دوں گا۔"

"بچے کو پولیس نے پکڑ لیا ہے، قصور بھی نہیں بتاتے، بس کہتے ہیں ہماری مرضی جب تک چاہیں

اندھ رکھیں، تم آئی بی کے پاس جاؤ۔"

"پڑاوی میری زمین پر چھڑا کر رہا ہے۔ کسی اور کو الٹ کر رہا ہے۔ کہتا ہے میرے کاغذ جعلی ہیں۔"

"میکام کے لئے پاس کے گاؤں جاتا ہے۔ روز آٹھ میل چل کر آنا جانا پڑتا ہے۔ آپ ایک سائیکل لے دیں تو میری بانی ہو گی۔"

"گھر میں بانی کا چنڈ پپ لگوا ہے۔ آپ مدد کر دیں۔"

وہ قہر سے ان درخواستوں کو سنتا تھا۔ کیا لوگوں کے یہ معمولی کام بھی ان کے لئے پہاڑ بن چکے ہیں۔ ایسا پہاڑ جسے عبور کرنے کے لئے وہ زندگی کے کئی سال ضائع کر دیتے ہیں۔ وہ سوچتا۔

میں نے ایک ایک اینڈر جب وہاں آتا تو اپنے ساتھ دس پندرہ ہزار روپیہ زیادہ لے کر آتا اور روپیہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بہت سے لوگوں کو بٹھا کر بڑی لیکن چھپتا بہت چھوٹی ضرورتیں پوری کر دیتے۔ ان کی زندگی میں کچھ آسانیاں مل آتے، اس کے کھسے ہوئے چند سفارش رتے اور فون کا کارڈ ان لوگوں کے کندھوں کے پیر اور پیروں میں پڑی نہ نظر آنے والی بیڑیوں کو کیسے اتار دیتے۔ اس کا احساس شاید سالار کو خود بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

لاہور میں اپنے قیام کے دوران وہ باقاعدہ کی ڈاکٹر سید علی صاحب کے پاس جاتا تھا۔ ان کے ہاں ہر رات عشاء کی نماز کے بعد کچھ لوگ جمع ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی موضوع پر بات کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ اس موضوع کا انتخاب وہ خود کرتے بعض دفعہ ان کے پاس آنے والے لوگوں میں سے کوئی ان سے سوال کرتا اور پھر یہ سوال اس رات کا موضوع گفتگو بن جاتا۔ عام اسکرلز کے برعکس ڈاکٹر سید علی صرف خود نہیں بولتے تھے، نہ ہی انہوں نے اپنے پاس آنے والے لوگوں کو صرف سوالات بتا دیا تھا بلکہ وہ اکثر اپنی بات کے دوران ہی چھوٹے موٹے سوالات کرتے رہتے اور پھر ان سوالات کا جواب دینے کے لئے نہ صرف لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے بلکہ ان کی رائے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ان کے اعتراضات کو بڑے تحمل اور بردباری سے سنتے۔ ان کے پاس آنے والوں میں صرف سالار سکندر تھا، جس نے ان سے کبھی سوال کیا تھا نہ کبھی ان کے کسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ کبھی کسی بات پر اعتراض کرنے والوں میں شامل ہوا نہ کسی بات پر رائے دینے والوں میں۔

وہ فرقان کے ساتھ آتا۔ فرقان نہ آتا تو اکیلا چلا آتا، مگر بے کے آخری میں سے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ جاتا، خاموشی سے ڈاکٹر صاحب اور وہاں موجود لوگوں کی گفتگو سنتا۔ بعض دفعہ اپنے دائیں بائیں آہٹنے والے لوگوں کے اشتہار پر اپنا ایک جملہ تعارف پیش کرتا۔

"میں سالار سکندر ہوں، ایک بینک میں کام کرتا ہوں۔"

وہ جب تک امریکہ میں رہا تب تک ہر پینے ایک بار وہاں سے ڈاکٹر سید علی کو فون کرتا رہا مگر فون پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہونے والی اس کی گفتگو بہت مختصر اور ایک ہی نوعیت کی ہوتی تھی۔ وہ کمال

کر تاؤ اکثر صاحب کال ریسیور کرتے اور ایک ہی سوال کرتے۔

وہ پہلی بار اس سوال پر جب چوٹ لگا تھا جب وہ پاکستان سے چند دن پہلے ہی امریکہ آیا تھا اور ڈاکٹر صاحب اس کی واپسی کا پھر رہے تھے۔ اسے تعجب ہوا تھا۔

”ابھی تو نہیں۔“ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا تھا۔ بعد میں وہ سوال اسے کبھی عجیب نہیں لگا کیونکہ وہ لا شعوری طور پر جان گیا تھا کہ وہ کیا پھر رہے تھے۔

آخری بار انہوں نے وہ سوال اس سے جب کیا تھا جب وہ امام کے حلقہ میں ریڈ لائٹ ارباب میں پہنچا تھا۔ جس دن وہیں پہنچنے کے ایک ہفتے کے بعد اس نے یہی کی طرح انہیں کال کیا تھا۔ یہی جیسی گفتگو کے بعد گفتگو ایسی سوال پر آ پہنچی تھی۔

”واپس پاکستان کب آ رہے ہیں؟“

بے اختیار سالار کا دل بھر آیا۔ اسے خود کو گپیو ذکر کرنے میں کچھ دیر لگی۔

”اگلے ماہ آ جاؤں گا۔ میں ریڈ ان کر رہا ہوں۔ واپس آ کر پاکستان میں ہی کام کروں گا۔“

”پھر تمہیکے، آپ سے اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔“ ڈاکٹر صاحب نے جب کہا تھا۔

”دعا کیجئے گا۔“ سالار آخر میں کہتا۔

”کروں گا کچھ اور.....؟“

”اور کچھ نہیں۔ اللہ حافظ۔“ وہ کہتا۔

”اللہ حافظ۔“ وہ جواب دیتے۔ گفتگو کا یہ سلسلہ پاکستان آنے تک جاری رہا جب وہ ان کے پاس

باقاعدگی سے جانے لگا تو یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

لاہور آنے کے بعد وہ باقاعدگی سے ان کے پاس جانے لگا تھا۔ اسے ان کے پاس سکون ملتا تھا۔ صرف ان کے پاس گزارا ہوا وقت ایسا ہوتا تھا جب وہ کچھ دیر کے لئے مکمل طور پر اپنے ذہن پریشانی سے آزادی حاصل کر لیتا تھا۔ بعض دفعہ ان کے پاس خاموش بیٹھے بیٹھے اسے اختیار اس کا دل جانتا وہ ان کے سامنے وہ سب کچھ اگل دے جسے وہ اتنے سالوں سے اپنے اندر زہر کی طرح بھرے پھر رہا تھا۔ چھپتا ہوا احساس جرم۔ بے یقینی، بے بسی، شرمندگی، ندامت، ہرجیز۔ پھر اسے خوف پید ا ہوتا ڈاکٹر سید علی اس کو پتا نہیں کن نظروں سے دیکھیں گے۔ اس کی ہمت دم توڑ جاتی۔

ڈاکٹر سید علی ابہام کو دور کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ وہ ان کے پاس خاموش بیٹھا رہتا۔ صرف سنتا، صرف سمجھتا، صرف نتیجے اخذ کرتا۔ کوئی دھند جیسی جو سمجھ رہی تھی۔ کوئی چیز جیسی جو نظر آنے لگی تھی۔ جن سوالوں کو وہ کئی سالوں سے سر پر لاہور کی صورت میں لئے پھر رہا تھا ان کے پاس ان کے جواب تھے۔

”اسلام کو کچھ کر سکیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ اس میں کتنی وسعت ہے۔ یہ نگہ نظری اور نگہ دل کا دین نہیں ہے نہ ہی ان دونوں چیزوں کی اس میں گنجائش ہے۔ یہ میں سے شروع ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ فرد سے معاشرے تک۔ اسلام آپ سے نہیں کہتا کہ آپ چوبیس گھنٹے سر پر ٹوپی، ہاتھ میں بیچ بکڑے ہر جگہ مسئلے بچانے بیٹھے رہیں۔ ہر بات میں اس کے حوالے دیتے رہیں۔ نہیں، یہ تو آپ کی زندگی سے۔ آپ کی اپنی زندگی سے حوالہ چاہتا ہے۔ یہ تو آپ سے راست بازی اور پارسانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ دیانت داری اور لگن چاہتا ہے۔ اخلاص اور استقامت مانگتا ہے۔ ایک اچھا مسلمان اپنی باتوں سے نہیں اپنے کروار سے دوسروں کو حشر کرتا ہے۔“

سالار ان کی باتوں کو ایک چھوٹے سے ریکارڈر میں ریکارڈ کر لیتا پھر گھر آ کر بھی سنتا رہتا۔ اسے ایک دہریہ حلقہ تھی، ڈاکٹر سید علی کی صورت میں اسے دور بہرمل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”سالار آؤ، اب ابھی جاؤ۔ کتنی نہیں کرواؤ؟“ انیتا نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے ناراضی سے کہا۔ وہ ہماری کشتی میں شرکت کے لئے اسلام آباد آیا ہوا تھا۔ تین دن کی پکڑنے لے کر حالانکہ اس کے گھر والوں کا اصرار تھا کہ وہ ایک ہفتے کے لئے آئے۔ شادی کی تقریبات کئی دن پہلے شروع ہو چکی تھیں۔ وہ ان تقریبات کی ”اہمیت“ اور ”توہیت“ سے واقف تھا۔ اس لئے گھر والوں کے اصرار کے باوجود وہ تین دن کی رخصت لے کر آیا اور اب وہ ہماری مہندی کے قتلشن میں شرکت کر رہا تھا جو عمار اور اس کے سرال والے مل کر کر رہے تھے۔ عمار اور اسرئی دونوں کے عزیز واقارب اور دوست مختلف قلمی اور باپ کاٹوں پر رقص کرنے میں مصروف تھے۔ ایک طوفان بدتمیزی تھا جو وہاں برپا تھا۔ سلیبس ٹرین، کھلے گلے، جسم کے ساتھ چپکے ہوئے کپڑے، پارک ملبوسات، سنگ اور صفوں کی ساز حیاں، مہبت کے بلاؤز، اس کی فلیکی کی عورتیں بھی دوسری عورتوں کی طرح اسی طرح کے ملبوسات پہننے ہوئے تھیں۔

مسکد گید رنگ تھی اور وہ تعزیر شروع ہونے پر اس بگے سے کافی دور کچھ ایسے لوگوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا جو کارپوریٹ یا بینکنگ سیکٹر سے تعلق رکھتے تھے اور سکندر یا اس کے اپنے بھائیوں کے شامنا تھے۔

مگر پھر مہندی کی رسومات کا آغاز ہونے لگا اور انیتا اسے الٹیج کی طرف لے گئی۔ اسرئی اور عمار بے تکلفی سے الٹیج پر بیٹھے ہاتھیں کر رہے تھے۔ وہ پہلی بار اسرئی سے مل رہا تھا۔ ہمارے اس کا اور اسرئی کا تعارف کروایا۔ مہندی کی رسومات کے بعد ان نے وہاں سے جانے کی کوشش کی مگر کامران اور علی نے اسے زبردستی روک دیا۔

”بھائی کی مہندی ہو رہی ہے اور تم اس طرح وہاں کوئے میں بیٹھے ہو۔“ طیبہ نے اسے ڈانٹا تھا۔
”جہیں یہاں ہونا چاہئے۔“

وہ ان کے کہنے پر وہیں کامران اور اس کی بیوی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ایک کزن نے ایک بار پھر وہاں دوپہر اس کے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی جو وہ سب ڈالے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر قدرے ناگوار سی سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اسے تنبیہ کی۔

اگلے چند منٹوں کے بعد وہاں رقص شروع ہو چکا تھا۔ عمار سمیت اس کے سارے بہن بھائی اور کنزیر قدرے رقص کر رہے تھے اور انہیں نے اسے بھی تھپتھا شروع کر دیا تھا۔
”نہیں! اینجا میں نہیں کر سکتا۔ مجھے نہیں آتا۔“

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے معذرت کی مگر اس کی معذرت قبول کرنے کے بجائے وہ اور عمار سمیت اسے گھسیٹ کر رقص کرنے والوں کے جھوم میں لے آئے تھے۔ کامران اور معصی کی شادی میں وہ بھی ایسے ہی رقص کرتا رہا تھا، مگر عمار کی مہندی پر وہ پچھلے سات سالوں میں اتکا بھڑا ہنی سڑنے لگا چکا تھا کہ وہاں اس جھوم کے درمیان خالی بازو کھڑے کرنا بھی اس کے لئے دشوار تھا۔ قدرے بے بس مسکراہٹ کے ساتھ وہ اسی طرح جھوم کے درمیان کھڑا رہا پھر اس نے اینجا کے کان میں کہا۔

”ایتنا..... میں ڈانس بھول چکا ہوں۔ Please let me go (براہ مہربانی مجھے جانے دو)۔“
”تم کرنا شروع کرو..... آجائے گا۔“ اینجا نے جواباً اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اب اس کی بھی اس جھوم میں شامل ہو چکی تھی۔

”میں نہیں کر سکتا۔ تم لوگ کرو۔ میں انجوائے کر رہا ہوں۔ مجھے جانے دو۔“
اس نے مسکراتے ہوئے نکلنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھ نے اسے اس کوشش میں کامیاب کر دیا۔
”عروغ ہر قوم، ہر نسل کا خواب ہوتا ہے اور پھر وہ قومیں جن پر الہامی کتابیں نازل ہوئی ہوں وہ تو عروغ کو اپنا حق سمجھتی ہیں مگر کبھی بھی کسی قوم پر عروغ صرف اس بنا پر نہیں آیا کہ اسے ایک کتاب اور نبی دے دیا گیا جب تک اس قوم نے اپنے اعمال اور افعال سے عروغ کے لئے اپنی اہلیت ثابت نہیں کر دی وہ کسی مرتبہ، کسی مقام، کسی فضیلت کے قابل نہیں ٹھہریں۔ مسلمان قوم یا امت کے ساتھ بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے اعلیٰ طبقات فحش اور لٹرس پرستی کا شکار ہیں۔ یہ دونوں چیزیں دہائی کی طرح ہوتی ہیں۔ ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور پھر یہ سلسلہ کہیں جڑنا نہیں۔“ اسے وہاں کھڑے ان ناچتی ہوئے عورتوں اور مردوں کے جھوم کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ڈاکٹر سیٹھ علی کی باتیں یاد آنے لگیں۔

”مومن عیاش نہیں ہوتا نہ جب وہ رعایا ہوتا ہے نہ جب وہ حکمران ہوتا ہے۔ اس کی

زندگی کسی جانور یا کیڑے کی زندگی جیسی نہیں ہوتی۔ کھانا پینا، اپنی نسل کو آگے بڑھانا اور فنا ہو جانا۔ یہ کسی جانور کی زندگی کا انداز تو ہو سکا ہے مگر کسی مسلمان کی نہیں۔“ سالار بے اختیار مسکرایا۔ وہ آج پھر ”جانوروں“ اور ”حشرات الارض“ کا ایک گروہ دیکھ رہا تھا۔ اسے خوشی ہوئی، وہ بہت عرصہ پہلے ان میں سے نکل چکا تھا۔ وہاں ہر ایک خوش باش، پرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ بلند حقہ اور چمکدار پیرے اور آنکھیں۔ اس کے سامنے طیبہ عمار کے سر کے ساتھ رقص کر رہی تھیں۔ اینجا اپنے سب سے بڑے بھائی کامران کے ساتھ۔

سالار نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے دائیں کتھنی کو مسلا۔ شاید یہ تیز میوزک تھا یا پھر اس وقت اس کا ذہنی اضطراب اسے اپنی کتھنی میں ہلکی سی درد کی لہر گزرتی محسوس ہوئی۔ اپنے گامز آواز کر اس نے بائیں ہاتھ سے اپنی دونوں آنکھیں مسلیں۔ دوبارہ گامز آنکھوں پر لگاتے ہوئے اس نے مڑ کر راست تلاش کرنے کی کوشش کی، کچھ جدوجہد کے بعد وہ اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے اسے دائرے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے خوشی راستہ دے دیا گیا۔

”کدھر جا رہے ہو؟“ بے تلام شور میں طیبہ نے بلند آواز میں جاننے سے پہلے اس کا بازو پکڑ کر پوچھا تھا۔ وہ ابھی رقص کرتے کرتے کچھ تھک کر اس کے پاس کھڑی ہوئی تھیں ان کا سانس بھولا ہوا تھا۔
”ممی! میں ابھی آتا ہوں۔ نماز پڑھ کر۔“

”آج رہنے دو.....“

سالار مسکرایا مگر اس نے جواب میں کچھ کہا نہیں بلکہ لمبی ٹی اپنا سر ہلاتے ہوئے نرمی سے ان کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا دیا۔

وہ اب باہر نکلنے کی تنگ دو دروازے پر تھا۔

”یہ کبھی نارمل نہیں ہو سکتا۔ زندگی کو انجوائے کرنا بھی ایک آرٹ ہے اور یہ آرٹ اس بے وقوف کو کبھی نہیں آئے گا۔“ انہوں نے اپنے تیسرے بیٹے کی پشت کو دیکھتے ہوئے قدرے افسوس سے سوچا۔
سالار نے اس جھوم سے نکل کر بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔

وہ جس وقت نماز پڑھنے کے لئے اپنے گھر کے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ سحر اس وقت بھی گانے میں مصروف تھا۔ اس وقت مسجد کی طرف جانے والا وہ اکیلا تھا۔ شاید گاڑیوں کی لمبی قطاروں کے درمیان سے سڑک پر پھیلے ہوئے وہ مسلسل ڈاکٹر سیٹھ علی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ”سینکڑوں“ کے اس مجمع کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا جو اس کے گھر پر تاج گانے میں مصروف تھے۔ مسجد میں کل ”چودہ“ لوگوں نے باجماعت نماز ادا کی تھی۔

پہنچانے کے بعد اسلام آباد اپنی پوسٹنگ کے دوران وہ سکندر عثمان کے گھر پر ہی رہتا رہا۔ لاہور آنے کے بعد بھی کسی پوش علاقے میں کوئی بڑا گھر رکھنے کے لئے منتخب کرنے کے بجائے اس نے فرقان کی بلڈنگ میں ایک فلیٹ کرائے پر لینے کو ترجیح دی۔

فرقان کے پاس فلیٹ لینے کی ایک وجہ اگر یہ تھی کہ وہ لاہور میں اپنی عدم موجودگی کے دوران فلیٹ کے بارے میں کسی عدم تحفظ کا شکار نہیں ہوتا تھا تو دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ فلیٹ کے بجائے کوئی گھر لینے پر اسے دو چار ملازم مستقل رکھنے پڑتے جب کہ اس کا بہت کم وقت فلیٹ پر گزارنا تھا۔ فرقان کے ساتھ آہستہ آہستہ لاہور میں اس کا سوشل سرکل بہت وسیع ہونے لگا تھا۔ فرقان بہت سوشل آدمی تھا اور اس کا معلقہ احباب بھی خاصا لمبا چڑا تھا۔ وہ سالار کے موڈ اور سپر امانٹ کو سمجھنے کے باوجود اسے واقف تھا کہ اپنے ساتھ مختلف شکوے رکھتے ہیں۔

وہ اس رات فرقان کے ساتھ اس کے کسی ڈاکٹر دوست کی ایک پارٹی اور محفل غزل میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ وہ ایک فارم پر ہونے والی پارٹی تھی۔ اس نے سالار کو گھر کو کھانچا اور محفل غزل کا سن کر وہ انکار نہیں کر سکا۔

فارم پر شہر کی ایلٹ کلاس کا اجتماع تھا۔ وہ ان میں سے اکثریت کو جانتا تھا۔ وہ اپنے شناسا کچھ لوگوں کے ساتھ جا تیس کرنے لگا۔ ڈنر چل رہا تھا اور ان ہی باتوں کے دوران اس نے فرقان کی تلاش میں نظر دوڑائی تھی وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سالار ایک بار پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانے کے بعد اسے چند لوگوں کے ساتھ فرقان کھڑا نظر آ گیا۔ وہ بھی اس طرف بڑھ آیا۔

”آؤ سالار! میں تمہارا تعارف کروا رہا ہوں۔“ فرقان نے اس کے قریب آنے پر چند جملوں کے تبادلے کے بعد کہا۔ ”یہ ڈاکٹر ضابطہ۔ اگر کارام با سٹیل میں کام کرتے ہیں۔ چائے کا میڈیٹیشن ہیں۔“ سالار نے ہاتھ ملایا۔

”یہ ڈاکٹر جلال انصر ہیں۔“ سالار کو اس شخص سے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ فرقان اب کیا کہہ رہا تھا وہ سن نہیں پایا۔ اس نے جلال انصر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ دونوں کے درمیان بہت رچی سار معاہدہ ہوا۔ جلال انصر نے بھی یقیناً اسے پہچان لیا تھا۔

سالار وہاں ایک ابھی شام گزارنے آیا تھا مگر اس وقت اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک اور بری رات گزارنے آیا تھا۔ یادوں کا ایک سیلاب تھا جو ایک بار پھر ہر بند توڑ کر اس پر چڑھائی کر رہا تھا۔ وہ سب اب اس طرف جا رہے تھے جہاں بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اب فرقان تھا۔ جلال انصر اب اس سے کچھ آگے دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ تھا۔ سالار نے سنے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کی پشت کو دیکھا۔

دشت تنہائی میں اسے جان جہاں لڑاں ہیں

تیری آواز کے سامنے

تیرے ہونٹوں کے سراپ

اقبال بانو کا ناشروں کے رنگی خمیں۔

دشت تنہائی میں

ذوری کے

خس و خاشاک سے

کھل رہے ہیں

تیرے پہلو کے سن اور گلاب

اس کے ارد گرد بیٹھے لوگ اپنا سر دھن رہے تھے۔ سالار چند لمحوں کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کے ساتھ خوش گیموں میں مصروف تھا۔ اسے زندگی میں کبھی کسی شخص کو دیکھ کر شک نہیں آیا تھا اس دن پہلی بار آ رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد اس نے فرقان سے کہا۔

”چلیں؟“ فرقان نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کہاں؟“

”گھر۔“

”ابھی تو پروگرام شروع ہوا ہے۔“ جنہیں بتایا تھا رات ویر تک یہ محفل چلے گی۔

”ہاں، مگر میں جانا چاہتا ہوں۔ کسی کے ساتھ بھجوا دو۔ تم بعد میں آ جاؤ۔“

فرقان نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

”تم کیوں جانا چاہتے ہو؟“

”مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔“ اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”اقبال بانو کو سنتے ہوئے بھی کوئی دوسرا کام یاد آ گیا ہے؟“ فرقان نے قدرے ملا متنی انداز میں کہا۔

”تم بیٹھو میں چلا جاتا ہوں۔“ سالار نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”جب باتیں کرتے ہو۔ یہاں سے کیسے جاؤ گے۔ فارم اتنا دور ہے۔ چلو اگر اتنی ہی جلدی ہے تو

چلے ہیں۔“ فرقان بھی اُنھ کے کھڑا ہو گیا۔

میزبان سے اجازت لیتے ہوئے وہ دونوں فرقان کی گاڑی میں آ بیٹھے۔

"اب بتاؤ۔ یوں ایک ناک کیا ہوا ہے؟" گاڑی کو قارم سے باہر لاتے ہوئے فرقان نے کہا۔

"میرا دہاں ٹھہرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"کیوں؟" سالار نے جواب نہیں دیا۔ وہ باہر سڑک کو دیکھتا رہا۔

"وہاں سے آٹھ آنے کی وجہ حال ہے؟"

سالار نے بے اختیار گردن موڑ کر فرقان کو دیکھا۔ فرقان نے ایک گہرا سانس لیا۔

"یعنی میرا اندازہ ٹھیک ہے۔ تم جلال انصر کی وجہ سے قتلشن سے بھاگ آئے ہو۔"

"جہیں کیسے چکا تھا؟" سالار نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا۔

"تم دونوں بڑے عجیب انداز میں آپس میں ملے تھے۔ جلال انصر نے خلاف معمول تمہیں کوئی

اہمیت نہیں دی جب کہ تمہارا بے شکستی شہرت والے فنکار کے سامنے تو اس جیسے آدمی کو مکمل اٹھنا چاہئے

تھا۔ وہ تعلقات بنانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا، خود تم بھی مسلسل اسے دیکھ رہے تھے۔" فرقان بہت

آرام سے کہہ رہا تھا۔

"تم جلال انصر کو جانتے ہو؟"

سالار نے گردن سیڑھی کر لی۔ وہ ایک بار پھر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

"امام اسی شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی۔" بہت دیر بعد اس نے دھم آواز میں کہا۔ فرقان کچھ

بول نہیں سکا۔ اسے توقع نہیں تھی جلال اور سالار کے درمیان اس طرح کی شناسائی ہو گی ورنہ وہ شاید یہ

سوال بھی نہ کرتا۔

گاڑی میں بہت دیر خاموشی رہی پھر فرقان نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی ہے کہ وہ جلال جیسے آدمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ تو بڑا

خرانت آدمی ہے۔ ہم لوگ اس کو "قصائی" کہتے ہیں۔ اس کی واحد دلچسپی پیڑ ہے۔ مریض کیسے لا کر

دے گا، کہاں سے لا کر دے گا، اسے دلچسپی نہیں ہوتی۔ تم دیکھنا آٹھ دس سال میں یہ ایسا رفتار کے ساتھ

پیڑ کھاتے ہوئے لاہور کا سب سے امیر ڈاکٹر ہو گا۔"

فرقان اب جلال انصر کے بارے میں تبصرہ کر رہا تھا۔ سالار خاموشی سے سن رہا تھا۔ جب فرقان

نے اپنی بات ختم کرنی تو اس نے کہا۔

"اس کو قسمت کہتے ہیں۔"

"تمہیں اس پر شک آرہا ہے؟" فرقان نے قدرے حیرانی سے کہا۔

"حسد تو میں کر نہیں سکتا۔" سالار عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "یہ جو کچھ تم مجھے اس کے بارے

میں بتا رہے ہو۔ یہ سب کچھ مجھے بہت سال پہلے پتا تھا۔ تب ہی جب میں امام کے سلسلے میں اس سے ملا

تھا۔ یہ کیسا ڈاکٹر بننے والا تھا، مجھے اندازہ تھا مگر آج اس قتلشن میں اسے دیکھ کر مجھے اس پر بے حاشا شک

آ گیا۔ کچھ بھی نہیں ہے اس کے پاس۔ معمولی شکل و صورت ہے۔ خاندان بھی خاص نہیں ہے۔ اس جیسے

ہزاروں ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ لاپٹی مادہ پرست بھی ہے مگر قسمت دیکھو کہ امام ہاشم جیسی لڑکی اس کے

عشق میں جکا ہوئی۔ اس کے پیچھے خوار ہوئی پھری۔ میں اور تم اسے قصائی کہہ لیں، کچھ بھی کہہ لیں،

صرف ہماری باتوں سے اس کی قسمت تو ہمیں بدل جائے گی نہ اس کی نہ میری۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ فرقان نے اس کے چہرے کو دھواں دھواں ہوتے دیکھا۔

"کوئی نہ کوئی خوبی تو ہو گی اس میں کہ..... کہ امام ہاشم کو اور کسی سے نہیں صرف اسی سے محبت

ہوتی۔" وہ اب اپنی دونوں آنکھوں کو مسل رہا تھا۔

"مجھے اگر پتا ہو تاکہ یہاں تم جلال انصر سے ملو گے تو میں تمہیں بھی اپنے ساتھ یہاں نہ لاتا۔"

فرقان نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی اگر یہ پتا ہو تاکہ میں یہاں اس کا سامنا کروں گا تو میں بھی کسی قیمت پر یہاں نہ آتا۔"

سالار نے وٹا انکرین سے نظر آنے والی تاریک سڑک کو دیکھتے ہوئے انصر کی سے سوچا۔

کچھ اور ستر پہلے حد خاموشی سے ملے ہوا پھر فرقان نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

"تم نے اسے بھی دھوٹنے کی کوشش نہیں کی؟"

"امام کو؟" یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"میں اسے کیسے دھو بیٹھا ہوں۔ کئی سال پہلے ایک بار میں نے کوشش کی تھی کوئی فائدہ نہیں ہوا

اور اب..... اب تو یہ اور بھی مشکل ہے۔"

"تم بہت عجیب کی دھو لے سکتے ہو۔"

"استہاروں اس کے بارے میں؟" سالار نے قدرے فحش سے کہا۔ "وہ تو پتا نہیں ملے پتا ملے

لیکن اس کے گھر والے مجھ تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ شک تو ان کو مجھ پر پہلے بھی تھا اور فرض کرو میں

ایسا بھگت کر بھی لوں تو تیرہ بجیں گی امام استہاروں۔ کیا کہوں؟" اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"پھر اسے بھول جاؤ۔" فرقان نے بڑی سہولت سے کہا۔

"کوئی سانس لینا بھول سکتا ہے؟" سالار نے ترکی پر تڑکی کہا۔

"سالار اب بہت سال گرد گئے ہیں۔ تم آخر کتنی دیر اس طرح اس لا حاصل عشق میں جتنا رہو

گے۔ جہیں اپنی زندگی کو دوبارہ پلان کرنا چاہتے۔ تم اپنی ساری زندگی امام ہاشم کے لئے تو ضائع نہیں

کر سکتے۔"

"میں کچھ بھی ضائع نہیں کر رہا ہوں۔ نہ زندگی کو نہ وقت کو نہ اپنے آپ کو۔ میں اگر امام ہاشم کو یاد رکھے ہوتے ہوں تو صرف اس لئے کیونکہ میں اسے بھلا نہیں سکتا۔ میرے بس میں نہیں ہے۔ مجھے اس کے بارے میں سوچنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن میں اس تکلیف کا عادی ہو چکا ہوں۔ وہ میری پوری زندگی کو dominate کرتی ہے۔ وہ میری زندگی میں نہ آتی تو میں آج یہاں پاکستان میں تمہارے ساتھ نہ بیٹھا ہوتا۔ سالار سکندر کہیں اور ہو تا یا شاید ہوتا ہی نہ۔ مجھ پر اس کا قرض بہت ہے۔ جس آدمی کے مقروض ہوں اس کو چنگی سے پکڑ کر اپنی زندگی سے کوئی باہر نہیں کر سکتا۔ میں بھی نہیں کر سکتا۔"

سالار نے دو لوگ انداز میں کہا۔

"فرخ کر دو دربارہ نہ ملے پھر.....؟" فرقان نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ بخت گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ بہت دیر بعد سالار نے کہا۔

"میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کسی اور موضوع پر بات کرتے ہیں۔" اس نے بڑی سہولت سے بات بدل دی۔

☆.....☆.....☆

چند سالوں میں فرقان کی طرح اس نے بھی گاؤں میں بہت کام کیا تھا اور فرقان کی نسبت زیادہ تیز رفتاری سے کیونکہ فرقان کے برعکس وہ بہت زیادہ اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس نے چند سالوں میں اس گاؤں کی حالت بدل کر رکھ دی تھی۔ صاف پانی، بجلی اور بڑی سڑک تک جانی ایک پختہ سڑک، اس کے پچھلے دو سالوں کی کارکردگی تھی۔ تیسرے سال وہاں ڈاک خانہ، محکمہ زراعت کا دفتر اور فون کی سہولت آتی تھی اور چوتھے سال اس کے اپنے اپنی اسکول میں۔ پھر کی کلاسز میں ایک این بی ای کوئی دوسرے لڑکیوں کے لئے دستکاری سکھانے کا آغاز کیا گیا۔ گاؤں کی دسپنری میں ایس بی ایس آئی۔ وہاں کچھ اور مشینری نصب کی گئی۔ فرقان کی طرح یہ ڈسپنری بھی اس نے اپنے وسائل سے اسکول کے ساتھ ہی شروع کی تھی اور اسے مزید بہتر بنانے میں فرقان نے اس کی مدد کی تھی۔

فرقان کے برعکس اس کی ڈسپنری میں ڈاکٹر کی عدم دستیابی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی ڈسپنری کا باقاعدہ آغاز ہونے سے بھی پہلے ایک ڈاکٹر اس کی کوشش کی وجہ سے وہاں موجود تھا۔

اسکول پر ہونے والے تمام اخراجات تقریباً ہی کے تھے لیکن ڈسپنری کو قائم کرنے اور اسے چلانے کے لئے ہونے والے اخراجات اس کے کچھ دوست برداشت کر رہے تھے۔ یو سی بی میں کام کے دوران بنائے ہوئے کالینک ڈور دو ستیاں اب اس کے کام آ رہی تھیں اور وہ انہیں استعمال کر رہا

تھا۔ وہ یو سی بی اور یو نیسکو میں اپنے بہن سے دوستوں کو پاکستان آنے پر وہاں لا چکا تھا۔ وہ اب وہاں ڈی کیٹیشن فرینک کی چانگ کرنے میں مصروف تھا، مگر چوتھے سال میں صرف یہی کچھ نہیں ہوا تھا کچھ اور بھی ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

سکندر عثمان اس دن سہ پہر کے قریب اسلام آباد آتے ہوئے گاڑی کا ٹائز بچھر ہونے پر سڑک پر ٹک گئے۔ ڈرائیور ٹائز بدلنے لگا اور وہ سڑک کے اطراف نظریں دوڑانے لگے۔ تب ان کی نظر ایک سائین بورڈ پر پڑی۔ وہاں لکھے ہوئے گاؤں کے نام نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ سالار سکندر کے حوالے سے وہ نام ان کے لئے نا آشنا نہیں تھا۔

ڈرائیور جب ٹائز بدل کر واپس ڈرائیو تک سیٹ پر آکر بیٹھا تو سکندر عثمان نے اس سے کہا۔

"اس گاؤں میں چلو۔" انہیں اپنا کئی تیس پید ہوا تھا۔ اس اسکول کے بارے میں جو سالار سکندر بچھلے کئی سالوں سے وہاں چلا رہا تھا۔

یہی سڑک پر تیز رفتاری سے گاڑی چلائے ہوئے دس منٹ میں وہ گاؤں کے اندر موجود تھے۔ آبادی شروع ہو چکی تھی۔ کچھ بچی کچھ دکان میں نظر آنے لگی تھیں۔ شاید یہ گاؤں کا "کمرشل ایریا" تھا۔

"یہاں نیچے آن کر کسی سے پوچھو کہ سالار سکندر کا اسکول کہاں ہے۔" سکندر عثمان نے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ اس وقت انہیں یاد آیا تھا کہ اس نے کبھی ان کے سامنے اسکول کا نام نہیں لیا تھا اور جہاں ان کی گاڑی موجود تھی وہاں اس پاس کبھی اسکول کے آجائے نظر نہیں آ رہے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کے لئے چند سال پہلے سکندر عثمان کی گاڑی بے حد اشتیاق کا باعث بنی مگر پچھلے کچھ سالوں میں سالار اور فرقان کی وجہ سے وہاں وقتاً فوقتاً گاڑیوں کی آمد ہوتی رہتی تھی۔ یہ پہلے کی طرح ان کے لئے تعجب انگیز نہیں رہی تھی مگر وہ گاڑی وہاں سے ہمیشہ کی طرح گزر جانے کے بجائے جب وہیں کھڑی ہو گئی تو یک دم لوگوں میں جھنسن بیدار ہوا۔

سکندر عثمان کی ہدایت پر ڈرائیور نیچے آن کر پاس کی ایک دکان کی طرف گیا اور وہاں بیٹھے چند لوگوں سے اسکول کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"یہاں سالار سکندر صاحب کا کوئی اسکول ہے؟" علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔

"جی ہاں ہے۔ یہ اسی سڑک پر آگے دائیں طرف موڑ مڑنے پر بڑی سی عمارت ہے۔" ایک آدمی نے بتایا۔

"آپ ان کے کوئی دوست ہیں؟" اس آدمی نے جواب کے ساتھ ساتھ سوال بھی کیا۔

"نہیں میں ان کے والد کے ساتھ آیا ہوں۔"

”والد؟“ اس آدمی کے منہ سے بے ساختہ لگا اور وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگ یک دم سکندر عثمان کی گاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اس آدمی نے اُنھ کو ڈرائیور سے ہاتھ ملایا۔

”سالار صاحب کے والد آئے ہیں بڑی خوش قسمتی ہے۔“ اس آدمی نے کہا اور پھر ڈرائیور کے ساتھ گاڑی کی طرف آنے لگا۔ وہاں بیٹھے ہوئے باقی لوگ بھی کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے آئے۔ سکندر عثمان نے دور سے انھیں ایک گروپ کی شکل میں اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ کچھ اُلجھن کا شکار ہو گئے۔ ڈرائیور کے پیچھے آنے والے آدمی نے بڑی عقیدت کے ساتھ کھڑی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ سکندر عثمان نے کچھ تذبذب کے عالم میں اس سے ہاتھ ملایا جبکہ اس آدمی نے بڑے جوش و خروش سے دونوں ہاتھوں کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا۔ اس کے ساتھ آنے والے دوسرے آدمی بھی اب یہی کر رہے تھے۔ سکندر کچھ اُلجھن کے انداز میں ان سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ صاب“

پہلے اور دوسرے آدمی نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔

”آپ کے لئے چائے لائیں یا پھر بوتل۔“ وہ آدمی اسی جوش و خروش سے پوچھ رہا تھا۔

ڈرائیور اب گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

”نہیں۔۔۔ کوئی ضرورت نہیں۔ بس راستہ ہی پوچھنا تھا۔“ انہوں نے جلدی سے کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ آدمی اور اس کے ساتھ کھڑے دوسرے لوگ وہیں کھڑے گاڑی کو آگے جاتے دیکھتے رہے پھر اس آدمی نے قدرے مایوسی سے سر ہلایا۔

”سالار صاحب کی اور بات ہے۔“

”ہاں سالار صاحب کی اور بھی بات ہے، وہ کبھی کبھار کھائے پینے بغیر یہاں سے اس طرح جاتے تھے۔“ ایک دوسرے آدمی نے تاکید کی۔ وہ لوگ اب وہاں قدم بڑھانے لگے۔

سالار گاؤں میں موجود ان چند دکانوں کے پاس ہی اپنی گاڑی کھڑی کر دیا کرتا تھا اور پھر وہاں موجود لوگوں سے ملنے ان کی پیش کردہ چھوٹی موٹی چیزیں کھاتا چیتا۔ وہاں سے پیدل دس منٹ میں اپنے اسکول چلا جاتا تھا۔ وہ لوگ مایوس ہوئے تھے۔ سکندر عثمان نے تو گاڑی سے اُترنے تک کا تکلف نہیں کیا تھا، کھانا پینا تو دور کی بات تھی۔

گاڑی اب موڑ مڑ رہی تھی اور موڑ مڑتے ہی ڈرائیور سے مزید کچھ کہتے کہتے سکندر عثمان خاموش ہو گئے۔ گنجیلی سیٹ پر بیٹھے وڈا سکرین کے پار نظر آنے والی وسیع و عریض عمارت ان چھوٹے چھوٹے کپے کپے مکانات اور کھلے کھیتوں کے درمیان دور سے بھی حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی تھی۔ سکندر کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ وہاں اتنا بڑا اسکول چلا رہا تھا مگر ان کو مبنی و بنیاد اسکول کی دور تک پہنچتی ہوئی عمارت

نے نہیں کیا تھا کہ اسکول کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر لگے اس سائین بورڈ نے کیا جس پر تیرہ کے ایک نشان کے اوپر چلی حروف میں اردو میں تحریر تھا۔ سکندر عثمان ہائی اسکول، ڈرائیور گاڑی اسکول کے سامنے روک چکا تھا۔

سکندر عثمان نے گاڑی سے اُتر کر اس عمارت کے گیٹ کے پار عمارت کے سامنے پرچھتے ہوئے اپنے نام کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی۔ سالار سکندر نے ایک بار پھر انھیں کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ گیٹ بند تھا مگر اس کے دوسری طرف چوکیدار موجود تھا جو گاڑی کو وہاں رکنے دیکھ کر گیٹ کھول رہا تھا۔ ڈرائیور جب تک گاڑی سے اُترا پوچھ کر ابا پر آگیا۔

”صاحب شہر سے آئے ہیں ڈرا اسکول دیکھنا چاہتے ہیں۔“ ڈرائیور نے چوکیدار سے کہا۔ سکندر عثمان بنو اس اسکول پر لگے اپنے نام کو دیکھ رہے تھے۔

”سالار صاحب کے حوالے سے آئے ہیں؟“ چوکیدار نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔“ ڈرائیور نے بلا توقف کہا۔ ”ویسے ہی آئے ہیں۔“ سکندر عثمان نے پہلی بار اپنی نظریں بٹا کر ڈرائیور اور پھر چوکیدار کو دیکھا۔

”میں سالار سکندر کا باپ ہوں۔“ سکندر عثمان نے مستحکم مگر بھرتائی ہوئی آواز میں کہا۔ ڈرائیور نے حیرانی سے ان کو دیکھا۔ چوکیدار ایک دم بولکھ گیا۔

”آپ۔۔۔ آپ سکندر عثمان صاحب ہیں؟“ سکندر کچھ کہے بغیر میکانیکی انداز میں گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ شام کو جاگنگ ٹریک پر تھا جب موہاگل پر سکندر عثمان کی کال آئی۔ اپنی بے ترتیب سانس پر قابو پا رہے تھے وہ جاگنگ کرتے کرتے زک گیا اور ٹریک کے پاس ایک شیٹ پر بیٹھ گیا۔

”بیلو بیلا! السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام۔۔۔ ٹریک پر ہو؟“ انہوں نے اس کے پھولے ہوئے سانس سے اندازہ لگایا۔

”ہی۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں۔۔۔“

”مئی کیسی ہیں؟“

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔“ سالار ان کی طرف سے کچھ مزید کہنے یا پوچھنے کا انتظار کرتا رہا۔ دوسری طرف اب خاموشی تھی پھر چند لمحوں کے بعد وہ بولے۔

”میں آج تمہارا اسکول دیکھ کر آیا ہوں۔“

"ریٹلی۔۔۔۔۔؟" سالار نے بے ساختہ کہا۔

"کیسا لگا آپ کو؟"

"تم نے یہ سب کیسے کیا ہے سالار؟"

"کیا۔۔۔؟"

"وہ سب کچھ جو وہاں ہے۔"

"پتا نہیں۔ بس بوتا گیا۔ مجھے پتا ہوتا تو میں آپ کو خود ساتھ لے جاتا۔ کوئی پراہلم تو نہیں ہوئی؟"

"وہاں سالار سکندر کے باپ کو کوئی پراہلم ہو سکتی ہے؟" انہوں نے جوابا کہا۔ سالار جانتا تھا وہ سوال نہیں تھا۔

"تم کسی طرح کے آدمی ہو سالار؟"

"پتا نہیں۔ آپ کو پتا ہونا چاہئے، میں آپ کا بیٹا ہوں۔"

"نہیں مجھے۔۔۔۔۔ مجھے تو بھی کبھی پتا نہیں چل سکا۔" سکندر کا لہجہ حقیقت۔ سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔

"مجھے بھی کبھی پتا نہیں چل سکا۔ میں تو اب بھی اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ سالار ایک انتہائی احمق دیکھتے اور غیبیت انسان ہو۔"

سالار ہنسا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں واقعی ایسا ہوں۔۔۔۔۔ اور کچھ۔۔۔؟"

"اور۔۔۔۔۔ یہ کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ تم میری اولاد ہو۔" سکندر جھین کی آواز لرز رہی تھی۔ اس بار چپ رہنے کی باری سالار کی تھی۔

"مجھے اس اسکول کے ہر ماہ کے اخراجات کے بارے میں بتا دیے۔ میری فرم ہر ماہ اس رقم کا چیک تمہیں بھجوا کر دے گی۔"

اس سے پہلے کہ سالار کچھ کہتا فون بند ہو چکا تھا۔ سالار نے پارک میں جھیلی تاریکی میں ہاتھ میں پکڑے موبائل کی روشنی اسکرین کو دیکھا۔ پھر جاگنگ ٹریک پر لگی روشنیوں میں وہاں دوڑتے لوگوں کو دیکھ کر وہ وہی جیسا خالی مذاق تھا جس نے عالم میں ان لوگوں کو دیکھتا رہا پھر انھیں کہنے کے لیے ڈبے بھرے ہوئے ٹریک پر آگیا۔

☆ ☆ ☆

رمحہ سے سالار کی جھیلی ملاقات لاہور آنے کے ایک سال بعد ہوئی تھی۔ وہ لندن اسکول آف

آکٹاگس کی گریجویٹ تھی اور سالار کے چنگ میں اس کی تعیناتی ہوئی تھی۔ اس کے والد بہت عرصے سے اس چنگ کے کنٹرول میں تھے اور سالار انہیں ذاتی طور پر جانتا تھا۔

رمحہ بہت خوب صورت، ڈچن اور خوش مزاج لڑکی تھی اور اس نے وہاں آنے کے کچھ عرصے کے بعد ہی ہر ایک سے خاصی بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ ایک کو ایک کے طور پر سالار کے ساتھ ہی اس کی اچھی سلام و صافھی اور کچھ اس کے والد کے حوالے سے بھی وہ اس کی خاصی عزت کرتا تھا۔ چنگ میں کام کرنے والی چند دوسری لڑکیوں کی نسبت رمحہ سے اس کی کچھ زیادہ بے تکلفی تھی۔

لیکن سالار کو قطعاً اندازہ نہیں ہوا کہ کس وقت رمحہ نے اسے کچھ زیادہ پیچیدگی سے لینا شروع کر دیا۔ وہ سالار کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ اس کے آفس میں بھی زیادہ آنے جانے لگی تھی اور آفس کے بعد بھی اکثر اوقات اسے کال کرتی رہتی۔ سالار کو چند بار اس کا رویہ کچھ خلاف معمول لگا لیکن اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے شبہات کو جھٹک دیا مگر اس کا یہ اطمینان چارے سے ایک سال کے بعد ایک واقعے کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

سالار صبح آفس میں داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی چونک گیا۔ اس کی ٹیبل پر ایک بھٹیلا بڑا اور خوب صورت کیے پڑا ہوا تھا۔ اپنا بریف کیس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے دو کیے اٹھا کر اس پر موجود کارڈ کھولا۔

"پتی برتھ ڈے ٹو سالار سکندر"

رمحہ دہلئی

سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ آج اس کی سالگرہ تھی مگر رمحہ یہ کیسے جانتی تھی وہ کچھ دیر کے سوچ میں گم ٹیبل کے پاس کھڑا پھر اس کے ٹیبل پر ایک طرف رکھ کر دیا اپنا کوٹ آٹار کر اس نے ریل والوگ چیمبر کی پشت پر لٹکا دیا اور تھیز پر بیٹھ گیا۔ کیک کے نیچے ٹیبل پر بھی ایک کارڈ پڑا ہوا تھا۔ اس نے بیٹھے کے بعد اس کا کارڈ کھولا۔ چند لمبے تک وہ اس میں گھسی ہوئی تحریر پڑھتا رہا پھر کارڈ بند کر کے اس نے اپنی دراز میں رکھ دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا اس کا کارڈ اور اس کے پاس دراصل کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد کچھ سوچتا رہا پھر اس نے کندھے سے جھٹک کر اپنا بریف کیس کھولا شروع کر دیا۔ وہ اس میں سے اپنا لیپ ٹاپ نکال کر بریف کیس کو نیچے کا پٹ پر اپنی ٹیبل کے ساتھ رکھ رہا تھا جب رمحہ اندر داخل ہوئی۔

"پتی برتھ ڈے سالار۔" اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

سالار مسکرایا۔

”تھیکس۔۔۔“ رمہ اب ٹھیل کے سامنے پڑی کرسی کھینچ کر بیٹھ رہی تھی، جب کہ سالار لیپ ٹاپ کو کھولنے میں مصروف تھا۔

”کیے اور کارڈ کے لئے بھی شکریہ۔ یہ ایک خوشگوار سرپرائز تھا۔“
سالار نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا وہ اب اپنا فون لیپ ٹاپ کے ساتھ اٹیچ کرنے میں مصروف تھا۔

”مگر تمہیں میری برتھ ڈے کے بارے میں پتا کیسے چلا؟ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔“
”جب یہ تو میں نہیں بتاؤں گی۔ بس پتا چلا تا تھا۔ چلا آیا۔“ رمہ نے کھٹکتی سے کہا۔ ”اور ویسے بھی دوست آپس میں یہ سوال بھی نہیں کرتے۔ اگر دوستوں کو ایسی چیزوں کا بھی پتہ نہیں ہوگا تو پھر وہ دوست تو نہیں ہوتے۔“

سالار لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا۔
”اب میں سارے اسٹاف کی طرف سے پارٹی کی ڈیمانڈ کے لئے آئی ہوں۔ آج کا ڈنر جمیں اریج کرنا چاہئے۔“ سالار نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔
”رمہ! میں اپنی برتھ ڈے سیلبریٹ نہیں کرتا۔“

”کیوں۔۔۔؟“
”ویسے ہی۔۔۔“
”کوئی وجہ تو ہوگی۔“
”کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بس میں ویسے ہی سیلبریٹ نہیں کرتا۔“
”پہلے نہیں کرتے ہو گے مگر اس بار تو کرنی پڑے گی۔ اس بار تو سارے اسٹاف کی ڈیمانڈ ہے۔“
رمہ نے بے تکلفی سے کہا۔

”میں کسی بھی دن آپ سب لوگوں کو کھانا کھلا سکتا ہوں۔ میرے گھر پر، ہوٹل میں، جہاں آپ چاہیں مگر میں برتھ ڈے کے سلسلے میں نہیں کھلا سکتا۔“ سالار نے صاف گوئی سے کہا۔
”یعنی تم چاہتے ہو کہ ہم تمہارے لئے پارٹی اریج کر دیں۔“ رمہ نے کہا۔

”میں نے ایسا نہیں کہا۔“ وہ کچھ حیران ہوا۔
”اگر تم پر رے اسٹاف کو پارٹی نہیں بھی دے سکتے تو کم از کم مجھے ڈنر پر تولے جاسکتے ہو۔“
”رمہ! میں آج رات کچھ مصروف ہوں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ۔“ سالار نے ایک بار پھر

معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں، میں بھی آجاؤں گی۔“ رمہ نے کہا۔

”نہیں یہ مناسب نہیں ہوگا۔“
”کیوں۔۔۔؟“

”وہ سب مرد ہیں اور تم ان سے واقف بھی نہیں ہو۔“ اس نے بہانا بنایا۔
”میں سمجھتی ہوں۔“ رمہ نے کہا۔
”پھر کل چلتے ہیں؟“

”نہیں نہیں۔۔۔ پھر کبھی چلیں گے۔ میں تمہیں بتا دوں گا۔“
رمہ کچھ مایوس ہوئی مگر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے فی الحال باہر کہیں لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔
”اوکے۔۔۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”مجھے امید ہے، تم نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔“ سالار نے اسے اُٹھتے دیکھ کر کہا۔
”نہیں بالکل نہیں۔ It's alright“ وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ سالار اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کا خیال تھا سالگرہ کا وہ معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

لچ آور کے دوران اس کے لئے ایک سرپرائز پارٹی تیار تھی۔ اس کے پاس مسٹر پال ملنے بڑی گرم جوشی سے سالگرہ پر مبارکباد دی تھی۔ وہ پارٹی رمہ نے اریج کی تھی اور ایک اور دوسرے لوازمات کو دیکھتے ہوئے وہ پہلی بار منیج معنوں میں تشویش میں مبتلا ہوا تھا اگر پہلے رمہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی پسندیدگی ظاہر کر رہی تھی تو اس دن اس نے بہت واضح انداز میں یہ بات ظاہر کر دی تھی۔ وہ لچ آور کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ اپنے آفس میں بیٹھا پہلی بار رمہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس سے کون سی ایسی غلطی ہوئی تھی، جس سے رمہ کو اس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ دیکھتے کچھ عرصے میں ملنے والی چند اچھی لڑکیوں میں سے ایک تھی مگر وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس میں انوالو ہوئے۔ لگے۔ وہ دیکھتے کچھ عرصے سے رمہ کے اپنے لئے خاص رویے کو اس کی خوش اخلاقی سمجھ کر ناٹا رہا تھا، مگر اس دن آفس سے نکلتے ہوئے اس کی طرف سے دیئے جانے والے چند پیکٹس کو گھر جا کر کھولنے پر اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ ابھی ان تحائف کو دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو رہا تھا، جب فرقان آگیا۔ ڈرائنگ روم میں بڑے سے پیکٹس فور اس کی نظر میں آگئے۔

”واؤ، آج تو خاصے تحائف آکھتے ہو رہے ہیں۔ دیکھ لوں؟“ فرقان نے صوف پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
سالار نے صرف سر ہلایا، گھڑی، پرفیومر، ٹائیٹاں، شیش، وہ کیے بعد دیکرے ان چیزوں کو نکال نکال کر دیکھتا رہا۔

”یہ تمہاری بری کا سامان اکٹھا نہیں ہو گیا؟“ فرقان نے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ”خاصا دل

کھول کر گفٹس دیئے ہیں تمہارے کو لیکز نے۔"

"صرف ایک کو لیک نے۔" سالار نے مداخلت کی۔

"یہ سب کچھ ایک نے دیا ہے؟" فرقان کچھ حیران ہوا۔

"ہاں۔"

"کس نے؟"

"رمو نے۔"

فرقان نے اپنے ہونٹ سکڑے۔

"تم جانتے ہو یہ تمام گفٹس ایک ڈیڑھ لاکھ کی ریٹ میں ہوں گے۔" وہاب دوبارہ ان چیزوں پر

نظر ڈال رہا تھا۔

صرف یہ گھڑی ہی پچاس ہزار کی ہے۔ کوئی صرف کو لیک سمجھ کر تو اتنی مہنگی چیزیں نہیں دے گا۔ تم

لوگوں کے درمیان کوئی۔۔۔ فرقان بات کرتے کرتے ڈک گیا۔

"ہم دونوں کے درمیان کچھ نہیں ہے۔ کم از کم میری طرف سے، مگر آج میں پہلی بار پریشان ہو گیا

ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ رمو۔۔۔ مجھ میں کچھ ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔" سالار نے ان

چیزوں پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھی بات ہے۔ چلو تم میں بھی کسی لڑکی نے دلچسپی لی۔" فرقان نے ان ٹیکٹس کو واپس

سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"دیئے بھی تم بہت کنوارے رہ گئے۔ گئے ہاتھوں اس سال یہ کام کرو۔"

"جب مجھے شادی نہیں کرنی تو میں اس سلسلے کو آگے کیوں بڑھاؤں۔"

"سالار دن بے دن تم بہت impractical کیوں ہوتے جا رہے ہو؟ تمہیں اب سیٹل ڈاؤن ہونے

کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ ہر لڑکی سے کب تک اس طرح بھاگتے پھرو گے۔ تمہیں اپنی

ایک فیملی شروع کر لینی چاہیے۔ رمو اچھی لڑکی ہے۔ میں اس کی فیملی کو جانتا ہوں۔ کچھ ماڈرن ضرور ہے

مگر اچھی لڑکی ہے اور چلو اگر رمو نہیں تو پھر تم کسی اور کے ساتھ شادی کرو۔ میں اس سلسلے میں

تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ تم اپنے بیڑ میں کسی مدد کے بغیر اب نہیں اس معاملے کے بارے میں

سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ تمہیں ان تمام باتوں کے بارے میں غور کرنا چاہیے اور کم از کم دوسرے کی

بات کے جواب میں کچھ کہہ ضرور دینا چاہیے۔"

فرقان نے آخری جیلے پر زور دیتے ہوئے کہا اس کا اشارہ اس کی خاموشی کی طرف تھا۔

"اس سے دوسرے کو یہ تسلی ہو جاتی ہے کہ وہ کسی مجھے کے سامنے تقریر نہیں کرتا رہا۔" فرقان

نے کہا۔

"تم کبھی اپنی شادی کے بارے میں سوچتے نہیں ہو؟"

"کون اپنی شادی کے بارے میں نہیں سوچتا؟" سالار نے مدھم آواز میں کہا۔ "میں بھی سوچتا

ہوں مگر میں اس طرح نہیں سوچتا جس طرح تم سوچتے ہو۔ چائے پیو گے؟"

"آخری جیلے کے بجائے تمہیں کہنا چاہئے تھا کہ کواں بند کرو۔"

فرقان نے ناراضی سے کہا۔ سالار نے مسکرا کر کندھے اچکا دیئے وہ اب چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

رمو نے حیرانی سے اپنے سامنے پڑے ان ٹیکٹس کو دیکھا۔ "لیکن سالار! یہ سب چیزیں تمہارا

برقہ ڈے گفٹ ہیں۔"

سالار اگلی صبح ایک ٹائی چھوڑ کر تمام چیزیں واپس اٹھا لیا تھا اور اب وہ رمو کے آفس میں تھا۔

"میں کسی سے اتنا مہنگا تحفہ نہیں لیا کرتا۔ ایک ٹائی کافی ہے۔"

"سالار، میں اپنے فریڈز کو اتنی سی مہنگے گفٹس دیتی ہوں۔" رمو نے وضاحت کی کوشش کی۔

"یقیناً تم دیتی ہو گی مگر میں نہیں لیتا۔ اگر تم نے زیادہ اصرار کیا تو میں وہ ٹائی بھی لا کر واپس

تمہیں دے دوں گا۔" سالار نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل آیا۔ رمو

پچھلے چہرے کے ساتھ اسے کمرے سے نکلتا دیکھتی رہی۔

”تقی صاحب! میں نے زندگی میں آج تک کسی سے بیعت نہیں لی۔ آپ کے منہ سے بیر کامل کا ذکر سنا۔ بیر کامل کون ہوتا ہے۔ بیر کامل کس کو کہتے ہیں۔ وہ کیا کرتا ہے۔ اس کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟“

وہ بڑی سنجیدگی سے اس شخص سے پوچھ رہے تھے۔

”آپ بیر کامل ہیں۔“ اس شخص نے کہا۔

”نہیں، میں بیر کامل نہیں ہوں۔“ ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

”آپ سے مجھے ہدایت ملتی ہے۔“ اس شخص نے اصرار کیا۔

”ہدایت تو استاد بھی دیتا ہے، ماں باپ بھی دیتے ہیں، لیڈرز بھی دیتے ہیں، دوست احباب بھی دیتے ہیں، کیا وہ بیر کامل ہو جاتے ہیں؟“

”آپ۔۔۔ آپ گناہ نہیں کرتے۔“ وہ آدمی گڑبڑا گیا۔

”ہاں، دانستہ طور پر نہیں کرتا، اس لئے نہیں کرتا، کیونکہ گناہ سے مجھے خوف آتا ہے۔ یہاں پر بیٹھے بہت سے لوگ دانستہ طور پر گناہ نہیں کرتے ہوں گے، کیونکہ میری طرح انہیں بھی گناہ سے خوف آتا ہو گا مگر نادانستگی میں مجھ سے کیا سرزد ہو جاتا ہے، اسے میں نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے نادانستگی میں مجھ سے بھی گناہ سرزد ہو جاتے ہوں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ کی دعا قبول ہوتی ہے۔“ وہ آدمی اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

”دعا تو ماں باپ کی بھی قبول ہوتی ہے، مجبور اور مظلوم کی بھی قبول ہوتی ہے اور بھی بہت سے لوگوں کی قبول ہوتی ہے۔“

”لیکن آپ کی تو ہر دعا قبول ہو جاتی ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔

ڈاکٹر سبط علی صاحب نے انکار میں سر ہلایا۔

”نہیں، ہر دعا تو قبول نہیں ہوتی۔ میں کئی سالوں سے ہر روز مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی دعا کرتا ہوں، ابھی تک تو قبول نہیں ہوئی۔ ہر روز میری کی جانے والی دعا میں قبول نہیں ہوتی۔“

”لیکن آپ کے پاس جو شخص دعا کروانے کے لئے آتا ہے، اس کے لئے آپ کی دعا ضرور قبول ہو جاتی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

”آپ کے لئے کی جانے والی دعا قبول ہو گئی ہوگی، یہاں بہت سے ایسے ہیں جن کے لئے میری

دعا قبول نہیں ہوتی یا نہیں ہوتی۔“

وہ اب کچھ بول نہیں سکا۔

باب ۷

سالار اس دن ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ابھی اپنا لیجر شروع نہیں کیا تھا جب ان کے پاس بیٹھے ایک ادیبز عمر آدمی نے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! آدمی کو بیر کامل مل جائے تو اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔“

سالار نے گردن موڑ کر اس شخص کو دیکھا، وہ وہاں پچھلے چند دن سے آ رہا تھا۔

”اس کی تسلیں سنو رہی ہیں۔ میں جب سے آپ کے پاس آنے لگا ہوں، مجھے لگتا ہے میں

ہدایت پا گیا ہوں۔ میرے لئے کام سیدھے ہونے لگے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ مجھے بیر کامل مل گیا

ہے۔ میں۔۔۔ میں آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ بڑی عقیدت مندی سے ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہنے لگا۔ کمرے میں مکمل خاموشی

چھا گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نرمی سے اس شخص کے ہاتھ پر تھپکی دیتے ہوئے اپنا ہاتھ چمڑا لیا۔

”آپ میں سے اگر کوئی بتائے کہ بیر کامل کون ہوتا ہے؟“
 وہاں موجود لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر ایک نے کہا۔
 ”بیر کامل نیک شخص ہوتا ہے، عبادت گزار شخص، پارسا آدمی۔“
 ڈاکٹر سیٹھ علی نے سر ہلایا۔

”بہت سے لوگ نیک ہوتے ہیں، عبادت گزار ہوتے ہیں، پارسا ہوتے ہیں۔ آپ کے ارد گرد ایسے بہت سارے لوگ ہوتے ہیں تو کیا وہ سب بیر کامل ہوتے ہیں؟“

”نہیں، بیر کامل وہ آدمی ہوتا ہے جو دکھاوے کے لئے عبادت نہیں کرتا۔ دل سے عبادت کرتا ہے، صرف اللہ کے لئے۔ اس کی نیکی اور پارسائی دعوے کو نہیں ہوتی۔“ ایک اور شخص نے اپنی رائے دی۔
 ”اپنے حلقہ احباب میں آپ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ایسے شخص کو ضرور جانتا ہو گا، جس کی عبادت کے بارے میں اسے یہ شبہ نہیں ہوتا کہ وہ دھوکہ دے، جس کی نیکی اور پارسائی کا بھی آپ کو یقین ہوتا ہے تو کیا وہ شخص بیر کامل ہے؟“

”کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک اور شخص نے کہا۔
 ”بیر کامل ایک ایسا شخص ہوتا ہے، جس کے الفاظ میں تاثر ہوتی ہے کہ وہ انسان کا دل بدل دیتے ہیں۔“

”تاثر بھی بہت سے لوگوں کے الفاظ میں ہوتی ہے۔ کچھ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ میں، کچھ کے قلم سے نکلنے والے الفاظ میں، تاثر تو اسٹیج پر کھڑے ایک کپیٹر اور اخبار کا کالم لکھنے والے ایک جرنلسٹ کے الفاظ میں بھی ہوتی ہے تو کیا وہ بیر کامل ہوتے ہیں؟“

ایک اور شخص بولا۔ ”بیر کامل وہ ہوتا ہے جسے الہام اور وجدان ہو جو مستقبل کو بوجھ سکے۔“

”ہم میں سے بہت سارے لوگ ایسے خواب دیکھتے ہیں جن میں مستقبل میں درپیش آنے والے حالات سے ہمیں آگہی ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ استحضار بھی کرتے ہیں اور پیڑوں کے بارے میں کسی حد تک جان چاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی پستی جس بہت تیز ہوتی ہے، وہ خطروں کو بھانپ جاتے ہیں۔“

”بیر کامل کون ہوتا ہے؟“ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خاموش رہے، انہوں نے پھر اپنا سول دہرایا۔
 ”بیر کامل کون ہو سکتا ہے؟“ سارا اُلجھن آمیز انداز میں ڈاکٹر سیٹھ علی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔
 ”کیا ڈاکٹر سیٹھ علی کے علاوہ کوئی اور بیر کامل ہو سکتا تھا اور اگر وہ نہیں تھے تو پھر کون تھا اور کون ہو سکتا ہے؟“

وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ میں ایک سی گونج تھی۔ ڈاکٹر سیٹھ علی ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہے تھے، پھر ان کے چہرے کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔

”بیر کامل میں کاملیت ہوتی ہے۔ کاملیت ان تمام چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو آپ کبہ رہے تھے۔ بیر کامل وہ شخص ہوتا ہے جو دل سے اللہ کی عبادت کرتا ہے، نیک اور پارسا ہوتا ہے۔ اس کی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ اس حد تک جس حد تک اللہ چاہے۔ اس کے الفاظ میں تاثر بھی ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو ہدایت بھی دیتا ہے مگر اسے الہام نہیں ہوتا اسے وجدان ہوتا ہے۔ وحی آتی ہے اس پر اور وحی کسی عام انسان پر نہیں آتی۔ صرف پیغمبر پر آتی ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کامل تھا مگر بیر کامل وہ ہے جس پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا جاتا ہے۔

ہر انسان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی بیر کامل کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔ کبھی نہ کبھی انسانی زندگی اس موڑ پر آکر ضرور کھڑی ہو جاتی ہے جب یہ لگتا ہے کہ ہمارے لبوں اور دل سے نکلنے والی دعائیں بے اثر ہو چکی ہیں۔ ہمارے سجدے اور ہمارے پھیلے ہوئے ہاتھ رحمتوں اور نعمتوں کو اپنی طرف موز نہیں پارہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی تعلق تھا جو ٹوٹ گیا ہے پھر آدمی کا دل چاہتا ہے اب اس کے لئے کوئی اور ہاتھ اٹھائے، کسی اور کے لب اس کی دعا لیاں تک پہنچائیں، کوئی اور اللہ کے سامنے اس کے لئے گواہ گوائے، کوئی ایسا شخص جس کی دعائیں قبول ہوتی ہوں، جس کے لبوں سے نکلنے والی التجائیں اس کے اپنے لفظوں کی طرح واپس نہ موڑ دی جاتی ہوں پھر انسان بیر کامل کی تلاش شروع کرتا ہے، بہانہ بنا کر دیکھتا ہے، دنیا میں کسی ایسے شخص کے لئے جو کاملیت کی کسی نہ کسی بیزگاہ پر کھڑا ہو۔

بیر کامل کی یہ تلاش انسانی زندگی کے ارتقاء سے اب تک جاری ہے۔ یہ تلاش وہ خواہش ہے جو اللہ خود انسان کے دل میں پیدا کر تا ہے۔ انسان کے دل میں یہ خواہش، یہ تلاش نہ آتی جاتی تو وہ پیغمبروں پر کبھی یقین نہ لاتا۔ کبھی ان کی پیروی اور اطاعت کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ بیر کامل کی یہ تلاش ہی انسان کو ہر زمانے میں آتارے جانے والے پیغمبروں کی طرف لے جاتی رہی پھر پیغمبروں کی مبعوثیت کا یہ سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی اور بیر کامل کی گنجائش نہیں رہی گئی۔

کون ہے جسے اب آئندہ آنے والے زمانے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کوئی مقام دیا جائے؟

کون ہے جسے آج یا آئندہ آنے والے زمانے میں کسی شخص کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کاملیت دے دی جائے؟

کون ہے جو آج یا آئندہ آنے والے زمانے میں کسی شخص کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر شہادت کا دعویٰ کر سکے؟

جہاد اور مستقل خاموشی کی صورت میں آنے والا فیصلہ یہ ہے جو اب ہم سے صرف ایک سوال

بیر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خود شناخت نہیں کر پایا تھا اور امام ہاشم نے ہر کام خود کیا تھا۔ شناخت سے اجاحت تھیں۔ اس کو سالار سکندر کی طرح دوسروں کے کندھوں کی ضرورت نہیں پڑی۔

سالار سکندر نے پچھلے آٹھ سالوں میں امام ہاشم کے لئے ہر جذبہ محسوس کیا تھا۔ حقارت، تحقیک، پیچھا تار، نفرت، محبت، سب کچھ۔ مگر آج وہاں بیٹھے چلی بار اسے امام ہاشم سے حسد ہو رہا تھا۔ حتیٰ کیا وہ؟ ایک عورت۔ ذرا سی عورت۔ آسمان کی حور نہیں تھی۔ سالار سکندر جیسے آدمی کے سامنے کیا وقت تھی اس کی۔

کیا میرے جیسا آئی کیو تھا اس کا؟

کیا میرے جیسے کامیابیاں تھیں اس کی؟

کیا میرے جیسا کام کر سکتی تھی وہ؟

کیا میرے جیسا نام نکاسکتی تھی؟

کچھ بھی نہیں تھی وہ اور اس کو سب کچھ پلیٹ میں رکھ کر دے دیا اور میں۔ میں جس کا آئی کیو لیول ۱۵۰+ مجھے سامنے کی چیزیں دیکھنے کے قابل نہیں رکھا؟

وہ اب آنکھوں میں نمی لئے اندھیرے میں دھنسا کر بین سے باہر دیکھتے ہوئے بڑا رہا تھا۔

”مجھے بس اس قابل کر دیا کہ میں باہر نگلوں اور دنیا فتح کر لوں۔ وہ دنیا جس کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے اور وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“

وہ رُک گیا۔ اسے امام پر غصہ آرہا تھا۔ آٹھ سال پہلے کا وقت ہو تا تو وہ اسے ”بچ“ کہتا، تب امام پر غصہ آنے پر وہ اسے یہی کہا کرتا تھا مگر آٹھ سال کے بعد آج وہ زبان پر اس کے لئے گالی نہیں لاسکتا تھا۔ وہ امام ہاشم کے لئے کوئی برا لفظ نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ صراطِ مستقیم پر خود سے بہت آگے کھڑی اس عورت کے لئے کون زبان سے برا لفظ نکال سکتا تھا؟

اپنے گلہ باز آواز پر اس نے اپنی آنکھیں میسیں۔ اس کے انداز میں تھکت خورگی تھی۔

”بیر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ صراطِ مستقیم۔“ آٹھ سال گئے تھے، مگر تلاش ختم ہو گئی تھی۔

جواب مل چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں ایک رستہ پر تھے۔ رستہ آج خام طور پر تیار ہو کر آئی تھی۔ وہ خوش تھی اور کوئی بھی اس کے چہرے سے اس کی خوشی کا اندازہ نہ لگا سکتا تھا۔ سالار ابھی۔

ویر سے مینو کارڈ لے کر سالار نے بند کر کے ٹیبل پر رکھ دیا۔ رستہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ اپنا کارڈ کھولے ہوئے تھی۔

”لچ میری طرف سے ہے مگر مینو آپ ملے کریں۔“ سالار نے مدہم سکرانٹ کے ساتھ کہا۔

”اوکے۔“ رستہ نے اختیار سکرانی پھر وہ مینو کارڈ پر نظر دوڑانے لگی اور سالار قرب و جوار میں۔

رستہ نے ویر کو کچھ ڈسٹنٹ کر دیا۔ جب ویر چلا گیا تو اس نے سالار سے کہا۔

”تمہاری طرف سے لچ کی یہ دعوت بڑا چھاپرا ہے انا ہے میرے لئے۔ پہلے تو کبھی تم نے ایسی کوئی دعوت نہیں دی؟ بلکہ میری دعوت بھی رد کرتے رہے۔“

”ہاں لیکن اب ہم دونوں کے لئے کچھ باتیں کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مجھے اسی لئے تمہیں یہاں بلانا پڑا۔“ سالار نے کہا۔

رستہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”کچھ باتیں؟۔۔۔ کون سی باتیں؟“

”پہلے لچ کر لیں، اس کے بعد کریں گے۔“ سالار نے اسے ٹالنے ہوئے کہا۔

”مگر لچ آنے اور کھانے میں کافی وقت لگے گا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم وہ باتیں ابھی کر لیں؟“

رستہ نے قدرے بے تابی سے کہا۔

”نہیں، یہ بہتر نہیں ہے۔ لچ کے بعد۔“ سالار نے سکرانٹے ہوئے مگر حقی انداز میں کہا۔

رستہ نے اس بار اصرار نہیں کیا۔ وہ دونوں بکلی پختگی گفتگو کرنے لگے پھر لچ آیا اور وہ دونوں لچ میں مصروف ہو گئے۔

لچ سے فارغ ہونے میں تقریباً پانچ گھنٹہ لگا۔ پھر سالار نے ویر سے کافی منگولی۔

”میرا خیال ہے، اب بات شروع کرنی چاہئے۔“

رستہ نے کافی کا پیلا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ سالار اب بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنی کافی میں تنجی بھار رہا تھا۔ رستہ کی بات پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں تم سے اس کارڈ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، جو تم نے دو دن پہلے مجھے بھیجا ہے۔“

رستہ کا چہرہ قدرے سرخ ہو گیا۔

وہ دونوں پہلے جب وہ شام کو اپنے فلیٹ پر پہنچا تو وہاں ایک کارڈ اور کیے اس کا منتظر تھا۔ وہ ایک ہفتہ

ہفتہ کا کچھ میں بینک کے کسی کام کے لئے رہا تھا اور اسی شام وہاں آیا تھا۔ کارڈ رستہ کا بھیجا ہوا تھا۔

”تمہیں وہ بارود کچھ کر مجھے سختی خوشی ہو گی اس کا اظہار ناممکن ہے۔“

سالار کارڈ پر لکھے پیغام کو پڑھ کر چند لمحوں کے لئے ساکت رہ گیا۔ اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ رستہ اس کے لئے اپنے احساسات کا اظہار کر رہی تھی۔

سالار نے اگلے دو دن اس کارڈ کے بارے میں رستہ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا لیکن اس نے ویک

ایڈ پر اسے لٹکی دعوت دے ڈالی۔ رمہ کے ساتھ اب ان تمام باتوں کو کلیئر کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

”تمہیں کارڈ برا الگا؟“ رمہ نے کہا۔

”نہیں، پیغام۔“

رمہ کچھ شرمندہ ہو گئی۔

”آئی ایم سوری، مگر میں صرف..... سالارا میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی کہ میں نے تمہیں کتنا مس کیا۔“

سالار نے کافی کافیک گھونٹ لیا۔

”تم مجھے ایسے لگتے ہو، میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

رمہ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

”ہو سکتا ہے یہ پروپوزل تمہیں عجیب لگے لیکن میں بہت عرصے سے اس سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ میں تم سے فطرت نہیں کر رہی ہوں جو کچھ کارڈ میں نے لکھا ہے میں واقعی تمہارے لئے وہی جذبات رکھتی ہوں۔“

سالار نے اسے بات مکمل کرنے دی۔ اب وہ کافی کاکپ پیچے رکھ چکا تھا۔

”لیکن میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ جب وہ خاموش ہو گئی تو اس نے دو لوک انداز میں کہا۔
”کیوں؟“

”کیا اس سوال کا جواب ضروری ہے؟“ سالار نے کہا۔

”نہیں، ضروری نہیں ہے مگر بتانے میں کیا حرج ہے۔“

”تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو؟“ سالار نے جواباً پوچھا۔

”کیونکہ تم مختلف ہو۔“

سالار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”عام مردوں جیسے نہیں ہو، وہ تار ہے تم میں، پھر ڈارگرومڈ ہو۔“

”میں ایسا نہیں ہوں۔“

”ثابت کرو۔“ رمہ نے اسے جیسے چیلنج کیا۔

”کر سکتا ہوں مگر نہیں کروں گا۔“ اس نے کافی کاکپ دوبارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہر مرد سالار سکندر سے بہتر ہے۔“

”کس لحاظ سے؟“

”ہر لحاظ سے۔“

”میں نہیں مانتی۔“

”تمہارے نہ ماننے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔“

”میں تمہیں جانتی ہوں، ڈیڑھ سال سے تمہارے ساتھ کام کر رہی ہوں۔“

”مردوں کے بارے میں اتنی جلدی کسی رائے پر پہنچنا مناسب نہیں ہوتا۔“

”تمہاری کوئی بات تمہارے بارے میں میری رائے کو تبدیل نہیں کر سکتی۔“ رمہ اب بھی اپنی بات پر قائم تھی۔

”تم جس فیملی سے تعلق رکھتی ہو، جس سوسائٹی میں مود کرتی ہو، وہاں تمہیں مجھ سے زیادہ اچھے مرد مل سکتے ہیں۔“

”تم مجھ سے صرف اپنی بات کرو۔“

”رمہ! میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔“

اس نے بالآخر کہہ دیا۔ اس ساری گفتگو میں پہلی بار رمہ کی رجحان زور پڑی۔

”تم نے..... تم نے کبھی..... کبھی نہیں بتایا۔“

سالار آہستہ سے مسکرایا۔ ”ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی تو کبھی بھی نہیں رہی۔“

”تم اس سے شادی کر رہے ہو؟“

دونوں کے درمیان اس بار خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔

”ہو سکتا ہے کچھ مشکلات کی وجہ سے میری وہاں شادی نہ ہو سکے۔“ سالار نے کہا۔

”میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکتی۔ تم کسی سے محبت کر رہے ہو، یہ جانتے ہوئے کہ وہاں تمہاری شادی نہیں ہو سکتی؟“

”کچھ ایسا ہی ہے۔“

”سالار! تم..... تم اتنے جذباتی تو نہیں ہو۔ ایک پریکٹیکل آدمی ہو کر تم کس طرح کی عجیب بات کر رہے ہو۔“

رمہ استہزاء سے انداز میں ہنس دی۔

”فرض کیا کہ وہاں تمہاری شادی نہیں ہوئی تو پھر..... پھر کیا تم کبھی شادی نہیں کرو گے؟“

”نہیں۔“

رمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ I can't believe it (مجھے یقین نہیں آ رہا)۔

”مگر ایسا ہی ہے، میں نے اگر کبھی شادی کا سوچا بھی تو دس چار سال بعد ہی سوچوں گا اور دس

چند سال تک ضروری نہیں کہ میں زندہ رہوں۔“

اس نے بے حد شگ لہجے میں کہتے ہوئے ویٹر کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔
 ”میں چاہتا ہوں رمہ! آج کی اس گفتگو کے بعد ہم دونوں کے درمیان دوبارہ ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو۔ ہم اچھے کو لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں یہ تعلق ایسے ہی رہے۔ میرے لئے اپنا وقت ضائع مت کرو۔ میں وہ نہیں ہوں، جو تم مجھے سمجھ رہی ہو۔“
 ویٹر قریب آگیا تھا۔ سالار اس کا لایا ہوا بل ادا کرنے لگا۔
 رمہ! سالار کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ اب کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سالار اس روز کسی کام سے لُچ بریک کے بعد آفس سے نکل آیا۔ ریلوے کراسنگ پر ٹریفک کا اثر وحام دیکھ کر اس نے دور سے ہی گاڑی موڑ لی۔ وہ اس وقت کسی ٹریفک جام میں جھنس کر وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

گاڑی کو پیچھے موڑ کر اس نے ایک دوسری سڑک پر ٹرن لے لیا۔ وہ اس سڑک پر تھوڑی ہی آگے گیا تھا جب اس نے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر ایک بوڑھی خاتون کو بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک بانی روڈ تھی اور اس وقت بالکل سناٹا تھی۔ خاتون اپنے لباس اور چہرے سے کسی بہت اچھے گھرانے کی نظر آتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی کچھ چوڑیاں بھی نظر آتی تھیں اور سالار کو خدشہ ہوا کہ اس اکیلی سڑک پر وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس نے گاڑی ان کے قریب لے جا کر روک دی۔ خاتون کی سفید رنگت اس وقت سرخ تھی اور سانس پھولا ہوا تھا اور شاید وہ اپنا سانس ٹھیک کرنے کے لئے ہی سڑک کے کنارے بیٹھی تھیں۔

”السلام علیکم! کیا مسئلہ ہے، آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟“
 سالار نے اپنے سن گلاسز اتارتے ہوئے گھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔
 ”بیٹا! مجھے رکش نہیں مل رہا۔“

سالار ان کی بات پر حیران ہوا۔ وہ مین روڈ نہیں تھی۔ ایک رہائشی علاقے کی بانی روڈ تھی اور وہاں رکشہ ملنے کا امکان نہیں تھا۔

”اماں جی! یہاں سے تو آپ کو رکش مل بھی نہیں سکتا۔ آپ کو جانا کہاں ہے؟“
 اس خاتون نے اسے اندرون شہر کے ایک علاقے کا نام بتایا۔ سالار کے لئے بالکل ممکن نہیں تھا کہ وہ انہیں وہاں چھوڑ آتا۔

”آپ میرے ساتھ آجائیں۔ میں آپ کو مین روڈ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ وہاں سے آپ کو رکش مل جائے گا۔“

سالار نے جھپٹے دروازے کا لاک کھولا اور پھر اپنی سیٹ سے اتر گیا مگر اماں جی اسے خاصی متاثر نظر آئیں۔ وہ ان کے اندیشوں کو بھانپ گیا۔

”اماں جی! ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شریف آدمی ہوں۔ آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں صرف آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ اس سڑک سے تو آپ کو رکش ملے گا نہیں اور اس وقت سڑک سناٹا ہے، آپ نے زیور پہنا ہوا ہے، کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے آپ کو۔“

سالار نے نرمی سے ان کے اندیشے دور کرنے کی کوشش کی۔ خاتون نے اپنی ٹینک درست کرتے ہوئے اپنی چوڑیوں کو دیکھا اور پھر سالار سے کہا۔

”لو..... یہ سارا زیور تو نفلتی ہے۔“

”چلیں، یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر کوئی بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ کوئی آپ سے یہ تھوڑی پوچھے گا کہ یہ زیور اصل ہے یا نفلتی۔“

سالار نے ان کے جھوٹ کا پردہ دھوکتے ہوئے کہا۔

وہ اب سوچ میں پڑ گئیں۔ سالار کو دیر ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے اماں جی! آپ اگر مناسب نہیں.....“

اس نے واپس اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھاے تو اماں جی فوراً بول اٹھیں۔

”نہیں، نہیں۔ میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔ پیپلے ہی ناگئیں ٹوٹ رہی ہیں چل چل کے۔“
 وہ ناگوں پر زور دیتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

سالار نے ان کا بازو پکڑ کر انہیں اٹھایا۔ کچھ سیٹ کا دروازہ کھول کر انہیں اندر بٹھا دیا۔
 بانی روڈ کو تیزی سے گرا کر اس کے وہ مین روڈ پر آگیا۔ اب وہ کسی خالی رکش کی تلاش میں تھا مگر اسے رکش نظر نہیں آیا۔ وہ آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہوئے کسی خالی رکش کی تلاش میں ٹریفک پر نظر پڑا۔
 دوڑانے لگا۔

”نام کیا ہے، بیٹا تمہارا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”سالار۔“

”سالار؟“ انہوں نے جیسے تصدیق چاہی۔ وہ بے اختیار مسکرایا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے نام کو جڑے ساتھ۔ کھجک کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بچائی خاتون تھیں اور اس سے ہوشیار آدمی بات کر رہی تھیں۔

”جی۔“ سالار نے تصدیق کی۔

”یہ کیا نام ہوا، مطلب کیا ہے اس کا؟“ انہوں نے یک دم دلچسپی لی۔

”کیا کام کرتے ہو؟“

سالار نے اپنا ہمدہ بتایا۔ اسے اندازہ تھا کہ اماں جی کے سر کے اوپر سے گزرے گا مگر وہ اس وقت بکا بکا رہ گیا جب انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”یہ افسر ہوتا ہے نا؟“

وہ بے اختیار ہنسا۔ اس سے زیادہ اچھی وضاحت کوئی اس کے کام کی نہیں دے سکتا تھا۔

”جی اماں جی! افسر“ ہوتا ہے۔“ وہ محفوظ ہوا۔

”کتنی پڑھے ہو تم؟“

”سولہ جماعتیں۔“

اس بار سالار نے اماں جی کا قارمولا استعمال کرتے ہوئے اپنی تعلیم کو آسان لفظوں میں پیش کیا۔ اماں جی کا جواب اس بار بھی حیران کن تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی سولہ جماعتیں.....؟ ایم بی اے کیا ہے یا ایم اے کنکس؟“

سالار نے بے اختیار چٹ کر اماں جی کو دیکھا۔ وہ اپنی ٹینک کے شیشوں سے اسے گھور رہی تھیں۔

”اماں جی! آپ کو پتا ہے ایم بی اے کیا ہوتا ہے یا ایم اے کنکس کیا ہوتا ہے؟“ وہ واقعی حیران تھا۔

”لو مجھے نہیں پتا ہو گا؟ میرے بڑے بیٹے نے پہلے ایم اے کنکس کیا اور پاکستان سے پھر انگلینڈ

جا کر اس نے ایم بی اے کیا۔ وہ بھی ٹینک میں ہی کام کرتا ہے مگر ادھر ادھر انگلینڈ میں۔ اسی کا تو بیٹا ہوا ہے۔“

سالار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے گردن واپس موڑ لی۔

”تو پھر تم نے بتایا نہیں؟“

”کیا؟“

سالار کو فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ انہوں نے کیا پوچھا تھا۔

”اپنی تعلیم کے بارے میں؟“

”میں نے ایم بی اے کیا ہے۔“

”کہاں سے؟“

”امریکہ سے۔“

”اچھا۔ ماں باپ ہیں تمہارے؟“

”جی۔“

”تسکتے بہن بھائی ہیں؟“ سوالات کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔

”پانچ۔“ سالار کو کوئی جائے فرار نظر نہیں آرہی تھی۔

سالار نے انہیں اپنے نام کا مطلب اس بار پنجابی میں سمجھایا۔ اماں جی کو اس کے پنجابی بولنے پر خاصی خوشی ہوئی اور اب وہ پنجابی میں گفتگو کرنے لگیں۔

سالار کے نام کا مطلب پوچھنے کے بعد انہوں نے کہا۔

”میری بڑی بہو کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔“

وہ حیران ہوا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ نام کا مطلب جاننے کے بعد ان کا انکا جملہ یہ ہو گا۔

”جی..... مبارک ہو۔“ فوری طور پر اسے یہی سوچا۔

”خیر مبارک۔“

انہوں نے خاصی مسرت سے اس کی مبارکباد وصول کی۔

”میری بہو کا فون آیا تھا، پچھ رہی تھی کہ امی! آپ نام تمہاریں۔ میں تمہارا نام دے دوں؟“

اس نے بیک ہوم پر سے کچھ حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

”دے دوں۔“

”چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔“

اماں جی اب اطمینان سے ٹینک اُتار کر اپنی بڑی سی چادر کے پلو سے اس کے شیشے صاف کرنے

لگیں۔ سالار کو اب بھی تک کوئی رکشہ نظر نہیں آیا تھا۔

”عمر کتنی ہے تمہاری؟“ انہوں نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے توڑا تھا۔

”تیس سال۔“

”شادی شدہ ہو؟“

سالار سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ہاں کہنا چاہتا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ ہاں کی صورت میں سوالات کا

سلسلہ مزید دراز ہو جائے گا اس لئے بہتر یہی تھا کہ انکار کر دے اور اس کا یہ اندازہ اس دن کی سب سے

فاش غلطی ثابت ہوا۔

”نہیں۔“

”شادی کیوں نہیں کی؟“

”ہں ایسے ہی۔ خیال نہیں آیا۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”اچھا۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سالار دعا نہیں کرتا رہا کہ اسے رکشہ جلدی مل جائے۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔

”کیا کرتے ہو تم؟“

”میں ٹینک میں کام کرتا ہوں۔“

”تفنی نہیں اور کتنے بھائی؟“

”ایک بہن اور چار بھائی۔“

”شادیوں کتنوں کی ہوئی ہیں؟“

”میرے علاوہ سب کی۔“

”تم سب سے چھوٹے ہو؟“

”نہیں، چوتھے نمبر پر ہوں۔ ایک بھائی چھوٹا ہے۔“

سالار کو اب پہلی بار اپنے ”سوشل ورک“ پر چچھتاوا ہونے لگا۔

”اس کی بھی شادی ہوگئی؟“

”جی۔“

”تو پھر تم نے شادی کیوں نہیں کی؟ کوئی محبت کا پیکر تو نہیں ہے؟“

اس بار سالار کے حیروں کے نیچے سے حقیقت میں زمین کھسک گئی۔ وہ ان کی قیادہ شامی کا تھک ہونے لگا۔

”اماں جی! درکش نہیں مل رہا۔ آپ مجھے ایڈریس بتادیں، میں آپ کو خود چھوڑ آتا ہوں۔“

سالار نے ان کے سوال کا جواب گول کر دیا۔

ویر تو اسے پہلے ہی ہو چکی تھی اور رکشے کا بھی کبھی نام و نشان نہیں تھا اور وہ اس بوڑھی خاتون کو کہیں سڑک پر بھی کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔

اماں جی نے اسے پتا بتایا۔

سالار کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک چوک میں کھڑے ٹریفک کانسٹیبل کو اس نے دوپٹہ دوہرا کر مدد کرنے کے لئے کہا۔ کانسٹیبل نے اسے علاقے کا رستہ سمجھایا۔

سالار نے وہ بارہ گاڑی چلانا شروع کی۔

”تو پھر تم نے مجھے بتایا نہیں کہ کہیں محبت کا پیکر تو نہیں تھا؟“

سالار کا دل چاہا وہ کہیں ڈوب کر مر جائے۔ وہ خاتون ابھی تک اپنا سوال نہیں بھولی تھیں جبکہ وہ صرف اس سوال کے جواب سے بچنے کے لئے انہیں گھر چھوڑنے پر تیار ہوا تھا۔

”نہیں اماں جی! ایسی کوئی بات نہیں۔“

اس بار اس نے تجوید کی سے کہا۔

”الحمد للہ۔“ وہ اماں جی کی اس ”الحمد للہ“ کا سیاق و سباق سمجھ نہیں پایا اور اس نے اس کا تڑد بھی نہیں کیا۔

اماں جی اب اس کے ماں باپ کے بارے میں کرید کرید کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش فرما رہی تھیں۔ سالار واقعی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

سب سے بڑی گزیر اس وقت ہوئی جب وہ اماں جی کے بتائے ہوئے علاقے میں پہنچا اور اس نے اماں جی سے مطلوبہ کھجی کی طرف رہنمائی کرنے کی درخواست فرمائی اور اماں جی نے کمال اطمینان سے کہا۔

”اب یہ تو مجھے پتہ ہے کہ اس علاقے میں گھر بے گھر پڑے مجھے معلوم نہیں۔“

وہ جھونچکا رو گیا۔

”اماں جی! تو کھر کیسے پہنچاؤں میں آپ کو۔ پتے کے بغیر اس علاقے میں آپ کو کہاں ڈراپ کروں؟“

وہ اپنے گھر پر کھٹا نمبر اور نام بتانے لگیں۔

”نہیں اماں جی! آپ مجھے کھجی کا نام بتائیں۔“

وہ کھجی کے نام کی بجائے نشانیاں بتانے لگیں۔

”طلوائی کی ایک دکان ہے کھجی کے کونے میں۔ بہت کھلی کھجی ہے۔ پرویز صاحب کا گھر بھی وہیں ہے، جن کے بیٹے جرمی میں شادی کی ہے پچھلے ہفتے۔ چلی بیوی اس کی ادھر ہی ہے ہمارے محلے میں۔ شادی کی اطلاع ملنے پر بے چاری نے درود و کرم ملے سر پر ڈھالیا۔“

وہ نشانیاں بتاتے بتاتے کہیں اور نکل گئیں۔

سالار نے سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی کر دی۔

”اماں جی! آپ کے شوہر کا کیا نام ہے؟ گھر کے بارے میں اور کھجی کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتائیں، اس طرح تو میں بھی آپ کو گھر نہیں پہنچا سکوں گا۔“

اس نے قفل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”میں سمید واماں کے نام سے جانی جاتی ہوں۔ میاں بے چارے تو دس سال پہلے فوت ہو گئے۔ ان کو کو لوگ بھول بھال گئے اور کھجی تو میں بتا رہی ہوں، بہت بڑی کھجی ہے۔ تین دن پہلے گھر کے دو اعلیٰ لگا کر گئے ہیں، بالکل نئے۔ سینٹ سے جوڑ کر گئے ہیں۔ ہر ماہ کوئی نہ کوئی آتا کر لے جاتا تھا، اب بے فکر رہی ہوگئی ہے۔“

سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

”اماں جی! کیا میں یہ کہہ کر لوگوں سے آپ کی کھجی کا پوچھوں کہ گھر کے دو نئے ڈھکنوں والی کھجی آپ وہاں کے کسی ایسے شخص کا نام بتائیں جسے لوگ جانتے ہوں جو قدرے معروف ہو۔“

”وہ مرتضیٰ صاحب ہیں جن کے بیٹے مظفر کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی کل صبح۔“

"اماں جی! یہ کوئی تعارف نہیں ہوتا۔"

وہ اس کی بات پر برہمان لگیں۔

"لو بھلا، اب کیا ہر گھر میں ٹانگ ٹوٹتی ہے کسی نہ کسی کی۔"

سالار چپ چاپ گاڑی سے اتر گیا۔ آس پاس کی دکانوں سے اس نے سعید و اماں کے بتائے ہوئے "کوائف" کے مطابق کھلی تلاش کرنا شروع کی، مگر جلد ہی اسے پتہ چل گیا کہ ان نشانیوں کے ساتھ وہ کم از کم آج کی تاریخ میں گھر نہیں دھونڈ سکتا۔

دو ماہ اس بدکردار وہیں لٹا۔

"اماں جی! گھر میں فون ہے آپ کے؟" گاڑی کے اندر گھسے ہی اس نے پوچھا۔

"ہاں ہے۔"

سالار نے سکون کا سانس لیا۔

"اس کا نمبر بتائیں مجھے۔" سالار نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

"نمبر کا تو مجھے نہیں پتا۔"

دو ایک بار پھر دھجک سے رہ گیا۔

"فون نمبر بھی نہیں پتا؟" اس نے شدید صدمے کے عالم میں کہا۔

"جی! میں نے کون سا بھی فون کیا ہے۔ میرے بیٹے خود کر لیتے ہیں، ارشہ دار بھی خود کر لیتے ہیں یا ضرورت ہو تو بی بی فون ملا دیتا ہے۔"

"اور حرا مال ٹاؤن میں کس کے پاس گئی تھیں؟"

سالار کو یک دم خیال آیا۔

"اور کچھ رشتے دار ہیں میرے۔ پوتے کی مٹھائی دینے گئی تھی۔"

انہوں نے فخریہ بتایا۔

سالار نے سکون کا سانس لیتے ہوئے گاڑی اٹار دی۔

"ٹھیک ہے، اور حرا چلتے ہیں۔ وہاں کا پتہ بتائیں۔"

"پتہ تو مجھے نہیں پتا۔"

سالار اس بار صدمے سے کچھ دیر کے لئے بول بھی نہ سکا۔

"تو پھر گئی کیسے تھیں آپ؟"

"جی! اصل میں جہاں جانا ہو مہمان کے بچے چھوڑ آتے ہیں، ان ہی کو گھر کا پتہ ہے۔ پچھلے دس سال سے مجھے وہی لے کر جا رہے ہیں۔ وہ چھوڑ آتے ہیں اور پھر وہاں سے ہلال وغیرہ وہاں چھوڑ جاتے

ہیں۔ اصل میں یہ ہلال وغیرہ بھی پہلے میرے گھر میں ہی رہتے تھے۔ یہی کوئی دس بارہ سال پہلے اور حرا گئے ہیں اس لئے میرے پورے محلے کو ان کے گھر کا پتہ ہے۔"

سالار نے کچھ نہیں کہا۔ اسے اب بھی اُمید تھی کہ جہاں سے اس نے ان خاتون کو چک کیا ہے ہلال وغیرہ کا گھر وہیں کہیں ہوگا۔

سعید و اماں کی گفتگو جاری تھی۔

"آج تو ایسا ہو کہ ہلال کے گھر پر کوئی قزاقی نہیں، صرف ملازمہ تھی۔ میں کچھ دیر بیٹھی رہی پھر بھی وہ لوگ نہیں آئے تو میں نے سوچا کہ خود گھر چلی جاؤں اور پھر ماشاء اللہ تم مل گئے۔"

"اماں جی! آپ رکشے والے کو کیا بتائیں؟"

"وہی جو تمہیں بتایا ہے۔"

وہ ان کی ذہانت پر باغ باغ ہو گیا۔

"اس سے پہلے بھی آپ اس طرح پتہ تار کر رہی تھیں؟"

اس نے قدرے افسوس بھرے لہجے میں گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہ۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

سعید و اماں کا اطمینان قابل رشک تھا۔ سالار مزید کچھ کہے بغیر گاڑی سڑک پر لے آیا۔

"اب تم کہاں جا رہے ہو؟"

سعید و اماں زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکیں۔

"جہاں سے میں نے آپ کو لیا تھا قزاقی سڑک پر ہوگا، آپ نے کوئی ٹرن تو نہیں لیا تھا؟"

سالار نے یک دیر مر سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، میں نے نہیں لیا۔"

سعید و اماں نے قدرے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

سالار نے ان کے لہجے پر غور نہیں کیا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا مطلب تھا گھر اس سڑک پر ہی کہیں تھا اور گلیوں کی نسبت کالونی میں گھر تلاش کرنا آسان تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب اسے صرف ایک سڑک کے گھر دیکھتے تھے۔

"تم سکرپٹ پیچے ہو؟"

خاموشی یک دم ٹوٹی۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے چوٹک گیا۔

"میں۔۔۔؟"

اس نے یک دیر مر میں دیکھا۔ سعید و اماں بھی یک دیر مر میں ہی دیکھ رہی تھیں۔

”آ..... نہیں۔“

وہ سوال کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔

”کوئی اور نشہ وغیرہ۔“

وہ اس بار سوال سے زیادہ ان کی بے تکلفی پر حیران ہوا۔

”آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”بس ویسے ہی۔ اب اتنا لمبا راستہ میں خاموش کیسے رہوں گی۔“

انہوں نے اپنی مجبوری بتائی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے، میں کرتا ہوں گا کوئی نشہ؟“

سالار نے جواباً ان سے پوچھا۔

”نہیں، کہاں..... اسی لئے تو میں پوچھ رہی ہوں..... تو پھر نہیں کرتے؟“

ان کے انداز نے اس بار سالار کو محظوظ کیا۔

”نہیں۔“ اس نے مختصر کہا۔ وہ اب سگنل پر ٹرکے ہوئے تھے۔

”کوئی گرل فرینڈ ہے؟“ سالار کو لگا آستے میں سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اس نے پلٹ کر سعیدہ ماں

کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ نے کیا پوچھا ہے؟“

”میں نے کہا ہے، کوئی گرل فرینڈ ہے؟“ سعیدہ ماں نے ”گرل فرینڈ“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

سالار مکمل سلا کر ہنس پڑا۔

”آپ کو پتا ہے گرل فرینڈ کیا ہوتی ہے؟“

سعیدہ ماں اس کے سوال پر برلمان لگیں۔

”کیوں بھئی..... دو بیٹے ہیں میرے، مجھے پتا نہیں ہو گا کہ گرل فرینڈ کیا ہوتی ہے۔ جب انہیں

باہر پڑھنے کے لئے بھیجا تھا تو کہہ کر بھیجا تھا میرے شوہر نے کہ گرل فرینڈ نہیں ہونی چاہئے اور پھر میں نے

میں ایک بار فون آتا تھا وہ توں کا۔“

سگنل کھل گیا۔ سالار مسکراتے ہوئے سیدھا ہو گیا اور ایک سیلیٹر پر پاؤں دبا دیا۔

سعیدہ ماں نے بات جاری رکھی۔

”میں وہ توں سے کتنی تھی کہ قسم کھا کر بتائیں، انہوں نے کوئی گرل فرینڈ بتائی تو نہیں۔ جب تک

شادیاں نہیں ہو گئیں۔ ہر بار فون پر سب سے پہلے وہ توں قسم کھا کر یہی بتا کر کرتے تھے مجھے۔ سلام بھی بعد

میں کیا کرتے تھے۔“

وہ فخریہ انداز میں بتاتی جا رہی تھیں۔

”بڑے تابعدار بچے ہیں میرے۔ وہ توں نے گرل فرینڈ نہیں بتائی۔“

”آپ نے اپنی پسند سے وہ توں کی کہیں شادیاں کی ہیں؟“

سالار نے پوچھا۔

”نہیں، وہ توں نے اور میری اپنی پسند سے شادیاں کی ہیں۔“

انہوں نے سادگی سے کہا۔ سالار کے حلق سے بے اختیار قبضہ نکلا۔

”کیا ہوا؟“ سعیدہ ماں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں، آپ کی ہویں انگریز ہیں؟“

”نہیں، پاکستانی ہیں مگر وہیں رہتی تھیں۔ میرے بیٹوں کے ساتھ کام کرتی تھیں مگر تم نے کیوں؟“

سعیدہ ماں نے اپنا سوال دہرایا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔“

سعیدہ ماں کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے کہا۔

”تو تم نے بتایا نہیں کہ گرل فرینڈ.....“

سالار نے بات کاٹ دی۔

”نہیں ہے سعیدہ ماں! گرل فرینڈ بھی نہیں ہے۔“

”ماشا اللہ..... ماشا اللہ۔“ وہ ایک بار پھر اس ماشا اللہ کا سیاق و سباق سمجھنے میں ناکام رہا۔

”گھر اپنا ہے؟“

”نہیں کرائے کا ہے۔“

”کوئی ملازم وغیرہ ہے؟“

”مستقل تو نہیں ہے مگر صفائی وغیرہ کے لئے ملازم رکھا ہوا ہے۔“

”اور یہ گاڑی تو اپنی ہی ہو گی؟“

”جی۔“

”اور تنخواہ کتنی ہے؟“

سالار روانی سے جواب دیتے دیتے ایک بار پھر چو لگا۔ گفتگو کو سہولیت پر جا رہی تھی، فوری طور

پر اس کی کچھ میں نہیں آیا۔

”سعیدہ ماں! آپ یہاں اکیلی کیوں رہتی ہیں۔ اپنے بیٹوں کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟“

سالار نے موضوع بدلا۔

”ہاں، میرا بھی ارادہ ہے۔ پہلے تو میرا دل نہیں چاہتا تھا مگر اب یہ سوچا ہے کہ بچی کی شادی کر لوں تو پھر باہر چل جاؤں گی۔ اکیلے رہتے رہتے تنگ آگئی ہوں۔“

سالار اب اس سڑک پر آگیا تھا جہاں سے اس نے سعید واماں کو پک کیا تھا۔
”میں نے آپ کو یہاں سے لیا تھا۔ آپ بتائیں، ان میں سے کون سا گھر ہے؟“ سالار نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے دائیں طرف کے گھروں پر نظر ڈالی۔

”نمبر کا نہیں پتہ، گھر کی تو پہچان ہوگی آپ کو؟“
سعید واماں بخور گھروں کو دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں..... ہاں گھر کی پہچان ہے۔“
وہ گھر کی نشانیاں بتاتے لگیں جو اتنی ہی مبہم تھیں، جتنا ان کے اپنے گھر کا پتہ۔ وہ سڑک کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ سعید واماں گھر نہیں پہچان سکیں۔ سالار، بالال کے والد کا نام پوچھ کر گاڑی سے نیچے اتر گیا اور باری باری دونوں اطراف کے گھروں سے سعید واماں کے بارے میں پوچھنے لگا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ اس سڑک پر موجود گھر میں جا چکا تھا۔ مطلوبہ نام کے کسی آدمی کا گھر وہاں نہیں تھا۔

”آپ کو ان کا نام ٹھیک سے یاد ہے؟“
وہ تھک ہار کر سعید واماں کے پاس آیا۔
”ہاں..... لو بھلا اب مجھے نام بھی پتا نہیں ہو گا۔“
سعید واماں نے بر لمانا۔

”لیکن اس نام کے کسی آدمی کا گھر یہاں نہیں ہے، نہ ہی کوئی آپ کے بارے میں جانتا ہے۔“
سالار نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو..... یہ ساتھ والی سڑک پر دیکھ لو۔“
سعید واماں نے کچھ فاصلے پر ایک اور سڑک کی طرف اشارہ کیا۔
”لیکن سعید واماں! آپ نے کہا تھا کہ گھر اسی سڑک پر ہے۔“ سالار نے کہا۔
”میں نے کب کہا تھا؟“ وہ محض ہنسی۔

”میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے ٹرن تو نہیں لیا۔ آپ نے کہا نہیں۔“ سالار نے انہیں یاد کروایا۔

”وہ تو میں نے کہا تھا مگر یہ ہوتا کیا ہے؟“
سالار کا دل ڈوبا۔

”ٹرن؟“

”ہاں، سبکی۔“

”آپ کسی اور سڑک سے سڑک تو یہاں نہیں آئیں؟“

”لو تو اس طرح کہو نا۔“ سعید واماں کو تسلی ہوئی۔

”میں کیوں یہاں بیٹھ گئی تھی۔ تھک گئی تھی چل چل کر اور یہ سڑک تو چھوٹی سی ہے۔ یہاں میں چل کر کیا تھک سکتی تھی؟“

سالار نے گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ وہ دن بہت خراب تھا۔

”کس سڑک سے سڑک یہاں آئی تھیں آپ؟“

اس نے سعید واماں سے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی۔

”میرا خیال ہے.....“ وہ پہلی سڑک کو دیکھتے ہوئے الجھیں۔

”یہ ہے۔“ انہوں نے کہا۔

سالار کو یقین تھا وہ سڑک نہیں ہوگی مگر اس نے گاڑی اس سڑک پر موڑ لی۔ یہ تو تھے تھا کہ آج اس کا سارا دن اسی طرح ضائع ہوتا تھا۔

اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہ وہاں آس پاس کی مختلف سڑکوں پر سعید واماں کو لے کر پھر ہاٹا مگر اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سعید واماں کو ہر گھر دور سے شاسا لگتا۔ پاس جانے پر وہ کہنا شروع کر دیتا۔

”نہ..... نہ..... نہ..... یہ نہیں ہے۔“

وہ بالآخر کالونی میں تلاش چھوڑ کر انہیں واپس اسی محلہ میں لے آیا جہاں وہ پہلے ان کا گھر ڈھونڈتا رہا تھا۔

مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہاں ضائع کرنے کے بعد جب وہ تھک کر واپس گاڑی کے پاس آیا تو شام ہو چکی تھی۔

سعید واماں اس کے برعکس اطمینان سے گاڑی میں بیٹھی تھیں۔

”ما؟“

انہوں نے سالار کے اندر بیٹھتے ہی پوچھا۔

”نہیں، اب تو رات ہو رہی ہے، تلاش بے کار ہے۔ میں پولیس میں رپورٹ کروا دیتا ہوں آپ کی۔ آپ کی بیٹی یا آپ کے محلے والے آپ کے ملنے پر پولیس سے رابطہ تو کریں گے ہی۔ پھر وہ لے جائیں گے آپ کو۔“

سالار نے ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے جو بڑبڑاہی کی۔

”ہاں، میرا سببی ارادہ ہے۔ پہلے تو میرا دل نہیں چاہتا تھا مگر اب یہ سوچا ہے کہ بیٹی کی شادی کر لوں تو پھر باہر چلی جاؤں گی۔ اکیلے رہتے رہتے تنگ آگئی ہوں۔“

سالار اب اس سڑک پر آگیا تھا جہاں سے اس نے سعیدہ لماں کو پک کھینچا تھا۔

”میں نے آپ کو یہاں سے لیا تھا۔ آپ بتائیں، ان میں سے کون سا گھر ہے؟“ سالار نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے دائیں طرف کے گھروں پر نظر ڈالی۔

”نمبر کا نہیں ہے، گھر کی تو پہچان ہوگی آپ کو؟“

سعیدہ لماں بغور گھروں کو دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں..... ہاں گھر کی پہچان ہے۔“

وہ گھر کی نشانیاں بتاتے نکلتی جراتی سی مہم قیاس، جتنا ان کے اپنے گھر کا پتہ۔ وہ سڑک کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ سعیدہ لماں گھر نہیں پہچان سکیں۔ سالار، بلال کے والد کا نام پوچھ کر گاڑی سے نیچے اتر گیا اور باری باری دونوں اطراف کے گھروں سے سعیدہ لماں کے بارے میں پوچھنے لگا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ اس سڑک پر موجود ہر گھر میں جا چکا تھا۔ مطلوبہ نام کسی آدمی کا گھر وہاں نہیں تھا۔

”آپ کو ان کا نام ٹھیک سے یاد ہے؟“

وہ تھک ہار کر سعیدہ لماں کے پاس آیا۔

”ہاں..... لو بھلا اب مجھے نام بھی پتا نہیں ہوگا۔“

سعیدہ لماں نے بدامانہ۔

”لیکن اس نام کے کسی آدمی کا گھر یہاں نہیں ہے، نہ ہی کوئی آپ کے بارے میں جانتا ہے۔“

سالار نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو..... یہ ساتھ والی سڑک پر دیکھ لو۔“

سعیدہ لماں نے کچھ فاصلے پر ایک اور سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

”لیکن سعیدہ لماں! آپ نے کہا تھا کہ گھرا سی سڑک پر ہے۔“ سالار نے کہا۔

”میں نے کب کہا تھا؟“ وہ معترض ہوئیں۔

”میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے ٹرن تو نہیں لیا۔ آپ نے کہا نہیں۔“ سالار نے انہیں یاد

کر دیا۔

”وہ تو میں نے کہا تھا مگر یہ ہو تا کیا ہے؟“

سالار کا دل ڈوبا۔

”ٹرن؟“

”ہاں، سببی۔“

”آپ کسی اور سڑک سے سڑک تو یہاں نہیں آئیں؟“

”نو تو اس طرح کہو نا۔“ سعیدہ لماں کو تسلی ہوئی۔

”میں کیوں یہاں بیٹھ گئی تھی۔ تھک گئی تھی چل چل کر اور یہ سڑک تو چھوٹی سی ہے۔ یہاں میں چل کر کیا تھک سکتی تھی؟“

سالار نے گاڑی اشارت کر لی۔ وہ دن بہت خراب تھا۔

”کس سڑک سے سڑک یہاں آئی تھیں آپ؟“

اس نے سعیدہ لماں سے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”میرا خیال ہے۔“ وہ پہلی سڑک کو دیکھتے ہوئے الجھیں۔

”یہ ہے۔“ انہوں نے کہا۔

سالار کو یقین تھا وہ سڑک نہیں ہوگی مگر اس نے گاڑی اس سڑک پر موڑ لی۔ یہ تو طے تھا کہ آج اس کا سارا دن اسی طرح ضائع ہونا تھا۔

اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہ وہاں اس پاس کی مختلف سڑکوں پر سعیدہ لماں کو لے کر پھرتا رہا مگر اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سعیدہ لماں کو ہر گھر دور سے شناسا لگتا۔ پاس جانے پر وہ کہنا شروع کر دیتا۔

”نہ..... نہ..... نہ..... یہ نہیں ہے۔“

وہ بالآخر کالونی میں تلاش چھوڑ کر، انہیں وہاں اسی محلہ میں لے آیا جہاں وہ پہلے ان کا گھر ڈھونڈتا رہا تھا۔

مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہاں ضائع کرنے کے بعد جب وہ تھک کر واپس گاڑی کے پاس آیا تو شام ہو چکی تھی۔

سعیدہ لماں اس کے برعکس اطمینان سے گاڑی میں بیٹھی تھیں۔

”لما؟“

انہوں نے سالار کے اندر بیٹھتی ہی پوچھا۔

”جس، اب تو رات ہو رہی ہے، تلاش بے کار ہے۔ میں پولیس میں رپورٹ کروا دیتا ہوں آپ کی۔ آپ کی بیٹی یا آپ کے محلے والے آپ کے نہ ملنے پر پولیس سے رابطہ تو کریں گے ہی۔ پھر وہ لے جائیں گے آپ کو۔“

سالار نے ایک بار پھر گاڑی اشارت کرتے ہوئے تجویز پیش کی۔

”ہج... ہج... آہ بے چاری پریشان ہو رہی ہوگی۔“

سعید وہاں کو اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ سالار کا دل چاہا وہ ان سے کہے کہ وہ ان کی بیٹی سے زیادہ پریشان ہے مگر وہ خاموشی سے ڈرا پیو کرتے ہوئے گاڑی پولیس اسٹیشن لے آیا۔

رپورت روج کر دانے کے بعد وہ اٹھ کر وہاں سے نکلے گئے۔ سعید وہاں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آپ بیٹھیں۔۔۔ آپ بیٹھیں رہیں گی۔“

سالار نے ان سے کہا۔

”نہیں۔۔۔ ہم انہیں یہاں کہاں رکھیں گے، آپ انہیں ساتھ لے جائیں، کسی نے ہم سے رابطہ کیا تو ہم انہیں آپ کا پتہ دے دیں گے۔“ پولیس انسپکٹر نے کہا۔

”لیکن میں تو انہیں آپ کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں۔“ سالار معترض ہوا۔

”دیکھیں، یو جی خاتون ہیں، اگر کوئی رابطہ نہیں کرتا ہم سے تو رات کہاں رہیں گی یہ۔۔۔ اور اگر کچھ دن اور گزر گئے۔۔۔“

پولیس انسپکٹر کہتا گیا۔ سعید وہاں نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی۔

”نہیں، مجھے اوجھڑ نہیں رہنا۔ بیٹا میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔ میں اوجھڑاں نہیں ہوں گی آدمیوں میں۔“

سالار نے انہیں پہلی بار گھبرائے ہوئے دیکھا۔

”لیکن میں تو۔۔۔“ اکیلا رہتا ہوں، وہ کہتے کہتے ڈک گیا، پھر اسے فرحان کے گھر کا خیال آیا۔

”اچھا ٹھیک ہے، چلیں۔“ اس نے ایک گھر اسٹاپس لیتے ہوئے کہا۔

باہر گاڑی میں آکر اس نے موبائل پر فرحان سے رابطہ قائم کیا۔ وہ انہیں فرحان کے ہاں ٹھہرانا چاہتا تھا۔ فرحان ابھی ہاسٹل میں ہی تھا۔ اس نے موبائل پر ساری صورت حال اسے بتائی۔

”نوشین تو کلاس گئی ہوئی ہے۔“ فرحان نے اسے بتایا۔

”مگر کوئی مسئلہ نہیں، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ انہیں اپنے فلیٹ پر لے جاؤں گا۔ وہ کون سی کوئی نوجوان خاتون ہیں کہ مسئلہ ہو جائے گا۔ تم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی محتاط ہو رہے ہو۔“

”نہیں، میں ان کے آرام کے حوالے سے کہہ رہا تھا۔“ آکر ڈنڈ لگے انہیں۔ ”سالار نے کہا۔

”نہیں گلتا پڑا پچھ لیتا تم ان سے، ورنہ پھر کسی ساتھ والے فلیٹ میں ٹھہرا دیں گے، عالم صاحب کی فیملی کے ساتھ۔“

”اچھا، تم آؤ پھر دیکھتے ہیں۔“

سالار نے موبائل بند کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا! میں تمہارے پاس ہی رہ لوں گی۔ تم میرے بیٹے کے برابر ہو، مجھے اعتماد ہے تم پر۔“

سعید وہاں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

”سالار نے صرف مسکراتے پر اکتفا کیا۔

اس نے راستے میں ڈک کر ایک ریستورنٹ سے کھانا لیا۔ بھوک سے اس کا ہر حال ہو رہا تھا اور ایک دم اسے احساس ہوا کہ سعید وہاں بھی دوپہر سے اس کے ساتھ کچھ کھائے پیئے بغیر ہی پھر رہی ہیں۔ اسے عدم اطمینان کا احساس ہوا۔ اپنے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے راستے میں ایک جگہ ڈک کر سعید وہاں کے ساتھ سیب کا تازہ جوس پیا۔ وہ زندگی میں پہلی بار کسی بوڑھے شخص کے ساتھ اتنا وقت گزار رہا تھا اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ کام انہیں نہیں تھا۔

فلیٹ میں پہنچ کر وہ ابھی سعید وہاں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا جب فرحان آگیا۔

اس نے سعید وہاں سے خود ہی اپنا تعارف کر دیا اور پھر کھانا کھانے لگا۔ چند منٹوں میں ہی وہ سعید وہاں کے ساتھ اتنی بے تکلفی کے ساتھ ٹھیکہ پچائی میں گفتگو کر رہا تھا کہ سالار کو رشک آنے لگا۔ اس نے فرحان سے اچھی گفتگو کرنے والا بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گفتگو کے انداز میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا کہ دوسرا اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھ دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اتنے سالوں سے دوستی کے باوجود وہ فرحان کی طرح گفتگو کرنا نہیں سیکھ سکا تھا۔

دس منٹ کے بعد وہ وہاں خاموشی سے کھانا کھانے والے ایک مساعی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جبکہ فرحان اور سعید وہاں مسلسل گفتگو میں مصروف تھے۔ سعید وہاں یہ جان کر کہ فرحان ڈاکٹر ہے، اس سے طبی مشورے لینے میں مصروف تھیں۔ کھانے کے خاتمے تک وہ فرحان کو مجبور کر چکی تھیں کہ وہ اپنا میڈیکل باکس لا کر ان کا چیک اپ کرے۔

فرحان نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ اوکو لو جسٹ تھا۔ وہ بڑی جس حراستی سے اپنا بیگ لے آیا۔ اس نے سعید وہاں کا ہلڈ پریش چیک کیا پھر اسٹیتھو سکوپ سے ان کے دل کی رفتار کو ماپا اور آخر میں نبض چیک کرنے کے بعد انہیں یقین دلایا کہ وہ بے حد تندرست حالت میں ہیں اور ہلڈ پریش بالکل کوئی بیماری انہیں نہیں ہے۔

سعید وہاں ایک دم بے حد ہشاش بشاش نظر آنے لگیں۔ سالار ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتے ہوئے کچن میں برتن دھو رہا۔ وہ دونوں لاؤنج کے صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

پھر اسی دوران اس نے فون کی گھنٹی سنی۔ فرحان نے فون اٹھایا تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹر سبط علی تھے۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے کہا۔

”سالار نے پولیس اسٹیشن پر کسی سعیدہ نام کی خاتون کے بارے میں اطلاع دی تھی۔“
فرقان حیران ہوا۔

”جی وہ سہیلی ہیں، ہمارے پاس۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“ ڈاکٹر سبط علی نے بے اختیار کہا۔

”ہاں، وہ میری عزیزہ ہیں، ہم انہیں تلاش کر رہے تھے چند گھنٹوں سے۔ پولیس سے رابطہ کیا تو سالار کا نام اور نمبر دے دیا انہوں نے۔“

فرقان نے انہیں سعیدہ اماں کے بارے میں بتایا پھر سعیدہ اماں کی بات فون پر ان سے کروائی۔
سالار بھی باہر لاؤنچ میں آگیا۔

سعیدہ اماں فون پر گفتگو میں مصروف تھیں۔

”ڈاکٹر صاحب کی عزیزہ ہیں یہ۔“

فرقان نے دھیمی آواز میں اس کے قریب آکر کہا۔

”ڈاکٹر سبط علی صاحب کی؟“ سالار حیران ہوا۔

”ہاں، ان ہی کی۔“

سالار نے بے اختیار اطمینان بھرا سانس لیا۔

”بھائی صاحب کہہ رہے ہیں تم سے بات کروانے کو۔“

سعیدہ اماں نے فرقان سے کہا۔

فرقان تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور ریسیور لے کر کھنڈ پر کچھ نوٹ کرنے لگا۔ ڈاکٹر سبط علی اسے ایڈریس لکھوا رہے تھے۔

سعیدہ اماں نے قدرے حیرانی سے لاؤنچ کے دروازے میں کھڑے سالار کو دیکھا۔

”تم کیا کر رہے ہو؟“ ان کی نظریں سالار کے اچھرن پر جمی تھیں۔

وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔

”میں..... برتن دھو رہا تھا۔“

سالار واپس کچن میں آیا اور اس نے اچھرن آٹا دیا۔ ویسے بھی برتن دھو کر تھکا ہوا تھا۔

”سالار! آؤ پھر انہیں چھوڑ آتے ہیں۔“

اسے اپنے مقب میں فرقان کی آواز آئی۔

”یہ کام بعد میں کر لیتا۔“

”تم گاڑی کی چابی لو، میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“ سالار نے کہا۔

انگلے دس منٹ میں وہ نیچے سالار کی گاڑی میں تھے۔ فرقان اگلی سیٹ پر تھا اور اس کے باوجود کچھلی سیٹ پر بیٹھی سعیدہ اماں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ سالار کو راستے کے بارے میں ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔

بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ بیس منٹ میں مطلوبہ محلے اور گلی میں تھے۔ بڑی گلی میں گاڑی ٹھکڑی کرنے کے بعد وہ دونوں انہیں اندر گلی میں ان کے گھر تک چھوڑنے گئے۔ سعیدہ اماں کو اب رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی گلی کو پہنچاتی تھیں۔

وہ فخریہ انداز میں کچھ جراتے ہوئے سالار کو بتاتی نکلیں۔

”حلوائی کی دکان..... گٹر کے سینٹ والے دھکن..... پرویز صاحب کا گھر۔“

”جی ا!“ سالار مسکراتے ہوئے سر ہلاتا رہا۔

اس نے ان کو یہ نہیں بتایا کہ ان کی بتائی ہوئی ساری نشانیاں صحیح تھیں۔ صرف وہ اسے ایک غلط علاقے میں لے گئی تھیں۔

”آمنہ بے چاری پریشان ہو رہی ہو گی۔“ انہوں نے سرخ اینٹ کی بنی ہوئی ایک حویلی نما دو منزلہ مکان کے سامنے رکتے ہوئے ۲۷۵۵ دفعہ کہا۔

فرقان نے آگے بڑھ کر ریل بجائی۔ سالار قدرے ستائشی انداز میں حویلی پر نظریں دوڑاتا رہا۔ وہ یقیناً کافی پرانی حویلی تھی مگر مسلسل دیکھ بھال کی وجہ سے وہ اس گلی میں سب سے باوقار لگ رہی تھی۔

”تم لوگوں کو اب میں نے چائے پینے بغیر جانے نہیں دیتا۔“ سعیدہ اماں نے کہا۔

”میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت پریشانی ہوئی۔ خاص طور پر سالار کو۔ بچہ مجھے سارا دن لئے پھرتا رہا۔“ سعیدہ اماں نے سالار کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں، سعیدہ اماں! اچائے ہم پھر بھی نکلیں گے، آج ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

”ہاں سعیدہ اماں! آج چائے نہیں پیئیں گے۔ کبھی آکر آپ کے پاس کھانا کھائیں گے۔“

فرقان نے بھی جلدی سے کہا۔

”دیکھ لیتا، ایسا نہ ہو کہ یاد ہی نہ رہے تمہیں۔“

”لیں، بھلا کھانا کیسے بھولیں گے ہم۔ وہ جو آپ پالک گوشت کی ترکیب بتا رہی تھیں، وہی بنا کر کھائیے گا۔“

فرقان نے کہا۔ اندر سے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ سعیدہ اماں کی بیٹی دروازہ کھولنے آرہی تھی اور اس نے دروازے سے کچھ فاصلے پر ہی سعیدہ اماں اور فرقان کی آوازیں سن لی تھیں، اس لئے اس نے کچھ بھی پوچھے بغیر دروازے کا پوٹ اندر سے ہوتے دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔

”ایسا سعید و اماں اخذ حافظ۔“ فرقان نے سعید و اماں کو دروازے کی میز حیاں چڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ سالار اس سے پہلے ہی پلٹ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے سالار نے فرقان سے کہا۔

”تمہاری سب سے ناپسندیدہ ڈش پالک گوشت ہے اور تم ان سے کیا کہہ رہے تھے؟“

فرقان نے قہقہہ لگایا۔ ”کہنے میں کیا حرج ہے۔ ویسے ہو سکتا ہے وہ واقعی اتنا اچھا پکائیں کہ میں کھانے پر مجبور ہو جاؤں۔“

”تم جاؤ گے ان کے گھر؟“

سالار گاڑی میں روڈ پر لاتے ہوئے حیران ہوا۔

”پالک جاؤں گا۔ وعدہ کیا ہے میں نے اور تم؟“

”میں تو نہیں جاؤں گا۔“ سالار نے انکار کیا۔

”جان نہ پچھان، منہ اٹھا کر ان کے گھر کھانا کھانے پہنچ جاؤں۔“

”ڈاکٹر سیٹ علی صاحب کی فرسٹ کزن ہیں وہ اور مجھ سے زیادہ تو تمہاری جان پچھان ہے ان کے ساتھ۔“ فرقان نے کہا۔

”وہ اور معاملہ تھا، انہیں مدد کی ضرورت تھی، میں نے مدد کر دی اور بس اتنا ہی کافی ہے۔ ان کے بیٹے یہاں ہوتے تو اور بات تھی لیکن اس طرح اکیلی عورتوں کے گھر میں تو کبھی نہیں جاؤں گا۔“ سالار تنہید و تھا۔

”میں کون سا اکیلا جانے والا ہوں یا بیوی بچوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ جانتا ہوں میرا اکیلا ان کے ہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ نو شین بھی ان سے مل کر خوش ہوگی۔“

”ہاں، بھابھی کے ساتھ پہلے جانا، کوئی حرج نہیں۔“ سالار مطمئن ہوا۔

”میں جاؤں۔؟ تم کو بھی ساتھ چھوڑنا ہے، انہوں نے تمہیں بھی دعوت دی ہے۔“

”میں تو نہیں جاؤں گا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ تم ہو آنا، کافی ہے۔“ سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

”تم ان کے خاص مہمان ہو، تمہارے بغیر تو سب کچھ پھیکا رہے گا۔“

سالار کو اس کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے گردن موڑ کر فرقان کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”میرا خیال ہے انہیں تم داماد کے طور پر پسند آگئے ہو۔“

”فضول باتیں مت کیا کرو۔“ سالار نے اسے ناراضی سے دیکھا۔

”اچھا۔۔۔ دیکھ لینا، پروپوزل آئے گا تمہارا اس گھر سے۔ سعید و اماں کو تم ہر طرح سے اچھے لگے ہو۔ ہر بات پر چھی ہے انہوں نے مجھ سے تمہارے بارے میں۔ یہ بھی کہ تمہارا شادی کا کوئی ارادہ ہے کہ نہیں اور ہے تو سب تک کرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ جیسے ہی کوئی اچھا پروپوزل ملا وہ فوراً کر لے گا پھر وہ اپنی بیٹی کے بارے میں بتائے لگیں۔ اب بھئی تقریباً وہ اپنی بیٹی کی کر رہی تھیں اگر ہم اس میں سے پچاس فیصد بھی کچھ لیں تو بھی وہ لڑکی۔ کیا نام لے رہی تھیں۔۔۔ ہاں آمنہ۔۔۔ تمہارے لئے بہترین ہوگی۔“

”شرم آتی چاہئے کہیں ڈاکٹر سیٹ علی صاحب کی رشتہ دار ہیں وہ اور تم ان کے بارے میں فضول باتیں کر رہے ہو۔“ سالار نے اسے جھڑکا۔

فرقان سنجیدہ ہو گیا۔

”میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا ہوں، تمہارے لئے تو یہ اعزاز کی بات ہونی چاہئے کہ تمہاری شادی ڈاکٹر سیٹ علی صاحب کے خاندان میں ہو۔۔۔۔۔“

”جست اسٹاپ! فرقان! یہ مسئلہ کافی ڈسکس ہو گیا، اب ختم کرو۔“ سالار نے سختی سے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے، ختم کرتے ہیں پھر کبھی بات کریں گے۔“

فرقان نے اطمینان سے کہا۔ سالار نے گردن موڑ کر چھٹی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ڈرائیونگ کر رہے ہو، سڑک پر دھیان رکھو۔“ فرقان نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ سالار کچھ ناراضی کے عالم میں سڑک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

سعید و اماں کے ساتھ ان کا رابطہ وہیں ختم نہیں ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ ایک شام ڈاکٹر سیٹ علی کے ہاں تھے جب انہوں نے اپنے لیچر کے بعد ان دونوں کو روک لیا۔

”سعید و آپ آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہیں، مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں آپ لوگوں کے ہاں انہیں لے جاؤں۔ میں نے ان کو بتایا کہ شام کو وہ لوگ میری طرف آئیں گے، آپ یہیں مل لیں۔ آپ لوگوں نے شاید کوئی وعدہ کیا تھا ان کے ہاں جانے کا، مگر کئے نہیں۔“

فرقان نے معنی خیز نظروں سے سالار کو دیکھا۔ وہ نظریں چرا گیا۔

”نہیں، ہم لوگ سوچ رہے تھے مگر کچھ مصروف تھی اس لئے نہیں جاپائے۔“ فرقان نے جواب لیا۔

”دو دنوں ڈاکٹر سیٹ علی کے ساتھ ان کے ڈائنگ روم میں بیٹے آئے جہاں کچھ دیر بعد سعید و اماں

بھی آگئیں اور آتے ہی ان کی شکایات اور ناراضی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فرقان انہیں مطمئن کرنے میں مصروف رہا جبکہ سالار خاموشی سے بیٹھا رہا۔

اگلے ویک اینڈ پر فرقان نے سالار کو سعیدہ اماں کی طرف جانے کے پروگرام کے بارے میں بتایا۔ سالار کو اسلام آباد اور پھر وہاں سے گاؤں جانا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی مصروفیت بتا کر سعیدہ اماں سے معذرت کر لی۔

ویک اینڈ گزرنے کے بعد لاہور واپسی پر فرقان نے اسے سعیدہ اماں کے ہاں گزارے جانے والے وقت کے بارے میں بتایا۔ وہ اپنی پہلی کیلک کے ساتھ وہاں گیا تھا۔

”سالار! میں سعیدہ اماں کی بیٹی سے بھی ملا تھا۔“

فرقان نے بات کرتے ہوئے اچانک کہا۔

”بہت اچھی لڑکی ہے۔ سعیدہ اماں کے برعکس خاصی خاموش طبع ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔ تم دونوں کی بڑی اچھی گزرے گی۔ نوٹیشن کو بھی بہت اچھی لگی ہے۔“

”فرقان! تم صرف دعوت تک ہی رہو تو بہتر ہے۔“ سالار نے اسے ٹوکا۔

”میں بہت سیریس ہوں سالار!“ فرقان نے کہا۔

”میں بھی سیریس ہوں۔“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔ ”تمہیں پتا ہے فرقان! تم جتنا شادی پر اصرار کرتے ہو، میرا شادی سے اتنا ہی دل اُٹتا جاتا ہے اور یہ سب تمہاری ان باتوں کی وجہ سے ہے۔“

سالار نے صوفے کی پشت سے ٹپک لگاتے ہوئے کہا۔

”میری باتوں کی وجہ سے نہیں۔ تم صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم امامہ کی وجہ سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔“

فرقان یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”اوکے..... صاف صاف کہہ دیتا ہوں، میں امامہ کی وجہ سے شادی کرنا نہیں چاہتا پھر.....؟“

سالار نے سرد مہری سے کہا۔

”یہ ایک بچکانہ سوچ ہے۔“ فرقان اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

”اوکے، فائن۔ چکانہ سوچ ہے پھر؟“ سالار نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

”Then you should get rid of it.“ (جب تمہیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے)۔ فرقان

نے نرمی سے کہا۔

”I don't want to get rid of it.... so?“ (میں اس سے چھٹکارا نہیں چاہتا..... پھر؟)۔

سالار نے ترکی بہ ترکی کہا۔ فرقان کچھ دیر لاجواب ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

”میرے سامنے دوبارہ تم سعیدہ اماں کی بیٹی کی بات مت کرنا اور اگر تم سے وہ اس بارے میں بات کریں بھی تو تم صاف صاف کہہ دینا کہ مجھے شادی نہیں کرنی، میں شادی شدہ ہوں۔“

”اوکے، نہیں کروں گا اس بارے میں تم سے بات۔“ غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

فرقان نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے صلح جوئی سے کہا۔

☆.....☆.....☆

”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اس لئے تمہیں بلوایا ہے۔“ سکندر نے مسکراتے ہوئے سالار کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ طیبہ کے ساتھ اس وقت لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے اور سالار ان کے فون کرنے پر اس ویک اینڈ پر اسلام آباد آیا ہوا تھا۔

سکندر عثمان نے قدرے سنسنائی نظروں سے اپنے تیسرے بیٹے کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ان کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد اب کپڑے تبدیل کر کے ان کے پاس آیا تھا۔ سفید شلوار قمیض اور گھر میں پہنی جانے والی سیاہ چپل میں وہ اپنے عام سے حلیے کے باوجود بہت ہادقار لگ رہا تھا۔ شاید یہ اس کے چہرے کی سنجیدگی تھی یا پھر شاید وہ آج پہلی بار کنگی سالوں کے بعد اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور وہ اعتراف کر رہے تھے کہ اس کی شخصیت بھی بہت وقار اور ٹھہراؤ آگیا ہے۔

انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سالار کی وجہ سے انہیں اپنے سوشل سرکل میں اہمیت اور عزت ملے گی۔ وہ جانتے تھے بہت جگہوں پر اب ان کا تعارف سالار سکندر کے حوالے سے ہوتا تھا اور انہیں اس پر خوشگوار حیرت ہوتی تھی۔ اس نے اپنی پوری فین اننگ میں انہیں بری طرح خوار اور پریشان کیا تھا اور ایک وقت تھا، جب انہیں اپنے اس بیٹے کا مستقبل سب سے تاریک لگتا تھا۔ اپنی تمام عمر معمولی صلاحیتوں اور قابلیت کے باوجود مگر ان کے اندازے اور خدشات صحیح ثابت نہیں ہوئے تھے۔

طیبہ نے خشک میوے کی پلیٹ سالار کی طرف بڑھائی۔

سالار نے چند کاجو اٹھائے۔

”میں تمہاری شادی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

کاجو مت میں ڈالنے ہوئے وہ ایک دم زک گیا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ سکندر عثمان اور طیبہ بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

”اب تمہیں شادی کر ہی لینی چاہئے سالار!“

سکندر نے کہا۔ سالار نے غیر محسوس انداز میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاجو بارہ خشک میوے کی پلیٹ میں رکھ دیئے۔

”میں اور طیبہ تو حیران ہو رہے تھے کہ اتنے رشتے تو تمہارے بھائیوں میں سے کسی کے نہیں آتے

جتنے تمہارے لئے آ رہے ہیں۔"

سکندر نے بڑے غصے انداز میں کہا۔

"میں نے سوچا کچھ بات دات کریں تم سے۔"

وہ چپ چاپ انہیں دیکھ رہا۔

"زاد بدلتی صاحب کو جانتے ہو؟" سکندر عثمان نے ایک بڑی مٹنی پیش کھنی کے ہیلے کا نام لیا۔

"جی۔۔۔ ان کی بیٹی میری کو لیک ہے۔"

"رمہ نام ہے شاید؟"

"جی۔"

"کمٹی لڑکی ہے؟"

وہ سکندر عثمان کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ان کا سوال بہت "واضح" تھا۔

"اچھی ہے۔" اس نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

"جیہیں پسند ہے؟"

"کس لحاظ سے؟"

"میں رمہ کے پر پوزل کی بات کر رہا ہوں۔" سکندر عثمان نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"زاد چھپکے کئی پھٹے سے مجھ سے اس مسئلے میں بات کر رہا ہے۔ اپنی وائف کے ساتھ وہ ایک دو

بار ہماری طرف آیا بھی ہے۔ ہم لوگ بھی ان کی طرف گئے ہیں۔ چھپکے ویک اینڈ پر رمہ سے بھی ملے

ہیں۔ مجھے اور طیبہ کو تو بہت اچھی لگی ہے۔ خوب صورت ہے، بہت well behaved ہے اور تمہارے

ساتھ بھی اس کی اچھی خاصی دوستی ہے۔ ان لوگوں کی خواہش ہے بلکہ اصرار ہے کہ تمہارے ذریعہ

دونوں ٹیلیفون میں کوئی رشتہ داری بن جائے۔"

"پاپا میری رمہ کے ساتھ دوستی نہیں ہے۔" سالار نے مدھم اور غبرے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہ میری کو ٹیک ہے۔ جان پہچان ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت اچھی لڑکی ہے مگر میں

اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"تم کہیں اور انٹرنل ہو؟"

سکندر نے اس سے پوچھا۔ وہ خاموش رہا۔ سکندر اور طیبہ کے درمیان نظروں کا تالہ ہوا۔

"اگر تمہاری کہیں اور دلچسپی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہمیں خوشی ہوگی وہاں تمہاری

شادی کی بات کرتے ہوئے اور یقیناً تم پر بھی کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے اس مسئلے میں۔"

سکندر نے نرمی سے کہا۔

"میں بہت عرصہ پہلے شادی کر چکا ہوں۔"

ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ سکندر کو کوئی

دشواری نہیں ہوئی یہ سمجھنے میں کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ ان کے چہرے پر یک دم سنجیدگی آگئی۔

"ایمانہ کی بات کر رہے ہو؟"

وہ خاموش رہا۔ سکندر بہت دیر تک بے یقینی سے اسے دیکھتے رہے۔

"اسنے عرصے سے اس لئے شادی نہیں کر رہے؟"

سکندر کو جیسے ایک شاک لگا تھا۔ ان کا خیال تھا وہ اسے بھلا چکا تھا۔ آخر یہ آٹھ سال پرانی بات تھی۔

"اب تک تو وہ شادی کر چکی ہوگی، اپنی زندگی آرام سے گزار رہی ہوگی۔ تمہاری اور اس کی

شادی تو کب کی ختم ہو چکی۔"

سکندر نے اس سے کہا۔

"نہیں پاپا! اس کے ساتھ میری شادی ختم نہیں ہوئی۔" اس نے پہلی بار سر اٹھا کر کہا۔

"تم نے اسے نکاح سے اس میں طلاق کا اختیار دیا تھا اور۔۔۔ مجھے یاد ہے تم اسے ڈھونڈنا چاہتے تھے

جا کہ طلاق دے سکو۔"

سکندر نے جیسے اسے یاد کر دیا۔

"میں نے اسے ڈھونڈا تھا مگر وہ مجھے نہیں ملی اور وہ یہ بات نہیں جانتی کہ اس کے پاس طلاق کا

اختیار ہے۔ وہ جہاں بھی ہوگی ابھی تک میری ہی بیوی ہوگی۔"

"سالار! آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ایک دو سال کی بات تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ یہ جان گئی ہو

کہ طلاق کا اختیار اس کے پاس ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اب بھی تمہاری بیوی ہی ہو۔"

سکندر نے قدرے مضطرب ہو کر کہا۔

"میرے علاوہ کوئی دوسرا تو اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا اور میں نے اسے اس حق کے بارے میں نہیں

بتایا اور جب تک وہ میرے نکاح میں ہے مجھے کہیں اور شادی نہیں کرنی۔"

"تمہارا نکاح کیا ہے اس کے ساتھ؟" سکندر نے بہت مدھم آواز میں کہا۔

"نہیں۔"

"آٹھ سال سے اس سے تمہارا رابطہ نہیں ہوا۔ اگر ساری عمر نہ ہوا تب کیا کر دے؟"

وہ خاموش رہا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

سکندر عثمان کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرتے رہے۔

"تم نے مجھ سے کہی یہ نہیں کہا کہ تم اس لڑکی کے ساتھ ایسا مٹنی اتواؤ ہو۔ تم نے تو مجھے کہنا بتایا

تھا کہ تم نے صرف وقتی طور پر اس کی مدد کی تھی وہ کسی اور لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی وغیرہ وغیرہ۔۔۔
سالار اس بار بھی خاموش رہا۔

سکندر عثمان چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔ وہ اپنے اس تیسرے بیٹے کو بھی نہیں جان سکتے تھے۔ اس کے دل میں کیا تھا وہ اس تک کبھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جس لڑکی کے لئے وہ آٹھ سال ضائع کر چکا تھا اور باقی کی زندگی ضائع کرنے کے لئے تیار تھا، اس کے ساتھ اس کے جذباتی تعلق کی شدت کیسی ہوسکتی تھی یہ اب شاید اسے لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمرے میں خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا پھر سکندر عثمان اٹھ کر اپنے رینگ روم میں چلے گئے۔ ان کی واپسی چند منٹوں کے بعد ہوئی۔ صوف پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے سالار کی طرف ایک لفاظہ بڑھا دیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے وہ لفاظہ بکڑ لیا۔

”امامہ نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔“

وہ سانس نہیں لے سکا۔ سکندر عثمان ایک بار پھر صوف پر بیٹھ چکے تھے۔

”یہ پانچویں سال پہلے کی بات ہے وہ تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔“ فون ناصر نے اٹھایا تھا اور اس نے امامہ کی آواز پہچانی۔ ”تب تم پاکستان میں تھے، ناصر نے تمہاری بجائے مجھ سے اس کی بات کراوائی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے اس کی بات کرواؤں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم مر چکے ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ تم سے رابطہ کرے اور جس مصیبت سے ہم بچنا چاہتے ہیں اس میں دوبارہ پڑیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری بات پر یقین کرنے کی کیونکہ تم کئی بار خود بخود کی کوشش کر چکے تھے۔ وہ دسم کی بہن تھی تمہارے بارے میں یہ سب کچھ جانتی ہوگی۔ کم از کم ایک ایسی کوشش کی تو وہ خود گواہ تھی۔ میں اسے نکاح نامے میں موجود مطلق کے اختیار کے بارے میں نہیں بتا سکا نہ ہی اسے مطلق نامے کے بارے میں جو میں نے تمہاری طرف سے تیار کر دیا تھا۔ تمہیں جب میں نے امریکہ بھجوا دیا تھا تو تم سے ایک سادہ کاغذ پر سائن لئے تھے، میں چاہتا تھا کہ مجھے ضرورت پڑے تو میں خود ہی مطلق نامہ تیار کروا لوں۔ یہ قانونی یا جائز تھا کہ نہیں اس کا پتہ نہیں مگر میں نے اسے تیار کروا دیا تھا اور میں امامہ کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا اور اسے تمام سچے زبانی دینا چاہتا تھا مگر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے نمبر ٹریس آؤٹ کر دیا وہ کسی بی بی اس کا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد میں ہزار کے کچھ ٹریڈرز ہینک مجھے اس نے ڈاک کے ذریعے بھیجا اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ شاید تم نے اسے کچھ رقم دی تھی۔ اس نے وہ واپس کی تھی۔ میں نے تمہیں اسے نہیں بتایا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم دوبارہ اس معاملے میں اتالو ہو۔ میں امامہ کی فیملی سے خوفزدہ تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ تب بھی تمہاری تاک میں ہوں گے اور میں چاہتا تھا تم اپنا کیریئر بناتے رہو۔“

وہ لفاظہ ہاتھ میں پکڑے رنگ بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ سکندر عثمان کو دیکھتا رہا، کسی نے بہت آہستگی کے ساتھ اس کے وجود سے جان نکال لی تھی۔ اس نے لفاظے کو ٹھیل پر رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طیبہ اور سکندر اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ کو دیکھ سکیں۔۔۔ وہ دیکھ چکے تھے مگر اس کے عواص چند لمحوں کے لئے بالکل کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ اپنے سامنے پڑی ٹھیل پر رکے اس لفاظے پر ہاتھ رکے وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اسے ٹھیل پر رکے رکے اس نے اس کے اندر موجود کاغذ کو نکال لیا۔
ڈائیر انکل سکندر!

مجھے آپ کے بیٹے کی موت کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو چند سال پہلے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے سالار کو کچھ رقم ادا کرنی تھی۔ وہ میں آپ کو بھجوا رہی ہوں۔

خدا حافظ

امامہ ہاشم

سالار کو لگا وہ واقعی مر گیا ہے۔ سفید چہرے کے ساتھ اس نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو دوبارہ لفاظے میں ڈال دیا۔ کچھ بھی کہے بغیر اس نے لفاظہ تھما اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔ سکندر اور طیبہ دم بخود اسے دیکھ رہے تھے جب وہ سکندر کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
”سالار۔۔۔!“

وہ زک گیا۔ سکندر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”جو کچھ بھی ہوا۔۔۔ نادانستگی میں ہوا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم۔۔۔ اگر تم نے کبھی مجھے امامہ کے بارے میں اپنی فیکٹوری بتائی ہو تو میں کبھی یہ سب نہ کہتا۔ میں اس سارے معاملے کو کسی اور طرح پینڈل کرنا چاہتا تھا اس کے ساتھ تمہارا رابطہ کروا دیتا۔ میرے بارے میں اپنے دل میں کوئی شکایت یا گلہ مت رکھنا۔“

سالار نے سر نہیں اٹھایا۔ ان سے نظر نہیں ملانی مگر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اسے ان سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ سکندر نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا، سکندر چاہتے تھے وہ وہاں سے چلا جائے۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں کو کسی پیچ کی طرح کپکپاتے دیکھا تھا۔ وہ بار بار انہیں سمجھنے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند منٹ اور وہاں رہنا تو شاید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ سکندر اپنے بچپن سے ہی مزید اضافہ نہیں چاہتے تھے۔

طیبہ نے اس ساری گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی، مگر سالار کے باہر جانے کے بعد انہوں نے

سکندر کی دل وہی کرنے کی کوشش کی۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا اس کی بہتری کے لئے کیا۔ وہ سمجھ جائے گا۔“

وہ سکندر کے چہرے سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتی تھیں۔ سکندر ایک سنگریٹ سلگاتے ہوئے کمرے میں پتھر لگا رہے تھے۔

”یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے سالار سے پوچھتے بغیر یا اس کو بتائے بغیر یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے امامہ سے اس طرح کا جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہئے تھا۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر تاسف آمیز انداز میں ایک ہاتھ کو منگی کی صورت میں پیچھے ہونے کمرے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

گاڑی بہت قتلہ انداز میں اس سڑک پر پھسل رہی تھی۔ سالار کئی سال بعد پہلی بار اس سڑک پر رات کے اس پہر گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ رات اس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چل رہی تھی۔ اسے لگا آٹھ سال اڑ کر عائب ہو گئے تھے۔ سب کچھ وہی تھا۔ وہیں تھا۔

کوئی بڑی آہستگی سے اس کے برابر میں آ بیٹھا۔ اس نے اپنے آپ کو فریب کی گرفت میں آنے دیا۔ گردن موڑ کر برابر والی سیٹ کو نہیں دیکھا۔ اوٹن کو حقیقت بتنے دیا۔ جانتے بوجھے کھلی آنکھوں کے ساتھ۔ کوئی آپ سسکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

”ذخیرا اکل سکندر!“

مجھے آپ کے بیٹے کی موت پر بہت افسوس ہوا۔ چند سال پہلے میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف آٹھانی پڑی، میں اس کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے سالار کو کچھ رقوم ادا کرنی تھی۔ وہ اب میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔“

خدا حافظ

امامہ ہاشم

ایک بار پھر اس خط کی تحریر اس کے ذہن میں گونجنے لگی تھی۔

وہ سکندر عثمان کے پاس سے آکر بہت دیر تک خط لے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔

اس نے امامہ کو کوئی رقوم نہیں دی تھی مگر وہ جانتا تھا اس نے اس کا کون سا قرض لوٹا تھا۔ موبائل فون کی قیمت اور اس کے بلز وہ خالی الذہنی کے عالم میں اپنے بیڈ پر بیٹھے نیم چارپک کر کے کی کڑکیوں سے باہر اس کے گھر کی تمہارت کو دیکھتا رہا۔ ساری دنیا یک دم پیسے ہر زندہ شے سے خالی ہو گئی تھی۔

اس نے خط پر تاریخ پڑھی، وہ امامہ کے گھر سے جانے کے تقریباً دو سال بعد بھیجا گیا تھا۔

دو سال کے بعد اگر وہ بیس ہزار روپے اسے بھجوا دی تھی تو اس کا مطلب تھا وہ خیریت سے تھی۔ کم از کم اس کے امامہ کے بارے میں بدترین اندیشے درست ثابت نہیں ہوئے تھے۔ اسے خوشی تھی لیکن اگر اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سالار مر چکا تھا تو پھر وہ اس کی زندگی سے بھی نکل گیا تھا اور اس کا کیا مطلب تھا وہ یہ بھی جانتا تھا۔

کتنی سمجھتے وہ اسی طرح وہیں بیٹھا رہتا پھر بتائیں اس کے دل میں کیا آیا، اپنا بیک بیک کر کے وہ گھر سے نکل آیا۔

اور اب وہ اس سڑک پر تھا۔ اسی دھند میں، اسی موسم میں، سب کچھ جیسے دھواں بن رہا تھا یا پھر دھند چند چھو گھنٹوں کے بعد وہ اسی ہوٹل نما سروس اسٹیشن کے پاس جا پہنچا۔ اس نے گاڑی روک لی۔ دھند میں ملوث وہ عمارت اب بالکل بدل چکی تھی۔ گاڑی کو موڑ کر وہ سڑک سے اُتار کر اندر لے آیا۔ پھر دروازہ کھول کر نیچے آئے، آٹھ سال پہلے کی طرح آج بھی وہاں خاموشی کا رائج تھا۔ صرف لائٹس کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی، اس نے ہارن نہیں دیا۔ اس نے لائٹس سے کوئی نہیں لکھا۔ برآمدے میں اب وہ پانی کا ڈرم نہیں تھا۔ وہ برآمدے سے گزرتے ہوئے اندر جانے لگا، تب ہی اندر سے ایک شخص نکل آیا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا سالار نے اس سے کہا۔

”میں چائے پیانا چاہتا ہوں۔“

اس نے جیسا کی اور واپس مڑ گیا۔

”آجائیں۔۔۔۔۔“

سالار اندر چلا گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا مگر اندر سے کچھ بدل چکا تھا۔ پہلے کی نسبت میزوں اور کرسیوں کی تعداد زیادہ تھی اور کمرے کی حالت بھی بہت بہتر ہو چکی تھی۔

”چائے لیں گے یا ساتھ کچھ اور بھی؟“ اس آدمی نے مڑ کر اچانک پوچھا۔

”صرف چائے۔“

سالار ایک کرسی سمجھ کر بیٹھ گیا۔

آدمی کاؤنٹر کے عقب میں اب اسٹوڈ جالنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“ اس نے چائے کے لئے کیتلی اوپر رکھتے ہوئے سالار سے پوچھا۔

جواب نہیں آیا۔

اس شخص نے گردن موڑ کر دیکھا۔ چائے پینے کے لئے آنے والا وہ شخص کمرے کے ایک کونے پر نظر نہیں جاتے ہوئے تھا۔ بالکل پتھر کے کسی میسے کی طرح بے حس و حرکت۔

وہ نماز پڑھ کر اس کے بالمقابل میز کے دوسری جانب کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ کچھ کہے بغیر اس نے میز پر پڑا جانے کا پ آٹھایا اور اسے پہنے لگی۔ لڑکا جب تک برگر لے آیا تھا اور اب ٹیبل پر برگر رکھ رہا تھا۔ سالار چمکی نظروں کے ساتھ اس برگر کی پلٹ کو دیکھ رہا تھا، جو اس کے سامنے رکھی جا رہی تھی۔ جب لڑکے نے پلٹ رکھ دی تو سالار نے کانٹے کے ساتھ برگر کا پ والا حصر آٹھایا اور تنقیدی نظروں سے فلٹک کا جائزہ دیا پھر چھری اٹھا کر اس نے لڑکے سے کہا جو اب امام کے برگر کی پلٹ اس کے سامنے رکھ چکا تھا۔

”یہ شامی کباب ہے۔“

filling کی اوپر والی تہ کو الگ کر رہا تھا۔

”یہ آٹھ ہے۔“ اس نے نیچے موجود آٹھ کو چھری کی مدد سے تھوڑا اٹھایا۔

”اور یہ کچپ، تو چکن کہاں ہے؟ میں نے جنہیں چکن برگر لانے کو کہا تھا؟“

اس نے اکھڑ لیچے میں لڑکے سے کہا۔

امام جب تک خاموشی سے برگر اٹھا کر کھانے میں مصروف ہو چکی تھی۔

”یہ چکن برگر ہے۔“ لڑکے نے قدرے گڑبڑا کر کہا۔

”کیسے چکن برگر ہے؟ اس میں کیسے چکن نہیں۔“ سالار نے چیلنج کیا۔

”ہم اسے ہی چکن برگر کہتے ہیں۔“ وہ لڑکا اب تروس ہو رہا تھا۔

”اور جو سادہ برگر ہے اس میں کیا لاتے ہو؟“

”اس میں بس شامی کباب ہوتا ہے۔ اٹھ جنہیں ہوتا۔“

”اور اٹھ ذال کا سادہ برگر چکن برگر بن جاتا ہے، چونکہ اٹھ سے مرعفی تھتی ہے اور مرعفی کے گوشت کو چکن کہتے ہیں اس لیے directly نہیں indirectly چکن برگر بنتا ہے۔“

سالار نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ لڑکا کھانے کے انداز میں ہنسنا۔ امام ان دونوں کی گفتگو پر توجہ دینے بغیر ہاتھ میں پکڑا برگر کھانے میں مصروف تھی۔

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ سالار نے کہا۔

لڑکے نے یقیناً سکون کا سانس لیا اور وہاں سے غائب ہو گیا۔ چھری اور کانٹے کو رکھ کر سالار نے بائیں ہاتھ سے برگر کو اٹھایا۔ برگر کھاتے ہوئے امام نے پہلی بار پلٹ سے سالار کے ہونٹوں تک بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے برگر کے سبز کو قجب آٹھایا اور یہ قجب ایک لمحہ میں غائب ہو گیا تھا۔ وایک بار پھر برگر کھانے میں مصروف تھی۔ سالار نے اپنے برگر کو دانتوں سے کاٹا ایک لمحہ کے لئے منہ چلا یا اور پھر برگر کو اپنی پلٹ میں اچھال دیا۔

”غضول برگر ہے۔ تم کس طرح کھا رہی ہو؟“ سالار نے لٹکے کو بمشکل حلق سے نکلنے ہوئے کہا۔

”اتنے برا نہیں ہے جتنا جنہیں لگ رہا ہے۔“ امام نے بے تاثر انداز میں کہا۔

”ہر چیز میں تمہارا اسٹینڈرڈ بڑا ہونے امام اودھا چاہے برگر ہو یا شوہر۔“

برگر کھاتے ہوئے امام کا ہاتھ ڈک گیا۔ سالار نے اس کے سفید چہرے کو ایک پل میں سرخ ہوتے دیکھا۔ سالار کے چہرے پر ایک تپا دینے والی مسکراہٹ آئی۔

”میں جہاں انصر کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے جیسے امام کو یاد دلایا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ امام نے پرسکون لیچے میں کہا۔

”میرا اسٹینڈرڈ واقعی بہت لوہے۔“ وہ ایک بار پھر برگر کھانے لگی۔

”میں نے سوچا تم برگر میرے منہ پر دے مارو گی۔“ سالار نے دلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میں رزق جیسی نعمت کو کیوں ضائع کروں گی۔“

یہ اتنے برا برگر نعمت ہے؟“ اس نے تھیک آٹھایا انداز میں کہا۔

”اور کون کون سی نعمتیں ہیں اس وقت تمہارے پاس۔“

”انسان اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ میری زبان پر ڈا اٹھ چکھنے کی جو حس ہے یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ میں اگر کوئی چیز کھاتی ہوں تو میں اس کا ڈا اٹھ محسوس کر سکتی ہوں۔ بہت سے لوگ اس نعمت سے بھی محروم ہوتے ہیں۔“

”اور ان لوگوں میں ٹاپ آف وی لسٹ، سالار سکندر کا نام ہو گا ہے نا؟“

اس نے امام کے بات مکمل کرنے سے پہلے ہی تیز آواز میں اس کی بات کاٹی۔

”سالار سکندر کم از کم اس طرح کی چیزیں کھا کر انجوائے نہیں کر سکتا۔“

اس شخص نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ سالار ایک دم چونک گیا۔ سامنے والی کرسی اب خالی تھی۔

”ساتھ میں کچھ اور چاہئے؟“ آدمی نے کھڑے کھڑے پھر چھا۔

”جنہیں، بس چائے کافی ہے۔“ سالار نے چائے کا کپ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

”آپ اسلام آباد سے آئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”ہاں اور چارہ ہے؟“ اس نے ایک اور سوال کیا۔

اس بار سالار نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ وہ اب چائے کا گھونٹ لے رہا تھا۔ اس آدمی کو شہر ہوا اس نے چائے پینے والے شخص کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی دیکھی ہے۔

”میں کچھ دیر یہاں اکیلا بیٹھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے سر اٹھائے بغیر کہا۔

وہ شخص کچھ تعجب سے اسے دیکھتا وہاں سبکیں میں چلا گیا اور غلامی نوعیت کے کاموں میں مصروف گاہے بگاہے دور سے سالار پر نظریں دوڑاتا رہا۔

پورے پندرہ منٹ بعد اس نے سالار کو ٹیبل چھوڑ کر کمرے سے نکلے دیکھا۔ وہ آدمی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ سبکیں سے کمرے میں آیا مگر اس سے پہلے کہ وہ سالار کے پیچھے باہر جاتا، میز پر خالی کپ کے نیچے پڑے ایک نوٹ نے اسے روک لیا۔ وہ بوجھ چکا سا اس نوٹ کو دیکھتا رہا، پھر اس نے آگے بڑھ کر اس نوٹ کو پکڑا اور تیزی سے کمرے سے باہر آگیا۔ سالار کی گاڑی اس وقت ریورس ہوتے ہوئے مین روڈ پر جارہی تھی۔ اس آدمی نے خیرانی سے اس دور جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھا پھر ہاتھ میں جکڑے اس ہزار روپے کے نوٹ کو برآمدے میں لگی نیو لائٹ کی روشنی میں دیکھا۔

”نوٹ اصلی ہے مگر آدمی بے وقوف۔“

اس نے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے زیر لب تبصرہ کیا اور نوٹ کو جیب میں ڈال لیا۔

☆.....☆.....☆

سکندر عثمان صبح ناشتی کی میز پر آئے تو بھی ان کے ذہن میں سب سے پہلے سالار کا خیال آیا تھا۔

”سالار کہاں ہے؟“ اسے بلواؤ۔“

انہوں نے ملازم سے کہا۔ ”سالار صاحب قورات کو ہی چلے گئے۔“

طیپ اور سکندر نے بے اختیار ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔

”کہاں چلے گئے؟“

”نہیں، وہاں لاہور چلے گئے، کہہ رہے تھے کوئی ضروری کام ہے، صبح صبح آپ کو بتا دوں۔“

سکندر یک دم اٹھ کر فون کی طرف چلے گئے۔ انہوں نے سالار کا نمبر ڈائل کیا۔ موبائل آف تھا۔ انہوں نے اس کے فلیٹ کا نمبر ڈائل کیا۔

وہاں جوالی مشین لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے پیغام ریکارڈ کر کے اسے بغیر فون بند کر دیا۔ کچھ پریشان

تھا۔ وہ بارہ ناشتی کی میز پر آ بیٹھے۔

”فون پر کالیکٹ نہیں ہوا؟“

طیپ نے پوچھا۔

”نہیں موبائل آف ہے۔ اس کے فلیٹ پر آس فون لگا ہوا ہے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔“

”ناشتہ کریں۔“

طیپ نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

”تم کرو۔“ میرا منہ نہیں ہے۔“

وہ اٹھ کر باہر نکل گئے۔ طیپ بے اختیار سانس لے کر رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆

سالار نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا، باہر فرقان تھا۔ وہ پلٹ کر اندر آگیا۔

”تم آئے؟“ فرقان نے قدرے خیرانی سے اس کے پیچھے اندر آتے ہوئے کہا۔

”آج صبح۔“ سالار نے صوفے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

”جہیں گاؤں جانا تھا؟“ فرقان نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں قپارنگ میں کچھ میٹھی گاڑی رکھ کر آگیا۔ بندہ آتا ہے تو بتائی دیتا ہے۔“

سالار جواب میں کچھ بے غیر صوفہ پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟“ فرقان نے چلی بار اس کے چہرے کو دیکھا اور تشویش میں جٹا ہوا۔

”کیا ہوا؟“ سالار نے جواب دیا۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں، جہیں کیا ہوا ہے؟“ فرقان نے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں۔“

”گھر میں سب خیریت ہے؟“

”ہاں۔“

”تو پھر تم سر میں درد ہے؟“

فرقان اب اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ سالار نے مسکرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی

آنکھوں کو مسلا۔

”تو پھر ہوا کیا ہے؟“

”آکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔“

”میں رات سویا نہیں۔“

ڈرائیو کرنا ہوا۔“

سالار نے بڑے عام سے انداز میں کہا۔

”تو اب سو جاتے۔“

یہاں آکر ٹیپ پر، صبح سے کیا کر رہے ہو؟“ فرقان نے کہا۔

”کچھ بھی نہیں۔“

”سوئے کیوں نہیں؟“

”نیند نہیں آ رہی۔“

”تم تو سلیپنگ پائے کر سو جاتے ہو، پھر نیند نہ آنا کی معنی رکھتا ہے؟“

فرقان کو تعجب ہوا۔

”بس آج نہیں لیٹا چاہتا تھا میں۔ یا یہ سمجھ لو کہ آج میں سونا نہیں چاہتا تھا۔“

”کھانا کھایا ہے؟“

”نہیں، بھوک نہیں لگی۔“

”دو دن رہے ہیں۔“ فرقان نے جیسے اسے بتایا۔

”میں کھانا بھجواتا ہوں کھالو۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر سوچا تو پھر رات کو نلکے میں آؤنگے کے لئے۔“

”نہیں، کھانا مت بھجواتا۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ شام کو انھوں کا تو باہر جا کر کہیں کھاؤں گا۔“

سالار کہتے ہوئے صوف پر لیٹ گیا اور اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ فرقان کچھ دیر بیٹھا اسے دیکھتا رہا، پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

رمحہ نے سالار کے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ اس نے ریسیٹین کی طرف جاتے ہوئے سالار کے کمرے کی کھڑکیوں کے چتر کھٹے ہوئے بلائیںڈرو میں اسے اندر دیکھا تھا۔ کوریڈور میں سے گزر جانے کی بجائے وہ رک گئی۔ سالار ٹھیل پر اپنی کھپیاں لٹکائے دو تونہاں سے اپنا سر پکڑے ہوئے تھا۔ رمحہ جانتی تھی کہ اسے کبھی بکھار میجرین کا دروہو تا تھا۔ وہ ریسیٹین کی طرف جانے کے بجائے اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

سالار اسے دیکھ کر سیدھا ہو گیا۔ وہ اب ٹھیل پر کھلی ایک فائل کو دیکھ رہا تھا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ رمحہ نے گھر مندی سے پوچھا۔

”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

اس نے رمحہ کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ رمحہ واپس جانے کے بجائے آگے بڑھ آئی۔

”نہیں تم ٹھیک نہیں لگ رہے؟“ اس نے سالار کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم ہلیر اس فائل کو لے جاؤ۔۔۔۔۔ اسے دیکھ لو۔ میں دیکھ نہیں پا رہا۔“

سالار نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے فائل بند کر کے ٹھیل پر اس کی طرف کھکا دی۔

”میں دیکھ لیتی ہوں، تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے تو کھر پٹے جاؤ۔“

رمحہ نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

”ہاں، ہنجر ہے۔ میں گھر چلا جاؤں۔“ اس نے اپنا بریف کیس نکال کر اسے کھولا اور اپنی چیزیں

اندر رکھنا شروع کر دیں۔ رمحہ بغور اس کا جائزہ لیتی رہی۔

☆.....☆.....☆

وہ گیارہ بجے آفس سے واپس گھر آ گیا تھا۔ یہ چوتھا دن تھا جب وہ مسلسل اسی حالت میں تھا۔ یک دم،

ہر چیز میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

بینک میں اپنی جاب۔

لمو (LUMS) کے لیکچررز۔

ڈائریکٹریٹلی کے ساتھ نشست۔

فرقان کی کمپنی۔

گاؤں کا اسکول۔

مستقبل کے منصوبے اور پلاننگ۔

اسے کوئی چیز بھی اپنی طرف متوجہ نہیں پارہی تھی۔

وہ جس امکان کے پیچھے کئی سال پہلے سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آ گیا تھا وہ ”امکان“ ختم ہو گیا تھا

اور اسے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ختم ہونے سے اس کے لئے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ وہ مسلسل

اپنے آپ کو اس حالت سے باہر لانے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا اور وہ مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔

محض یہ تصور کہ وہ کس اور شخص کی بیوی بن کر کسی اور کے گھر میں رہ رہی ہوگی۔ سالار سکندر

کے لئے اتنا ہی جان لیوا تھا جتنا ماضی کا یہ اندیشہ کہ وہ غلط باتوں میں نہ چلی گئی ہو اور اس بڑبڑاتی حالت میں

اس نے عمر بھر پر جانے کا فیصلہ کیا تھا وہ واحد جگہ تھی جو اس کی زندگی میں اچانک آ جانے والی اس بے

معنویت کو ختم کر سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ احرام باندھے خانہ کعبہ کے صحن میں کھڑا تھا۔ خانہ کعبہ میں کوئی نہیں تھا۔ دور دور تک کسی وجود

کا نشان نہیں تھا۔ رات کے پچھلے پہر آسمان پر چاند اور ستاروں کی روشنی نے صحن کے ماربل سے منعکس ہو

کر وہاں کی ہر چیز کی ایک عجیب سی رودھی روشنی میں شبلا دیا تھا۔ چاند اور ستاروں کے علاوہ ہاں اور کوئی

روشنی نہیں تھی۔

خانہ کعبہ کے خلاف پر نکلی ہوئی آیات، سیاہ کلاف پر عجیب طرح سے روشن تھیں۔ ہر طرف گہرا

سکوت تھا اور اس گہرے سکوت کو صرف ایک آواز توڑ رہی تھی۔ اس کی آواز۔ اس کی اپنی آواز۔

وہ مقام منظم سے پاس کھڑا تھا۔ اس کی نظریں خانہ کعبہ کے دروازے پر تھیں اور دوسرا اٹھائے بلند آواز

سے کہتے لگا۔

”لبيك اللهم لبيك o لبيك لا شريك لك لبيك o ان الحمد والتعmente للملك والمملك

لا شريك لك o“

(حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں تیرا گوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بیشک حمد و ثناء تیرے لئے ہے، نعمت تیری ہے، بادشاہی تیری ہے گوئی تیرا شریک نہیں)۔
پوری قوت سے گونجی ہوئی اس کی آواز خانہ کعبہ کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔ اس کی آواز خلائی و مستوں تک جا رہی تھی۔

"لیک اللہم لیک....."

گنگے پاؤں، نیم بر بند وہاں کھڑا وہ اپنی آواز پہچان رہا تھا۔

"لیک لا شریک لک لیک....." وہ صرف اس کی آواز تھی۔ ان الحمد والنعمة لک والملك.....

اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اس کی ٹھوڑی سے نیچے اس کے چہرے کی انگوٹھوں پر گر رہے تھے۔

"لا شریک لک....."

اس کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

"لیک اللہم لیک....."

اس نے خانہ کعبہ کے خلاف پر کندہ آیات کو یک دم بہت روشن دیکھا۔ اتار و شن کہ وہ جگہ گئے گئی تھیں۔ آسمان پر ستاروں کی روشنی بھی اچانک بڑھ گئی تھی۔ وہ ان آیات کو دیکھ کر ہاتھ مہموت سر زد۔ کسی معمول کی طرح، زبان پر ایک ہی جملہ لئے..... اس نے خانہ کعبہ کے دروازے کو بہت آہستہ آہستہ کھلتے دیکھا۔

"لیک اللہم لیک....."

اس کی آواز اور بلند ہو گئی۔ ایک ورد کی طرح۔ ایک سانس۔ ایک لے۔

"لیک لا شریک لک لیک....."

اس وقت پہلی بار اس نے اپنی آواز میں کسی اور آواز کو مدغم ہوتے محسوس کیا۔

"ان الحمد والنعمة....."

اس کی آواز کی طرح وہ آواز بلند نہیں تھی۔ کسی سرگوشی کی طرح تھی۔ کسی گونج کی طرح، مگر وہ پہچان سکتا تھا وہ اس کی آواز کی گونج نہیں تھی۔ وہ کوئی اور آواز تھی۔

"لک والملك....."

اس نے پہلی بار خانہ کعبہ میں اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی کو محسوس کیا۔

"لا شریک لک....."

خانہ کعبہ کا دروازہ کھل رہا تھا۔

"لیک اللہم لیک....."

وہ اس نسوانی آواز کو پہچانتا تھا۔

"لیک لا شریک لک....."

وہ اس کے ساتھ وہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

"لیک ان الحمد والنعمة....."

آواز انہیں طرف نہیں تھی، بائیں طرف تھی۔ کہاں..... اس کی پشت پر۔ چند قدم کے فاصلے پر۔

"لک والملك لا شریک لک....."

اس نے جبکہ کراہتے پاؤں پر گرنے والے آنسوؤں کو دیکھا اس کے پاؤں ہریک پکے تھے۔

اس نے سر اٹھا کر خانہ کعبہ کے دروازے کو دیکھا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ اندر روشنی تھی۔ دو دھیا روشنی۔ اتنی روشنی کہ اس نے بے اختیار گھٹنے ٹیک دیئے۔ وہ اب سجدہ کر رہا تھا، روشنی کم ہو رہی تھی۔ اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔ روشنی اور کم ہو رہی تھی۔

وہ آٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خانہ کعبہ کا دروازہ اب بند ہو رہا تھا۔ روشنی اور کم ہوتی جا رہی تھی اور تب اس نے ایک بار پھر سرگوشی کی صورت میں وہی نسوانی آواز سنی۔

اس بار اس نے مز کر دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

سالار کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حرم شریف کے ایک برآمدے کے ستون سے سرٹکائے ہوئے تھا۔ وہ کچھ دیر سستانے کے لئے وہاں بیٹھا تھا مگر نیند نے عجب انداز میں اس پر غلبہ پایا۔

وہ امام تھی۔ بے شک امام تھی۔ سفید احرام میں اس کے پیچھے کھڑی۔ اس نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی مگر ایک جھلک بھی اسے یقین دلانے کے لئے کافی تھی کہ وہ امام کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ خانی الدینی کے عالم میں لوگوں کو ادا حرم سے اُدھر جاتے دیکھ کر بے اختیار اس کا دل بھر آیا۔

آٹھ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اسے اس عورت کو دیکھنے جسے اس نے آج وہاں حرم شریف میں خواب میں دیکھا تھا کسی زخم کو پھر دہرایا تھا۔ اس نے گلاسز اتار دیئے اور دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

آنکھوں سے اچلتے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس پرقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکانے بہت دیر وہاں بٹھا رہا تھا۔

آنکھوں سے اچلتے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس پرقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکانے بہت دیر وہاں بٹھا رہا تھا۔

آنکھوں سے اچلتے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس پرقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکانے بہت دیر وہاں بٹھا رہا تھا۔

آنکھوں سے اچلتے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس پرقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکانے بہت دیر وہاں بٹھا رہا تھا۔

آنکھوں سے اچلتے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس پرقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکانے بہت دیر وہاں بٹھا رہا تھا۔

آنکھوں سے اچلتے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس پرقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکانے بہت دیر وہاں بٹھا رہا تھا۔

آنکھوں سے اچلتے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس پرقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکانے بہت دیر وہاں بٹھا رہا تھا۔

آنکھوں سے اچلتے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس پرقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکانے بہت دیر وہاں بٹھا رہا تھا۔

پھر اسے یاد آیا وہ ہر سال وہاں عروہ کرنے کے لئے آیا کرتا تھا۔ وہ امام ہاشم کی طرف سے بھی عروہ کیا کرتا تھا۔

وہ اس کی عافیت اور لمبی زندگی کے لئے بھی دعا مانگا کرتا تھا۔

وہ امام ہاشم کو ہر پڑیٹائی سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی دعا مانگا کرتا تھا۔

اس نے وہاں حرم شریف میں اتنے سالوں میں اپنے اور امام کے لئے ہر دعا مانگ چھوڑی تھی جہاں بھڑکی دعا تھیں، مگر اس نے وہاں حرم شریف میں کبھی امام کو اپنے لئے نہیں مانگا تھا۔ عجیب بات تھی مگر اس نے وہاں کبھی امام کے حصول کے لئے دعا مانگی تھی۔ اس کے آنسو یک دم ختم گئے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وضو کے بعد اس نے عمرے کے لئے احرام باندھا۔ کعبہ کا خوف کرتے ہوئے اس پر اتفاقاً اسے مقام منترم کے پاس جگہ مل گئی۔ وہاں، جہاں اس نے اپنے آپ کو خواب میں کھڑے دیکھا تھا۔

اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے دعا کرتا شروع کی۔

”یہاں کھڑے ہو کر تجھ سے انجاء دعا مانگا کرتے تھے۔ ان کی دعاؤں میں اور میری دعا میں بہت فرق ہے۔“

وہ گڑگڑا رہا تھا۔

”میں نبی ہو تا تو نبیوں جیسی دعا کرتا مگر میں تو عام بشر ہوں اور گناہگار بشر۔ میری خواہشات، میری آرزوئیں سب عام ہیں۔ یہاں کھڑے ہو کر کبھی کوئی کسی عورت کے لئے نہیں رو دیا ہو گا، میری ذلت اور پستی کی اس سے زیادہ انتہا کیا ہو گی کہ میں یہاں کھڑا۔۔۔ حرم پاک میں کھڑا۔۔۔ ایک عورت کے لئے گڑگڑا رہا ہوں مگر مجھے نہ اپنے دل پر اختیار ہے نہ اپنے آنسوؤں پر۔“

یہ میں نہیں تھا جس نے اس عورت کو اپنے دل میں جگہ دی، یہ تو نے کیا۔ کیوں میرے دل میں اس عورت کے لئے اتنی محبت ڈالی کہ میں تیرے سامنے کھڑا بھی اس کو یاد کر رہا ہوں آ کیوں مجھے اس قدر بے بس کر دیا کہ مجھے اپنے وجود پر بھی کوئی اختیار نہیں رہا؟ میں وہ بشر ہوں جسے تو نے ان تمام کمزوریوں کے ساتھ بنایا۔ میں وہ بشر ہوں جسے تیرے سوا کوئی راستہ دکھانے والا نہیں اور وہ عورت وہ میری زندگی کے ہر راستے پر کھڑی ہے۔ مجھے کہیں جانے کہیں پہنچنے نہیں دے رہی یا تو اس کی محبت کو اس طرح میرے دل سے نکال دے کہ مجھے کبھی اس کا خیال تک نہ آئے یا پھر اسے مجھے دے دے۔ وہ نہیں ملے گی تو میں ساری زندگی اس کے لئے روتا رہا ہوں گا۔ وہ مل جائے گی تو تیرے علاوہ میں کسی کے لئے آنسو نہیں بہا سکتا۔ میرے آنسوؤں کو غواص ہونے دے۔

میں یہاں کھڑا تھا سے پاک عورتوں میں سے ایک کو مانگتا ہوں۔

میں امام ہاشم کو مانگتا ہوں۔

میں اپنی نسل کے لئے اس عورت کو مانگتا ہوں، جس نے آپ کے خلیفہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں کسی کو شریک نہیں کیا۔ جس نے ان کے لئے اپنی زندگی کی تمام آسائشوں کو چھوڑ دیا۔

اگر میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نیکی کی ہے، تو مجھے اس کے عوض امام ہاشم دے دے۔ تو چاہے تو یہ اب بھی ہو سکتا ہے۔ اب بھی ممکن ہے۔

مجھے اس آزمائش سے نکال دے۔ میری زندگی کو آسان کر دے۔

آٹھ سال سے میں جس تکلیف میں ہوں مجھے اس سے رہائی دے دے۔

سالار سکندر پر ایک بار پھر رحم کر، وہی جو تیری مہلت میں افضل ترین ہے۔

دور درجہ کے ہاں بلک رہا تھا اس جگہ پر جہاں اس نے خود کو خواب میں دیکھا تھا مگر اس بار اس کی پشت پر امام ہاشم نہیں تھی۔

بہت دیر تک وہاں گڑگڑانے کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ آسمان پر ستاروں کی روشنی اب بھی تھم تھم کر۔ خانہ کعبہ رو شیوں سے اب بھی بھرا ہوا تھا۔ لوگوں کا ہجوم رات کے اس پہر بھی اسی طرح تھا۔ خواب کی طرح خانہ کعبہ کا دروازہ بھی نہیں کھلا تھا۔ اس کے باوجود وہاں سے ہٹتے ہوئے سالار سکندر کو اپنے اندر سکون آتا محسوس ہوا تھا۔

وہ اس کیفیت سے باہر آ رہا تھا جس میں وہ پچھلے ایک ماہ سے تھا۔ ایک عجیب سا قرار تھا جو اس دعا کے بعد اسے ملا تھا اور وہ اسی قرار اور طمانیت کو لے کر بے ایک ہفتہ کے بعد پاکستان لوٹ آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”میں اگلے سال اپنی انجی ڈی کے لئے امریکہ جا رہا ہوں۔“

فرقان نے بے اختیار چونک کر سالار کو دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ سالار حیرانی سے مسکرایا۔

”کیا مطلب کا کیا مطلب؟ میں اپنی انجی ڈی کرنا چاہتا ہوں۔“

”یوں اچانک؟“

”اچانک تو نہیں۔ اپنی انجی ڈی کرنی تو چاہی مجھے۔ بہتر ہے ابھی کر لوں۔“ سالار اطمینان سے بتا رہا تھا۔ وہ دونوں فرقان کے گاؤں سے واپس آ رہے تھے۔ فرقان ڈرائیو کر رہا تھا جب سالار نے اچانک اسے اپنی انجی ڈی کے ارادے کے بارے میں بتایا۔

”میں نے چنک کو بتا دیا ہے، میں نے ریزائن کرنے کا سوچا ہے، لیکن وہ مجھے چھٹی دینا چاہ رہے ہیں۔ ابھی میں نے سوچا نہیں ہے کہ ان کی اس آفر کو قبول کر لوں یا پھر ریزائن کر دوں۔“

”تم ساری پانچ گھنٹے بیٹھے ہو۔“

”ہاں یار۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں واقعی اگلے سال پنی انٹرنیٹ ڈی کے لئے جا رہا ہوں۔“

”چند ماہ پہلے تک تو تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”ارادے کا کیا ہے، وہ تو ایک دن میں بن جاتا ہے۔“

سالار نے کندھے سے جھکتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے باہر نظر آنے والے کھیتوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ویسے بھی بیگانگ سے متعلق ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں مگر یہاں میں پچھلے کچھ سالوں میں اتنا

مصرف رہا ہوں کہ اس پر کام نہیں کر سکا۔ میں چاہتا ہوں پنی انٹرنیٹ ڈی کے دوران میں یہ کتاب لکھ کر شائع

ہو کر والوں۔ میرے پاس کچھ فرصت ہوگی تو میں یہ کام آسانی سے کر لوں گا۔“

فرقان کچھ دیر خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اس نے کہا۔

”اور اسکول۔۔۔ اس کا کیا ہو گا؟“

”اس کا کچھ نہیں ہو گا۔ یہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ اس کا انٹرا سٹرکچر بھی بہتر ہوتا جائے گا۔ پور ڈ آف

گو رنرز ہے، وہ لوگ آتے جاتے رہیں گے۔ تم ہو۔۔۔ میں نے پاپا سے بھی بات کی ہے وہ بھی آیا کریں

گے یہاں پر۔۔۔ میرے نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ یہ اسکول بہت پہلے سالار اسکندر کی

تھمائی ہوئی لائسنس چھوڑ چکا ہے۔ آئندہ بھی اسے ان کی ضرورت نہیں پڑے گی مگر میں عمل طور پر اس

سے قطع تعلق نہیں کر رہا ہوں۔ میں اس کو دیکھتا رہوں گا۔ کبھی میری مدد کی ضرورت پڑی تو آجایا کروں

گا۔ پہلے بھی تو ایسا ہی کیا کرتا تھا۔“

وہ اب تھرمس میں سے چائے کی پٹ ڈال رہا تھا۔

”پنی انٹرنیٹ ڈی کے بعد کیا کرو گے؟“ فرقان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”واپس آؤں گا۔ پہلے کی طرح سینئر پر کام کروں گا۔ ہمیشہ کے لئے نہیں جا رہا ہوں۔“

سالار نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے کو تھپکا۔

”کیا چند سال بعد نہیں جاسکتے تھم؟“

”نہیں، جو کام آج ہوتا چاہئے اسے آج ہی ہونا چاہئے۔ میرا موڈ ہے آگے بڑھنے کا۔ چند سال

بعد شاید خواہش نہ رہے۔“

سالار نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا وہ اب بائیں ہاتھ سے ریڈیو کو ٹیون کرنے میں

مصروف تھا۔

”روٹری (Rotary) کلب والے اگلے ویک اینڈ پر ایک فنکشن کر رہے ہیں۔ میرے پاس انویٹیشن

آیا ہے۔ چلو گے؟“

اس نے ریڈیو کو ٹیون کرتے ہوئے فرقان سے پوچھا۔

”کیوں نہیں چلوں گا۔ ان کے پروگرام دلچسپ ہوتے ہیں۔“

فرقان نے جواب دیا۔ ”گفتگو کا موضوع بدل چکا تھا۔“

☆ ☆ ☆

اس دن اتوار تھا۔ سالار صبح دیر سے اٹھا۔

اخبار لے کر سرخیوں پر نظر دوڑاتے ہوئے وہ کچن میں ناشتہ تیار کرتے لگا۔ اس نے صرف منہ

ہاتھ دھو لیا تھا۔ شیشو نہیں کی۔ نائٹ ڈریس کے اوپر ہی اس نے ایک ڈھلا ڈھالا سویٹر پہن لیا اس نے نیپٹی

میں چائے کا پانی ابھی رکھا ہی تھا جب ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ اخبار ہاتھ میں پکڑے کچن سے باہر آ

گیا۔ دروازہ کھولنے پر اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا جب اس نے سعیدہ لہاں کو وہاں کھڑا پایا۔ سالار نے

دروازہ کھول دیا۔

”السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟“

اپنی حیرت پر قابو پاوتے ہوئے اس نے کہا۔

”اللہ کا شکر ہے میں بالکل ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟“

انہوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ پھیرے۔

”میں بھی ٹھیک ہوں، آپ اندر آئیں۔“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک لگتے نہیں رہے ہو۔ کمزور ہو گئے ہو، چہرہ بھی کالا ہو رہا ہے۔“ انہوں نے اپنی ہینک کے

شیشوں کے پیچھے سے اس کے چہرے پر غور کیا۔

”تم کلا نہیں ہوا۔ میں نے شیشو نہیں کی۔“ سالار نے بے اختیار اپنی مسکراہٹ روکی۔ وہ ان

کے ساتھ چلا ہوا اندر آ گیا۔

”کو بھلا شیشو کیوں نہیں کی۔ اچھا ڈراما رکھنا چاہتے ہو۔۔۔ بہت اچھی بات ہے۔ نیلے کا کام ہے۔

بہت اچھا کر رہے ہو۔“

وہ صوف پر بیٹھے ہوئے بولیں۔

”جیسا لہاں! ڈراما بھی نہیں رکھ رہا ہوں۔۔۔ آج اتوار ہے۔ دیر سے اٹھا ہوں کچھ دیر پہلے ہی، اس

لئے شیشو نہیں کی۔“ وہ ان کی بات پر محظوظ ہوا۔

”دیر سے کیوں اٹھے ہو۔ جینا دیر سے نہ اٹھا کرو۔ صبح جلدی اٹھ کر فجر کی نماز پڑھا کرو۔۔۔

پھر سے پُر رونق آتی ہے۔ اسی لئے تو تمہارا چہرہ مرجھایا ہوا ہے۔ صبح نماز پڑھ کر بندہ قرآن پڑھے پھر میر

کو چلا جائے۔ صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔“
سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔

”میں نماز پڑھ کر سویا تھا۔ صرف اتوار والے دن ہی دیر تک سوتا ہوں۔ ورنہ روز صبح وہی کرتا ہوں جو آپ کہہ رہی ہیں۔“

وہ اس کی وضاحت پر بے حد خوش نظر آنے لگیں۔

”بہت اچھی بات ہے..... اسی لئے تو تمہارا چہرہ دیکھ رہا ہے۔ رونق نظر آرہی ہے۔“

انہوں نے اپنے بیان میں ایک بار پھر تبدیلی کی۔

”آپ کیالیں کی؟“

وہ اپنے چہرے پر کوئی تبصرہ نہیں سننا چاہتا تھا، اس لئے اس نے موضوع بدلا۔

”ہنٹا کر رہی گی؟“

”نہیں، میں ناشتا کر کے آئی ہوں۔ صبح تھکے سات بجے میں ناشتا کر لیتی ہوں۔ گیارہ ساڑھے

گیارہ تو میں دوپہر کا کھانا بھی کھا لیتی ہوں۔“

انہوں نے اپنے معمولات سے آگاہ کیا۔

”تو پھر دوپہر کا کھانا کھا لیں۔ ساڑھے دس تو ہو رہے ہیں۔“

”نہیں ابھی تو مجھے ہموک ہی نہیں ہے۔ تم میرے پاس آکر بیٹھو۔“

”میں آتا ہوں ابھی۔“

وہ ان کے انکار کے باوجود جگن میں آگیا۔

”پورے چھ گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم نے ایک بار بھی شکل نہیں دکھائی۔ حالانکہ وعدہ کیا تھا تم نے۔“

اسے جگن میں ان کی آواز سنائی دی۔

”میں بہت مصروف تھا ماں جی۔“

اس نے اپنے لئے چائے تیار کرتے ہوئے کہا۔

”لو ابھی بس کیا مصروفیت..... ارے بیٹے! مصروف وہ ہوتے ہیں، جن کے بیوی بیٹے ہوتے ہیں

نہ تم نے گھر بسایا، نہ تم گھر والوں کے ساتھ رہ رہے ہو..... پھر بھی کہتے ہو مصروف تھا.....“

وہ نو سٹر سے سلاکس نکالتے ہوئے ان کی بات پر مسکرایا۔

”اب بیٹو دیکھو، یہ تمہارے کرنے کے کام تو نہیں ہیں۔“

وہ اسے چائے کی لٹے لٹے دیکھ کر نکلتی سے بولیں۔

”میں تو کہتی ہوں یہ کام مرد کے کرنے والے ہی نہیں ہیں۔“
وہ کچھ کہے بغیر مسکراتے ہوئے میز پر برتن رکھنے لگا۔

”اب دیکھو بیوی ہوتی تو یہ کام بیوی کر رہی ہوتی۔ مرد اچھا لگتا ہی نہیں ایسے کام کرتے ہوئے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں جی! اگر اب مجھ پر ہے۔ اب بیوی نہیں ہے تو کیا کیا جاسکتا ہے۔“

سالار نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ انہیں اس کی بات پر ہنسا لگا۔

”یہ کیا بات ہوئی، کیا کیا جاسکتا ہے؟ ارے بیٹے! دنیا لڑکیوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہارے تو

اپنے ماں باپ بھی ہیں۔ ان سے کہو..... تمہارا رشتہ طے کریں۔ یا تم چاہو تو میں کوشش کروں۔“

سالار کو یک دم صورت حال کی حقیقی کا احساس ہونے لگا۔

”نہیں، نہیں اماں جی! آپ چائے پیئیں میں بہت خوش ہوں، اپنا زندگی سے..... جہاں تک گھر

کے کاموں کا تعلق ہے تو وہ تو ہمارے پیئر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کر لیا کرتے تھے۔“

”لو اب تم کہاں سے کہاں نکلتی گئے۔ میں تو تمہاری بات کر رہی ہوں۔“ وہ کچھ گڑبڑا گئیں۔

”آپ یہ ہنک لیں اور کیک بھی.....“

سالار نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ارے ہاں، جس کام کے لئے میں آئی ہوں وہ تو بھول ہی گئی۔“

”انہیں اچانک یاد آیا، اپنے ہاتھ میں پکڑا بڑا سایک انہوں نے کھول کر اندر کچھ تلاش کرنا

شروع کر دیا۔

”تمہاری بہن کی شادی طے ہو گئی ہے۔“

سالار کو چائے پیتے پیتے اختیار اچھو لگا۔

”میری بہن کی..... اماں جی! میری بہن کی شادی تو پانچ سال پہلے ہو گئی تھی۔“

اس نے کچھ ہکا بکا ہوتے ہوئے بتایا۔ وہ اچھی دیر میں اپنے بیک سے ایک کارڈ برآمد کر چکی تھیں۔

”ارے میں اپنی بیٹی کی بات کر رہی تھی۔ آمدنی، تمہاری بہن ہی ہوئی تھی۔“

انہوں نے اس کے بیٹے پر بڑے افسوس کے عالم میں اسے دیکھتے ہوئے کارڈ چھلایا۔

سالار کو بے اختیار ہنسی آئی کل تک وہ اس کی بیوی بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں اور اب

ایک دم بہن بنادیا، مگر اس کے باوجود سالار کو بے تابشا اطمینان محسوس ہوا۔ کم از کم اب اسے ان سے یا

ان کی بیٹی سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

بہت مسرور سا ہو کر اس نے کارڈ پکڑ لیا۔

”بہت مبارک ہو..... کب ہو رہی ہے شادی؟“ اس نے کارڈ کھولتے ہوئے کہا۔

کو چلا جائے۔ صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔“
سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔

”میں نماز پڑھ کر سویا تھا۔ صرف اتوار والے دن ہی دیر تک سوتا ہوں۔ ورنہ روزِ صبح ہی کرتا ہوں جو آپ کہہ رہی ہیں۔“

وہ اس کی وضاحت پر بے حد خوش نظر آنے لگیں۔

”بہت اچھی بات ہے..... اسی لئے تو تمہارا چہرہ چمک رہا ہے۔ روتی نظر آ رہی ہے۔“

انہوں نے اپنے بیان میں ایک بار پھر تبدیلی کی۔

”آپ کیالیں گی؟“

وہ اپنے چہرے پر کوئی تبصرہ نہیں سننا چاہتا تھا، اس لئے اس نے موضوع بدلا۔

”ناشتا کریں گی؟“

”نہیں، میں ناشتا کر کے آئی ہوں۔ صبح چھ سات بجے میں ناشتا کر لیتی ہوں۔ گیارہ ساڑھے

گیارہ تو میں دوپہر کا کھانا بھی کھا لیتی ہوں۔“

انہوں نے اپنے معمولات سے آگاہ کیا۔

”تو پھر دوپہر کا کھانا کھالیں۔ ساڑھے دس تو ہو رہے ہیں۔“

”نہیں ابھی تو مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔ تم میرے پاس آکر بیٹھو۔“

”میں آتا ہوں ابھی.....“

وہ ان کے انکار کے باوجود کچن میں آگیا۔

”پورے چھ ماہ سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم نے ایک بار بھی شکل نہیں دکھائی۔ حالانکہ وعدہ

کیا تھا تم نے۔“

اسے کچن میں ان کی آواز سنائی دی۔

”میں بہت مصروف تھا ماں جی۔“

اس نے اپنے لئے چائے تیار کرتے ہوئے کہا۔

”کو ایسی بھی ایک مصروفیت..... ارے بیٹے! مصروف وہ ہوتے ہیں، جن کے بیوی بچے ہوتے ہیں

نہ تم نے گھر بسایا نہ تم گھر والوں کے ساتھ رہ رہے ہو۔ پھر بھی کہتے ہو مصروف تھا.....“

وہ ٹوسٹر سے سلاکس نکالنے ہوئے ان کی بات پر مسکرایا۔

”اب سبنا دیکھو، یہ تمہارے کرنے کے کام تو نہیں ہیں۔“

وہ اسے چائے کی ٹرے لاتے دیکھ کر تنگی سے بولیں۔

”میں تو کہتی ہوں یہ کام مرد کے کرنے والے ہی نہیں ہیں۔“
وہ کچھ کہے بغیر مگر اسے ہوئے میز پر برتن رکھنے لگا۔

”اب دیکھو بیوی ہوتی تو یہ کام بیوی کی کر رہی ہوتی۔ مرد اچھا لگتا ہی نہیں ایسے کام کرتے ہوئے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں ماں جی! مگر اب مجھ پر ہے۔ اب بیوی نہیں ہے تو کیا کیا جاسکتا ہے۔“

سالار نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ انہیں اس کی بات پر جھکا لگا۔

”یہ کیا بات ہوئی، کیا کیا جاسکتا ہے؟ ارے بیٹے! دنیا بڑکیوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہارے تو

اپنے ماں باپ بھی ہیں۔ ان سے کہو..... تمہارا رشتہ طے کریں۔ یا تم چاہو تو میں کوشش کروں۔“

سالار کو یک دم صورتِ حال کی تنگی کا احساس ہونے لگا۔

”نہیں، نہیں! ماں جی! آپ چائے پیچیں میں بہت خوش ہوں، اپنی زندگی سے..... جہاں تک مگر

کے کاموں کا تعلق ہے تو وہ تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کر لیا کرتے تھے۔“

”لو اب تم کہاں سے کہاں بکھٹ گئے۔ میں تو تمہاری بات کر رہی ہوں۔“ وہ کچھ گڑبڑا لگیں۔

”آپ یہ نکتہ لیں اور ٹھیک بھی۔“

سالار نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ارے ہاں، جس کام کے لئے میں آئی ہوں وہ تو بھول ہی گئی۔“

”نہیں اچانک یاد آیا، اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا سائیکل انہوں نے کھول کر اندر کچھ تلاش کرنا

شروع کر دیا۔

”تمہاری بہن کی شادی طے ہو گئی ہے۔“

سالار کو چائے پیتے ہی اختیار اچھوٹا لگا۔

”میری بہن کی..... اماں جی! میری بہن کی شادی تو پانچ سال پہلے ہو گئی تھی۔“

اس نے کچھ ہکا بکا ہوتے ہوئے بتایا۔ وہ اتنی دیر میں اپنے بیک سے ایک کارڈ برآمد کر چکی تھیں۔

”ارے میں اپنی بیٹی کی بات کر رہی تھی۔ آمنہ کی، تمہاری بہن ہی ہوئی نا.....“

انہوں نے اس کے بیٹے پر بڑے افسوس کے عالم میں اسے دیکھتے ہوئے کارڈ تھمایا۔

سالار کو بے اختیار ہنسی آئی کل تک وہ اسے اس کی بیوی بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں اور اب

ایک دم بہن بنادیا، مگر اس کے باوجود سالار کو بے حاشا اطمینان محسوس ہوا۔ کم از کم اب اسے ان سے یا

ان کی بیٹی سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

بہت مسرور سا ہو کر اس نے کارڈ پکڑ لیا۔

”بہت مبارک ہو..... کب جو رہی ہے شادی؟“ اس نے کارڈ کھولتے ہوئے کہا۔

"اگلے بیٹے....."

"جیسے اماں جی! آپ کی فکر ختم ہو گئی۔"

سالار نے "میری" کے بجائے "آپ کی" کا لفظ استعمال کیا۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے، بہت اچھی جگہ رشتہ ہو گیا۔ میری ذمہ داری ختم ہو جائے گی پھر میں بھی اپنے بیٹوں کے پاس انگلیٹھ چلی جاؤں گی۔"

سالار نے کارڈ پر ایک سرسری سی نظر دوڑائی۔

"یہ کارڈ تمہیں دینے خاص طور پر آئی ہوں۔ اس بار کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ تمہیں شادی پر آنا ہے، بھائی بن کر رخصت کرنا ہے، بہن کو۔"

سالار نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے چائے کا کپ لیا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ضرور آؤں گا۔"

وہ کپ پیچھے رکھ کر سلاکس پر کہیں لگانے لگا۔

"یہ فرقان کا کارڈ بھی لے کر آئی ہوں میں۔ اس کو بھی دینے جاتا ہے۔"

انہیں اب فرقان کی یاد دہانی ملنے لگی۔

"فرقان کو تو آج بھابی کے ساتھ اپنے سرال جانا تھا۔ اب تک تو نکلیں چکا ہو گا۔ آپ مجھے دے دیں۔ میں اسے دے دوں گا۔" سالار نے کہا۔

"تم اگر بھول گئے تو؟" وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔

"میں نہیں بھولوں گا، اچھا میں فون پر اس سے آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔"

وہ یک دم خوش ہوئیں۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم فون پر اس سے میری بات کروادو۔"

سالار اُنھ کے فون اسی میز پر لے آیا۔ فرقان کا موبائل نمبر داخل کر کے اس نے اسمتیکر آن کر دیا اور خود ناشتہ کرنے لگا۔

"فرقان اسید واماں آئی ہیں میرے پاس۔"

فرقان کے کال ریسیور نے پر اس نے بتایا۔

"ان سے بات کرو۔"

وہ خاموش ہو گیا، اب فرقان اور سعید واماں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔

دس منٹ بعد جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو سالار ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ برتن کچن میں رکھتے ہوئے اسے

خیال آیا۔

"آئی کس کے ساتھ تھیں آپ؟" وہ باہر نکل آیا۔

"اپنے بیٹے کے ساتھ" سعید واماں نے اطمینان سے کہا۔

"اچھا، بیٹا آگیا آپ کا؟ چھوٹا والا یا بڑا والا؟"

سالار نے دلچسپی لی۔

"میں ساتھ والوں کے راشد کی بات کر رہی ہوں۔" سعید واماں نے بے اختیار برملا کیا۔

سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا سعید واماں کے لئے ہر لڑکا اپنا بیٹا اور ہر لڑکی اپنی بیٹی تھی۔ وہ بڑے آرام سے رشتے گزرتی تھیں۔

"تو وہ کہاں ہے؟" سالار نے پوچھا۔

"وہ چلا گیا۔ موٹر سائیکل پر آئی ہوں اس کے ساتھ، آندھی کی رفتار سے چلائی ہے اس نے۔ نو بجے بیٹھی ہوں، پورے ساڑھے دس بجے اوپر پہنچا دیا اس نے، میری ایک نہیں سنی اس نے۔ سارا راستہ۔۔۔ بار بار یہی کہتا رہا آجستہ چار بار ہوں۔ یہاں اتار دے وقت کہنے لگا آپ کے ساتھ موٹر سائیکل پر میرا آخری سفر تھا۔ وہ بارہ گئیں جانا ہوا تو پیدل لے کر جاؤں گا آپ کو۔۔۔"

سالار کو ہنسی آئی۔ آدھ گھنٹہ میں طے ہونے والے راستہ کو بڑھ گھنٹہ میں طے کرنے والے کی جھنجھلاہٹ کا وہ اندازہ کر سکتا تھا۔ یوں صوفوں کے ساتھ وقت گزارنا خاصا مشکل کام تھا۔ یہ وہ سعید واماں کے ساتھ ہونے والی پہلی ملاقات میں ہی جان گیا تھا۔

"تو وہاں کیسے جائیں گی۔ راشد بیٹے آئے گا آپ کو؟"

"ہاں اس نے کہا تو ہے کہ بیٹھ ختم ہونے کے بعد آپ کو لے جاؤں گا۔ اب دیکھو کب آتا ہے۔" وہ اسے ایک بار پھر اپنی بیٹی اور اس کے ہونے والے سرال کے بارے میں اطلاعات پہنچانے لگیں۔

وہ مسکراتے ہوئے بی بی فرمانہ داری سے سنتا رہا۔

اس قسم کی معلومات میں اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی مگر سعید واماں اب اس کے ساتھ بیٹنگ کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی باتیں رتی بھراس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں مگر وہ یوں ظاہر کرتا رہا جیسے وہ ہر بات سمجھ رہا ہے۔

دوپہر کا کھانا اس نے ان کے ساتھ کھایا۔ اس نے ان کے سامنے فریئر سے کچھ نکال کر گرم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک بار پھر شادی کے فائدہ اور ضرورت پر کچھ نہیں سنتا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ریسیورٹ فون کر کے لڑکا آڑ رو دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد کھانا آگیا۔

کھانے کے وقت تک راشد نہیں آیا تو سالار نے ان کی تشویش کو کم کرنے کے لئے کہا۔

"میں گاڑی پر چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔"

وہ فوراً ہٹا رہی تھیں۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے، اس طرح تم میرا گھر بھی دیکھ لو گے۔“

”اماں جی! میں آپ کا گھر جانتا ہوں۔“

سالار نے کار کی چابی تلاش کرتے ہوئے انہیں یاد دلایا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ اس گلی میں تھا جہاں سعیدہ اماں کا گھر تھا۔ دو گاڑی سے اتر کر انہیں اندر گلی میں

دروازے تک چھوڑ گیا۔ انہوں نے اسے اندر آنے کی دعوت دی، جسے اس نے شکر یہ کے ساتھ رد کر دیا۔

”آج نہیں..... آج بہت کام ہیں۔“

وہ اپنی بات کہہ کر کھینچا۔

”بچے! اسی لئے کہتی ہوں شادی کر لو۔ بیوی ہوگی تو خود سارے کام دیکھے گی۔ تم کہیں آ جا سکو

گے۔ اب یہ کوئی زندگی ہے کہ پھنسی کے دن بھی گھر کے کام لے کر بیٹھے رہو گے۔“ انہوں نے افسوس

بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب میں جاؤں؟“

اس نے کمال فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہاں ٹھیک ہے جاؤ، مگر یاد رکھنا شادی پر ضرور آنا۔ فرقان سے بھی ایک بار پھر کہہ دینا کہ وہ بھی

آئے اور اس کو کارڈ ضرور پہنچا دینا۔“

سالار نے ان کے دروازے پر گئی ہوئی ڈور بیل دوبارہ بجائی اور غدا حافظ کہتے ہوئے چلا۔

اپنے پیچھے اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ سعیدہ اماں اب اپنی بیٹی سے کچھ کہہ رہی تھیں۔

باب ۸

”پھر کیا ہوگا رام ہے، چلو گے؟“

فرقان نے اگلے دن شام کو اس سے کارڈ لینے ہوئے کہا۔

”نہیں، میں تو اس ویک اینڈ پر کر اپنی چار ہاؤس، آئی بی اے کے ایک سیمینار کے لئے۔ اتوار کو

میری دامہی ہوگی۔ میں تو آکر بس سوؤں گا۔“

nothing else۔ تم چلے جانا، میں لفافہ دے دوں گا، وہ تم میری طرف سے معذرت کرتے ہوئے

دے دیتا۔“ سالار نے کہا۔

”کتنے افسوس کی بات ہے سالار! وہ خود کارڈ دے کر گئی ہیں، اتنی محبت سے بلایا ہے۔“

فرقان نے کہا۔

”جانتا ہوں لیکن میں ادھر جا کر وقت ضائع نہیں کر سکتا۔“

"ہم بس تھوڑی دیر بیٹھیں گے پھر آجائیں گے۔"

"فرقان! امیری واپسی کنترم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے میں آؤں کہ آپ نہ سوں یا آؤں کہ رات کو آؤں۔"

"جے جے فضل آؤں ہو تم اودہ بڑی مایوس ہوں گی۔"

"کچھ نہیں ہوگا، میرے نہ ہونے سے ان کی بیٹی کی شادی تو نہیں رک جائے گی۔ ہو سکتا ہے انہیں پہلے ہی میرے نہ آنے کا اندازہ ہو اور ویسے بھی فرقان! تم اور میں کوئی اتنے اہم مہمان نہیں ہیں۔"

سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

"بہر حال میں اور میری بیوی تو جائیں گے۔ چاہے ہم کم اہم مہمان ہی کیوں نہ ہوں۔" فرقان نے ناراضی سے کہا۔

"میں نے کب روکا ہے۔ ضرور جاؤ، تمہیں جانا بھی چاہیے۔ سعیدہ اماں کے ساتھ تہناری مجھ سے زیادہ بے تکلفی اور دوستی ہے۔" سالار نے کہا۔

"مگر سعیدہ اماں کو میرے بچائے تمہارا زیادہ خیال رہتا ہے۔" فرقان نے جتایا۔

"وہ صورت ہوتی ہے۔" سالار نے اس کی بات کو شجیدگی کے لئے بغیر کہا۔

"جو بھی ہو تا ہے بہر حال تمہارا خیال تو ہوتا ہے انہیں۔ چلو اور کچھ نہیں تو ڈاکٹر سبطی کی مزیدہ سمجھ کر ہی تم ان کے ہاں چلے جاؤ۔" فرقان نے ایک اور حربہ آزمایا۔

"ڈاکٹر صاحب تو خود یہاں نہیں ہیں۔ وہ تو خود شادی میں شرکت نہیں کر رہے اور اگر وہ یہاں ہوتے بھی تو کم از کم مجھے تمہاری طرح مجبور نہیں کرتے۔"

"اچھا، میں بھی نہیں کرتا تمہیں مجبور۔ نہیں جانا چاہیے تو مت جاؤ۔"

فرقان نے کہا۔

سالار ایک بار پھر اپنے لپ ہاپ کے ساتھ مصروف ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک سرسبز و وسیع مہزار تھا جہاں دودو نوں موجود تھے۔ وسیع کھلے مہزار میں درخت تھے مگر زیادہ بلند نہیں۔ خوب صورت پھولدار جھاڑیاں تھیں، چاروں طرف خاموشی تھی۔ وہ دونوں کسی درخت کے سائے میں بیٹھے کے بجائے ایک پھولدار جھاڑی کے قریب کھلی دھوپ میں بیٹھے تھے۔ امامہ اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ہوئے بیٹھی تھی اور وہ گھاس پر چٹ لینا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ان دونوں کے جوتے کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے تھے۔ امامہ نے اس بار خوب صورت سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ امامہ اس سے کچھ کہتے ہوئے دور کسی چیز کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے لینے لینے اس کی چادر کے ایک پلو سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ یوں جیسے دھوپ کی

شعاعوں سے آنکھوں کو بچانا چاہتا ہو۔ اس کی چادر نے اسے عجیب سا سکون اور سرشاری دی تھی۔ امامہ نے چادر کے سرے کو اس کے چہرے سے ہٹانے یا کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔ دھوپ اس کے جسم کو تراوت بخش رہی تھی۔ آنکھیں بند کئے وہ اپنے چہرے پر موجود چادر کے کس کو محسوس کر رہا تھا۔ اس پر غنودگی جاری ہو رہی تھی۔ وہ نیندا سے اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔

سالار نے یک دم آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنے بیڈ پر چٹ لینا ہوا تھا۔ کسی چیز نے اس کی نیند کو توڑ دیا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے کچھ دیر بے چینی سے اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھتا رہا۔ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ ایک اور خواب۔ ایک اور الوٹن۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جب اس کو اس موبائل فون کی آواز نے متوجہ کیا، جو مسلسل اس کے سر ہانے بج رہا تھا۔ یہ فون ہی تھا جو اسے اس خواب سے باہر لے آیا تھا۔ قدرے جھنجھٹا ہوتے اس نے لینے لینے ہاتھ بڑھا کر اس نے موبائل اٹھایا۔ دوسری طرف فرقان تھا۔

"کہاں تھے سالار! کب سے فون کر رہا ہوں۔ انیڈ کیوں نہیں کر رہے تھے؟" فرقان نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

"میں سو رہا تھا۔" سالار نے کہا اور کھڑے پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظراب پہلی بار گھڑی پر پڑی جو چار بج رہی تھی۔

"تم فوراً سعیدہ اماں کے ہاں چلے آؤ۔" دوسری طرف سے فرقان نے کہا۔

"کیوں؟ میں نے تمہیں بتایا تھا، میں تو۔"

فرقان نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں جانتا ہوں، تم نے مجھے کیا بتایا تھا مگر یہاں کچھ ایجنسی ہو گئی ہے۔"

"کیسی ایجنسی؟" سالار کو تشویش ہوئی۔

"تم یہاں آؤ گے تو پتا چل جائے گا۔ تم فوراً یہاں پہنچو، میں فون بند کر رہا ہوں۔"

فرقان نے فون بند کر دیا۔

سالار کچھ پریشانی کے عالم میں فون کو دیکھتا رہا۔ فرقان کی آواز سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پریشان تھا مگر سعیدہ اماں کے ہاں پریشانی کی نوعیت کیا ہو سکتی تھی۔

پندرہ منٹ میں کپڑے تبدیل کرنے کے بعد گاڑی میں تھا۔ فرقان کی اگلی کال اس نے کار میں ریسیڈو کی تھی۔

"تم کچھ بتاؤ تو سہی، ہو کیا ہے؟ مجھے پریشان کر دیا ہے تم نے۔" سالار نے اس سے کہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تم اور عری آ رہے ہو۔ یہاں آؤ گے تو تمہیں پتا چل جائے"

گا۔ میں فون پر تھیں لی بات نہیں کر سکتا۔

فرقان نے ایک بار پھر فون بند کر دیا۔

تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے آدھ گھنٹہ کا سفر تقریباً پندرہ منٹ میں طے کیا تھا۔
فرقان اسے سعیدہ اماں کے گھر کے باہر ہی مل گیا۔ سالار کا خیال تھا کہ سعیدہ اماں کے ہاں اس وقت
بہت چہل چل پھیل ہو گی مگر ایسا نہیں تھا۔ وہاں دور دور تک کسی بات کے آثار نہیں تھے۔ فرقان کے
ساتھ وہ بیرونی دروازے کے بائیں طرف بیٹے ہوئے ایک پرانی طرز کے ڈرائنگ روم میں آگیا۔

”آخر ہو گیا ہے جو تمہیں مجھے اس طرح بلانا پڑ گیا۔“

سالار اب اُلجھ رہا تھا۔

”سعیدہ اماں اور ان کی بیٹی کے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ فرقان نے اس کے سامنے والے
صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔
”کیسا مسئلہ؟“

”جس لڑکے سے ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی اس لڑکے نے کہیں اور اپنی مرضی سے شادی کر
لی ہے۔“

”مائی گڈ نیس۔“ سالار کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ان لوگوں نے ابھی کچھ دیر پہلے سعیدہ اماں کو یہ سب فون پر بتا کر ان سے معذرت کی ہے۔ وہ
لوگ اب بارات نہیں لا رہے۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے ان لوگوں کے ہاں گیا ہوا تھا، مگر وہ لوگ واقعی
مجبور ہیں۔ انہیں اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے، اس لڑکے نے بھی انہیں
صرف فون پر ہی اس کی اطلاع دی ہے۔“ فرقان تفصیل بتاتا نکلا۔

”اگر وہ لڑکا شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو اسے بہت پہلے ہی ماں باپ کو صاف صاف بتا دینا چاہئے
تھا۔ بھابھ کی شادی کر لینے کی بہت سخی تو ماں باپ کو پہلے اس شادی سے انکار کر دینے کی بھی بہت ہوتی
چاہئے تھی۔“ سالار نے ناپسندیدگی سے کہا۔

”سعیدہ اماں کے بیٹوں کو اس وقت یہاں ہونا چاہئے تھا، وہ اس معاملے کو چنل کر سکتے تھے۔“

”لیکن اب وہ نہیں ہیں تو کسی نہ کسی کو تو سب کچھ دیکھنا ہے۔“

”سعیدہ اماں کے کوئی اور قریبی رشتہ دار نہیں ہیں؟“ سالار نے پوچھا۔

”میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر سبط علی صاحب سے بات کی ہے فون پر۔“ فرقان نے اسے بتایا۔

”لیکن ڈاکٹر صاحب بھی فوری طور پر تو کچھ نہیں کر سکیں گے۔ یہاں ہوتے تو اور بات تھی۔“

سالار نے کہا۔

”انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہاری فون پر ان سے بات کرواؤں۔“ فرقان کی آواز اس
بار کچھ دھیمی تھی۔

”میری بات..... لیکن کس لئے؟“ سالار کچھ حیران ہوا۔

”ان کا خیال ہے کہ اس وقت تم سعیدہ اماں کی مدد کر سکتے ہو۔“

”میں؟“ سالار نے چونک کر کہا۔ ”میں کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟“

”آمنہ سے شادی کر کے۔“

سالار دم بخود نکلیں چھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

”تمہارا دامغ تو ٹھیک ہے؟“ اس نے بمشکل فرقان سے کہا۔

”ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔“ سالار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”پھر تمہیں پتا نہیں ہے کہ تم کیا کیا رہے ہو۔“

وہ ایک جھٹکتے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فرقان برق رفتاری سے اٹھ کر اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔

”کیا سوچ کر تم نے یہ بات کہی ہے۔“ سالار اپنی آواز پر قابو نہیں رکھ سکا۔

”میں نے یہ سب تم سے ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر کہا ہے۔“ سالار کے چہرے پر ایک رنگ آنے لگا۔

گز رہ گیا۔

”تم نے انہیں میرا نام کیوں دیا؟“

”میں نے نہیں دیا، سالار! انہوں نے خود تمہارا نام لیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم

سے درخواست کروں کہ میں اس وقت سعیدہ اماں کی بیٹی سے شادی کر کے اس کی مدد کروں۔“

کسی نے سالار کے بیروں کے نیچے سے زمین کھینچی تھی یا سر سے آسمان، اسے اندازہ نہیں ہوا۔ وہ

پلٹ کر وہاں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”میں شادی شدہ ہوں فرقان! تم نے انہیں بتایا۔“

”ہاں، میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ تم نے کئی سال پہلے ایک لڑکی سے نکاح کیا تھا، مگر پھر وہ لڑکی

وہاں نہیں رہی۔“

”پھر؟“

”وہ اس کے باوجود وہی چاہتے ہیں کہ تم آمنہ سے شادی کر لو۔“

”فرقان..... میں..... وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔“

”اور اماں..... اس کا کیا ہو گا؟“

”تمہاری زندگی میں اماں کہیں نہیں ہے۔ اتنے سالوں میں کون جانتا ہے، وہ کہاں ہے۔ ہے بھی

کہ نہیں۔

”فرقان۔۔۔ سالار نے ترشی سے اس کی بات کاٹی۔“ اس بات کو رہنے دو کہ وہ ہے یا نہیں۔

مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اگر کل امامہ آجانی ہے تو۔۔۔ کیا ہو گا؟“

”تم یہ بات ڈاکٹر صاحب سے کہو۔“ فرقان نے کہا۔

”نہیں، تم یہ سب کچھ سعید و لہاں کو بتاؤ، آمد کو بتاؤ، ضروری تو نہیں ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کو قبول کر لے جس کی پہلے سے ہی ایک قوی ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ پھر اسی لڑکے کو قبول کر لیتی جس نے کہیں اور شادی کر لی ہے۔“

”وہ اگر بات لے کر آجاتا تو شاید یہ بھی ہو جاتا۔ مسئلہ تو یہی ہے کہ وہ آمد سے دوسری شادی پر بھی تیار نہیں ہے۔“

”اسے ڈھونڈنا جاسکتا ہے۔“

”ہاں، ڈھونڈنا جاسکتا ہے لیکن یہ کام اس وقت نہیں ہو سکتا۔“

”ڈاکٹر صاحب نے آمد کے لئے غلط انتخاب کیا ہے۔ میں۔۔۔ میں آمد کو کیا دے سکتا ہوں۔

میں تو اس آدمی سے بھی بدتر ہوں جو ابھی اسے چھوڑ گیا ہے۔“

سالار نے بے چارگی سے کہا۔

”سالار! نہیں اس وقت کسی کی ضرورت ہے، ضرورت کے وقت صرف وہی آدمی سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے، جو سب سے زیادہ قابل اعتبار ہو۔ تم زندگی میں اتنے بہت سے لوگوں کی مدد کرتے آ رہے ہو، کیا ڈاکٹر سبطا علی صاحب کی مدد نہیں کر سکتے۔“

”میں نے لوگوں کی پیسے سے مدد کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مجھ سے بڑے نہیں مانگ رہے۔“

اس سے پہلے کہ فرقان کچھ کہتا اس کے موبائل پر کال آنے لگی تھی۔ اس نے نمبر دیکھ کر موبائل سالار کی طرف بڑھادیا۔

”ڈاکٹر صاحب کی کال آ رہی ہے۔“

سالار نے تے تے ہوئے چہرے کے ساتھ موبائل پکڑ لیا۔

وہاں بیٹھے موبائل کان سے لگائے سالار کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ زندگی میں ہر بات، ہر شخص سے نہیں کہی جاسکتی۔ وہ جو کچھ فرقان سے کہہ سکتا تھا وہ ان سے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں دلائل دے سکتا تھا، نہ بھانے سکتا تھا۔ انہوں نے مخصوص نرم لہجہ میں اس سے درخواست کی تھی۔

”اگر آپ اپنے والدین سے اجازت لے سکیں تو آمد سے شادی کر لیں۔ وہ میری بیٹی جیسی ہے۔ آپ سمجھیں میں اپنی بیٹی کے لئے آپ سے درخواست کر رہا ہوں، آپ کو تکلیف دے رہا ہوں لیکن میں

ایسا کرنے کے لئے مجبور ہوں۔“

”آپ جیسا چاہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔“

اس نے دم آواز میں ان سے کہا۔

”آپ مجھ سے درخواست نہ کریں، آپ مجھے علم دیں۔“ اس نے خود کو کہتے پایا تھا۔

فرقان تقریباً دس منٹ کے بعد اندر آیا۔ سالار موبائل فون ہاتھ میں پکڑے گم صم فرش پر نظریں پٹائے ہوئے تھا۔

”ڈاکٹر صاحب سے بات ہو گئی تھی؟“

فرقان نے اس کے بالقابل ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے دم آواز میں اس سے پوچھا۔

سالار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر کچھ لمبے سینئر فیمل پر اس کا موبائل رکھ دیا۔

”میں رخصتی ابھی نہیں کرواؤں گا۔ بس نکاح کافی ہے۔“

اس نے چند لمحوں بعد کہا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ فرقان کو بے اختیار اس پر

تس آیا۔ وہ مقدر کا ”شکار“ ہونے والا پہلا انسان نہیں تھا۔

☆☆☆☆

سڑک پر گہما گہمی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ رات بہت تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ گہری دھند ایک بار پھر ہر چیز کو اپنے حصار میں لے رہی تھی۔

سڑک پر چلنے والی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی دھند کو چیرتے ہوئے اس ہالکونی کی تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی جہاں منڈیر کے پاس ایک اسٹول پر سالار بیٹھا ہوا تھا۔ منڈیر پر اس کے سامنے کافی کا ایک گگ بڑا ہوا تھا، جس میں سے اٹھنے والی گرم بھاپ دھند کے پس منظر میں عجیب سی شکلیں بنانے میں مصروف تھی اور وہ۔۔۔ وہ سینے پر دونوں ہاتھ پٹے تک یک جیسے سسٹان سڑک کو دیکھ رہا تھا جو دھند کے اس غلاف میں بہت جرب نظر آ رہی تھی۔

رات کے دس بج رہے تھے اور وہ چند منٹ پہلے ہی گھر پہنچا تھا۔ سعید و لہاں کے گھر نکاح کے بعد وہ وہاں لگا نہیں تھا۔ اسے وہاں عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی لے کر بے مقصد شام سے رات گئے تک سڑکوں پر بھر تارہا۔ اس کا موبائل آف تھا۔ وہ بیر ونی دیا سے اس وقت کوئی رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ موبائل آن ہوتا تو فرقان اس سے رابطہ کرتا۔ بہت سی وضائیں دینے کی کوشش کرتا یا ڈاکٹر سبطا علی رابطہ کرتے۔ اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے۔

وہ یہ دونوں چیزیں نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس وقت مکمل خاموشی چاہتا تھا۔ اُغٹھی ہوئی بھاپ کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر چند گھنٹے پہلے کے واقعات کے بارے میں سوچا۔ سب کچھ ایک خواب کی طرح

لگ رہا تھا۔ کاش خواب ہی ہوتا۔ اسے وہاں بیٹھنے کی ماہ پہلے حرم پاک میں مانگی جانے والی دعا یاد آئی۔
 ”تو کیا اسے میری زندگی سے نکال دینے کا فیصلہ ہوا ہے؟“ اس نے تکلیف سے سوچا۔
 ”تو پھر یہ اذیت بھی تو ستم ہونی چاہئے۔ میں نے اس اذیت سے رہائی بھی تو مانگی تھی۔ میں نے اس کی یادوں سے فرار بھی تو چاہا تھا۔“ اس نے مندر پر پرکھا گرم کافی کا کپ اپنے سر دھاتوں میں حمام لیا۔
 تو امام باہم بالا خر تم میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکل گئیں۔
 اس نے کافی کی کٹنی اپنے اندر راتاری۔

”اور اب کیا میں بچھڑتاؤں کہ کاش میں کبھی سعید والماں کو اس سڑک پر نہ دیکھتا یا میں ان کو لٹ نہ دیتا۔ ان کا گھر مل جاتا اور میں انہیں وہاں ڈراپ کر کے آجاتا، ان کو اپنے گھر نہ لاتا، نہ راولپاڑہ بھرتے، نہ وہ اس شادی پر مجھے بلاتیں یا پھر کاش میں آج کراچی میں ہی نہ ہوتا۔ یہاں ہوتا ہی نہیں یا میں موبائل آف کر کے سوتا۔ فون کارڈ سیور رکھ دیتا۔ فرکان کی کال ریسیور نہ کر تا یا پھر کاش میں ڈاکٹر سیٹھ علی کو نہ جانتا ہوتا کہ ان کے کہنے پر مجھے مجبور نہیں ہونا پڑتا یا پھر شاید مجھے یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ امام میرے لئے نہیں ہے۔“ اس نے کافی کا کھم دوبارہ مندر پر رکھ دیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے، پھر جیسے کوئی خیال آنے پر اپنا والٹ نکال لیا۔ والٹ کی ایک جیب سے اس نے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر کھول لیا۔
 ڈیر اکل سکندر!

مجھے آپ کے بیٹے کی موت پر بہت افسوس ہوا۔ چند سال پہلے میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے سالار کو کچھ رقم ادا کرنی تھی وہ اب میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔

فدا حافظ

امام باہم

اس نے نو ماہ میں کتنی بار اس کاغذ کو پڑھا تھا اسے یاد نہیں تھا۔ اس کاغذ کو چھوٹے ہوئے اسے اس کاغذ میں امام کا لمس محسوس ہوتا۔ اس کے ہاتھ سے لکھا ہوا اپنا نام..... کاغذ پر تحریر ان چند جملوں میں اس کے لئے کوئی اپنائیت نہیں تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ امام کو اس کی موت کی خبر پر بھی کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ خبر اس کے لئے دھاتی سال بعد رہائی کا پیغام بن کر آئی تھی۔ اسے کیسے افسوس ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ چند پہلے اس کے لئے بہت اہم ہو گئے تھے۔

اس نے کاغذ پر لکھے جملوں پر اپنی انگلیاں پھیریں۔ اس نے آخر میں لکھے امام باہم کے نام کو چھوا..... پھر کاغذ کو دوبارہ اسی طرح تکرار کے والٹ میں رکھ لیا۔

مند پر رہ کافی کا کھم سرد ہو چکا تھا۔ سالار نے ٹھنڈی کافی کے باقی کھم کو ایک گھونٹ میں اپنے اندر اُنٹل لیا۔

ڈاکٹر سیٹھ علی ایک ہفتے تک لندن سے واپس پاکستان پہنچ رہے تھے اور اسے ان کا انتظار تھا۔ امام باہم کے بارے میں جو کچھ وہ اتنے سالوں سے انہیں نہیں بتا سکا تھا وہ انہیں اب بتانا چاہتا تھا۔ اپنے ماضی کے بارے میں جو کچھ وہ انہیں نہیں بتایا تھا اب وہ ان سے کہہ دینا چاہتا تھا۔ اسے اب پروا نہیں تھی۔ وہ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے۔

☆.....☆.....☆

رمضان کی چار تاریخ تھی، جب ڈاکٹر سیٹھ علی واپس آگئے تھے۔ دو رات کو کافی دیر سے آئے تھے اور سالار نے اس وقت انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ رات کو ان کے پاس پہلے کی طرح جانا چاہتا تھا مگر وہ پہر کو خلاف توقع بینک میں ان کا فون آگیا۔ سالار کے کالج کے بعد یہ ان کا سالار کے ساتھ تیسرا رابطہ تھا۔ وہ کچھ دیر اس کا حال احوال دریافت کرتے رہے اور پھر انہوں نے اس سے کہا۔
 ”سالار آپ آج رات کو نہ آئیں، شام کو آجائیں۔ افطار ہی میرے ساتھ کریں۔“

”ٹھیک ہے، میں آجاؤں گا۔“ سالار نے عالمی بھرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر ان کے درمیان مزید گفتگو ہوتی رہی پھر ڈاکٹر سیٹھ علی نے فون بند کر دیا۔

وہ اس دن بینک سے کچھ جلدی نکل آیا۔ اپنے فلیٹ پر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ جب ان کے ہاں پہنچا اس وقت افطار ہی میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔

ڈاکٹر سیٹھ علی کا ملازم اسے اجازت والے پیر دی کرے کے بجائے سیدھا اندر لاؤنج میں لے آیا تھا۔ ڈاکٹر سیٹھ علی نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس سے گفتگو ہونے کے بعد بڑی محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑا۔

”پہلے آپ ایک دوست کی حیثیت سے یہاں آتے تھے، آج آپ گھر کا ایک فرد بن کر یہاں آئے ہیں۔“

وہ جانتا تھا ان کا اشارہ کس طرف تھا۔

”آئیے بیٹھے۔“ وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود دوسرے صوف پر بیٹھ گئے۔

”بہت مبارک ہو۔ اب تو آپ بھی گھر والے ہو گئے ہیں۔“

سالار نے خاموش نظروں اور چمکی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

”میں بہت خوش ہوں کہ آپ کی شادی آمنہ سے ہوئی ہے۔ وہ میرے لئے میری چوتھی بیٹی کی طرح ہے اور اس رشتے سے آپ بھی میرے داماد ہیں۔“

سالار نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی زندگی میں امام باہم کا پند لکھا ہوا ہوتا تو شاید ان کے منہ سے یہ جملہ نہ گزرتا کہ وہ اپنے آپ پر فخر کرتا مگر سالار فرق امام باہم تھی۔ سالار فرق وہی ایک لڑکی پیدا کر رہی تھی جو جی اور نہیں تھی۔

ڈاکٹر سید علی کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

”آپ اتنے سالوں سے میرے پاس آ رہے ہیں آپ نے کبھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ آپ نکاح کر چکے ہیں۔ تب بھی نہیں جب ایک دو بار آپ سے شادی کا ذکر ہوا۔“

سالار نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”میں آپ کو بتانا چاہتا تھا مگر.....“ وہ بات کرتے کرتے چپ ہو گیا۔

”سب کچھ اتنا عجیب تھا کہ میں آپ کو کیا بتاتا۔“ اس نے دل میں کہا ”کب ہوا تھا آپ کا نکاح؟“

ڈاکٹر سید علی دھتکے لچکے میں پوچھ رہے تھے۔ ”سازمے آٹھ سال پہلے۔ تب میں انیس سال کا تھا۔“ اس نے کسی شکست خوردہ معمول کی طرح کہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ انہیں سب کچھ بتاتا گیا۔ ڈاکٹر سید علی نے اسے ایک بار بھی نہیں ٹوکا تھا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک وہ چپ رہے تھے۔

بہت دیر بعد انہوں نے اس سے کہا تھا۔

”آمنہ بہت اچھی لڑکی ہے اور وہ خوش قسمت ہے کہ اسے ایک صالح مرد ملا ہے۔“

ان کی بات سالار کو ایک چابک کی طرح لگی۔

”صالح؟ میں صالح مرد نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب! میں تو..... اصل السافٹین ہوں۔ آپ مجھے جانتے ہوئے تو میرے لئے کبھی یہ لفظ استعمال کرتے نہ اس لڑکی کے لئے میرا انتخاب کرتے جسے آپ اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔“

”ہم سب اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ”زمانہ جاہلیت“ سے ضرور گزرتے ہیں، بعض گزر جاتے ہیں، بعض ساری زندگی اسی زمانے میں گزرا دیتے ہیں۔ آپ اس میں سے گزر چکے ہیں۔ آپ کا بچپن اتنا ہلکا ہے کہ آپ گزر چکے ہیں۔ میں آپ کو بچپن سے روکوں گا تو یہ اور اماع، آپ پر فرض ہے کہ آپ اپنی ساری زندگی یہ کریں، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ شعر بھی ادا کریں کہ آپ نفس کی تمام بناریوں سے چھٹکارا پا چکے ہیں۔

اگر دنیا آپ کو اپنی طرف نہیں کھینچتی اگر اللہ کے خوف سے آپ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں، اگر وہ زخ کا قصور آپ کو ڈراتا ہے، اگر آپ اللہ کی عبادت اس طرح کرتے ہیں، جس طرح کرنی چاہتے، مگر کبھی آپ کو اپنی طرف راغب کرتی ہے اور برائی سے آپ ڈک جاتے ہیں تو پھر آپ صالح ہیں۔ کچھ صالح ہوتے ہیں، کچھ صالح بننے جیتے، صالح ہونا خوش قسمتی کی بات ہے، صالح بننا دردناک و عساری

نکوار پر چلتے کے برابر ہے۔ اس میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ اس میں زیادہ تکلیف سہی پڑتی ہے۔ میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ آپ صالح ہیں کیونکہ آپ صالح بنے ہیں، اللہ آپ سے بڑے کام لے گا۔“

سالار کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ انہوں نے ایک بار پھر امام باہم کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا، کچھ نہیں کہا تھا۔ کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی سے نکل گئی؟ کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ آئندہ بھی کبھی اس کی زندگی میں نہیں آئے گی؟ اپنی زندگی آمنہ کے ساتھ ہی گزاری تھی۔ اس کی؟ اس کا دل ڈوبا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے امامہ کے حوالے سے کوئی تہلی، کوئی دلاسا، کوئی امید چاہتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب خاموش تھے۔ وہ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

”میں آپ کے اور آمنہ کے لئے بہت دعا کروں گا بلکہ میں بہت دعا کر کے آیا ہوں خانہ کعبہ میں.....“ وہ رفیع رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ ”وہ لندن سے واپسی پر عمرہ کر کے آئے تھے۔ سالار نے سر جھکا لیا۔ دور اوائی کی آواز آ رہی تھی۔ ملازم افطار کے لئے میز تیار کر رہا تھا۔ اس نے جو میل دل کے ساتھ ڈاکٹر سید علی کے ساتھ بیٹھ کر روزہ افطار کیا پھر وہ اور ڈاکٹر سید علی نماز پڑھنے کے لئے قرعہ مسجد میں چلے گئے۔ وہاں سے واپسی پر اس نے ڈاکٹر سید علی کے پاس کھانا کھایا اور پھر اپنے فلیٹ پر واپس آ گیا۔

☆.....☆.....☆

”نکل میرے ساتھ سعید و اماں کے ہاں ٹھہر سکتے ہو؟“

اس نے ڈاکٹر سید علی کے گھر سے واپسی کے بعد سو بجے کے قریب فرقان کو فون کیا۔ فرقان ہاسٹل میں تھا۔ اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔

”ہاں، کیون نہیں۔ کوئی خاص کام ہے؟“

”میں آمنہ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

فرقان کچھ دیر بول نہیں سکا۔ سالار کا کالج بہت ہموار تھا۔ وہاں کسی تہلی کے کوئی آ جا رہا نہیں تھے۔

”کیسی باتیں؟“

”کوئی تشویش بات یا کچھ نہیں ہے۔“ سالار نے جیسے اسے تہلی دی۔

”پھر بھی۔“ فرقان نے اصرار کیا۔

”تم پھر امامہ کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟“

”تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ چلو گے؟“

سالار نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

”ہاں، چلوں گا۔“

"تو پھر میں تمہیں کل ہی بتاؤں گا کہ مجھے اس سے کیا بات کرنی ہے۔"
اس سے پہلے کہ فرقان کچھ کہتا، فون بند ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

"تم اس سے امام کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟" فرقان نے گاڑی ڈرائی کرتے ہوئے سالار سے پوچھا۔

"نہیں، صرف امام کے بارے میں نہیں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو میں کرنا چاہتا ہوں۔"
"فارگاہ سیک سالار اگڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش مت کرو۔" فرقان نے ناراضی سے کہا۔
"اس کو میری ترجیحات اور مقاصد کا پتہ ہونا چاہیے۔ اب اسے ساری زندگی گزارنی ہے میرے ساتھ۔"

سالار نے اس کی ناراضی کی پروا کئے بغیر کہا۔

"پتا چل جائے گا، سمجھ دار لڑکی ہے وہ اور اگر کچھ بتانا ہی ہے تو گھر لاکر بتانا، وہاں پینڈورا پکس کھول کر مت بیٹھنا۔"

"گھر لاکر بتانے کا کیا فائدہ، جب اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں وہ میری باتوں کو سنے، سمجھے، سوچے اور پھر کوئی فیصلہ کرے۔"

"اب کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی وہ۔ تمہارا اور اس کا نکاح ہو چکا ہے۔"
"رخصتی تو نہیں ہوئی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیوں نہیں پڑتا۔ اگر اس کو میری بات پر اعتراض ہو تو وہ اس رشتے کے بارے میں نظر ثانی کر سکتی ہے۔" سالار نے سنجیدگی سے کہا۔

فرقان نے جپتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اور اس نظر ثانی کے لئے تم کس طرح کے حقائق اور دلائل پیش کرنے والے ہو اس کے سامنے؟"
"میں اسے صرف چند باتیں بتانا چاہتا ہوں جس کا جانتا اس کے لئے ضروری ہے۔" سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"وہ ڈاکٹر سید علی کی رشتہ دار ہے، میں اس حوالے سے اس کی بہت عزت کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے نہیں کہا ہوتا تو یہ رشتہ قائم بھی نہیں ہوتا لیکن میں۔"

فرقان نے اس کی بات کا ٹھٹھا دیا۔

"ٹھیک ہے، تم کو اس سے جو کہتا ہے، کہہ لینا لیکن امام کے ذکر کو ذرا کم ہی رکھنا کیونکہ اگر وہ کسی

بات سے ہرٹ ہوئی تو وہ یہی بات ہوگی، باقی چیزوں کی پروا وہ شاید نہ کرے۔ آخر آل۔ دوسری بیوی ہونا یا کھانا آسان نہیں ہوتا۔"

فرقان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اور میں چاہتا ہوں، وہ یہ بات محسوس کرے، سوچے، اس کے بارے میں..... ابھی تو کچھ بھی نہیں بگڑا۔ تم کہتے ہو، وہ خوب صورت ہے، پڑھنی لکھنی ہے، اچھی ٹیپلی سے تعلق ہے اس کا۔"

فرقان نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"ختم کرو اس موضوع کو سالار! تم کو اس سے جو کہتا ہے اسے جو سمجھاتا ہے جا کر کہہ لینا۔"

"میں اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" سالار نے کہا۔

"میں سعید و اماں سے کہہ دوں گا۔ وہ تمہیں اکیلے میں اس سے بات کروادیں گی۔"

فرقان نے اس کی بات پر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ آدھ گھنٹہ میں سعید و اماں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ دروازہ سعید و اماں نے ہی کھولا تھا اور سالار اور فرقان کو دیکھ کر وہ جیسے خوشی سے بے حال ہو گئی تھیں۔ وہ ان دونوں کو اسی بیٹھک نما کمرے میں لے گئیں۔

"سعید و اماں! سالار، آمنہ سے تمہاری میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

فرقان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ سعید و اماں کچھ انجھیں۔

"کیسی باتیں؟" وہ اب سالار کی طرف دیکھ رہی تھیں جو خود بھی بیٹھنے کے بجائے فرقان کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔

"جس چند باتیں، جو وہ اس سے کرنا چاہتا ہے مگر پریشانی والی کوئی بات نہیں۔" فرقان نے انہیں تسلی دی۔

سعید و اماں ایک بار پھر سالار کو دیکھنے لگیں۔ اس نے نظریں چرائیں۔

"اچھا..... پھر تم میرے ساتھ آ جاؤ بیٹا! آمنہ اندر ہے۔ ادھر آ کر اس سے مل لو۔"

سعید و اماں کہتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئیں۔ سالار نے ایک نظر فرقان کو دیکھا پھر وہ خود بھی سعید و اماں کے پیچھے چلا گیا۔

بیٹھک حیر دہنی دروازے کے بائیں جانب تھی۔ دائیں جانب ادھر جانے والی میز حیاں تھیں۔ حیر دہنی دروازے سے کچھ آگے بائیں سامنے کچھ میز حیاں چڑھنے کے بعد گزری کا ایک اور پرانی طرز کا بہت بڑا دروازہ تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا اور وہاں سرخ اینٹوں کا بڑا وسیع صحن نظر آرہا تھا۔

سعید و اماں کا رخ ان ہی میز حیوں کی طرف تھا۔ سالار ان سے کچھ فاصلے پر تھا۔ سعید و اماں اب

سڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ وہ جب سڑھیاں چڑھ کر صحن میں داخل ہو گئیں تو سالار بھی کچھ جھجکا ہوا سڑھیاں چڑھنے لگا۔

وسیع سرخ اینٹوں کے صحن کے اطراف دیواروں کے ساتھ کھاریاں بنائی تھیں جن میں گے ہوئے بھڑپوے اور نیلیں سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی دیواروں کے بیک گراؤڈ میں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ صحن کے ایک حصے میں دھوپ تھی اور دن کے اس حصے میں بھی وہ دھوپ بے حد تیز تھی۔ دھوپ نے سرخ رنگ کو کچھ اور نمایاں کر دیا تھا۔

آہستہ آہستہ سڑھیاں چڑھ کر سالار نے صحن میں قدم رکھ دیا اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ صحن کے دھوپ والے حصے میں رکھی چارپائی کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ شاید ابھی چارپائی سے اترتی تھی۔ اس کی پشت سالار کی طرف تھی۔ وہ سفید کرتے اور سیاہ شلوار میں ملبوس تھی اور نہہر نکلتی تھی۔ اس کی کمر سے کچھ اوپر اس کے سیاہ سیلے بال لوں کی صورت میں اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا سفید وہ چھپ چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے کرتے کی آستینوں کو کھینچ کر تنک فولد کرتے ہوئے سالار کی طرف مڑی تھی۔

سالار سانس نہیں لے سکا۔ اس نے اندر کی اس میں سے زیادہ خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی یا پھر اسے اس لڑکی سے زیادہ خوب صورت کوئی نہیں لگا تھا۔ وہ یقیناً آمد تھی۔ اس گھر میں آمد کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ وہ اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ کسی نے اس کے دل کو ٹھٹھی میں لپیٹا تھا۔ دھڑکن لڑکی تھی یا وہاں وہ جان نہیں سکا۔

اس کے اور آمد کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ آستین موڑتے ہوئے آمد کی پہلی نظر سعید واماں پر پڑی۔

”سالار بیٹا آیا ہے۔“

سعید واماں بہت آگے بڑھ آئی تھیں۔ آمد نے گردن کو ترچھا کرتے ہوئے صحن کے دروازے کی طرف دیکھا۔ سالار نے اسے بھی ٹھٹکتے دیکھا، پھر وہ مڑی۔ اس کی پشت ایک بار پھر سالار کی طرف تھی۔ سالار نے اسے جھٹکتے اور چارپائی سے دوپٹہ اٹھاتے دیکھا۔ دوپٹے کو سینے پر پھیلاتے ہوئے اس نے اس کے ایک پیو کے ساتھ اپنے سر اور پشت کو بھی ڈھاپ لیا تھا۔

سالار اب اس کی پشت پر بکھرے بال نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اسے آمد کے اطمینان نے حیران کیا تھا۔ وہاں کوئی گھبراہٹ، کوئی جلدی، کوئی گرجائی نہیں تھی۔

سعید واماں نے مڑ کر سالار کو دیکھا پھر اسے دروازے میں ہی کھڑے دیکھ کر انہوں نے کہا۔

”اوسے بیٹا وہاں کیوں کھڑے ہو، اندر آؤ۔ تھمارا ہانسی گھر ہے۔“

آمد نے دوپٹہ اوڑھنے کے بعد مڑ کر اسے ایک بار پھر دیکھا تھا۔ وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بلکیں جھپکائے بغیر وہ بخود بے حس و حرکت۔

آمد کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ وہ اب آگے آگیا تھا۔

”یہ آمد ہے، میری بیٹی۔“ سعید واماں نے اس کے قریب آنے پر تعارف کر دیا۔

”السلام علیکم؟“ سالار نے آمد کو کہتے سنا۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ وہ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسے دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

وہ نروس ہو رہا تھا۔ آمد نے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

”سالار! تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔“

سعید واماں نے آمد کو بتایا۔

آمد نے ایک بار پھر سالار کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے بیک وقت نظریں پر انہیں۔ آمد نے سعید واماں کو دیکھا اور سالار نے آمد کی کلائیوں تک ہنسدی کے نقش و نگار سے بھرے ہاتھوں کو۔

ایک دم اسے لگا کہ وہ اس لڑکی سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

”سالار بیٹا اندر کمرے میں چلتے ہیں۔ وہاں تم اطمینان سے آمد سے بات کر لینا۔“

سعید واماں نے اس بار سالار کو مخاطب کیا۔

سعید واماں کہتے ہوئے اندر برآمدے کی طرف بڑھیں۔ سالار نے آمد کو سر جھکائے ان کی وجہ دیکھ کر دیکھا۔ وہ وہیں کھڑا اسے اندر جاتا دیکھتا رہا۔ سعید واماں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ آمد نے دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے مڑتے اسے دیکھا۔ سالار نے برق رفتاری سے نظر جھٹک لیا۔ آمد نے مڑ کر اسے دیکھا پھر شاید وہ حیران ہوئی۔ سالار اندر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ سالار نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے قدم آگے بڑھا دیئے۔ آمد کچھ مطمئن ہو کر مڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

سالار جب کمرے میں داخل ہوا تو سعید واماں پہلے ہی ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔ آمد لائٹ آن کر رہی تھی۔ سالار کو دھوپ سے اندر آکر ٹھٹکی کا احساس ہوا۔

”جھبو بیٹا؟“ سعید واماں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ سالار کرسی پر بیٹھ گیا۔ آمد لائٹ آن کرنے کے بعد اس سے کچھ فاصلے پر ان کے بائیں طرف ایک کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

سالار منتظر تھا کہ سعید واماں چند لمحوں میں وہاں سے اٹھ کر چلی جائیں گی۔ مگر ان کے واضح طور پر انہیں بتایا تھا کہ وہ اس سے جوابی میں بات کرنا چاہتا تھا، مگر چند لمحوں کے بعد سالار کو اندازہ ہو گیا کہ اس

کا یہ انتظار ہے کار تھا۔ وہ شاید یہ بھول گئی تھیں کہ سالار تنہائی میں آمنہ سے ملنا چاہتا تھا یا پھر ان کا یہ خیال تھا کہ وہ تنہائی صرف فرقان کی عدم موجودگی کے لئے تھی۔ سالار نے انہیں اس میں شامل نہیں کیا ہو گا یا پھر وہ بھی سالار کو اتنا قابل اعتبار نہیں سمجھتی تھیں کہ اپنی بیٹی کے ساتھ اسے اکیلا چھوڑ دیتیں۔

سالار کو آخری اندازہ صحیح لگا۔ وہ اس سے جو کچھ اور جانتا کچھ کہنا چاہتا تھا، سعیدہ واماں کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا، وہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو کھٹکانے کی کوشش کی۔ اسے کچھ تو کہنا ہی تھا وہ کچھ نہیں دھوڑ سکا۔ اس کا ذہن خالی تھا۔

نیم تاریک خنک کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ وہ اب دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسانے فرش پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

آمنہ نے کمرے میں کوئی فیسی لائٹ روشن کی تھی۔ اونچی دیواروں والا فرنیچر سے بھرا ہوا دوسرا عریض کمرہ شاید سنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں بہت زیادہ دروازے تھے اور تمام دروازے بند تھے۔ کمرے میں موجود واحد کھڑکی پر آدھے میں کھلتی تھی اور اس کے آگے پردے تھے۔ فرش کو بھاری بھر کم میروں شخص و لٹاکر کے قالین سے ڈھکا گیا تھا اور فیسی لائٹ کمرے کو پوری طرح روشن کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

کم از کم کمرے میں سالار کو تاریکی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ اس کے احساسات تھے یا پھر۔ مجھے اپنے optician سے آج ضرور ملنا چاہیے۔ قریب کے ساتھ ساتھ شاید میری دور کی نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔

سالار نے مایوسی سے سوچا۔ سینئر فیل کے دوسری طرف بیٹھی آمنہ کو وہ کچھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر نظر قالین پر جمادی پھر اس نے ایک دم آمنہ کو اٹھنے دیکھا۔ وہ دیوار کے پاس جا کر کچھ اور لائٹس آن کر رہی تھی۔ کمرہ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں جگمگا اٹھا۔ فیسی لائٹ بند ہو گئی۔ سالار جہان ہوا۔ آمنہ نے پہلے ٹیوب لائٹ آن کیوں نہیں کی تھی، پھر چانک اسے احساس ہوا وہ بھی نروس تھی۔

آمنہ دوبارہ پھر اس کے سامنے کاؤنچ پر آکر نہیں بیٹھی۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر سعیدہ واماں کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سالار نے اس بار اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسی طرح قالین کو گھورتا رہا۔ سعیدہ واماں کا صبر بالآخر جواب دے گیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کھٹکھار کر سالار کو متوجہ کیا۔

”گرو بیٹا! وہ باتیں جو تم نے آمنہ سے تنہائی میں کرنی تھیں۔“

انہوں نے سالار کو بڑے پیار سے یاد دلایا۔

”اتنی دیر سے چپ بیٹھے ہو، میرا قول ہول رہا ہے۔“

سالار نے ایک گہرا سانس لیا، پھر سعیدہ واماں اور آمنہ کو باری باری دیکھا۔

”کچھ نہیں، میں بس انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔“

اس نے اپنے کچے کھجور کے لامکان ہموار رکھتے ہوئے کہا۔ سعیدہ واماں کے چہرے پر ہلکا سا ہنسی۔

”تو اتنی سی بات تھی اور فرقان نے مجھے ڈرا دیا۔ ہاں ہاں ضرور دیکھو، کیوں نہیں۔ بیوی ہے تمہاری۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ ان سے کہہ دیں کہ سالار پیک کر لیں، میں باہر انتظار کرتا ہوں۔“

وہ دروازے کی طرف بڑھتا ہوا سعیدہ واماں سے یوں۔ آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ سعیدہ واماں بھی حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”مگر بیٹا! تم تو صرف کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے اس سے، پھر رخصتی۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے میں چاہتی تھی باقاعدہ رخصت کروں اور۔۔۔۔۔“

سالار نے نرمی سے سعیدہ واماں کی بات کاٹی۔

”آپ یہ کچھ لیں کہ میں باقاعدہ رخصت کروانے کے لئے ہی آیا ہوں۔“

سعیدہ واماں کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

”کھپ ہے بیٹا! تم اگر ایسا چاہتے ہو تو ایسا ہی کسی مگر انتظار کے لئے رو۔ چتہ کھینے ہی باقی ہیں، کھانا تو کھا کر جاؤ۔“

”نہیں، مجھے اور فرقان کو کچھ کام ہے۔ میں اسے صرف ایک گھنٹے کے لئے لے کر آیا تھا۔ زیادہ دیر نہ کھانگن نہیں ہے میرے لئے۔“ وہ کھڑے کھڑے کہہ رہا تھا۔

”لیکن اماں! مجھے تو سالار پیک کرنے میں بہت دیر لگے گی۔“

آمنہ نے وہیں کرسی پر بیٹھے ہوئے پہلی بار ساری گفتگو میں حصہ لیا۔ سالار نے مڑ کر اسے دیکھے پھر سعیدہ واماں سے کہا۔

”سعیدہ اماں! آپ ان سے کہیں یہ آرام سے بیٹھ کر لیں، میں باہر انتظار کروں گا۔ جتنی دیر یہ چاہیں۔“

وہ اب کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

فرقان نے حیرانی سے سالار کو دیکھا۔ وہ بیٹھک میں داخل ہو رہا تھا۔

”تم اتنی جلدی واپس آ گئے، میں تو سوچ رہا تھا کہ تم خاصی دیر کے بعد واپس آؤ گے۔“

سالار جواب میں کچھ کہنے کے بجائے بیٹھ گیا۔

فرقان نے اس کے چہرے کو فور سے دیکھا۔

"خیر ہے۔"

"ہاں۔"

"آمنہ سے ملاقات ہوئی؟"

"ہاں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟"

"نہیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں آمنہ کو ساتھ لے کر چاہا ہوں۔"

"کیا؟" فرقان بھونچکا رہ گیا۔

"تم تو اس سے بات کرنے کے لئے آئے تھے۔"

سالار جواب دینے کے بجائے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ یک دم رکھتی کا کیوں سوچ لیا؟"

"بس سوچ لیا۔"

اس بار فرقان نے اسے ابھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

☆.....☆.....☆

وہ گھٹنے کے بعد آمنہ دب فرقان اور سالار کے ساتھ سالار کے فلیٹ پر پہنچی تھی، تب افطار میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ سالار نے افطاری کا سامان راستے سے لے لیا تھا۔ فرقان ان دونوں کو افطاری کے لئے اپنے فلیٹ پر لے جانا چاہتا تھا مگر سالار اس پر رضامند نہیں ہوا۔ فرقان نے اپنی بیوی کو بھی سالار کے فلیٹ پر بلوایا۔

افطاری کے لئے فیملی فرقان کی بیوی نے ہی تیار کیا تھا۔ آمنہ نے مدد کرنے کی کوشش کی تھی جسے فرقان اور اس کی بیوی نے رد کر دیا۔ سالار نے مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ موہاگل لے کر بالکونی میں چلا گیا۔ لاؤنج میں بیٹھے کھڑکیوں کے شیشوں کے پار آمنہ نے اسے بالکونی میں ٹپٹے موہاگل پر کسی سے بات کرتے دیکھا۔ وہ بہت عجیبہ و غریب نظر آ رہا تھا۔

اس نے سعید اماں کے گھر سے اپنے فلیٹ تک ایک بار بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ یہ صرف فرقان تھا جو وقتاً فوقتاً اسے مخاطب کرتا رہا تھا اور اب بھی یہی ہو رہا تھا۔

سالار نے وہ خاموشی افطار کی میز پر بھی توڑی۔ فرقان اور اس کی بیوی ہی آمنہ کو مختلف چیزیں سرو کرتے رہے۔ آمنہ نے اس کی خاموشی اور سرد مہر کی محسوس کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

افطار کے بعد وہ فرقان کے ساتھ مغرب کی نماز کے لئے نکل آیا تھا۔ فرقان کو مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد باہل جانا تھا۔

مسجد سے نکل کر فرقان کے ساتھ کار پارکنگ کی طرف آتے ہوئے فرقان نے اس سے کہا۔

"تم بہت زیادہ خاموش ہو۔" سالار نے ایک نظرات دیکھا مگر کچھ کہے بغیر چلا ہوا۔

"کیا تمہیں کچھ کہنا نہیں ہے؟"

وہ مسلسل اس کی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سالار نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

مغرب کے وقت ہی وہ بندھن ہونے لگی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے فرقان کو دیکھا۔

"نہیں، مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

چند لمبے ساتھ چلنے کے بعد فرقان نے اسے بڑبڑاتے سنا۔

"میں آج کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں ہوں۔"

فرقان کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔ ساتھ چلتے چلتے اس نے سالار کا کندھا چھو لیا۔

میں تمہارے احساسات سمجھ سکتا ہوں لیکن زندگی میں یہ سب ہو جا رہا ہے، تم امامہ کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے تم نے کیا۔ جتنا انتظار کر سکتے تھے تم نے کیا۔ آٹھ نو سال کم نہیں ہوتے۔ اب تمہاری قسمت میں اگر یہی لڑکی ہے تو ہم کیا تم کیا کر سکتے ہیں۔"

سالار نے بے تاثر نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس گھر میں آج امامہ کا مقدر نہیں تھا، آمنہ کا مقدر تھا۔ سو وہ آگئی۔ اس سے نکاح ہوئے سات دن ہوئے ہیں اور آٹھویں دن وہ یہاں ہے۔ امامہ کے ساتھ نکاح کو نو سال ہونے والے ہیں اور وہ آج تک تمہارے پاس نہیں آ سکی۔ کیا تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ امامہ تمہارے مقدر میں نہیں ہے۔"

وہ پوری دہمچی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہماری بہت ساری خواہشات ہوتی ہیں۔ بعض خواہشات اللہ پوری کر دیتا ہے، بعض نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے امامہ کے نہ ملنے میں تمہارے لئے بہتری ہو۔ ہو سکتا ہے اللہ نے تمہیں آمنہ ہی کے لئے رکھا ہو۔ ہو سکتا ہے آج سے چند سال بعد تم اسی بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکو۔"

وہ دونوں اب پارکنگ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ فرقان کی گاڑی شروع میں ہی کھڑی تھی۔

"میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی انسان نہیں دیکھا جس کی ہر خواہش پوری ہو، جس نے جو چاہا ہو

پالیا ہو پھر شکوہ کس بات کا۔ آمنہ کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارنے کی کوشش کرو۔“
 دو دنوں اب گاڑی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ فرقان نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول دیا مگر بیٹھے
 سے پہلے اس نے سالار کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے باری باری اس کے دونوں گالوں کو
 نرمی سے چوما۔

”جہیں بیٹا یاد رکھنا چاہئے کہ تم نے ایک نیکی کی ہے اور اس نیکی کا اجر اگر جہیں یہاں نہیں ملے گا
 تو اگلی دنیا میں مل جائے گا۔“

دو اب سالار کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سالار سر کو ہلکا سا خم
 کرتے ہوئے تھوڑا سا مسکرایا۔

فرقان نے ایک گہرا سانس لیا۔ آج کے دن یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو اس نے سالار کے چہرے پر
 دیکھی تھی۔ اس نے خود بھی مسکراتے ہوئے سالار کی پشت چھپائی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سالار نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ فرقان آئینہ میں چالی لگا رہا تھا۔ جب اس نے سالار کو
 کھڑکی کا شیشہ اٹھلی سے بھاتے دیکھا۔ فرقان نے شیشہ نیچے کر دیا۔

”تم کہہ رہے تھے کہ تم نے آج تک کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا، جس نے جس چیز کی بھی خواہش کی
 ہو اسے مل گئی ہو۔“

سالار کھڑکی پر جھکے پر سکون آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ فرقان نے ابھی ہوئی نظروں سے اسے
 دیکھا۔ وہ بے حد پرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

”پھر تم مجھے دیکھو کیونکہ میں وہ انسان ہوں، جس نے آج تک جو بھی چاہا ہے اسے وہ مل گیا ہے۔“
 فرقان کو لگا اس کا ذہن غم کی وجہ سے متاثر ہو رہا تھا۔

”جیسے تم میری نیکی کہہ رہے ہو وہ دراصل میرا ”اثر“ ہے جو مجھے زمین پر ہی دے دیا گیا ہے۔ مجھے
 آخرت کے انتظار میں نہیں رکھا گیا اور میرا مقدر آج بھی وہی ہے جو نو سال پہلے تھا۔“

وہ خیر ظہیر کر گہری آواز میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے وہی عورت دی گئی ہے جس کی میں نے خواہش کی تھی، امامہ باہم اس وقت میرے گھر پہ
 ہے، خدا حافظ۔“

فرقان دم بخود رہ جاتے ہوئے اس کی پشت دیکھتا رہا۔ وہ کیا کہہ کر کیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔
 ”شاید میں ٹھیک سے اس کی بات نہیں سن پایا۔“ پھر شاید اس کا داغ خراب ہو گیا ہے۔ یا پھر
 شاید اس نے صبر کر لیا ہے۔ امامہ باہم.....؟ سالار اب بہت دور نظر آ رہا تھا۔

باب ۹

لاہور پہنچنے کے بعد اس کے لئے اگلا مرحلہ کسی کی مدد حاصل کرنے کا تھا مگر کس کی؟ وہ باہم
 نہیں جاسکتی تھی۔ وہ جویریہ اور باقی لوگوں سے رابطہ نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اس کے گھر والے اس کی
 دوستوں سے واقف تھے اور چند گھنٹوں میں وہ اسے لاہور میں ڈھونڈنے والے تھے، بلکہ ہو سکتا تھا اب
 تک اس کی تلاش شروع ہو چکی ہو اور اس صورت حال میں ان لوگوں سے رابطہ کرنا خطرے سے خالی
 نہیں تھا۔ اس کے لئے صبیحہ کی صورت میں واحد آپشن رہ جاتا تھا، مگر وہ اس بات سے واقف نہیں تھی کہ
 وہ ابھی پشاور سے واپس آئی تھی یا نہیں۔

صبیحہ کے گھر پر ملازم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ لوگ ابھی پشاور میں ہی تھے۔

”واپس کب آئیں گے؟“ اس نے ملازم سے پوچھا۔ وہ اسے جانتا تھا۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے مگر ایک دو دن تک آ جائیں گے۔“ اس نے امامہ کو بتایا۔

"کیا آپ کے پاس وہاں کا فون نمبر ہے؟" اس نے قدرے مایوسی کے عالم میں پوچھا۔

"جی، وہاں کا فون نمبر میرے پاس ہے۔" ملازم نے اس سے کہا۔

"وہ آپ مجھے دے دیں۔ میں فون پر اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

اسے کچھ صبر مل گئی۔ ملازم اسے اندر لے آیا۔ ڈرائنگ روم میں اسے بٹھا کر اس نے وہ نمبر دیا۔

اس نے موبائل پر وہ نمبر دیکھ کر سمجھ کر رنگ کیا۔ فون پشاور میں گھر کے کسی فرد نے اٹھایا تھا اور اسے بتایا کہ سمیٹر باہر گئی ہوئی ہے۔

امام نے فون بند کر دیا۔

"سمیٹر سے میری بات نہیں ہو سکی۔ میں کچھ دیر بعد اسے دوبارہ فون کروں گی۔" اس نے پاس کھڑے ملازم سے کہا۔

"جب تک میں یہیں بیٹھوں گی۔"

ملازم سر جاتے ہوئے چلا گیا۔ اس نے ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ سمیٹر کو فون کیا۔ وہ اس کی کال پر حیران تھی۔

اس نے اسے مختصر طور پر اپنا گھر چھوڑ آنے کے بارے میں بتایا۔ اس نے اسے سالار سے اپنے نکاح کے بارے میں نہیں بتایا کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی سمیٹر اس سارے معاملے کو کس طرح دیکھے گی۔

"امام! تمہارے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ تم اس معاملے میں کورٹ سے رابطہ کرو۔ تبدیلی مذہب کے حوالے سے پروٹیکشن مانگو۔" سمیٹر نے اس کی ساری گفتگو سننے کے بعد کہا۔

"میں یہ کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"سمیٹر! میں پہلے ہی اس مسئلے کے بارے میں بہت سوچ چکی ہوں۔ تم میرے بابا کی پوزیشن اور اثر و رسوخ سے واقف ہو۔ پریس کو طوقان اٹھادے گا۔ میری فیملی کو بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں یہ تو نہیں چاہتی کہ میرے گھر پر پتھر اڑاؤ ہو، میری وجہ سے میرے گھر والوں کی زندگی کو

خطرہ ہو اور آج تک بچتی لڑکیوں نے اسلام قبول کر کے کورٹ پر پروٹیکشن لینے کی کوشش کی ہے ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کورٹ دارالامان مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ نیل بھونانے کے مترادف ہے۔ کیس کا فیصلہ کتنی

دیر تک ہو، کچھ پتا نہیں۔

گھر والے ایک کے بعد ایک کیس قاضی کرتے رہتے ہیں۔ کتنے سال اس طرح گزر جائیں، کچھ پتا نہیں ہوتا اگر کسی کو کورٹ آزاد رہنے کی اجازت دے دے گی۔ وہ تو وہ لوگ اسے مسئلہ کھڑے کرتے رہتے ہیں کہ بہت ساری لڑکیاں واپس گھر والوں کے پاس چلی جاتی ہیں۔ میں نہ تو دارالامان میں اپنی زندگی

برباد کرنا چاہتی ہوں نہ ہی لوگوں کی نظروں میں آنا چاہتی ہوں۔ میں نے خاموشی کے ساتھ گھر چھوڑا ہے اور میں اسی خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہاری بات سمجھ سکتی ہوں امام! لیکن مسائل تو تمہارے لئے ابھی بھی کھڑے کئے جائیں گے۔ وہ جنہیں تلاش کرنے کے لئے اپنی چوٹی کا زور لگا دیں گے اور ان لوگوں کے لئے مسائل پیدا ہوں گے جو جنہیں پناہ دیں گے اور وہ جب جنہیں ڈھونڈنا شروع کریں گے تو مجھ تک پہنچنا تو ان کے لئے

بہت آسان ہو گا۔ تمہاری مدد کر کے ہمیں بہت خوشی ہو گی مگر میرے ایوینجی چاچوں کے گم ہونے کا درد چھپ کر کرنے کے بجائے محل کر کے جائے اور کورٹ اس معاملے میں یقیناً تمہارے حق میں اپنا فیصلہ دے گا۔ تم ابھی میرے گھر پر ہی رہو۔ میں اس بارے میں ملازم کو کہہ دیتی ہوں اور آج میں اپنے ابو سے بات

کرتی ہوں ہم کو شش کریں گے، کل لاہور واپس آ جائیں۔"

امام نے ملازم کو بلا کر فون اس کے حوالے کر دیا۔ سمیٹر نے ملازم کو کچھ ہدایات دیں اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

"میں سمیٹر بی بی کا کمرہ کھول رہا ہوں، آپ وہاں چلی جائیں۔" ملازم نے اس سے کہا۔

وہ سمیٹر کے کمرے میں چلی آئی مگر اس کی تشویش اور پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ سمیٹر کے نقطہ نظر کو سمجھ سکتی تھی۔ وہ یقیناً یہ نہیں چاہتی تھی کہ خود سمیٹر اور اس کی فیملی پر کوئی مصیبت آئے۔ اس

معاملے میں سمیٹر کے اندیشے درست تھے۔ اگر ہاشم مبین کو یہ پتا چل جاتا کہ اسے سمیٹر کی فیملی نے پناہ دی تھی تو وہ ان کے جانی دشمن بن جاتے۔ شاید اس لئے سمیٹر نے اس سے قانون کی مدد لینے کے لئے کہا تھا

مگر یہ راستہ اس کے لئے زیادہ دشوار تھا۔

جماعت کے اگلے دن کے لیے رات کی بیٹی کا اس طرح مذہب چھوڑ دینا پوری جماعت کے منہ پر طمانچے کے مترادف تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس سے پورے ملک میں جماعت اور خاندان کے خاندان کو کتنی زک

پہنچے گی اور وہ اس بے عزتی سے بچنے کے لئے کس حد تک جا سکتے تھے، امام جانتی نہیں تھی، مگر اندازہ کر سکتی تھی۔

وہ سمیٹر کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی جب اس کے ذہن میں ایک جھماکے کے ساتھ سیدو مریم سہیل کا خیال آیا تھا۔ وہ سمیٹر کی دوست اور کلاس فیلو تھی۔ وہ اس سے کئی بار ملتی رہی تھی۔ ایک بار

سمیٹر کے گھر پر ہی مریم کو اس کے قبول اسلام کا پتا چلا تھا۔ وہ شاید سمیٹر کی واحد دوست تھی جسے سمیٹر نے امام کے بارے میں بتا دیا تھا اور مریم بہت حیران نظر آتی تھی۔

"تمہیں اگر کبھی میری کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مجھے ضرور بتانا بلکہ بلا جھجک میرے پاس آ جانا۔"

اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اہامہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ بعد میں بھی اہامہ سے ہونے والی ملاقاتوں میں وہ ہمیشہ اس سے اسی گرم جوشی کے ساتھ ملتی رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا کیوں خیال آیا تھا یا وہ کس حد تک اس کی مدد کر سکتی تھی مگر اس وقت اس نے اس سے بھی رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے موبائل سے فون کرنا چاہا مگر موبائل کی بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اسے ری چارج کرنے کے لئے دکھایا اور خود لاؤڈ ریج میں آکر اپنی ڈائری سے مریم کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

فون ڈاکٹر سید علی نے اٹھایا تھا۔

”میں مریم سے بات کرنا چاہتی ہوں، میں ان کی دوست ہوں۔“

اس نے اپنا تعارف کروایا۔ اس نے پہلی بار مریم کو فون کیا تھا۔

”میں بات کر دیتا ہوں۔“ انہوں نے فون ہولڈر کھینچ کر کہا۔ کچھ سیکنڈز کے بعد اہامہ نے دوسری طرف مریم کی آواز سنی۔

”ہیلو۔“

”ہیلو مریم! میں اہامہ بات کر رہی ہوں۔“

”اہامہ۔۔۔ اہامہ ہاشم؟“ مریم نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

وہ اسے اپنے بارے میں بتاتی گئی۔ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی جب اس نے بات ختم کی تو مریم نے کہا۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں صبیحہ کے گھر پر ہوں، مگر صبیحہ کے گھر پر کوئی نہیں ہے۔ صبیحہ پشاور میں ہے۔“

اس نے صبیحہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں اسے نہیں بتایا۔

”تم وہیں رہو۔ میں ڈرائیور کو بھجوواتی ہوں۔ تم اپنا سامان لے کر اس کے ساتھ آ جاؤ۔۔۔ میں اتنی دیر میں اپنی امی اور ابو سے بات کرتی ہوں۔“

اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ یہ صرف ایک اتفاق تھا کہ اس نے ڈاکٹر سید علی کے گھر کی جانے والی کال سالار کے موبائل سے نہیں کی تھی ورنہ مسکند رحمان ڈاکٹر سید علی کے گھر بھی پہنچ جاتے اور اگر اہامہ کو یہ خیال آ جاتا کہ وہ موبائل کے ٹیبلٹ سے اسے فریٹس آؤٹ کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ لاہور آ کر ایک پار بھی موبائل استعمال نہ کرتی۔

یہ ایک اور اتفاق تھا کہ ڈاکٹر سید علی نے اپنے آفس کی گاڑی اور ڈرائیور کو اسے لینے کے لئے بھجوایا تھا، ورنہ صبیحہ کا ملازم مریم کی گاڑی اور ڈرائیور کو بھجوانا لیتا تو کچھ مریم اکثر وہاں آ کر یا تھی اور

صبیحہ کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی یہ جان جاتے کہ وہ صبیحہ کے گھر سے کہاں تھی۔

☆☆☆☆

آدھ گھنٹہ کے بعد ملازم نے ایک گاڑی کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ اپنا بیگ اٹھانے لگی۔

”کیا آپ جا رہی ہیں؟“

”ہاں۔“

”مگر صبیحہ لپٹی تو کبہر رہی تھی کہ آپ یہاں رہیں گی۔“

”نہیں۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔ اگر صبیحہ کا فون آنے تو آپ اسے بتادیں کہ میں پہلی گئی ہوں۔“

اس نے دانستہ طور پر اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ مریم کے گھر جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

وہ پہلی بار مریم کے گھر گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے وہاں جا کر ایک بار پھر مریم اور اس کے والدین کو اپنے بارے میں سب کچھ بتانا پڑے گا۔ وہ وہی طور پر خود کو سوالوں کے لئے تیار کر رہی تھی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

”ہم لوگ تو ناشہ کر چکے ہیں تم ناشہ کر لو۔“

مریم نے پورے رخ میں اس کا استقبال کیا تھا اور اسے اندر لے جاتے ہوئے کہا۔ اندر لاؤنج میں ڈاکٹر سید علی اور ان کی بیوی سے اس کا تعارف کرو لیا گیا۔ وہ دوپڑے چاک سے ملے۔ اہامہ کے چہرے پر اتنی سراسیمگی اور پریشانی تھی کہ ڈاکٹر سید علی کو اس پر ترس آیا۔

”میں تمہارا لگاتی ہوں۔ مریم تم اسے اس کا کمرہ دکھاؤ۔۔۔ تاکہ یہ کپڑے بھیج کر لے۔“ سید علی کی بیوی نے مریم سے کہا۔

وہ جب کپڑے بدل کر آئی تو ناشہ لگ چکا تھا۔ اس نے خاموشی سے ناشہ کیا۔

”اہامہ! اب آپ جا کر سو جائیں۔ میں آفس جا رہا ہوں، شام کو واپسی پر ہم آپ کے مسئلے پر بات کریں گے۔“

ڈاکٹر سید علی نے اسے ناشہ ختم کرتے دیکھ کر کہا۔

”مریم! تم اسے کمرے میں لے جاؤ۔“ وہ خود لاؤنج سے اٹھ گئے۔

وہ مریم کے ساتھ اپنے کمرے میں پہلی آئی۔

”اہامہ! اب تم سو جاؤ۔ تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے کہ تم بچھلے کئی گھنٹوں سے نہیں سوئیں۔

عام طور پر چھٹن اور پریشانی میں نیند نہیں آتی اور تم اس وقت اس کا شکار ہو گی۔ میں تمہیں کوئی ٹیبلٹ لا کر دیتی ہوں اگر نیند آگئی تو ٹیبلٹ ہے ورنہ ٹیبلٹ لینا۔“

وہ کمرے سے باہر نکل گئی، کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی پانی کا گلاس اور ٹیبلٹ پیڑرا ہڈ نیل پر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"تم پاگل رہیں گے ہو کر سو جاؤ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم سمجھو کہ تم اپنے گھر میں ہو۔" وہ کمرے کی لائٹ آف کرتی ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے مگر ابھی تک باہر بہت دھند تھی اور کمرے کی کڑکیوں پر پردے ہونے کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ اس نے کسی معمول کی طرح ٹیبلٹ پانی کے ساتھ نگل لی۔ اس کے بغیر نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن میں اساتے بہت سے خیالات آرہے تھے کہ پیڑرا لیٹ کر نیند کا انتظار کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ چند منٹوں کے بعد اس نے اپنے اعصاب پر ایک ٹھونگی طاری ہوتی محسوس کی۔

☆ ☆ ☆

وہ جس وقت دوبارہ اٹھی اس وقت کمرہ مکمل طور پر تاریک ہو چکا تھا۔ وہ پیڑرا سے اُٹھ کر دیوار کی طرف گئی اور اس نے لائٹ جلادی، وال ٹاک رات کے ساڑھے گیارہ بج رہا تھا۔ وہ فوراً طور پر اندازہ نہیں کر سکی کہ یہ اتنی لمبی نیند ٹیبلٹ کا اثر تھی یا پھر پچھلے کئی دنوں سے صبح طور پر نہ سو سکتے کی۔

"جو کچھ بھی قیاد صبح سے بہت بہتر حالت میں تھی۔ اسے بے حد بھوک لگ رہی تھی، مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ گھر کے افراد اس وقت جاگ رہے ہوں گے یا نہیں۔ بہت آہستگی سے وہ دروازہ کھول کر لاؤنج میں نکل آئی۔ ڈاکٹر سیٹھ علی لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"اچھی نیند آئی؟" وہ بڑی رضائے سے پوچھے۔

"جی ہاں!" اس نے مسکرائے کی کوشش کی۔

"اب ایسا کریں کہ وہ سانس لیکن سے وہاں چلی جائیں۔ کھانا رکھا ہوا ہے۔ گرم کریں۔ وہاں نیل پر ہی کھا لیں اس کے بعد چائے کے دو کپ بنا لیں اور یہاں آ جائیں۔"

وہ کچھ کہے بغیر بکتن میں پہلی گئی۔ فرخا میں رکھا ہوا کھانا ٹال کر اس نے گرم کیا اور کھانے کے بعد چائے لے کر لاؤنج میں آگئی۔ چائے کا ایک کپ بنا کر اس نے ڈاکٹر سیٹھ علی کو دیا۔

وہ کتاب میز پر رکھ چکے تھے۔ دوسرا کپ لے کر وہ ان کے ساتھ دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اندازہ کر چکی تھی کہ وہ اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔

"چائے بہت اچھی ہے۔"

انہوں نے ایک سپ لے کر مسکراتے ہوئے کہا وہ اتنی نرمی سے تھی کہ ان کی تعریف پر مسکرا سکی نہ

شکر ہے اور اگر سکی۔ وہ صرف انہیں دیکھتی رہی۔

"امام! آپ نے جو فیصلہ کیا ہے اس کے صحیح ہونے میں کوئی دورانے نہیں ہو سکتی مگر فیصلہ بہت بڑا ہے اور اساتے بڑے فیصلے کرنے کے لئے بہت ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس کم عمری میں، مگر بعض دفعہ فیصلے کرنے کے لئے اتنی جرأت کی ضرورت نہیں ہوتی جتنی ان پر قائم رہنے کے لئے ہوتی ہے۔ آپ کو کچھ عرصہ بعد اس کا اندازہ ہوگا۔"

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"میں آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا مذہب کی تبدیلی کا فیصلہ صرف مذہب کے لئے ہے یا کوئی اور وجہ بھی ہے۔"

وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"میرا خیال ہے مجھے زیادہ واضح طور پر یہ سوال پوچھنا چاہئے کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کسی لڑکے میں دلچسپی رکھتی ہیں اور اس کے کہنے پر یا اس کے لئے آپ نے کمرے لگتے کا فیصلہ کیا ہو یا مذہب بدلنے کا۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے آپ یہ مت سوچنا کہ اگر ایسی کوئی وجہ ہوگی تو میں آپ کو برا سمجھوں گا یا آپ کی مدد نہیں کروں گا۔ میں یہ صرف اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اگر ایسا ہوا تو پھر مجھے اس لڑکے اور اس کے گھروالوں سے بھی ملنا ہوگا۔"

ڈاکٹر سیٹھ علی اب سوائے نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت امامہ کو پہلی بار مریم سے اتنی دیر سے رابطہ کرنے پر چھپتا ہوا اور ک سالار کے بجائے ڈاکٹر سیٹھ علی، جلال سے یا اس کے گھروالوں سے بات کرتے تو شاید۔ "اس نے پوچھل دل سے لگی میں سر جلا دیا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"کیا آپ کو واقعی یقین ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے؟" انہوں نے ایک بار پھر پرسکون انداز میں اس سے کہا۔

"جی۔ میں نے اسلام کسی لڑکے کے لئے قبول نہیں کیا۔" وہ اس بار جھوٹ نہیں بول رہی تھی، اس نے اسلام واقعی جاہل العصر کے لئے قبول نہیں کیا تھا۔

"پھر آپ کو یہ اندازہ ہونا چاہئے کہ آپ کو کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"مجھے اندازہ ہے۔"

"آپ کے والد باغش مبین صاحب سے میں واقف ہوں۔ جماعت کے بہت سرگرم اور بار بار سوشل لیزر ہیں اور آپ کا ان کے مذہب سے تعلق ہو کر اس طرح گھر سے چلے آنا ان کے لئے ایک بہت بڑا

دھچکا ہے۔ آپ کو ڈھونڈنے اور واپس لے جانے کے لئے دوزخ میں آسمان ایک کر دیں گے۔"

”مگر میں کسی بھی قیمت پر واپس نہیں جاؤں گی۔ میں نے بہت سوچ بچھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“
”گھر آپ نے چھوڑ دیا ہے۔ اب آپ آگے کیا کریں گی؟“ امامہ کو اندیشہ ہوا کہ وہ اسے کورٹ میں جانے کا مشورہ دیں گے۔

”میں کورٹ میں نہیں جاؤں گی۔ میں کسی کے بھی سامنے آنا نہیں چاہتی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سامنے آکر میرے لئے بہت زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔“

”پھر آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟“ انہوں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سامنے نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ میڈیکل کالج میں اپنی اسٹڈیز جاری نہیں رکھ سکیں گی۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”میں ویسے بھی خود تو میڈیکل کی تعلیم افورڈ کر بھی نہیں سکتی۔“

”اور اگر کسی دوسرے میڈیکل کالج میں کسی دوسرے شہر یا صوبے میں آپ کی مائٹریشن کروادی جائے تو؟“

”نہیں، وہ مجھے ڈھونڈ لیں گے۔ ان کے ذہن میں بھی سب سے پہلے یہی آئے گا کہ میں مائٹریشن کروانے کی کوشش کروں گی اور اسے تھوڑے سے میڈیکل کالج میں مجھے ڈھونڈنا بہت آسان کام ہے۔“

”پھر؟“

”میں بی ایس سی میں کسی کالج میں اپنی اسٹڈیز لینا چاہتی ہوں مگر کسی دوسرے شہر میں۔ لاہور میں

وہ ایک ایک کالج چھان ماریں گے اور میں اپنا نام بھی بدلاؤنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ ان دونوں کاموں میں میری مدد کر سکیں تو میں بہت احسان مند رہوں گی۔“

ڈاکٹر سبط علی بہت دیر خاموش رہے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ پھر انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

”امامہ! ابھی کچھ عرصہ آپ کو سیکھنا رہنا چاہئے، پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ کے گھر والے آپ

کی تلاش میں کیا کیا طریقے اختیار کرتے ہیں۔ چند ہفتے انتظار کرتے ہیں پھر دیکھتے ہیں آگے کیا کرنا ہے۔

آپ اس گھر میں بالکل محفوظ ہیں۔ آپ کو اس حوالے سے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کورٹ

میں نہیں جانا چاہئیں؟ میں آپ کو اس کے لئے مجبور بھی نہیں کروں گا اور آپ کو یہ ڈر نہیں ہونا چاہئے

کہ کوئی یہاں تک آجائے گا یا آپ کو زبردستی یہاں سے لے جائے گا۔ آپ کے ساتھ کوئی بھی کسی بھی

طرح کی زبردستی نہیں کر سکتا۔“

انہوں نے اس رات اسے بہت سی تسلیاں دی تھیں۔ اسے ڈاکٹر سبط علی کی شکل دیکھ کر بے اختیار

ہاشم بھٹن یاد آتے رہے۔ وہ بوہم دل کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن ڈاکٹر سبط علی شام ہانچ بچے کے قریب اپنے آفس سے آئے تھے۔

”صاحب آپ کو اپنی اسٹڈیز میں بار ہے ہیں۔“

وہ اس وقت مریم کے ساتھ کچن میں تھی جب ملازم نے آکر اسے پیغام دیا۔

”آؤ امامہ! بیٹھو!“ اسٹڈی کے دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہونے پر ڈاکٹر سبط علی نے

اس سے کہا وہ اپنی ٹیبل کی ایک دروازے کچھ پیچھے ڈکھال رہے تھے وہ وہاں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آج میں نے کچھ معلومات کروائی ہیں آپ کے بارے میں کہ آپ کے گھر والے آپ کی تلاش

میں کہاں تک پہنچے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔“

انہوں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

”یہ سالار سکندر کون ہے؟“

ان کے اگلے سوال نے اس کے دل کی دھڑکن کو چند لمحوں کے لئے روک دیا تھا۔ وہ اب کرسی پر

بیٹھے اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے کی قف ہوتی ہوئی رنگت نے انہیں یہ بتا دیا کہ وہ ام امامہ

کے لئے اچھی نہیں تھا۔

”سالار! ہمارے ساتھ۔۔۔ والے۔۔۔ گھر۔۔۔ میں۔۔۔ رہتا۔۔۔ ہے۔“ اس نے اٹھتے

ہوئے کہا۔

”اس نے میری بہت مدد کی ہے۔ گھر سے نکلنے میں۔۔۔ اسلام آباد سے لاہور مجھے وہی چھوڑ

کر گیا تھا۔“

وہ دانستہ رنگ لگ گئی۔

”کیا اس کے ساتھ نکاح کے بارے میں بھی بتانا چاہئے؟“ وہ گولو میں تھی۔

”آپ کے والد نے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے، آپ کو اغوا کرنے کے

الزام میں۔“

امامہ کے چہرے کی رنگت اور زرد ہو گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ سالار سکندر اتنی جلدی پکڑا جائے

گا اور اب اس کے گھر والے یقیناً جلال انصر بھی پہنچ جائیں گے اور وہ نکاح اور اس کے بعد کیا وہ یہاں

آجائیں گے۔“

”کیا وہ پکڑا گیا؟“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”نہیں۔۔۔ یہ فیس آؤٹ کر لیا گیا تھا کہ وہ اس رات کسی لڑکی کے ساتھ لاہور تک آیا تھا لیکن

اس کا اصرار ہے کہ وہ آپ نہیں تھیں۔ کوئی دوسری لڑکی تھی۔ اس کی کوئی گرل فرینڈ۔۔۔ اور اس نے اس

کا ثبوت بھی دے دیا ہے۔“

ڈاکٹر سیٹھ علی نے دانت طور پر یہ نہیں بتایا کہ وہ لڑکی کوئی طوائف تھی۔

”پولیس اسے گرفتار اس کے اپنے والد کی وجہ سے نہیں کر سکی۔ اس کے ثبوت دینے کے باوجود آپ کے گھروالوں کا بھی اصرار ہے کہ آپ کی گمشدگی میں وہی ملوث ہے۔ امامہ! کیا سزا لڑکا ہے یہ سالار سکندر؟“

ڈاکٹر سیٹھ علی نے اسے تفصیل بتاتے ہوئے اچانک بچھا۔

”بہت برا۔“ بے اقرار امامہ کے منہ سے نکلا۔ ”بہت ہی برا۔“

”مگر آپ تو یہ کہہ رہی تھیں کہ اس نے آپ کی بہت مدد کی ہے۔ پھر.....“

”ہاں، اس نے میری مدد کی ہے مگر وہ بہت برے کردار کا لڑکا ہے۔ میری مدد شاید اس نے اس لئے کی ہے کیونکہ میں نے ایک بار اسے فرسٹ ایڈ دی تھی۔ اس نے خود بخود کسی کی کوشش کی تھی تب۔ اور شاید اس لئے بھی اس نے میری مدد کی ہوگی کیونکہ میرا بھائی اس کا دوست ہے۔ ورنہ وہ بہت برا لڑکا ہے۔ وہ ذہنی مریض ہے۔ پتا نہیں عجیب یا تمہیں کہتا ہے۔ عجیب حرکتیں کرتا ہے۔“

امامہ کے ذہن میں اس وقت اس کے ساتھ کئے گئے سفر کی یاد تازہ تھی جس میں وہ پورا رات جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر سیٹھ علی نے سر ہلایا۔

”پولیس آپ کی فریڈز سے بھی پوچھ لیجئے کہ وہ کون سی پولیس گئی ہے۔ سمیٹر پشاور سے واپس آگئی ہے، مگر مریم نے سمیٹر کو یہ نہیں بتایا کہ آپ تمہارے یہاں ہیں۔ آپ اب سمیٹر سے رابطہ مت کریں۔ اسے فون بھی مت کریں کیونکہ ابھی وہ اس کے گھر کو اڑ آ رہی ہیں۔ پولیس کے اور فون کو بھی وہ خاص طور پر چیک کریں گے۔ بلکہ آپ اب کسی بھی دوست سے فون پر کالیکٹ مت کرنا۔ نہ ہی یہاں سے باہر جائے۔“

انہوں نے اسے ہدایت دی۔

”میرے پاس موبائل ہے۔ اس پر بھی کالیکٹ نہیں کر سکتی؟“

وہ چونکے۔

”آپ کا موبائل ہے؟“

”نہیں، اس لڑکے سالار کا ہے۔“

وہ سالار تک پہنچے گئے تو موبائل تک بھی پہنچ جائیں گے۔ ”وہ بات کرتے کرتے رک گئے۔“

”جو کال آپ نے ہمارے گھر کی تھی وہ اس موبائل سے تھی؟“ اس بار ان کی آواز میں جھجھکی

توشیح تھی۔

”نہیں، وہ میں نے سمیٹر کے گھر سے کی تھی۔“

”آپ اب اس موبائل پر دوبارہ کوئی کال کرنا نہ کال کر لیں گے۔“

وہ کچھ مطمئن ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

اگلے کچھ دنوں میں اسے ڈاکٹر سیٹھ علی نے اس کی تلاش کے سلسلے میں اور خبریں موصول ہوتی رہی تھیں۔ ان کے ذریعہ معلومات بھی جی تھے مگر وہ بے حد باوجود تھے۔ اسے برجیدہ وضوٹ اجارہ تھا۔ میڈیکل کالج، ہسپتال، کلاس، فیلوز..... ہاسٹل، روم، تیس اور فرینڈز..... ہاشم مبین نے اسے وضوٹ لے کے لئے بیڑ بھیجے کا سہارا نہیں لیا تھا۔ میڈیکل کالج میں اسے اس کے لئے رسوا کن ثابت ہوتا۔ وہ جس حد تک اس کی گمشدگی کو خفیہ رکھنے کی کوشش کر سکتے تھے کر رہے تھے، مگر وہ پولیس کی مدد حاصل کئے ہوئے تھے۔ ان کی ہمت بھی اس سلسلے میں ان کی پوری مدد کر رہی تھی۔

وہ لوگ سمیٹر تک پہنچ گئے تھے مگر وہ یہ جان نہیں پاتے تھے کہ وہاں اور آنے کے بعد اس کے گھر گئی تھی۔ شاید یہ سمیٹر کے ان دنوں پشاور میں ہونے کا نتیجہ تھا جن دنوں امامہ اپنے گھر سے چلی آئی تھی۔ ورنہ شاید سمیٹر اور اس کے گھروالوں کو بھی کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا۔

مریم نے سمیٹر کو امامہ کی اپنے ہاں موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس نے عملی طور پر یوں ظاہر کیا تھا جیسے امامہ کی اس طرح کی گمشدگی باقی سلاؤٹس کی طرح اس کے لئے بھی حیران کن بات تھی۔

☆.....☆.....☆

چند ہفتے گزر جانے کے بعد جب امامہ کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر سیٹھ علی کے ہاں محفوظ ہے اور کوئی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تو اس نے سالار سکندر کو فون کیا۔ وہ اس سے نکاح کے بیچہ نہ لینا چاہتی تھی اور جب پہلی بار یہ جان کر اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ سالار نے تو حلاق کا حق اسے تقویٰ کیا تھا ورنہ وہ اسے حلاق دینے کا کوئی ارادہ کرتا تھا۔

ڈاکٹر سیٹھ علی کے گھر پہنچنے کے بعد اس نے پہلی بار موبائل کا استعمال کیا تھا اور وہ بھی کسی کو بتائے بغیر اور سالار سے فون پر بات کرنے کے بعد اسے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہوا۔ اسے سالار جیسے شخص پر بھی کسی اس حد تک اعتماد نہیں کرنا چاہئے تھا اور اسے بیچہ نہ کو دیکھنے میں کتنا وقت لگ سکتا تھا جو اس نے انہیں دیکھنے سے اجتناب کیا اور پھر آخر اس نے بیچہ نہ کی ایک کاپی فوری طور پر اس سے کیوں نہیں لی۔ کم از کم اس وقت جب وہ اپنے گھر سے نکل آئی تھی۔

اسے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شخص اس کے لئے تنہی بڑی مصیبت بن گیا تھا اور آئندہ آنے والے دنوں میں..... وہ اب ہر بات پر بچتا رہی تھی۔ اگر اسے اندازہ ہو جا کہ وہ ڈاکٹر سیٹھ علی جیسے آدمی کے پاس پہنچ جائے گی تو وہ بھی بھی نکاح کرنے کی حماقت نہ کرے گی اور سالار جیسے آدمی کے ساتھ تو جی

بھی نہیں۔

اور اگر اسے یقین ہو تاکہ ڈاکٹر سید علی بر حالت میں اس کی مدد کریں گے تو وہ کم از کم سالار کے بارے میں ان سے بھوت نہ لپکتی پھر وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے، مگر اب جب وہ انہیں بڑے دھمے اور یقین کے ساتھ یہ یقین دلا رہی تھی کہ وہ کسی لڑکے کے ساتھ کسی بھی طرح ہوائوں میں تھی تو اس کاغذ کا انکشاف اور وہ بھی اس لڑکے کے ساتھ..... جس کی ہوائیوں کے بارے میں وہ ڈاکٹر سید علی سے بات کر چکی تھی اور جس کے بارے میں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ امام کے والدین نے اس کے خلاف اغوا کا کیس فائل کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اگر اب ڈاکٹر سید علی کو یہ حقائق بتائے گی تو کوشش کرے گی تو ان کا رد عمل کیا ہو گا اور وہ کم از کم اس وقت وہاں دھمکانے کو نہ لے لے تیار نہیں تھی۔

انگلے کی دن اس کی بھوک پیاس باغلق شتم ہو گئی۔ مستقبل یک دم بھوت بن گیا تھا اور سالار سکندر..... اسے اس شخص سے اتنی نفرت محسوس ہو رہی تھی کہ اگر وہ اس کے سامنے آ جاتا تو وہ اسے شوت کر دیتی۔ اسے جیج جیج خدشے اور اندیشے تک کرتے رہتے۔ پہلے اگر اسے صرف اپنے گھر والوں کا خوف تھا تو اب اس خوف کے ساتھ سالار کا خوف بھی شامل ہو گیا تھا اگر اس نے بھی میری تلاش شروع کر دی تو اور اس کے ساتھ ہی اس کی حالت خیر ہونے لگی۔

ان کا وزن یک دم کم ہونے لگا تھا۔ وہ پہلے بھی خاموش رہتی تھی مگر اب اس کی خاموشی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ شدید ذہنی دباؤ میں تھی اور یہ سب کچھ ڈاکٹر سید علی اور ان کے گھر کے افراد سے پوشیدہ نہیں تھا۔ ان سب نے اس سے باری باری ان اچانک آنے والی تبدیلیوں کی وجہ جاننے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں ناکافی رہی۔

”تم پہلے بھی ادا اس پریشان لگتی تھی مگر اب ایک دو ہفتے سے بہت زیادہ پریشان لگتی ہو۔ کیا پریشانی ہے امام؟“

سب سے پہلے مریم نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا۔

”نہیں، کوئی پریشانی نہیں۔ بس میں گھر کو مس کرتی ہوں۔“

امام نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں، میں یہ نہیں مان سکتی۔ آخر اب اچانک اتنا کمزور مہ کرنے لگی انہیں کہ کھانا پینا بھول گئی ہو۔ چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے لگے ہیں اور وزن کم ہوتا جا رہا ہے۔ کیا تم تیار ہو تا جانتی ہو؟“

وہ مریم کی کہی ہوئی کسی بات کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی بھی اس کی پریشانی کا اندازہ پکائی نہ لے سکتا تھا اور شاید یہ اندازہ بھی کہ یہ پریشانی کسی نئے مسئلے کا نتیجہ

تھی مگر وہ اس معاملے میں بے بس تھی۔ وہ سالار کے ساتھ ہونے والے نکاح اور اس سے متعلق خدشات کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پا رہی تھی۔

”مجھے اب اپنے گھر والے زیادہ یاد آنے لگے ہیں۔ جوں جوں دن گزر رہے ہیں مجھے زیادہ یاد آ رہے ہیں۔“

امام نے مدغم آواز میں اس سے کہا اور یہ بھوت نہیں تھا، اسے واقعی اب اپنے گھر والے پہنچنے سے زیادہ یاد آنے لگے تھے۔

وہ بھی ابھی اتنا ہلکا عرصہ ان سے الگ نہیں رہی تھی اور وہ بھی مکمل طور پر اس طرح کٹ کر..... لاہور باطل میں رہتے ہوئے بھی وہ مینے میں ایک بار ضرور اسلام آباد جاتی اور ایک دو پار و سیم یا پاشم مین لاہور اس سے ملنے پہنچے آتے اور فون پر زیادہ محبت تھی وہ خواہوں اور خیالوں کے علاوہ نظر آئی نہیں سکتے تھے۔ وہ مسند میں موجود کسی ویران جزیرے پر آن ٹپھی ہو۔ جہاں دور دور تک کوئی تھا ہی نہیں اور وہ چہرے..... جن سے اسے سب سے زیادہ محبت تھی وہ خواہوں اور خیالوں کے علاوہ نظر آئی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ مریم اس کے جواب سے مطمئن ہوئی یا نہیں مگر اس نے موضوع بدل دیا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو گا کہ اس طرح اس کا ذہن بٹ جائے گا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر سید علی کی تین بیٹیاں تھیں، مریم ان کی تیسری بیٹی تھی۔ ان کی بڑی دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ جب کہ مریم اور بیٹی بیٹی کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ڈاکٹر سید علی نے امام کو اپنی بڑی دونوں بیٹیوں سے بھی متعارف کر دیا تھا۔ وہ دونوں بیرون شہر مقیم تھیں اور ان کا رابطہ زیادہ تر فون کے ذریعہ ہی ہوتا تھا مگر یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ امام کے وہاں آنے کے چند عرصوں کے دوران وہ دونوں باری باری یک دھم دونوں کے لئے وہاں آئیں۔

امام سے ان کا رویہ یہ مریم سے مختلف نہیں تھا۔ ان کے رویے میں اس کے لئے محبت اور مانوسیت کے علاوہ کچھ نہیں تھا لیکن امام کو انہیں دیکھ کر ہمیشہ اپنی بڑی بیٹیوں یاد آ جاتیں اور پھر سب سے کچھ یاد آ جاتا۔ اپنا گھر..... بابا..... بڑے بھائی..... و سیم..... اور سعد..... سعد سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ ان کی جماعت کے بااثر خاندان اپنے گھروں میں اولاد ہونے کے باوجود بے سہارا ایٹیم بچوں میں سے کسی ایک لڑکے کو کوڈ لینے لگے تھے۔ یہ اپنی جماعت کے افراد کی مستقبل میں تقدار بدھانے کے لئے کوششوں کا ایک ضروری حصہ تھی۔ ایسا کچھ ہمیشہ عام مسلمانوں کے بچوں میں سے ہی ہوتا اور ہمیشہ لڑکا ہوتا۔ سعد ہی اسی سلسلے میں بہت چھوٹی مریم اس کے گھر آتا تھا۔ وہ اس وقت اسکول کے آخری سالوں میں تھی اور اسے گھر میں ہونے والے اس عجیب اضافے نے کچھ حیران کیا تھا۔

”ہم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر ادا کرنے کے لئے سعد کو گود لیا ہے، تاکہ ہم بھی دوسروں کو لوگوں پر احسانات کر سکیں اور نیکی کا یہ سلسلہ جاری رہے۔“
اس کی امی نے اس کے استسار پر اسے بتایا تھا۔
”تم سمجھو وہ تہیہ را چھوڑا بھائی ہے۔“

تب اسے اپنے باپا اور امی پر بہت فخر ہوا تھا۔ وہ کہتے عقیم لوگ تھے کہ ایک سے سہا اپنے کو اچھی زندگی دینے کے لئے گھر لے آئے تھے، اسے اپنا نام دے رہے تھے۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کے ساتھ ہاٹ رہے تھے۔ اس نے تب غور نہیں کیا تھا کہ ایسا ہی ایک بچہ اس کے تایا اعظم کے گھر پر بھی کیوں تھا۔ ایسا ہی ایک بچہ اس کے چھوٹے چچا کے گھر پر کیوں تھا؟ ایسے ہی بہت سے دوسرے بیٹے ان کے جاننے والے کچھ اور بااثر خاندانوں کے گھر پر کیوں تھے؟ اس کے لئے بس یہی کافی تھا کہ وہ ایک اچھا کام کر رہے تھے۔ ان کی جماعت ایک ”افیس کام“ کی رونق کر رہی تھی۔ یہ اس نے بہت بعد میں جانتا تھا کہ اس ”افیس کام“ کی حقیقت کیا تھی؟

سعد اس سے بہت ناموس تھا۔ اس کا زیادہ وقت امامہ کے ساتھ ہی گزر رہا تھا۔ وہ شروع کے کئی سال امامہ کے کمرے میں اس کے بیڈ پر ہی سو کر پڑا اسلام قبول کر لینے کے بعد میڈیکل کالج سے وہ جب بھی اسلام آباد آتی، وہ سعد کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بتاتی رہتی۔ وہ اچھا چھوٹا تھا کہ کسی چیز کو لفظی طریقے سے نہیں سمجھا یا سکتا تھا مگر وہ اس سے صرف ایک بات کہتی رہی۔
”جیسے اللہ ایک ہو تب اسی طرح تمہارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایک ہی ہیں۔ ان سا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“

وہ اسے ساتھ یہ تاکید بھی کرتی رہتی کہ وہ ان دونوں کی آپس کی باتوں کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتائے اور امامہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی یہ کوشش بے کار تھی۔ سعد کو بچپن ہی سے مذہبی اہتمامات میں لے جایا جانے لگا تھا اور وہ اس اثر کو قبول کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے سوچتی رہتی کہ وہ میڈیکل کی تعلیم کے بعد سعد کو لے کر اپنے گھر والوں سے الگ ہو جائے گی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ کس قدر مشکل کام تھا۔ اس نے گھر سے بھاگتے ہوئے بھی سعد کو اپنے ساتھ لے آئے گا سوچا تھا مگر یہ کام ناممکن تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اسے لاتے ہوئے خود بھی پکڑی جائے۔ وہ اسے وہاں چھوڑ آتی تھی اور اب ڈاکٹر سید علی کے پاس پہنچ جاتے کے بعد اسے اس کا بار بار خیال آتا کہ وہ کسی طرح اسے وہاں لے آتی تو وہ بھی اس دلدل سے نکل سکتا تھا مگر ان تمام سوچوں، تمام خیالوں نے اپنے گھر والوں کے لئے اس کی محبت کو کم نہیں کیا نہ اپنے گھر والوں کے لئے نہ جلال اصر کے لئے۔

وہ ان کا خیال آنے پر جو روٹا شروع ہوئی تو ساری رات روتی رہی۔ شروع کے دنوں میں وہ

ایک الگ کمرے میں تھی اور مریم کو اس کا اندازہ نہیں تھا مگر ایک رات وہ اچانک اس کے کمرے میں اپنی کوئی کتاب لینے آئی۔ رات کے پچھلے پہر اسے قطعاً یہ اندازہ نہیں تھا کہ امامہ جاگ رہی ہو گی اور نہ صرف جاگ رہی ہو گی بلکہ رورہی ہو گی۔

امامہ کمرے کی لاکٹ آف کئے اپنے بیڈ پر کھل اوڑھے رورہی تھی جب اچانک دروازہ کھلا تو اس نے کھل سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ وہ نہیں جانتی تھی مریم کو کیسے اس کے جاگنے کا اندازہ ہوا تھا۔
”امامہ! جاگ رہی ہو؟“

اس نے امامہ کو آواز دی۔ امامہ نے حرکت نہیں کی مگر پھر مریم اس کی طرف چلی آئی اور اس نے کھل اس کے پہرے سے ہٹا دی۔

”میرے اللہ..... تم رورہی ہو..... اور اس وقت.....؟“
وہ اس کے پاس ہی تشویش کے عالم میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ امامہ کی آنکھیں بری طرح سو جی ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیا ہوا تھا، مگر اسے سب سے زیادہ غم امت اس کی طرح پکڑے جانے کی تھی۔

”اس لئے تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی کیونکہ تم روتی رہتی ہو اور صبح یہ کہہ دیتی ہو کہ رات کو سونے میں دقت ہوئی اس لئے آنکھیں سو جی ہوئی ہیں۔ بس تم آج سے یہاں نہیں سوؤ گی۔ اٹھو میرے کمرے میں چلو۔“

اس نے کچھ برہمی کے عالم میں اسے سمجھ کر اٹھایا۔ امامہ ایک لفظ نہیں بولی تھی۔ وہ اس وقت بے حد شرمندہ تھی۔

مریم نے اس کے بعد اسے اپنے کمرے میں ہی سلائے شروع کر دی۔ راتوں کو یہ تک رونے کا وہ ختم ہو گیا مگر نیند پر اس کااب بھی کوئی اختیار نہیں تھا۔ اسے نیند بہت دیر سے آتی تھی۔
کئی بار مریم کی عدم موجودگی میں اس کی میڈیکل کی کتابیں دیکھتی اور اس کا دل بھر آتا۔ وہ جانتی تھی سب کچھ بہت پیچھے رو گیا تھا۔

صبح مریم اور ڈاکٹر سید علی کے گھر سے چلے جانے کے بعد وہ سارا دن آگنی کے ساتھ گزار دیتی یا شاید وہ سارا دن اس کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ اسے اکیلا نہ رہنے دینے کی کوشش میں مصروف رہتی تھیں مگر ان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی وہ نہیں کن کن سوچوں میں ڈوبتی رہتی تھی۔

اس نے سالار کے ساتھ وہ بار بار ایلر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کی ذہنی پریشانی میں اضافے کے علاوہ اس ریلے سے اسے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔

اسے ڈاکٹر سہیل علی کے ہاں آئے تین ماہ ہو گئے تھے جب ایک دن انہوں نے رات کو اسے بلایا۔
 ”آپ کو نا کھر چھوڑے کچھ وقت گزر گیا ہے۔ آپ کے گھر والوں نے آپ کی تلاش ابھی تک ختم تو نہیں کی ہو گی مگر چند ماہ پہلے والی تندی و تیزی نہیں رہی ہو گی اب..... میں جانتا چاہتا ہوں کہ آپ اب آگے کیا کرنا چاہتی ہیں۔“
 انہوں نے مختصر تجویز کے بعد کہا۔
 ”میں نے آپ کو بتایا تھا میں اسٹریز جاری رکھنا چاہتی ہوں۔“
 وہ اس کی بات پر کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے کہا۔
 ”امام! آپ نے اپنا شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ وہ ان سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

”شادی.....؟ کیا مطلب.....؟“ وہ بے اختیار بھلائی۔

”آپ جن حالات سے گزر رہی ہیں ان میں آپ کے لئے، سب سے بہترین راستہ شادی ہی ہے کسی اچھی فیملی میں شادی ہو جانے سے آپ اس عدم تحفظ کا فکارت نہیں رہیں گی جس کا فکارت آپ ابھی ہیں۔ میں چند اچھے لڑکوں اور فیملیز کو جانتا ہوں میں چاہتا ہوں ان میں سے کسی کے ساتھ آپ کی شادی کر دی جائے۔“

وہ بالکل سفید چہرے کے ساتھ انہیں چپ چاپ دیکھتی رہی۔ وہ ان کے پاس آنے سے بہت پہلے اپنے لئے اسی مل کو منتخب کر چکی تھی اور اسی ایک مل کو حوصلے و دھڑکتے وہ سالار سکندر سے نکاح کی صداقت کر چکی تھی۔

اس وقت اگر وہ سالار سکندر سے راضی نہ کر چکی ہوتی تو وہ بلا حیل و دھت ڈاکٹر سہیل علی کی بات ماننے پر تیار ہو جاتی۔ وہ جانتی تھی ان حالات میں کسی اچھی فیملی میں شادی اسے کتنی اور کن مصیبتوں سے بچا سکتی تھی۔ اس نے آج تک کبھی خود مختار زندگی نہیں گزاری تھی۔ وہ اپنی ہر چیز کے لئے اپنی فیملی کی محتاج رہی تھی اور وہ یہ تصور کرتے ہوئے بھی خود فرد رہتی تھی کہ آخر وہ کب اور کس طرح صرف اپنے مل بوتے پر زندگی گزار سکے گی۔

مگر سالار سے وہ نکاح اس کے گلے کی ایسی بڑی بن گیا تھا جسے وہ نہ لگ سکتی تھی اور نہ اگل سکتی تھی۔
 ”میں میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔“

”کیوں؟“ اس کے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا، مگر حقیقت بتانے کے لئے حوصلہ نہیں تھا۔
 ڈاکٹر سہیل علی اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں کہ وہ ایک جھوٹی لڑکی ہے جو اب تک انہیں دھوکا دیتے ہوئے ان کے پاس رہ رہی تھی۔

”یہ کیا کہ شاید..... وہ سالار سے شادی کے لئے ہی اپنے گھر سے نکلی تھی اور باقی سب کچھ کے بارے میں جھوٹ بول رہی تھی۔“

اور اگر انہوں نے حقیقت جان لینے پر اس کی مدد سے معذرت کر لی یا اسے گھر سے چلے جانے کا کہا تو.....؟ اور اگر انہوں نے اس کے والدین سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو.....؟ وہ تین ماہ سے ڈاکٹر سہیل علی کے پاس تھی۔ وہ کتنے اچھے انسان تھے وہ بخوبی جانتی تھی لیکن وہ اس قدر خود فرد اور محتاط تھی کہ وہ کسی قسم کا رسک لینے پر تیار نہیں تھی۔

”میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں تاکہ کسی پر بھی بوجھ نہ بنوں۔ کسی پر بھی..... شادی کر لینے کی صورت میں اگر مجھے بعد میں کسی بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تو میں کیا کروں گی۔ اس وقت تو میرے لئے شاید تعلیم حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہے گا۔“

اس نے ایک لمبی خاموشی کے بعد جیسے کسی فیصلہ پر پہنچتے ہوئے ڈاکٹر سہیل علی سے کہا۔
 ”امام! ہم ہمیشہ آپ کی مدد کرنے کے لئے موجود رہیں گے۔ آپ کی شادی کر دینے کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ میرے گھر سے آپ کا تعلق ختم ہو جائے گا یا میں آپ سے جان چھڑانا چاہتا ہوں..... آپ میرے لئے چوتھی بیٹی ہیں۔“
 امام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”میں آپ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گا جو آپ چاہیں گی وہی ہو گا یہ صرف میری ایک تجویز تھی۔“
 ڈاکٹر سہیل علی نے کہا۔
 ”کچھ سال گزر جانے دیں اس کے بعد میں شادی کر لوں گی۔ جہاں بھی آپ کہیں گے۔“ اس نے ڈاکٹر سہیل علی سے کہا۔ ”مگر ابھی فوری طور پر نہیں۔“

ابھی مجھے سالار سکندر سے جان چھڑانی ہے۔ اس سے طلاق لینے کا کوئی راستہ تلاش کرنا ہے۔“
 وہ ان سے بات کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”کس شہر میں پڑھنا چاہتی ہیں آپ؟“
 ڈاکٹر سہیل علی نے اس پر مزید کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔
 ”کسی بھی شہر میں، دیوبند کوئی ترجیح نہیں ہے۔“ اس نے ان سے کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے گھر سے آتے ہوئے اپنے سارے ڈاکو منتس اپنے پاس موجود دیوارات اور رقم بھی لے آئی تھی۔ جب ڈاکٹر سہیل علی نے اسے لکھنؤ کے چند دن بعد ایک دن اسے بلا کر ملتان میں اس کے ایڈمیشن کے فیصلے کے بارے میں بتانے کے ساتھ اس کے ڈاکو منتس کے بارے میں پوچھا تو وہ اس بیک کو لے کر

ان کے پاس چلی آئی اس نے ڈاکٹمنس کا ایک لفافہ نکال کر انھیں دیا پھر زیورات کا لفافہ نکال کر بھی ان کی میز پر رکھ دیا۔

"میں یہ زیورات اپنے گھر سے لائی ہوں۔ یہ بہت زیادہ تو نہیں ہیں مگر پھر بھی اتنے ہیں کہ انہیں بچہ کچھ عرصہ میں اسانی سے اپنی تعلیم کے اخراجات اٹھا سکتی ہوں۔"

"نہیں، یہ زیورات بیچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ کی شادی میں آپ کے کام آئیں گے جہاں تک تعلیمی اخراجات کا تعلق ہے تو آپ کو پتا ہونا چاہئے کہ آپ میری ذمہ داری ہیں۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ بات کرتے کرتے چوتھے۔ ان کی نظر اس کے ٹیبل پر رکے چھوٹے سے کھلے جگہ کے اندر تھی۔ امام نے ان کی نظروں کا تقابض کیا۔ وہ بیگ میں نظر آنے والے چھوٹے سے پتول کو دیکھ رہے تھے۔ امام نے قدرے شرمندگی کے عالم میں اس پتل کو بھی نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

"یہ میرا پتل ہے۔ میں یہ بھی گھر سے لائی ہوں، میں نے آپ کو بتایا تھا مجھے سالار سے مدد ملنی تھی اور وہ اچھا لڑکا نہیں تھا۔"

وہ انہیں اس کے بارے میں مزید نہیں بتا سکتی تھی۔ ڈاکٹر سیٹھ علی پتول کو اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔

"چلاؤ آتا ہے آپ کو اسے؟"

امام نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

"کاٹ میں این سی سی کی ٹریننگ ہوتی تھی۔ میرا بھائی وسم بھی رائل نکل شک کلب میں جایا کرتا تھا کبھی کبھار مجھے بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے بابا سے مذکر کے خریدے تھا۔ یہ گولڈ پیڈنڈ ہے۔"

وہ ان کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتول کو دیکھتے ہوئے دم دم آواز میں کہہ رہی تھی۔

"آپ کے پاس اس کا لائسنس ہے؟"

"ہے مگر وہ ساتھ لے کر نہیں آئی۔"

"پھر آپ اسے یہیں پر رہنے دیں۔ ملتان ساتھ لے کر نہ جائیں۔ زیورات کو لا کر میں رکھا دیتے ہیں۔" امام نے سر ہلایا۔

☆ ☆ ☆

وہ چند ماہ کے بعد ملتان اپنی اسٹڈنٹ کے سلسلے کو ایک بار پھر جاری رکھنے کے لئے آگئی تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر، دوسرے شہر سے تیسرے شہر۔ ایک ایسا شہر جس کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا، مگر اس نے تو خواب میں اور بہت کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ کیا اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ بیس سال کی عمر میں ایک بار پھر بی ایس سی میں داخلہ لے گی۔ اس عمر میں جب لڑکیاں بی ایس سی کر

چکی ہوتی ہیں۔

کیا اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے میڈیکل کالج چھوڑ دے گی۔

کیا اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ اپنے والدین کے لئے کبھی اس قدر تکلیف اور شرمندگی کا باعث بنے گی۔

کیا اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ اس جگہ کے بجائے کسی اور سے محبت کرے گی اور پھر اس سے شادی کے لئے یوں پاگلوں کی طرح کوشش کرے گی۔

کیا اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ ان کوششوں میں ناکامی کے بعد وہ سالار سکندر جیسے کسی لڑکے کے ساتھ اپنی مرضی سے نکاح کر لے گی۔

اور کیا اس نے یہ سوچا تھا کہ ایک بار گھر سے نکل جانے کے بعد اسے ڈاکٹر سیٹھ علی کے گھر آنے جیسا گھر مل سکے گا۔

اسے باہر کی دنیا میں پھرنے کی عادت نہیں تھی اور اسے باہر کی دنیا میں پھرنا نہیں پڑا تھا۔ اپنے گھر سے نکلنے وقت اس نے اللہ سے اپنی حفاظت کی بے تحاشا دعا مانگی تھی۔ اس نے دعائیں کی تھیں کہ اسے در بدر نہ پھرتا پڑے۔ وہ اتنی بول نہ تھی کہ مردوں کی طرف ہر جگہ دندناتی پھرتی۔

اور واقعی نہیں جانتی تھی کہ جب اسے اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے سلسلے میں خود جگہ جگہ پھرتا پڑے گا۔ ہر طرح کے مردوں اور لوگوں کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ کیسے کرے گی۔ وہ بھی اس صورت میں جب کہ اس کے پیچھے چلتی بیک گراؤنگ نام کی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔

اپنی فیملی کے سامنے کے نیچے لاہور آکر میڈیکل کالج میں پڑھنا اور آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے باہر جانے کے خواب دیکھنا اور بات تھی۔ تب اس کے لئے کوئی مالی مسائل نہیں تھے اور ہاشم بین احمد کے پاس اتنی دولت اور اثر و رسوخ تھا کہ صرف ہاشم بین احمد کے نام کا حوالہ کسی بھی شخص کو اس سے بات کرتے ہوئے مرعوب اور محتاط کر دینے کے لئے کافی تھا۔

گھر سے نکلنے کے بعد اسے جس ماحول کے سامنے کاغذ تھا اس ماحول کا سامنا اسے نہیں کرنا پڑا تھا۔ پہلے سالار سکندر اسے خیریت لاہور چھوڑ گیا تھا اور اس کے بعد ڈاکٹر سیٹھ علی تک رسائی جس کے بعد اسے اپنے چھوٹے بڑے کسی کام کے لئے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

ڈاکٹمنس میں نام کی جدلی، ملتان میں ایلمینٹن۔ ہاسٹل میں رہائش کا انتظام۔ اس کے تعلیمی اخراجات کی ذمہ داری۔ وہ اس ایک فوج کے لئے اللہ کا جتنا شکر ادا کرتی وہ کم تھا۔ کم از کم اسے کسی بڑے ماحول میں جلائی جنگ لڑنے کے لئے جگہ دیکھ کھانے نہیں پڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ ملتان چلی آئی، یہ اس کے لئے زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ ایک مشکل اور تکلیف دہ دور۔۔۔۔۔ وہ پائل میں رہ رہی تھی اور وہ عجیب زندگی تھی۔ بعض دفعہ اسے اسلام آباد میں اپنا گھر اور خاندان کے لوگ اتنی شدت سے یاد آتے کہ اس کا دل چاہتا وہاں لوگ اس کے پاس چلی جائے۔ بعض دفعہ وہ بغیر کسی وجہ کے رونے لگتی۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا وہ جلال اضر سے رابطہ کرے۔ اسے وہ بے تحاشہ یاد آتے۔ وہ بی ایس سی کر رہی تھی اور اس کے ساتھ بی ایس سی کرنے والی لڑکیاں وہی تھیں جو ایک ایس سی میں میرٹ لسٹ پر نہیں آ سکی تھیں اور اب وہ بی ایس سی کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں جانے کی خواہش مند تھیں۔

”میڈیکل کالج ڈاکٹر“ اس کے لئے بہت عرصے تک یہ دونوں الفاظ ٹھٹھرتے رہے۔ کئی بار وہ اپنے ہاتھ کی لکڑیوں کو دیکھ کر حیران ہوتی رہتی۔ آخر وہاں کیا تھا جو ہر چیز کو فطری کی ریت بنا رہا تھا۔ کئی بار اسے جوہر سے کی جانے والی اپنی یاد آتیں۔

”میں اگر ڈاکٹر نہیں بن سکتی تو میں تو زندگی نہیں رہ سکوں گی۔ میں مر جاؤں گی۔“

وہ حیران ہوتی وہ عمری تو نہیں تھی۔ اسی طرح زندہ تھی۔

”پاکستان کی سب سے مشہور آئی سیٹلسٹ؟“

سب کچھ ایک خواب ہی رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ ہر چیز کے اپنے پاس تھی وہ ہر چیز سے اتنا دور تھی۔ اس کے پاس گھر نہیں تھا۔

اس کے پاس گھر والے نہیں تھے۔ اس کے پاس اسجد نہیں تھا۔ میڈیکل کی تعلیم نہیں تھی۔

جلال بھی نہیں تھا۔ وہ زندگی کی ان آسائشوں سے ایک ہی جھٹکے میں عرصہ عرصہ ہو گئی تھی جن کی وہ عادی تھی اور اس کے باوجود وہ زندہ تھی۔ امامہ کو کبھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر بہادر تھی یا کبھی ہو سکتی تھی مگر وہ ہو گئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تکلیف میں کمی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یوں جیسے اسے صبر آ رہا تھا۔ اللہ کے بعد شاید زمین پر یہ ڈاکٹر سہیل تھے جن کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی تھی۔

میں نے ایک بار دیکھا ایڈر وہ ان کے پاس لاہور آئی۔ وہ تو خالقِ ہاں فون کرتے رہتے، اسے کچھ نہ کچھ سمجھاتے رہتے۔ ان کی بیٹیاں اور بیوی بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ ان کے نزدیک ان کے گھر کا ایک فرد بن چکی تھی اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو یہاں کیا ہوتا۔ وہ کئی بار سوچتی۔

☆ ☆ ☆

ملتان میں اپنے قیام کے دوران بھی اس نے سالار سکندر کو کبھی اپنے ذہن سے فراموش نہیں کیا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ طور پر شروع کرنے کے بعد وہ ایک بار اس سے رابطہ کرنا چاہتی تھی اور اگر وہ

پھر اسے خلاق دینے سے انکار کر دیتا تو وہ اب بالآخر ڈاکٹر سہیل علی کو اس تمام معاملے کے بارے میں بتا دیتا چاہتی تھی۔

اور سالار سے رابطہ اس نے بی ایس سی کے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد لاہور آنے سے پہلے کیا۔ اپنے پاس موجود سالار کے موبائل کا استعمال وہ بہت پہلے ترک کر چکی تھی۔

وہ مبین جاتی تھی کہ دو سال کے عرصہ میں سالار وہاں ہی موبائل نمبر کو استعمال کرنا شروع کر چکا ہے یا پھر اس نے نمبر کو استعمال کر رہا تھا جو اس نے اپنے موبائل دے دینے کے بعد دیا تھا۔

ایک بی بی او سے اس نے سب سے پہلے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔

اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اب وہ کوئی تیسرا نمبر لے ہوئے تھا اور وہ نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے بالآخر اس کے گھر کا نمبر ڈائل کیا کچھ دیر تک بلی ہوئی رہی، پھر فون اٹھا لیا گیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ کسی عورت نے دوسری طرف سے کہا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ میں سالار سکندر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ امامہ نے کہا۔

”سالار صاحب سے۔۔۔۔۔ آپ کون بول رہی ہیں۔“

امامہ کو اپنا تک محسوس ہوا جیسے اس عورت کے کچھ میں یک دم جنس پیدا ہو گیا تھا۔

امامہ کو پتا نہیں کہ اس کی آواز سناساگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی چاکاں اس عورت نے بڑی پر جوش آواز میں کہا۔ ”امامہ بی بی آپ امامہ بی بی ہیں؟“

ایک کرنت کھا کر امامہ نے بے اختیار کرڈیل دیا۔ وہ کوئی تھی جس نے اسے صرف آواز سے پہچان لیا تھا۔ اتنے سالوں بعد بھی۔۔۔۔۔ اور اتنی جلدی اور وہ بھی سالار سکندر کے گھر پر۔۔۔۔۔

کچھ دیر اس کے ہاتھ کا پچھتے رہے۔ وہ بی بی او کے اندر والے لیکن میں تھی اور کچھ دیر ریسیور اسی طرح ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔

”جو بھی ہو مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسلام آباد سے اتنی دور ہوں کہ یہاں مجھ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ مجھے خود فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے سوچا پوری بی بی او کے مالک کو ایک بار پھر کال ملانے کے لئے کہا۔

فون کی کھنٹی بجنے پر اس بار فون فوراً اٹھا لیا تھا مگر اس بار بولے والا کوئی مرد تھا اور وہ سالار نہیں تھا۔ یہ وہ آواز تھی جس نے جان گئی تھی۔

”میں سالار سکندر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”آپ امامہ ہاشم ہیں؟“

مرد نے گھردری آواز میں کہا۔ اس بار امامہ کو کوئی شاک نہیں لگا۔

”جی۔“ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

”آپ ان سے میری بات کروادیں۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے اس مرد نے کہا۔

”کیوں؟“

”سالار زندہ نہیں ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“ بے اختیار امامہ کے حلق سے نکلا۔

”وہ مر گیا؟“

”ہاں۔۔۔“

”جب۔۔۔؟“

اس بار مرد خاموش رہا۔

”آپ سے آخری بار ان کا رابطہ کب ہوا؟“

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس آدمی نے کہا۔

”چند سال پہلے۔۔۔ ڈھائی سال پہلے۔“

”ایک سال پہلے اس کی زوجہ ہوئی ہے۔ آپ۔۔۔“

امامہ نے کچھ بھی اور سننے سے پہلے فون بند کر دیا۔ کچھ کہنے اور سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ آزاد ہو چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک انسان کے طور پر اسے اس کی موت پر افسوس ہونا چاہیے تھا مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اگر اس نے اس طرح اسے خالق دینے سے انکار نہ کیا ہوتا تو وہ یقیناً اس کے لئے دکھ محسوس کرتی مگر اس وقت ڈھائی سال کے بعد اسے بے اختیار سکون اور خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ توجہ دے کر اس کے سر اٹھی ہوئی تھی وہ غائب ہو چکی تھی۔

اسے اب ڈاکٹر سید علی کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صبح معنوں میں آزاد ہو چکی تھی وہ اس کا دہاں بائیں میں آخری دن تھا اور اس رات اس نے سالار سکندر کے لئے بخشش کے لئے دعا کی۔ وہ اس کی موت کے بعد اسے معاف کر چکی تھی اور وہ اس کی موت پر بے پناہ خوش تھی۔

☆ ☆ ☆

اس سے فون پر بات کرنے والی وہی ملازمہ تھی جو سالار کے ساتھ ساتھ اس کے گھر میں بھی کام کرتی رہی تھی اور اس نے امامہ کی آواز کو فوراً پہچان لیا تھا۔ امامہ کے فون بند کرتے ہی وہ کچھ اضطراب اور جوش و خروش کے عالم میں سکندر عثمان کے پاس پہنچ گئی۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس دن طبیعت کی

خرابی کی وجہ سے وہ گھر پر ہی تھے۔

”ابھی کچھ دیر پہلے ایک لڑکی کا فون آیا ہے۔ وہ سالار صاحب سے بات کر چکا تھا جی۔“

”تو تم بات کروادیتیں۔“ سکندر عثمان نے قدرے لا پرواہی سے کہا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ

سالار بھی ان دنوں پاکستان آیا ہوا تھا اور گھر پر ہی موجود تھا۔ ملازمہ کچھ ہنگامی۔

”صاحب جی! وہ امامہ کی بی بی تھیں۔“

سکندر عثمان کے ساتھ سے چائے کا کپ چھوٹے چھوٹے بچا، وہ ایک دم حواس باختہ نظر آنے لگا۔

”امامہ ہاشم۔ ہاشم بنین کی بیٹی؟“ ملازمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سکندر عثمان کا سر گھومنے لگا۔

”تو کیا سالار ہر ایک کو بے وقوف بناتا رہا ہے۔ وہ ابھی تک امامہ کے ساتھ رابطے میں ہے اور وہ

چاہتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ تو پھر یقیناً وہ اس سے ملنا بھی رہا ہوگا۔“ انہوں نے بے اختیار سوچا۔

”اس نے تمہیں خود اپنا نام بتایا؟“ انہوں نے چائے کا کپ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔۔۔ میں نے ان کی آواز پہچان لی اور جب میں نے ان کا نام لیا تو انہوں نے فون بند کر

دیا۔“ ملازمہ نے سکندر عثمان کو بتایا۔ ”مگر مجھے یقین ہے وہ ان ہی کی آواز تھی۔ مجھے سمجھ ازم اس بارے

میں کوئی دھوکہ نہیں ہو سکتا۔“ اس سے پہلے کہ سکندر عثمان کچھ کہتے انہوں نے فون کی گھنٹی سنی مگر اس بار

وہ ڈاکٹنگ روم میں موجود انٹیشن کی طرف بڑھ گئے اور انہوں نے فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف موجود

لڑکی ایک بار پھر سالار سکندر کا پوچھ رہی تھی۔ ان کے احتشاد پر اس نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ وہ امامہ ہاشم

ہی تھی۔ وہ نہیں جانتے کیوں مگر بے اختیار ان کے دل میں آیا کہ وہ اسے سالار کے مرنے کی خبر دے

دیں، تاکہ وہ وہ بارہ بھی ان کے گھر فون نہ کرے۔ انہیں اس سے بات کر کے یہ اندازہ تو ہو ہی چکا تھا

کہ وہ بہت عرصے سے سالار کے ساتھ رابطہ نہیں کر سکی ہے اور اس کے پاس ان کے بیان کی صداقت کو

پرکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ وہ بارہ رابطہ نہ کرتی تو ان کی جان اس سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ سکتی تھی۔

وہ ابھی تک اس ایک سال کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتے تھے۔ جب امامہ کی گمشدگی کے فوراً بعد سالار

پر شبہ ہونے کی وجہ سے ہاشم بنین امامہ نے ان کے لئے ہر قسم کی پریشانی کوڑی کی تھی۔

بہت سے سرکاری دفاتر جہاں پہلے ان کی خدمت کی فائز بہت آسانی سے نکل آتی تھیں۔ معینوں

پہنچی رہیں۔ ان کے گھر دھمکی آمیز کا لڑو خط آتے رہے۔ کئی لوگوں نے بالواسطہ طور پر ان پر دباؤ

ڈالا کہ وہ ہاشم بنین امامہ کی بیٹی کی واپسی کے لئے ان کی مدد کریں۔ ایک لمبے عرصے تک سالار کی نگرانی کی

گئی اور نگرانی کا یہ سلسلہ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ برہمنی جاری رہا، مگر جب کسی طرح بھی امامہ سے اس کے

رابطے کا کوئی ثبوت یا سراغ نہیں ملا تو قدرے وقت پر تمام مگر مہاں ختم ہو گئیں۔

سکندر عثمان کی بے پناہ کوشش کے باوجود بھی ہاشم بنین کے ساتھ ان کے تعلقات بے حال نہیں

ہوئے مگر ان کی طرف سے عدم توجہ کا اندیشہ ختم ہو گیا تھا اور اب ڈھائی سال بعد وہ لڑکی ایک بار پھر سالار سے رابطہ کرنا چاہتی تھی وہ کسی صورت بھی دوبارہ ان حالات کا سامنا نہ خود کرنا چاہتے تھے نہ ہی سالار کو کرنے دینا چاہتے تھے۔

اگر وہ خود ہاشم مبین احمد کی نگر کے آدمی نہ ہوتے تو اب تک وہ اس سے زیادہ نقصان اٹھا چکے ہوتے، جتنا نقصان انہوں نے اس ایک سال اور خاص طور پر شروع کے چند ماہ میں اٹھایا تھا۔ وہ امام کو اس طلاق نامے کی ایک کاپی بھجوانا چاہتے تھے جو سالار کی طرف سے انہوں نے تیار کیا تھا اور انہیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ جائز تھا یا نہیں۔ وہ صرف امام کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ سالار یا اس کے خاندان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہونا چاہیے نہ ہی ہوگا۔

اگر کچھ تھا بھی تو وہ سالار کی موت اور اس سے بھی پہلے کے تحریر شدہ اس طلاق نامے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا مگر یہ ایک اور اتفاق تھا کہ امام نے ان کی بات مکمل طور پر سے بغیر فون بند کر دیا انہوں نے فون کو ریس آؤٹ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ملتان کے ایک پی ای او کا ثابت ہوا۔ سالار ایک ہفتہ کے بعد واپس امریکہ جانے والا تھا اور انہوں نے اس ایک ہفتہ اس کی مکمل طور پر نگرانی کروائی۔ وہ ملازموں کو ہدایات دے چکے تھے کہ کسی کا بھی فون آئے وہ کسی بھی صورت سالار سے بات نہ کروائیں، وہ چاہے فون کسی مرد کا ہو یا عورت کا جب تک وہ خود یہ جان نہ لیتے کہ فون کرنے والا کون تھا۔ ملازمہ کو بھی وہ ہفتی کے ساتھ منع کر چکے تھے کہ وہ سالار کو امام کی اس کال کے بارے میں نہ بتائے۔ ایک ہفتے کے بعد جب سالار واپس امریکہ چلا گیا تو انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

سر پر آئی ہوئی آفت ایک بار پھر مل گئی تھی۔ سالار کی واپسی کے چند ہفتے کے بعد انہیں ایک لفافہ موصول ہوا تھا۔

امام نے لاہور واپس پہنچنے کے بعد وہ موبائل بیچ دیا تھا۔ وہ اسے واپس نہیں بھجوا سکتی تھی اور سالار کی وفات کے بعد اب یہ امکان نہیں تھا کہ کبھی اس کے ساتھ آنا سامنا ہونے کی صورت میں وہ اسے وہ موبائل واپس دے سکے گی۔ اس نے موبائل بیچنے سے ملنے والی رقم کے ساتھ اپنے پاس موجود کچھ اور رقم شامل کی۔ وہ اندازاً ان کا لڑکے کی عمر تھی، جو ڈھائی تین سال پہلے سالار نے ادا کئے ہوں گے اور چند دوسرے اخراجات جو اپنے گھر قید کے دوران اور وہاں سے لاہور فرار کے دوران سالار نے اس پر کئے تھے۔ اس کے ساتھ سکندر عثمان کے نام ایک مختصر نوٹ بھجوا دیا تھا۔ فریڈریکس۔ اس کے سر پر موجود اس آدمی کا قرض بھی اتر گیا تھا۔

اس رقم اور اس کے ساتھ ملنے والے نوٹ سے سکندر عثمان کو تسلی ہو گئی تھی کہ وہ دوبارہ اس سے رابطہ نہیں کرے گی اور یہ بھی کہ اس نے واقعی ان کی بات پر یقین کر لیا تھا۔

باب ۱۰

ملتان سے بی ایس سی کرنے کے بعد وہ لاہور چلی آئی تھی۔ اسے گھر چھوڑے تین سال ہوئے والے تھے اور اس کا خیال تھا کہ اب کم از کم اس طرح اسے تلاش نہیں کیا جائے گا، جس طرح پہلے کیا جاتا رہا تھا۔ اگر کیا بھی کیا تو صرف میڈیکل کالج پر نظر رکھی جائے گی۔ اس کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ اس نے پنجاب یونیورسٹی میں یکسٹری میں ایم ایس سی کے لئے ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ بے حد محتاط تھی۔ یہ لاہور تھا یہاں کسی بھی وقت کوئی بھی اسے پہچان سکتا تھا۔ ملتان میں وہ صرف چادر اوڑھ کر کالج جاتی تھی۔ لاہور میں اس نے نقاب لگانا شروع کر دیا۔

لاہور میں دوبارہ وہ ابھی کے بعد وہ ڈاکٹر سہیل علی کے ساتھ نہیں رہی تھی وہ سعید واماں کے پاس رہنے لگی تھی۔

سعیدہ اماں سے اس کی پہلی ملاقات ڈاکٹر سید علی نے ملتان جانے سے پہلے لاہور میں کروائی تھی۔ سعیدہ اماں کے بہت سے عزیز و اقارب ملتان میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر سید علی امامہ کو ان سے آگاہ کرنا چاہتے تھے، تاکہ ملتان میں قیام کے دوران کسی بھی ضرورت یا ایجنسی میں وہ ان کی مدد لے سکے۔

سعیدہ اماں ایک ہفتہ ستر سالہ بے حد باوقار اور ایکٹو عورت تھیں۔ وہ لاہور کے اندرون شیر میں ایک پرانی حویلی میں تنہا رہتی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا جبکہ دو بیٹے بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں مقیم تھے۔ وہ دونوں شادی شدہ تھے اور ان کے بے حد اصرار کے باوجود سعیدہ اماں باہر جانے پر تیار نہیں تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے باری باری ہری سال پاکستان آیا کرتے اور کچھ عرصہ قیام کے بعد واپس چلے جاتے تھے۔ ڈاکٹر سید علی نے ان کی قربت داری تھی۔ وہ ان کے گزن ہوتے تھے۔

ڈاکٹر سید علی نے امامہ کے بارے میں پہلے ہی سعیدہ اماں کو بتادیا تھا، اسی لئے جب وہ ان کے ساتھ ان کے گھر پہنچی تو وہ بڑی گرم جوشی سے اس سے ملی تھیں۔ انہوں نے ملتان میں موجود تقریباً پچھتر برس رشتہ دار کے بارے میں تفصیلات اس کے گوش گزار کر دی تھیں اور پھر شاید اس سب کو ناکافی جانتے ہوئے انہوں نے خود ساتھ چل کر اسے ہاسٹل چھوڑ آنے کی آفر کی تھی۔ ڈاکٹر سید علی نے نرمی سے رد کر دیا تھا۔

”نہیں آیا! آپ کو زحمت ہوگی۔“ ان کے بے حد اصرار کے باوجود وہ نہیں مانے تھے۔

”بہتر تو یہ ہے بھائی صاحب کہ آپ اسے میرے بھائیوں میں سے کسی کے گھر ٹھہرا دیں۔ بچی کو گھر جیسا آرام اور ماحول ملے گا۔“

انہیں اچانک ہاسٹل پر اعتراض ہونے لگا اور پھر انہوں نے ہاسٹل کی زندگی کے کئی مسائل کے بارے میں روشنی ڈالی تھی مگر ڈاکٹر سید علی اور خود وہ بھی کسی کے گھر میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ ہاسٹل بہترین آپشن تھا۔

☆.....☆.....☆

سعیدہ اماں سے اس کی دوسری ملاقات ملتان جانے کے چند ماہ بعد اس وقت ہوئی تھی، جب ایک دن اچانک اسے کسی خاتون ملاقاتی کی اطلاع ہاسٹل میں دی گئی تھی۔ کچھ دیر کے لئے وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہاں اس طرح اچانک اس سے ملنے کو ان کا شک تھا اور وہ بھی ایک خاتون۔ مگر سعیدہ اماں کو کچھ کہہ دیا تو وہ رو گئی۔ وہ اس سے اسی گرم جوشی سے ملی تھیں، جس طرح لاہور میں ملی تھیں۔ وہ تقریباً دو ہفتے ملتان میں رہی تھیں اور ان دو ہفتوں میں کئی بار اس سے ملنے آئیں۔ ایک بار وہ ان کے ساتھ ہاسٹل سے ان کے بھائی کے گھر بھی گئی۔

پھر یہ جیسے ایک معمول بن گیا تھا۔ وہ چند ماہ بعد ملتان آئیں اور اپنے قیام کے دوران باقاعدگی

سے اس کے پاس آتی رہیں۔ وہ خود جب سینے میں ایک بار لاہور آتی تو ان سے ملنے کے لئے بھی جاتی۔ کئی بار جب اس کی چھٹیاں زیادہ ہوتیں تو وہ اسے وہاں ٹھہرنے کے لئے اصرار کرتیں۔ وہ کئی بار وہاں رہی تھی۔ سرخ انگوٹھ کا بنانا وہ اوپر اٹھا لگتا تھا پھر یہ تنہائی کا وہ احساس تھا، جو وہ ان کے ساتھ شیئر کر رہی تھی۔ اس کی طرح وہ بھی تنہا تھیں۔ اگرچہ ان کی یہ تنہائی ان کے بعد وقت میل جول کی وجہ سے کم ہو جاتی تھی مگر اس کے باوجود امامہ ان کے احساسات کو بنا گوشش کے سمجھ سکتی تھی۔

لاہور واپس شفٹ ہونے سے بہت عرصہ پہلے ہی انہوں نے امامہ سے یہ جان لینے کے بعد کہ وہ ایم ایس کی لاہور سے کرنا چادر ہی ہے، اسے ساتھ رکھنے کے لئے اصرار کرنا شروع کر دیا۔

اسی عرصے کے دوران ڈاکٹر سید علی کی سب سے بڑی بیٹی ان کے پاس اپنے بچوں سمیت کچھ عرصہ کے لئے رہنے چلی آئیں۔ ان کے شوہر بی بی اننگ ڈی کے لئے بیرون ملک چلے گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر سید علی کے بچے تھے۔ جانے سے پہلے وہ اپنی پہلی کوان کے ہاں ٹھہرا گئے۔ ڈاکٹر سید علی کے گھر میں جب کہ کسی کی نہیں تھی مگر امامہ اب ان کے گھر میں رہنا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنے بیرون پر کھڑا ہونا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر سید علی کے احسانات کا وہ جو پہلے ہی اسے زیر بار کر رہا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ان کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کرے اور اس کے بعد اس کے چاب کرنے پر بھی وہ اسے کہیں اور رہنے نہ دیتے لیکن اگر وہ پہلے ہی علیحدہ رہائش اختیار کر سکتی تو اس کے لئے ان سے اپنی بات منوانا آسان ہوتا۔ سعیدہ اماں کا گھر اسے اپنی رہائش کے لئے بہت مناسب لگا تھا۔ وہ چاب شروع کرنے پر انہیں مجبور کر کے کرائے کی مدت کچھ نہ کچھ لینے پر مجبور کر سکتی تھی مگر ڈاکٹر سید علی شاید یہ سب کبھی گوارا نہ کرتے۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر سید علی کے لئے اس کا فیصلہ ایک شاک کی طرح تھا۔

”کیوں آؤ! امیرے گھر پر کیوں نہیں رہ سکتیں؟“ انہوں نے بہت چاراضی سے اس سے کہا۔ ”سعیدہ آپا کے ساتھ کیوں رہنا چاہتی ہیں؟“

”وہ بہت اصرار کر رہی ہیں۔“

”میں انہیں سمجھا دوں گا۔“

”نہیں، میں خود بھی ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں ان کے ساتھ رہوں گی تو ان کی تنہائی دور ہو جائے گی۔“

”یہ کوئی وجہ نہیں ہے۔ آپ ان کے پاس جب چاہیں جا سکتی ہیں، مگر ساتھ رہنے کے لئے نہیں۔“

”چلیزہ آپ مجھے وہاں رہنے کی اجازت دے دیں، میں وہاں زیادہ خوش رہوں گی۔ میں اب

آہستہ آہستہ اپنے بیرون پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔“

ڈاکٹر سید علی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”یہ وہی پرکڑے ہونے سے کیا مراد ہے آپ کی؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

”میں آپ پر بہت لمبے عرصے تک بوجھ نہیں بٹھا جاتی۔ پہلے ہی میں بہت سال سے آپ پر انحصار کر رہی ہوں، مگر ساری زندگی تو میں آپ پر بوجھ بن کر نہیں گزار سکتی۔“

وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ اسے لگا اس کے آخری جملے نے ڈاکٹر سید علی کو تکلیف دی تھی۔

اسے پچھتاوا ہوا۔

”میں نے کبھی بھی آپ کو بوجھ نہیں سمجھا آمنت! کبھی بھی نہیں۔ بنیال بوجھ نہیں ہوتی اور میرے لئے آپ ایک بچی کی طرح ہیں پھر یہ بات..... مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔“

”میں جانتی ہوں اب! مگر میں صرف اپنی فیلنگز کی بات کر رہی تھی۔ دوسرے پروفیشنل ہونا بہت تکلیف دہ بات ہے۔ میں سعیدہ اماں کے ساتھ رہ کر زیادہ پرسکون رہوں گی۔ میں انہیں پیے (pay) کروں گی۔ آپ کو کوش کبھی پیے (pay) کرنا چاہا ہو بھی تو نہ کر سکوں گی۔ شاید مجھے دوس زندگیاں بھی ملیں

تو میں آپ کے احسانات کا بدلہ نہیں ادا کر سکتی مگر اب بس..... آپ اور نہیں..... میں نے زندگی کو گزارنے کے سارے طریقے ابھی سیکھنے ہیں۔ مجھے سمجھنے دیں۔“

ڈاکٹر سید علی نے اس کے بعد اسے دوبارہ اپنے گھر میں رہنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے لئے بھی ان کی احسان مند تھی۔

سعیدہ اماں کے ساتھ رہنے کا تجربہ اس کے لئے باہل میں یا ڈاکٹر سید علی کے ہاں رہنے سے بالکل مختلف تھا۔ اسے ان کے پاس ایک عجیب سی آزادی اور خوشی کا احساس ہوا تھا۔ وہ بالکل اکیلی رہتی تھیں۔ صرف ایک ملازمہ تھی جو دن کے وقت آکر گھر کے کام کر دیا کرتی تھی اور شام کو اپنا کھانا چلی جایا کرتی تھی۔ وہ بے حد سوشل لائف گزارتی تھیں۔ محلے میں ان کا بہت آنا جانا تھا اور نہ صرف محلے میں بلکہ

اپنے رشتے داروں کے ہاں بھی اور ان کے گھر بھی اکٹڑ کوئی نہ کوئی آتا ہوا تھا۔ انہوں نے محلے میں ہر ایک سے اہماد کا تعارف اپنی ہمارائی کہہ کر کر دیا تھا اور چند سالوں کے بعد

یہ تعارف بھائی سے بچی میں تبدیل ہو گیا تھا، اگرچہ محلے والے کچھ تعارف سے واقف تھے، مگر اب کسی نئے محلے والے سے جب وہ اہماد کو بچی کی حیثیت سے متعارف کروائیں تو کسی کو کوئی تجسس نہیں ہوتا تھا۔

لوگ سعیدہ اماں کی عادت سے واقف تھے کہ وہ کتنا محبت بھرا دل رکھتی تھیں۔ ان کے بیٹے اہماد سے واقف تھے، بلکہ وہ باقاعدگی سے فون پر سعیدہ اماں سے بات کرتے ہوئے اس کا حال احوال بھی دریافت کرتے رہتے تھے۔ ان کی بیوی اور بیٹے بھی اس سے بات چیت کرتے رہتے تھے۔

ان کے بیٹے ہر سال پاکستان آیا کرتے تھے اور ان کے قیام کے دوران بھی اہماد کو کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ جیسے وہ ان کی فیملی کا حصہ نہیں تھی، بعض دفعہ اسے یوں ہی لگتا جیسے وہ واقعی سعیدہ اماں کی بیٹی اور ان کے بیٹوں کی بہن تھی۔ ان دونوں کے بیٹے اسے پتو پتو کہا کرتے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس کی کرنے کے بعد اس نے ڈاکٹر سید علی کے توسط سے ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاب شروع کر دی تھی۔ اس کی جاب بہت اچھی تھی اور پہلی بار اس نے مالی طور پر بھی خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ یہ ویسی زندگی نہیں تھی جو وہ اپنے والدین کے گھر گزارتی تھی نہ ہی ویسی تھی جیسی زندگی کے وہ خواب دیکھا کرتی تھی مگر یہ ویسی بھی نہیں تھی جن خدشات کا وہ گھر سے نکلنے ہوئے شکار تھی۔ وہ ہر ایک کے بارے میں نہیں کہہ سکتی مگر اس کے لئے زندگی ہجرات کا دوسرا نام تھی۔

سالار سکندر جیسے لڑکے سے اس طرح کی مدد..... ڈاکٹر سید علی تک رسائی..... سعیدہ اماں جیسے خاندان کا ملنا..... تعلیم کا مکمل کرنا اور پھر وہ جاب..... صرف جلال الفرح تھا جس کا خیال ہمیشہ اسے تکلیف میں مبتلا کر دیتا تھا اور شاید وہ اسے مل جاتا تو وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔

آٹھ سالوں نے اس میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ گھر سے نکلنے وقت وہ جانتی تھی کہ اب دنیا میں اس کے خڑے اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے کبھی نہ کوئی توقعات وابستہ کرنی تھیں نہ ہی ان کے پورا نہ ہونے پر تکلیف محسوس کرتی تھی۔ اس کا رونا دھونا بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا گیا تھا۔ تین سال کی عمر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوف زدہ اور پریشان ہونے والی اہماد باشم آہستہ آہستہ اپنا وجود کھوئی گئی تھی۔ نئی نمودار ہونے والی اہماد زیادہ پر اعتماد اور مضبوط اعصاب رکھتی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت زیادہ محتاط بھی ہو گئی تھی۔ ہر چیز کے بارے میں اپنی گفتگو کے بارے میں، اپنے

طور اطوار کے بارے میں۔

ڈاکٹر سید علی اور سعیدہ اماں دونوں کے خاندانوں نے اسے بہت محبت اور اپنائیت دی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ کوشش کرتی تھی کہ وہ کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کرے، جو انہیں قابل اعتراض یا ناگوار لگے۔ باشم بین کے گھر میں اسے یہ ساری احتیاطیں نہیں کرنی پڑتی تھیں مگر وہاں سے نکل کر اسے

یہ سب کچھ سیکنا پڑا تھا۔

سعیدہ اماں کی کشمکش کے دوران وہ آفس میں تھی۔ چار بجے کے قریب جب وہ گھر آئی تو گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس کے پاس اس تالے کی دوسری کاپی تھی، کیونکہ اس سے پہلے بھی سعیدہ اماں کی بار

ادھر آؤ گھر چلی جایا کرتی تھیں۔ اسے تشویش نہیں ہوئی۔

لیکن جب مغرب کی آواز انہوں نے گئی تو وہ پہلی بار فکر مند ہوئی کیونکہ وہ شام کو تھکے بغیر کبھی یوں غائب نہیں ہوتی تھیں۔ ساتھ والوں کے ہاں پتا کرنے پر اسے پتا چلا کہ ان کا بیٹا انہیں ہال کے گھر مرنے

چھوڑ کر آیا تھا۔ سعید وہاں پہلے بھی آنکڑ وہاں آتی جاتی رہتی تھیں، اس لئے امامہ ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے وہاں خون کیا تو اسے پتا چلا کہ وہ وہاں سے جا چکی تھیں اور تب پہلی بار اسے صحیح معنوں میں تشویش ہوئے گی۔

اس نے باری باری ہر اس جگہ پتاکیا جہاں وہ جا سکتی تھیں مگر وہ کہیں بھی نہیں ملیں اور تب اس نے ڈاکٹر سہا علی کو اطلاع دی۔ اس کی حالت تب تک بے حد خراب ہو چکی تھی۔ سعید وہاں کا میل جول اپنے محکمے تک ہی تھا۔ وہ اندرون شہر کے علاوہ کسی جگہ کو اچھی طرح نہیں جانتی تھیں۔ انہیں کسی دوسری جگہ جانا ہوتا تو وہ مہسایوں کے کسی لڑکے ساتھ چائیں یا پھر امامہ کے ساتھ اور یہی بات امامہ کو تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

دوسری طرف سالار اندرون شہر کے سوا شہر کے تمام پش علاقوں سے واقف تھا۔ اگر اسے اندرون شہر کے بارے میں قہوڑی بہت معلومات بھی ہو تیں تب بھی وہ سعید وہاں کے دھورے پتے کے بارے میں نہ کسی طرح ان کے گھر تک پہنچ جاتا۔

ڈاکٹر سہا علی نے رات گئے اسے سعید وہاں کی خبر سے اسے کسی چاننے والے کے پاس ہوئے کی اطلاع دی اور امامہ کی جیسے جان میں جان آئی۔

مزید ایک گھنٹے کے بعد دروازے کی بیل جھنجھی اور اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا۔ دروازے کی اوٹ سے اس نے سعید وہاں کے پیچھے کھڑے ایک خوش شکل آدمی کو دیکھا، جس نے دروازہ کھلنے پر اسے سلام کیا اور پھر سعید وہاں کو گھدہ اٹھا لے گئے ہوئے مڑا اور اس دوسرے دروازے پر قیامت گھنٹے کے پیچھے چلے گئے جس کی امامہ کی طرف پشت تھی۔ امامہ نے اس پر غور نہیں کیا وہ تو بے اختیار سعید وہاں سے لپٹ گئی تھی۔

سعید وہاں اگلے کئی دن اس کے سامنے ان دونوں کا نام لیج رہیں، سالار اور فرقان۔ امامہ کو پھر بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ سالار۔ سالار سکندر بھی ہو سکتا تھا۔ مردہ لوگ زندہ نہیں ہو سکتے تھے اور اسے اگر اس کی موت کا یقین نہ بھی ہو تب بھی سالار سکندر جیسا شخص نہ تو ڈاکٹر سہا علی کا شہسوار ہو سکتا تھا نہ اس میں اس طرح کی اچھائیاں ہو سکتی تھیں جن اچھائیاں کا ذکر سعید وہاں و کافور خان کرتی رہتی تھیں۔

اس کے کچھ بعد اس نے جس شخص کو اس رات سعید وہاں کے ساتھ سیر میں لے کر لے دیکھا تھا اس شخص سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ فرقان اپنی بیوی کے ساتھ ان کے ہاں آیا تھا۔ اسے وہ اور اس کی بیوی دونوں اچھے لگے تھے۔ پھر وہ چند ایک بار اور ان کے گھر آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی شناسائی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اسے چاہیہ کرتے تب وہ سال ہو چکے تھے۔ کچھ وقت شاید اور اسی طرح گزر جاتا۔ اگر وہ اٹھاتا

ایک روز اس سڑک سے گزرتی جہاں جلال کے بنائے ہوئے ہاسٹل کے باہر اس کا نام آویزاں تھا۔ جلال اصرار کا نام اس کے قدم روک دینے کے لئے کافی تھا مگر کچھ دیر تک ہاسٹل کے باہر اس کا نام دیکھتے رہنے کے بعد اس نے طے کیا تھا کہ وہ وہاں اس سڑک پر کبھی نہیں آئے گی۔

جلال شادی کر چکا تھا۔ یہ وہ گھر چھوڑے وقت ہی سالار سے جان چکی تھی اور وہ وہاں اس کی زندگی میں نہیں آنا چاہتی تھی مگر اس کا یہ فیصلہ دیر پا ثابت نہیں ہوا۔

دو ہفتے کے بعد فارما سٹیل کیمپنی کے آفس میں ہی اس کی ملاقات رہا ہوئی۔ راہب وہاں کسی کام کے لئے آئی تھی۔ چند لمحوں کے لئے تو اسے اپنے سامنے کچھ کر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح کا دیکھنا ظاہر کرے۔ یہ مشکل راہب نے آسان کر دی۔ وہ اس سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہی تھی۔

”تم ٹیک دم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ کالچ اور ہاسٹل میں تو ایک لمبا عرصہ طوقان بچا رہا۔“

راہب نے چوتھے اس سے پوچھا۔ امامہ نے مسکرائے کی کوشش کی۔

”بس میں گھر سے چلی گئی تھی۔ کیوں گئی تھی تم تو جانتی ہی ہو گی۔“ امامہ نے مختصر کہا۔

”ہاں، مجھے کچھ اندازہ تو تھا ہی مگر میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ویسے ہم لوگوں کی بڑی کم بختی آئی۔ میری جو بری، ذہنیہ، سب کی۔۔۔ پولیس تک نے چھ کچھ کی ہم سے۔ ہمیں تو کچھ پتا ہی نہیں تھا تمہارے بارے میں، مگر ہاسٹل اور کالچ میں بہت ساری باتیں پھیل گئی تھیں تمہارے بارے میں۔“

راہب اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی مسلسل بولے جا رہی تھی۔

”تم کیسی مٹی کی تھیں؟“ اس نے بات کرتے کرتے اچانک پوچھا۔

”ہاں۔“ امامہ اکثر کام پر جانے کا کہتے ہوئے بولی۔

”مگر کئی کہاں تھیں؟“

”کہیں نہیں، یہیں لاہور میں تھی۔ تم بتاؤ، تم کیا کر رہی ہو آج کل اور جو بری۔۔۔ باقی سب۔“

امامہ نے بات بدلنے ہوئے کہا۔

”میں پریکٹس کر رہی ہوں لاہور میں۔ جو بری اسلام آباد میں ہوتی ہے۔ شادی ہو گئی ہے اس کی ایک ڈاکٹر سے۔ میری بھی قاروقی سے ہوئی ہے۔ تمہیں تو پتا ہو گا کلاس فیلو تھا میرا۔“

امامہ مسکرائی۔ ”اور ذہنیہ؟“ اس کا دل بے اختیار دھڑکا تھا۔

”ہاں، ذہنیہ آج کل الیگنڈ میں ہوتی ہے۔ ریڈیائی کر رہی ہے وہاں اپنے شوہر کے ساتھ۔

اس کے بھائی کے ہاسٹل میں ہی قاروق پریکٹس کرتے ہیں۔“

امامہ نے بے اختیار اسے دیکھا۔ ”جلال اصرار کے ہاسٹل میں؟“

”ہاں، اسی کے ہاسٹل میں۔ وہ اسٹیشنریشن کر کے آیا ہے کچھ عرصے پہلے جہاں بے چارے کے

ساحہ بڑی تر بیڑی ہوئی ہے۔ چند ماہ پہلے طلاق ہو گئی ہے۔ حالانکہ اتنا چھابندہ ہے مگر۔
امام اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی۔

”طلاق..... کیا؟“

”پتا نہیں، فاروقی نے پوچھا تھا اس سے۔ کہہ رہا تھا ڈرامہ سٹینڈنگ نہیں ہوئی۔ بیوی بھی بڑی اچھی تھی اس کی۔ ڈاکٹر سے وہ بھی لیکن پتا نہیں کیوں طلاق ہو گئی۔ ہم لوگوں کا تو خاصا آنا جانا تھا ان کے گھر میں۔ ہمیں کبھی بھی اندازہ نہیں ہوا کہ ایسا کوئی مسئلہ ہے دونوں کے درمیان۔ ایک بیٹا ہے تین سال کا۔ وہ چال کے پاس ہی ہے۔ اس کی بیوی اپنی امریکہ چلی گئی ہے۔“

راہد لاپرواہی سے تمام تفصیلات بتا رہی تھی۔

”تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ یہ تو میں جان گئی ہوں کہ یہاں چاب کر رہی ہو، مگر اسٹڈی تو تم نے نکلی نہیں کی۔“

”ایسا ایس کی کیا ہے گیسٹری میں۔“

”اور شادی وغیرہ؟“

”وہ ابھی نہیں۔“

”یہ شمس کے ساتھ تمہارا جھگڑا ختم ہو گیا نہیں؟“

امام نے حیرت سے اس کو دیکھا۔

”نہیں۔“ پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی پھر چلی گئی۔ امام باقی کا سارا وقت آفس میں ڈسٹرب رہی۔ اس نے حال انصر کو بھی بھلا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے بھلا نہیں سکتی تھی۔ اس نے صرف اپنی زندگی سے اس کو الگ کر دیا تھا مگر وہاں بیٹھے ہوئے اس دن اسے احساس ہوا کہ یہ بھی ایک خوش گمانی یا شو فرین کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ جہاں انصر کو اپنی زندگی سے الگ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ صرف اس کی زندگی میں داخل ہو کر اسے کسی پریشانی سے دوچار کرنا چاہتی تھی نہ ہی اس کی ازدواجی زندگی کو خراب کرنا چاہتی تھی لیکن ہر بار جاننے کے بعد کہ اس کی ازدواجی زندگی پہلے ہی ناکام ہو چکی ہے اور وہ ایک بار پھر اکٹھا تھا۔ اسے پانچ آٹھ سال پہلے وہ کس طرح اس شخص کے حصول کے لئے بچوں کی طرح کلیاتی رہی تھی۔ وہ اسے بالکل نہیں کر سکتی تھی۔ جب بہت سی دیریں بہت سی کوششیں جنہیں وہ چار کر سکتی تھی نہ جلال انصر کا سکھ تھا۔

مگر اب بہت وقت گزر چکا تھا۔ ان کا دونوں میں سے اب کچھ بھی ان دونوں کے درمیان نہیں تھا۔ اب اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ ایک شادی کر چکا تھا یا اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔

”مجھے اس کے پاس ایک بار پھر جانا چاہئے، شاید وہ اب بھی میرے بارے میں سوچتا ہو شاید اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو۔“ امام نے سوچا تھا۔

اس نے آخری بار فون پر بات کرتے ہوئے اس سے جو کچھ کہا تھا، امام اس کے لئے اس کو معاف کر چکی تھی۔ جلال کی جگہ جو بھی ہو تا وہ یہی کہتا۔ صرف ایک لڑکی کے لئے تو کوئی بھی اتنے رسک نہیں لیتا اور پھر اس کا کیرئیر تھا جسے وہ ہٹانا چاہتا تھا۔ اس کے پیش کی اس سے کچھ امیدیں تھیں جنہیں وہ شتم نہیں کر سکتا تھا۔ میری طرح وہ بھی مجبور تھا۔ بہت سال پہلے کہے گئے اس کے حلوں کی بازگشت نے بھی اسے دلواواشتہ پایا ہے فیصلہ پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔

”مجھے اس کے پاس جانا چاہئے۔ ہو سکتا ہے یہ موقع مجھے اللہ نے ہی دیا ہو۔ ہو سکتا ہے اللہ نے میری دعاؤں کو اب قبول کر لیا ہو۔ ہو سکتا ہے اللہ کو مجھ پر اب رحم آیا ہو۔“

وہ بار بار سوچ رہی تھی۔

”ورنہ اس طرح آپنا کب راہد میرے سامنے کیوں آجاتی۔ مجھے کیوں یہ پتا چلا کہ اس کی بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے اب میں اس کے سامنے جاؤں تو.....“ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ جلال انصر کے پاس دو بارہ جانا چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

”میں ڈاکٹر جلال انصر سے ملنا چاہتی ہوں۔“ امام نے رپیشٹ سے کہا۔

”ایمانٹ منٹ ہے آپ کی؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، ایمانٹ منٹ نہیں ہے۔“

”پھر تو وہ آپ سے نہیں مل سکیں گے۔ ایمانٹ منٹ کے بغیر وہ کسی چیفٹ کو نہیں دیکھتے۔“ اس نے بڑے پریشانی سے کہا۔

”میں چیفٹ نہیں ہوں، ان کی دوست ہوں۔“ امام نے کاؤنٹر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

”ڈاکٹر صاحب جانتے ہیں کہ آپ اس وقت ان سے ملنے آئیں گی؟“ رپیشٹ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

”ایک منٹ، میں ان سے پوچھتی ہوں۔“ اس نے رپیشٹ کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ رپیشٹ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"امام ہاشم۔" اسے یاد نہیں اس نے کتنے سالوں بعد اپنا نام لیا تھا۔

"سرا کوئی قانون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ آپ کی دوست ہیں۔ امام ہاشم نام ہے ان کا۔"

دوسری طرف سے جلال کی کھنگو مٹی رہی۔

"او کے سر۔" پھر اس نے رؤیو رکھ دیا۔

"آپ اندر چلی جائیں۔" رؤیو شہت نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

وہ سر ہاتھ بٹے دو دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ جلال انصر کا ایک مرئیں باہر نکل رہا تھا اور وہ خود اپنی میز کے چپے کھڑا تھا۔ امام نے اس کے چہرے پر حیرت دیکھی تھی۔ وہ اپنے دھڑکنے والی آواز باہر تک سن سکتی تھی۔ اس نے جلال انصر کو آٹھ سال اور کتنے ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ امام نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یاد نہیں آیا۔

"What a pleasant surprise Inuma." (کیسا خوشگوار سر پر اثر ہے امام اے۔)

جلال نے آگے بڑھ کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟"

وہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر بولی۔ پچھلے آٹھ سال سے یہ پہرہ ہر وقت اس کے ساتھ رہا تھا اور یہ آواز بھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں، آؤ بیٹھو۔"

اس نے اپنی ٹیبل کے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود ٹیبل کے دوسری جانب اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ ہمیشہ سے جانتی تھی۔ وہ جلال انصر کو جب بھی دیکھے گی اس کا دل اسی طرح بے قابو ہو گا مگر اتنی خوشی، ایسی شہزادی تھی جو وہ اپنے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑتی محسوس کر رہی تھی۔

"کیا پیو گی؟ پائے، کافی، سوٹ ڈرنک؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"جو آپ چاہیں۔"

"او کے، کافی منگوا لیتے ہیں۔ تمہیں پسند تھی۔"

وہ انٹر کام آٹھار کی کو کافی بجھوائے کی ہدایات دے رہا تھا اور وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ڈرامائی لب نہیں تھی۔ اس کا بغیر اسٹاک مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کا وزن پہلے کی نسبت کچھ بڑھ گیا تھا۔ وہ پہلے کی نسبت بہت پر اعتماد اور بے تکلف نظر آ رہا تھا۔

"تم آج کل کیا کر رہی ہو؟" رؤیو رکھنے ہی اس نے امام سے پوچھا۔

"ایک فارسیو بنگلہ کمپنی میں کام کر رہی ہوں۔"

"ایم بی بی ایس تو چھوڑ دیا تھا تم نے۔"

"ہاں، ایم ایس سی کیا ہے کسٹری میں۔"

"کون سی کمپنی ہے؟" امام نے نام بتایا۔

"وہ تو بہت اچھی کمپنی ہے۔"

وہ کچھ دیر اس کمپنی کے بارے میں تعریفی تبصرہ کر تا رہا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

"میں اسٹیٹس ٹریڈنگ کر کے آیا ہوں۔"

وہ اپنے بارے میں اتنے تانے لگا۔ وہ گلیں بھجھکائے بغیر کسی معمول کی طرح اسے دیکھتی رہی۔ بعض لوگوں کو صرف دیکھنا ہی کتنا "کافی" ہوتا ہے۔ اس نے اسے بات کرتے دیکھ کر سوچا تھا۔

"ایک سال ہو اے اس باہل کو شروع کئے اور بہت اچھی پیکٹس چل رہی ہے میری۔"

وہ بولتا رہا۔ کافی آجلی تھی۔

"تمہیں میرا کیا ہے چلا؟" وہ کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"میں نے آپ کے ہاسٹل کے بورڈ پر آپ کا نام پڑھا تھا پھر راجہ سے ملاقات ہوئی۔ آپ جانتے ہوں گے۔" راجہ بھی واقف تھی اس سے۔

"راجہ قاروق کی بات کر رہی ہو۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا شوہر ڈاکٹر قاروق میرے

ساتھ کام کرتا ہے۔" اس نے کافی پیتے ہوئے کہا۔

"ہاں، وہی..... پھر میں یہاں آ گئی۔"

امام نے اچھی کافی نہیں پی تھی۔ کافی بہت گرم تھی اور بہت گرم چیزیں نہیں پیتی تھی۔ اس نے کسی زمانے میں میز کے دوسری جانب بیٹھے ہوئے شخص کو آئینہ نظر کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں برخونی

تھی، برہہ برخونی جو ایک مکمل مرد میں ہونی چاہئے۔ برہہ برخونی جو وہ اپنے شوہر میں دیکھنا چاہتی تھی۔ ساڑھے آٹھ سال گزرے تھے اور امام کو یقین تھا کہ وہ اب بھی ویسا ہی ہے۔ چہرے سے ڈاکڑی کے ہٹ جانے

کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کو اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت نہ رہی ہو۔ اپنے ہاسٹل کی کامیابی کے عقیدے اس کے سامنے پڑتے ہوئے بھی امام اس کی اسی آواز کو اپنے کانوں میں

کو بچھ محسوس کر رہی تھی، جس آواز نے ایک بار اس کی زندگی کا سب سے مشکل فیصلہ آسان کر دیا تھا۔

وہ اس کے منہ سے کامیاب پیکٹس اور شہرت کا سن کر مسرور تھی۔ جلال نے زندگی میں ان ہی کامیابیوں کو سمیٹنے کے لئے ساڑھے آٹھ سال پہلے اسے چھوڑ دیا تھا مگر وہ خوش تھی۔ آج سب کچھ جلال

اصرہ کی مٹھی میں تھا۔ کم از کم آج فیصلہ کرنے میں اسے کسی دوشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

”تم نے شادی کر لی؟“ بات کرتے کرتے اس نے اچانک پوچھا۔

”نہیں۔“ امامہ نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

”تو پھر تم کہاں رہتی ہو، کیا اپنے پیرئس کے پاس ہو؟“ جلال اس بار کچھ سنجیدہ تھا۔

”نہیں۔“

”پھر؟“

”انکی رہتی ہوں، پیرئس کے پاس کیسے جاسکتی تھی۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

”آپ نے شادی کر لی؟“ جلال نے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

”ہاں، شادی کر لی اور علیحدگی بھی ہو گئی۔ تین سال کا ایک بیٹا ہے میرا۔ میرے پاس ہی ہوتا ہے۔“ جلال نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

”آئی ایم سوری۔“ امامہ نے تلخ بارہا قسوس کیا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اچھا ہوا یہ شادی ختم ہو گئی۔“

”It was not a marriage, it was a mess.“ (یہ شادی نہیں تھی ایک کھیر تھا۔)

جلال نے کافی کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر اس خاموشی کو

امامہ نے توڑا۔

”بہت سال پہلے ایک بار میں نے آپ کو پرہیز کیا تھا جلال؟“

جلال اسے دیکھنے لگا۔

”پھر میں نے آپ سے شادی کے لئے ریکویسٹ کی تھی۔ آپ اس وقت مجھ سے شادی نہیں

کر سکتے۔“

”کیا میں یہ ریکویسٹ آپ سے دوبارہ کر سکتی ہوں؟“

اس نے جلال اصرہ کے چہرے کا رنگ بدلنے دیکھا۔

”اب تو حالات بدل چکے ہیں۔ آپ کسی پریزنٹ نہیں ہیں۔ نہ ہی میرے پیرئس کے کسی رد عمل

کا آپ کو اندیشہ ہو گا نہ ہی آپ کے پیرئس اعتراض کریں گے۔ اب تو آپ مجھ سے شادی کر سکتے ہیں۔“

وہ جلال کا جواب سننے کے لئے زکی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کی خاموشی نے امامہ کے اعصاب

کو متھل کیا۔ شاید یہ اس لئے خاموش ہے کیونکہ اسے اپنی پہلی شادی یا بیٹے کا خیال ہو گا۔ امامہ نے سوچا۔

مجھے اسے بتانا چاہئے کہ مجھے اس کی پہلی شادی کی کوئی پروا نہیں ہے، نہ ہی اس بات پر اعتراض کہ اس کا

ایک بیٹا بھی ہے۔

”جلال! مجھے آپ کی پہلی شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔۔۔۔“

جلال نے اس کی بات کاٹ دی۔

”امامہ! یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں ممکن نہیں ہے۔ کیا آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے؟“

”محبت کی بات نہیں ہے امامہ! اب بہت وقت گزر چکا ہے۔ ویسے بھی ایک شادی ناکام ہونے کے

بعد میں فوری طور پر دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنے کیرئیر پر دھیان دینا چاہتا ہوں۔“

”جلال! آپ کو مجھ سے تو کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔ میرے ساتھ تو آپ کی شادی ناکام

نہیں ہو سکتی۔“

”پھر بھی..... میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔“ جلال نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں انتظار کر سکتی ہوں۔“

جلال نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں امامہ! اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تم سے شادی کر سکوں۔“

دو دم سادھے اسے دیکھتی رہی۔

”یہ شادی میں نے اپنی مرضی سے کی تھی۔ دوبارہ میں اپنی مرضی نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری شادی میں

اپنے پیرئس کی مرضی سے کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ اپنے پیرئس کو میرے بارے میں بتادیں۔ شاید وہ آپ کو اجازت دے دیں۔“ اس نے

ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

”نہیں تا سکا۔“ دیکھو امامہ! کچھ حقائق ہیں جن کا سامنا مجھے اور جیہیں بہت حقیقت پسندی سے کرنا

چاہئے۔ میں اپنے لئے تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی زمانے میں،

میں بھی تمہارے ساتھ اتنا دلچسپ رہا ہوں کہ لو کہ محبت کرتا تھا۔ میں آج بھی تمہارے لئے دل میں بہت

خاص جذبات رکھتا ہوں اور ہمیشہ رکھوں گا مگر زندگی جذبات کے سہارے نہیں گزارا جاسکتی۔“

وہ زکا۔ امامہ کافی کے کپ سے اٹھتے دھوئیں کے پار اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تم جب سات آٹھ سال پہلے اپنا گھر چھوڑ دی تھیں تو میں نے جیہیں سمجھایا تھا کہ اس طرح نہ کرو

لیکن تم نے اس معاملے کو اپنی مرضی کے مطابق منڈل کیا۔ اپنے پیرئس کو مجھ سے شادی کے لئے کوئی

کرنے کے بجائے تم مجھے رکتی رہیں کہ میں تم سے چھپ کر شادی کر لوں۔ میں ایسا نہیں کر سکا اور

نہ ہی یہ مناسب تھا۔ مذہب کی بات اپنی جگہ، مگر مذہب کے ساتھ معاشرہ بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے جس

میں ہم رہتے ہیں اور جس کی ہمیں پروا کرنی چاہئے۔“

امامہ کو یقین نہیں آیا۔ وہ یہ سب اس شخص کے منہ سے سن رہی تھی جو۔۔۔

”تم تو چلی گئیں مگر تمہارے جانے کے بعد تمہارا اس طرح غائب ہو جانا کتنا بڑا اسکینڈل ثابت ہوا اس کا تمہیں اندازہ نہیں۔ تمہارے بچہ منٹس نے پریس میں یہ خبر آنے نہیں دی مگر پورے میڈیکل کالج کو تمہارے اس طرح چلے جانے کا پتا تھا۔ پولیس نے تمہاری بہت ساری فرینڈز اور گلاس فیلوز سے تمہارے بارے میں انوکھی کنیشن کی۔ نہ بچ بھی اس میں شامل تھی۔ خوش قسمتی سے ہم بچ گئے۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں نے اتنے سال محنت کر کے اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ میں اتنا بہادر نہیں ہوں کہ میں تم سے شادی کر کے لوگوں کی چہ گوئیوں کا نشانہ بنوں۔ میرا اگلا بیٹنا ڈاکٹر کی کیونٹی میں ہے اور امامہ ہاشم کی میری بیوی کے طور پر واپسی بھی اسکینڈل لاز کر دے گی۔ تم سے شادی کر کے میں لوگوں سے نظریں نہیں چراتا چاہتا۔ تم اتنے سال کہاں رہی ہو، کیسے رہی ہو، یہ بہت اہم سوالات ہیں۔ میرے بزنس کو تمہاری کسی بات پر یقین نہیں آئے گا اور مجھے لوگوں کی نظروں میں اپنا یہ مقام برقرار رکھنا ہے۔ تم بہت اچھی ہو مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ تم اچھی لڑکی نہیں ہو اور میں کسی اسکینڈل لاز ڈاکٹر کی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی یہ کہے کہ میری بیوی کا کردار اچھا نہیں ہے۔ آئی ہو پ۔ تم میری پوزیشن کو سمجھ سکتی ہو۔“

کافی کے کپ سے اٹھتا دھواں شمع ہو چکا تھا مگر جلال انصر کا چہرہ ابھی کسی دھوئیں کے پیچھے چھپا نظر آ رہا تھا یا پھر یہ اس کی آنکھوں میں اترنے والی دھند تھی جس نے جلال انصر کو غائب کر دیا تھا۔

کری کے دونوں ہتھوں کا سہارا لیتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ہاں، میں سمجھ سکتی ہوں۔“ اس نے اپنے آپ کو کہتے سنا۔ ”تھہ فاؤنڈ۔“

”آئی ایم سوری امامہ! جلال معذرت کر رہا تھا۔ امامہ نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ جیسے نیند کی حالت میں چلے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی۔

شام کے سات بج چکے تھے۔ اندر میرا اچھا چکا تھا۔ سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹس اور نیون سائن بورڈز روشن تھے۔ سڑک پر بہت زیادہ ٹریفک تھی۔ اس پورے روڈ پر دونوں طرف ڈاکٹر کے ٹیکس تھے۔ اسے یاد تھا کسی زمانے میں اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کا بھی ایسا ہی ٹیکس ہو تا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ وہ بھی اپنے نام کے آگے اسی طرح کوئی مختصر کی ایک لمبی لسٹ دیکھنا چاہتی تھی بالکل ویسے ہی جس طرح جلال انصر کے نام کے ساتھ تھیں۔ بالکل ویسے ہی جس طرح اس روڈ پر لگے ہوئے بہت سے ڈاکٹر کے ناموں کے ساتھ تھی۔ یہ سب ہو سکتا تھا، یہ سب ممکن تھا، اس کے ہاتھ کی مٹی میں تھا کہ وہ۔۔۔ وہ بہت سال پہلے اپنے گھر سے نہ نکلی ہوئی۔

وہ بہت دیر تک جلال کے ہاسٹل کے باہر سڑک پر کھڑی خالی الذہنی کی کیفیت میں سڑک پر دوڑتی ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں سے کہاں جائے اس نے ایک بار پھر مرکز ہاسٹل کے ماتھے پر جھک گئے الیکٹریک بورڈ پر ڈاکٹر جلال انصر کا نام دیکھا۔

”تم ابھی لڑکی ہو، مگر لوگ تمہیں اچھا نہیں سمجھتے۔“

اسے چند منٹ پہلے کہے ہوئے اس کے الفاظ یاد آئے، وہاں کھڑے اسے پہلی بار پتا چلا کہ اس نے اپنی پوری زندگی ایک طرف محبت میں گزار دی تھی۔ جلال انصر کو اس سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ نہ ساڑھے آٹھ سال پہلے، نہ اب۔ اس کو صرف امامہ کی ضرورت نہیں تھی، اس کے ساتھ شملک باقی چیزوں کی بھی ضرورت تھی۔ اس کا لمبا بچہ ڈاکٹر کی ایک گراؤنڈ۔۔۔ سوسائٹی میں اس کے خاندان کا نام اور مرتبہ۔ اس کے خاندان کے کانٹیکٹس۔ اس کے خاندان کی دولت۔ جس کے ساتھ تھی ہو کر وہ سب لگا کر راتوں رات اپر کلاس میں آ جاتا۔ اور وہ اس خوش منی مٹی جتلا رہی کہ وہ صرف اس کی محبت میں جتلا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک بار بھی اس کے کردار کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ کم از کم یہ یقین ضرور رکھے گا کہ وہ غلط راستے پر نہیں چل سکتی مگر وہ پھر غلط تھی۔ اس کے نزدیک وہ ایک اسکینڈل لاز ڈاکٹر کی تھی جس کے وقار میں اپنی مٹی یاد اور سارے لوگوں سے کچھ کہنے کے لئے اس کے پاس کوئی لفظ نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ سال پہلے گھر چھوڑتے ہوئے وہ جانتی تھی کہ لوگ اس کے بارے میں بہت کچھ کہیں گے۔ وہ اپنے لئے کانٹنن بھرا راستہ، زہر افگنی زبانیں اور مٹھ کر تی نظریں جن رہی تھی مگر اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان لوگوں میں جلال انصر بھی شامل ہو گا۔ زہر افگنی زبانوں میں ایک زبان اس کی بھی ہو گی۔ وہ زندگی میں کم از کم جلال انصر کو اپنے کردار کے اچھا ہونے کے بارے میں کوئی صفائی یاد وضاحت نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ اس کو کوئی صفائی دے ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے نظروں نے ساڑھے آٹھ سال بعد پہلی بار اسے صحیح معنوں میں حقیقت کے نتیجے ہوئے صحرا میں جھیک دیا تھا۔ وہ معاشرے کے لئے ایک outcast بن چکی تھی۔

”تو امامہ ہاشم یہ ہے تمہاری اوقات، ایک اسکینڈل لاز اور stigmatized (دامغ دار) لڑکی اور تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی تھیں۔“

دو فٹ کا پتھر پر چلنے لگی۔ ہر بورڈ، ہر نیون سائن کو پڑھتے ہوئے۔ وہاں لگے ہوئے بہت سے ڈاکٹروں کے ناموں سے وہ واقف تھی۔ ان میں سے کچھ اس کے گلاس فیلوز تھے۔ کچھ اس سے جو خیر، کچھ اس سے سینئر اور وہ خود کہاں کھڑی تھی کہیں بھی نہیں۔

”تم دیکھنا امامہ! تم کس طرح ڈمکمل و خوار ہو گی۔ تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا، کچھ بھی نہیں۔“ اس کے کانوں میں ہاشم مبین کی آواز گونجنے لگی تھی۔ اس نے اپنے کانوں پر سیال ہارے کو پتے

وہ ایک دم بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ چند لمحوں کے لئے اسے لگا وہ وہیں ہو، خانہ کعبہ میں، پھر جیسے وہ حقیقت میں واپس آگئی۔ اس نے آنکھ کر کر کے کی لائٹ جلا دی اور پھر بیٹھ کر آکر دوبارہ بیٹھ گئی۔ اسے خواب اپنی پوری جزئیات سمیت یاد تھا۔ وہیں جیسے اس نے کوئی فلم دیکھی ہو۔ مگر اس آدمی کا چہرہ وہ اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے مزے سے پہلے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

”خوش الحان آواز، جلال انصر کے سوا کسی ہو سکتی ہے۔“ اس نے سوچا۔

مگر وہ شخص دراز قد تھا۔ جلال انصر سا تو اقامت خاص کے احرام میں سے نکلے ہوئے کتہے سے اور بازوؤں کی رنگت صاف تھی اور اس کی آواز وہ شامسا سی۔ وہ یہ پہچان نہیں پاسی تھی کہ وہ آواز جلال کی تھی یا کسی اور کی۔

خواب بہت عجیب تھا مگر اس کے سر کا درو غائب ہو چکا تھا اور وہ حیران کن طور پر نہ سون رہی تھی۔ اس نے آنکھ کر کر کے کی لائٹ آن کی۔ والی فلک ایک عجیب تھا۔ امام کو یاد آیا۔ وہ رات کو عثمان کی نماز پڑھتے بغیر ہی سو گئی تھی۔ اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کئے تھے نہ ہی سونے سے پہلے وضو کیا تھا۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے اور اپنے کمرے سے باہر آگئی۔ سعید دھان کے کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ وہ سو رہی تھیں۔ پورے گھر میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ محسن میں بلب جل رہا تھا۔ بجلی بجی، حد تک موجودگی بھی بلب کی روشنی میں محسوس کی جاسکتی تھی۔ محسن کی دیواروں کے ساتھ چڑھی بڑبیلیں، سرخ اینٹوں کی دیواروں کے ساتھ بالکل ساکت تھیں۔ وہ دھوکہ کرنے کے لئے محسن کے دوسری طرف موجود دھندہ روم میں جانا چاہتی تھی مگر محسن میں جانے کے بجائے وہ آبرہے کے ستون کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اپنے سویچز کی آستینوں کو اوپر کرتے ہوئے اس نے اپنی ٹرٹ کی آستینوں کے مٹن کو تھپتھپاتے ہوئے انٹوں اوپر فونڈ کر دیا۔ چند لمحوں کے لئے اسے جھرمجھری آئی۔ تنگی بہت زیادہ تھی پھر وہ ان بیلوں کو دیکھنے لگی۔ ایک بار پھر جلال انصر کے ساتھ شام کو ہونے والی ملاقات اسے یاد آئی تھی مگر اس بار اس کی باتوں کی کوئی انتہا ایک بار نہیں کر رہی تھی۔

دھبھری میٹی چھائی کی تو نے ہی تو کی

میں تو مر جانا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا

تہ بہ تہ تیریاں ذہن پر جب نوبتی ہیں

نور ہو جاتا ہے کچھ اور ہو جا تیرا

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

اس کی دولت ہے فقط نقش کف پا تیرا

ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ گزرا ہے ہوئے پچھلے سارے آٹھ

سالوں میں یہ آواز۔ اور یہ الفاظ اس کے ذہن سے کبھی معدوم نہیں ہوئے تھے اور پھر اسے کچھ دیر پہلے کے خواب میں سنائی دینے والی وہ دوسری آواز یاد آئی۔

”لیک اللہم لیک، لیک لا شریک لك لیک، ان الحمد والنعمه لك و الملك لا شریك لك۔“

وہ آواز بانوس اور شماسا تھی مگر جلال انصر کی آواز کے علاوہ وہ اور کسی آواز سے واقف نہیں تھی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے خواب میں دیکھے ہوئے اس منظر کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ مقام ختم، خانہ کعبہ کا کھلا دروازہ، خلاف کعبہ کی دور وشن آیات۔ وہ بے سکون، غلطی، معطل رات۔ خانہ کعبہ کے دروازے سے پھونکتی وہ دو دھار دھار آواز جیسا کہ تلمیذ پر حنا دھارو۔ امام نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر تک وہ محسن میں آخری درخت میں نظریں جمائے اس آدمی کے بارے میں سوچتی رہی۔

اس آدمی کے بے پردہ کندھے کی پشت پر ہلکے ہلکے بالوں میں زخم کا ایک مندر شدہ نشان تھا۔ امام کو حیرت ہو رہی تھی۔ خواب کی اس طرح کی جزئیات سے پہلے کبھی یاد نہیں رہی تھیں۔ اس نے زندگی میں پہلی بار خانہ کعبہ کو خواب میں دیکھا تھا اور وہاں بیٹھے اسے خواہش ہوئی تھی کہ کاش وہ کبھی اسی طرح مسجد نبوی ﷺ میں روزہ، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑی ہو۔ اسی طرح مسجد نبوی ﷺ کو لوگوں سے خالی ہو دیا۔ وہاں صرف وہ ہو، وہ وہاں انہوں نہیں لگائی وہ کتنی دیر وہاں اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ اپنے گرد و پیش میں جب کوئی بھی نہ تھا۔ سعید دھان تھوڑے پھرنے کے لئے دھوکہ کرنے کی خاطر باہر محسن میں اٹھی تھیں۔ امام کو وہاں اس وقت دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔

”تہا رہے سر کا درو کیا ہے؟“ اس کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے پوچھا۔

”اب تو در نہیں ہے۔“ امام نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”رات کو کمانا کھائے بغیر ہی سو گئی تھیں؟“ وہ اس کے پاس آبرہے کے حلقے سے فرش پر بیٹھتے ہوئے پوچھیں۔

وہ خاموش رہی۔ سعید دھان ایک گرم اونانی شال اوڑھے ہوئے تھیں۔ امام نے ان کے کندھے سے اپنا چہرہ لگا دیا۔ ان کے سینے پر سے گرم شال سے ایک عجیب سی آسودگی کا احساس ہوا۔

”اب تم شادی کر لو آمت؟“ سعید دھان نے اس سے کہا۔ وہ اسی طرح گرم شال میں اپنا چہرہ چھپائے رہی۔ سعید دھان پہلی بار یہ بات نہیں کہہ رہی تھیں۔

”آپ کر دیں۔“ وہ ہمیشہ ان کی اس بات پر خاموشی اختیار کر لیتی تھی۔ کیوں؟ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی لیکن آج پہلی بار وہ خاموش نہیں رہی تھی۔

”تم کچھ کہہ رہی ہو؟“ سعید دھان اس کی بات پر حیران ہوئی تھیں۔

"میں جاکہ رہی ہوں۔" امام نے سر ان کے کندھے سے اٹھالیا۔
 "تمہیں کوئی پسند ہے؟" سعیدہ اماں نے اس سے پوچھا۔ وہ سر جھکا کر خروش کو دیکھ رہی تھی۔

"کوئی مجھے پسند ہے؟" نہیں مجھے کوئی بھی پسند نہیں ہے۔" سعیدہ اماں کو اس کی آواز بھڑائی ہوئی لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہیں اس نے ایک بار پھر ان کی مثال میں اپنا چہرہ چھپایا۔
 "تمہاری شادی ہو جائے تو میں بھی اگلیڈ پٹی چلی جاؤں گی۔"

انہوں نے اس کے سر کو چھو چھپاتے ہوئے کہا اور اس کے سر کو چھپتاتے ہوئے ہی انہیں احساس ہوا کہ وہ ان کی مثال میں منہ چھپانے لگیوں سے رو رہی تھی۔

"آمنہ آمد۔ بیٹا کیا ہوا؟" انہوں نے پریشان ہو کر اس کا چہرہ سے اٹھانے کی کوشش کی۔

وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح ان کے ساتھ لگ کر رو رہی۔

"اللہ کے لئے..... کچھ تو بتاؤ، کیوں رو رہی ہو؟" وہ دل گرفتہ ہو گئیں۔

"کچھ نہیں..... بس ایسے ہی..... سر میں درد ہو رہا ہے۔" انہوں نے زبردستی اس کا گیلیا پیرہا دیا۔
 کیا تھا۔ وہ اب اپنی آستینوں سے چہرہ پوچھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سعیدہ اماں سے آنکھیں نہیں ملائی تھیں۔ سعیدہ اماں بکا بکا سے ہاتھ روم کی طرف جاتے دیکھتی رہیں۔

سعیدہ اماں اس کی شادی کی بات کرنے والی انہیں نہیں تھیں۔ اس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ڈاکٹر سبط علی نے ایک بار پھر اس سے شادی کا ذکر کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی جب اس نے کیوں انکار کر دیا تھا۔
 یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اب آزاد تھی۔

"مجھے کچھ عرصہ چاہ کر لینے دیں اس کے بعد میں شادی کر لوں گی۔" اس نے ڈاکٹر سبط علی سے کہا تھا۔ شاید یہ جھپٹنے کی سالوں سے ڈاکٹر سبط علی پر مائل طور پر ایک بوجھ بننے کا احساس تھا، جس سے وہ نجات حاصل کرنا چاہتی تھی یا پھر کہیں اس کے لا شعور میں یہ چیز تھی کہ ڈاکٹر سبط علی کو اس کی شادی پر ایک بار پھر اعتراضات کرنے پڑیں گے اور وہ یہ جانتی تھی کہ وہ ان اعتراضات کے لئے خود کچھ جمع کرنے کی کوشش کر لے۔ اس نے یہ بات ڈاکٹر سبط علی کو نہیں بتائی تھی مگر اس نے ان سے چاہ کی اجازت لے لی تھی۔

شاید وہ ابھی کچھ عرصہ مزید چاہ کرتی رہتی، مگر جلال انصر سے اس ملاقات کے بعد وہ ایک تکلیف دہ ذہنی دھچکے سے دوچار ہو گئی تھی اور اس نے یک دم سعیدہ اماں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ وہ نہیں جانتی۔ سعیدہ اماں نے ڈاکٹر سبط علی سے اس بات کا ذکر کیا یا نہیں مگر وہ خود ان دونوں مکمل طور پر اس کے لئے رشتے کی تلاش میں سرگرداں تھیں اور اس کو شش کا نتیجہ فدی کی صورت میں لکھا تھا۔

فیدہ ایک کہنی میں اٹھے عہدے پر کام کر رہا تھا اور اس کی شہرت بھی بہت اچھی تھی۔ فیدہ کے گھر والے اسے جیٹلی پارک دیکھ کر ہی پسند کر گئے تھے اور اس کے بعد سعیدہ اماں نے ڈاکٹر سبط علی سے اس رشتے کی بات کی۔
 ڈاکٹر سبط علی کو کچھ تاہل ہوا..... شاید وہ اس کی شادی اب بھی اپنے جاننے والوں میں کرنا چاہتے تھے، مگر سعیدہ اماں کی فیدہ اور اس کے گھر والوں کی بے پناہ تعریفوں کے بعد اور فیدہ اور اس کے گھر والوں سے خود ملنے کے بعد انہوں نے سعیدہ اماں کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، البتہ انہوں نے فیدہ کے بارے میں بہت چھان بین کروائی تھی اور پھر وہ بھی مطمئن ہو گئے تھے۔

فیدہ کے گھر والے ایک سال کے اندر شادی کرنا چاہتے تھے لیکن پھر اچانک انہوں نے چند ماہ کے اندر شادی پر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ یہ صرف ایک اتفاق ہی تھا کہ ڈاکٹر سبط علی اسی دوران اپنی کچھ مصروفیات کی وجہ سے اگلیڈ میں تھے جب فیدہ کے گھر والوں کے اصرار پر تار بننے لگی کہ وہ سعیدہ اماں فون پر ان سے مشورہ کرتی رہی تھیں اور ڈاکٹر سبط علی نے انہیں اپنا انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ وہ فوری طور پر وہاں سے نہیں آ سکتے تھے، البتہ انہوں نے کلثوم آجی کو وہاں پاکستان بھجوا دیا تھا۔

اس کی شادی کی تیاری کلثوم آجی اور سریم نے ہی کی تھی جو راہ پونڈی سے کچھ مقنوں کے لئے اپنی سرال لاہور آگئی تھی۔ ڈاکٹر سبط علی نے اس کی شادی کی تاریخ طے ہو جانے کے بعد فون پر اس سے طویل گفتگو کی تھی۔ ان کی تین بیٹیوں کی شادی ان کے اپنے خاندان میں ہی ہوئی تھی اور ان کے سرال میں سے کسی نے بھی جیڑ نہیں لیا تھا، مگر ڈاکٹر سبط علی نے بیٹیوں بیٹیوں کے جیڑ کے لئے مخصوص کی جانے والی رقم انہیں عفتنا دے دی تھی۔

"سازھے آٹھ سال پہلے جب آپ میرے گھر آئیں تھیں اور میں نے آپ کو اپنی بیٹی کہا تھا تو میں نے آپ کے لئے بھی کچھ رقم رکھ دی تھی۔ وہ رقم آپ کی مات ہے۔ آپ اسے ویسے لے لیں یا پھر میں مریم اور کلثوم سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کے جیڑ کی تیاری پر اسے خرچ کریں۔ سعیدہ اماں خواہش تھی کہ شادی ان کے گھر پر ہو ورنہ میں چاہتا تھا کہ یہ شادی میرے گھر پر ہو۔ آپ کے گھر پر....." انہوں نے اس سے کہا تھا۔

"مجھے اس بات پر بہت رنج ہے کہ میں اپنی پوتھی بیٹی کی شادی میں شرکت نہیں کر سکوں گا مگر شاید اس میں ہی کوئی بہتری ہے۔ میں جبر بھی آخری وقت تک کو شش کروں گا کہ کسی طرح شادی پر آ جاؤں۔" وہ ان کی باتوں کے جواب میں بالکل خاموش رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا نہ ہی یہ اصرار کیا تھا کہ وہ اپنی شادی پر اپنی رقم خرچ کرے گی اور نہ ہی یہ کہ وہ شادی ان کی رقم سے نہیں کرنا چاہتی۔ اس دن اس کا دل چاہا تھا ان کا ایک اور احسان لینے کو۔ وہ اس پر اتنے احسان کر چکے تھے کہ اب اسے ان احسانوں کی عادت ہونے لگی تھی۔ اسے صرف ان سے ایک گلہ تھا وہ آخر اس کی شادی میں شرکت کیوں

نہیں کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

فہد کے گھر والوں کا اصرار تھا کہ شادی سادگی سے ہو اور اس پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ اماں خود بھی شادی سادگی سے کرنا چاہتی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ فہد کے گھر والوں کا سادگی پر اصرار دراصل کچھ اور دو جہات کی بناء پر تھا۔

اس کا نکاح مہندی والی شام کو ہو گا تھا مگر اس شام کو سب پر کے قریب فہد کے گھر والوں کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی کہ نکاح اگلے دن یعنی شادی والے دن ہی ہو گا۔ سب تک اسے یا سعید و اماں کو کوئی اطلاع نہیں ہوا تھا کہ فہد کے گھر میں کوئی منہ مناد تھا۔ مہندی کی ویسے بھی کوئی بچی چوڑی تقریب نہیں تھی۔ صرف سعید و اماں کے بہت قریبی لوگ تھے یا پھر دو بچی ہمسائے۔ نکاح کی تقریب کے لئے جس کھانے کا بہانہ کیا گیا تھا وہ ان لوگوں کو سرور دیا گیا۔

شادی کی تقریب بھی سادگی سے مگر بر ہی ہوئی تھی۔ چار بیجے بارات کو آجاتا تھا اور پچھ بیجے کے قریب رخصتی تھی لیکن بارات آنے سے ایک گھنٹہ پہلے فہد کے گھر والوں نے سعید و اماں کو فہد کی روپوشی کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے اس رشتے سے معذرت کر لی۔

اماں کو چار بیجے تک اس سارے معاملے کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ فہد کے گھر سے عروسی لباس پہلے بھجوا دیا گیا تھا اور وہ اس وقت وہاں پہنچے تقریباً چھ بجے جب مریم اس کے کمرے میں پہنچی آئی، اس کا چہرہ دستا ہوا تھا۔ اس نے اماں کو کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہا، اس نے اماں کو فوری طور پر یہ نہیں بتایا تھا کہ فہد کے گھر والے نکاح کر کے جا چکے تھے۔ اس نے اماں سے صرف یہی کہا کہ فہد کے گھر والوں نے شادی کیسٹل کر دی ہے اس کے گھر میں کسی قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ یہ بتا کر بہت افراتفری میں کمرے سے نکل گئی۔ اماں نے کپڑے تبدیل کر لئے لیکن اس وقت اس کی چھٹی حس نے اسے اس پریشانی سے آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے مریم کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی اور باہر موجود لوگوں کے تاثرات نے اس کے تمام شبہات کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ سعید و اماں کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ کلثوم آنٹی، میون نور العین آیا۔ ہمسائے میں رہنے والی چند عورتیں، مریم اور سعید و اماں۔ مریم سعید و اماں کو پانی پھا رہی تھی۔ وہ بہت ظحال نظر آرہی تھیں۔ ایک لمبے کے لئے اس کے دل کی دھڑکن لگی۔ انہیں کیا ہوا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی سب کی نظریں اس پر پڑیں۔ میون آپاں کی طرف تیزی سے بڑھیں۔

”آہ آہ باہر آ جاؤ۔“ انہوں نے اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔

”اماں کو کیا ہوا ہے؟“ وہ ان کی طرف بڑھ گئی۔ کلثوم آنٹی نے کمرے میں موجود لوگوں کو باہر نکالنا شروع کر دیا۔ وہ سعید و اماں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”انہیں کیا ہوا ہے؟“ اس نے بے تابی سے مریم سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ سعید و اماں کا چہرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اماں کو دیکھ رہی تھیں مگر اسے یوں لگا جیسے وہ اس وقت اسے دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔ گھاس ہاتھ سے پٹاتے ہوئے انہوں نے اسے ساتھ لٹکا کر روٹنا شروع کر دیا۔

کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ صرف ڈاکٹر سیٹھ علی کی چلی وہاں پر تھی۔

”کیا ہوا ہے اماں؟ مجھے بتائیں۔“ اماں نے انہیں نرمی سے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”فہد نے اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر مگرے جا کر کسی اور کے ساتھ شادی کر لی ہے۔“ مریم نے دم دم آواز میں کہا۔ ”وہ لوگ کچھ دیر پہلے معذرت کرنے آئے تھے۔ وہ لوگ یہ رشتہ ختم کر گئے ہیں۔“ چند منٹ تک وہ بائبل سنا کر رہی تھی۔ خون کی گردش دل کی دھڑکن، چلتی ہوئی سانس۔ چند سیکنڈ سب کچھ جیسے رگڑ گیا تھا۔

”کیا میرے ساتھ یہ بھی ہوا تھا؟“ اس نے بے اختیار پوچھا۔

”کوئی بات نہیں اماں! آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ اس نے بڑی سہولت سے سعید و اماں کے آنسو صاف کئے۔ سب کچھ ایک بار پھر بھائی ہو گیا تھا سو اسے اس کی رنگت کے وہ فحش تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ سعید و اماں کو اس کی باتوں پر اور روٹا آیا۔

”یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں۔“ اماں نے انہیں بات مکمل کرنے نہیں دی۔

”اماں! چھوڑیں ناں۔ کوئی بات نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ لیت جائیں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔“ وہ انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میں تمہارے دل کی حالت کو سمجھ سکتی ہوں۔ میں تمہارے غم کو جانتی ہوں۔ آمنا امیری بچی مجھے معاف کر دو۔ یہ سب میری وجہ سے ہی ہوا ہے؟“ انہیں تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔

”مجھے کوئی غم نہیں ہے اماں! کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں بائبل ٹھیک ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سعید و اماں سے کہا۔

سعید و اماں یک دم روتے ہوئے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

اماں کسی سے کوئی بات کہے بغیر ایک بار پھر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے بیڈ پر تمام چیزیں اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے انہیں سینا شروع کر دیا۔ اس کی جگہ کو اور لڑکی ہوئی تو اس وقت وہاں بیٹھی رو رہی ہوئی مگر وہ خیر معلوم طور پر پرسکون تھی۔

"اگر میں جلال کے نہ ملے پر میر کر سکتی ہوں تو یہ تو پھر ایک ایسا شخص تھا جس کے ساتھ میری کوئی بند باہمی وابستگی نہیں تھی۔" اس نے اپنے عروسی لباس کو کھینچ کر تے ہوئے سوچا۔

"زادہ سے زیادہ کیا ہو گا، یہاں بھی لوگوں کے سامنے نظریں چرا کر اور سر جھکا کر چلنا پڑے گا۔"

کچھ ہاتھ اندر بے غزنی برداشت کرتی پڑے کی تو پھر کیا ہوا۔ اس میں میرے لئے کیا کیا ہے۔"

مریم کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے ساتھ چیزیں سینٹے لگی۔

"ایو کو فن کر دیا ہے۔" مس نے امام کو بتایا۔

وہ پہلی بار کچھ جھنجھلائی۔

"کیوں خود بخود تم لوگ انہیں تک کر رہے ہو۔ انہیں وہاں سکون سے رہنے دو۔"

"اچھا بڑا حادثہ ہو گیا ہے اور تم۔"

اس نے مریم کی بات کاٹ دی۔

"مریم میری زندگی میں اس سے بڑے حادثے ہو چکے ہیں۔ یہ کیا معنی رکھتا ہے۔ مجھے تکلیف پہنچے

کی عادت ہو چکی ہے۔ تم سیدہ اماں کو تلی دو۔ مجھے کچھ نہیں ہوا میں بالکل ٹھیک ہوں اور ایو کو بھی خود بخود

تک نہ کرو۔ وہ وہاں پر بیٹھان ہوں گے۔"

مریم کو کچھ نہیں سینٹے ہوئے وہ ہٹا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی۔ کٹھوم آئی، سیدہ اماں کے ساتھ یک دم اندر آ گئیں۔ امام کو

ان دونوں کے چہرے بہت عجیب لگے۔ کچھ دیر پہلے کے برعکس وہ دونوں بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔

اس کے کسی سوال سے پہلے کٹھوم آئی نے اسے سالار کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ دو دم بخود ان کی

باتیں سن رہی تھی۔

"اگر تمہیں اعراض نہ ہو تو تمہارا نکاح اس سے کر دیا جائے؟" آئی نے اس سے پوچھا۔

"سہیل علی اسے بہت اچھی طرح جانتے تھے، وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔" وہ اسے تسلی دینے کی کوشش

کر رہی تھیں۔

"اگر ایو اسے جانتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعراض نہیں۔ آپ جیسا بہتر سمجھیں کریں۔"

"اس کا ایک دوست تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔" وہ اس مطالبے پر کچھ حیران ہوئی تھی مگر اس

نے فرقان سے ملنے سے انکار نہیں کیا۔

"میرے دوست نے آٹھ نو سال پہلے ایک لڑکی سے نکاح کیا تھا۔ اپنی پسند سے۔"

وہ چپ چاپ فرقان کو بکھیتی رہی۔

"وہ آپ سے شادی پر تیار ہے، مگر وہ اس لڑکی کو طلاق دینا نہیں چاہتا۔ کچھ وجوہات کی بنا پر وہ

لڑکی اس کے ساتھ نہیں رہی لیکن وہ اب بھی اسے اپنے گھر میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو یہ بتا دوں تاکہ اگر آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہو تو اس بات کو سنیں ختم کر دیں گے

لیکن میں آپ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ شاید وہ لڑکی اسے کبھی بھی نہ ملے، آٹھ نو سال سے اس کا

میرے دوست کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ یہ ایک سو سو مئی میں آیا ہے، جس پر وہ اس کا انتظار کر رہا

ہے۔ ڈاکٹر سہیل علی صاحب آپ کو اپنی بیٹی سمجھتے ہیں اور اس حوالے سے آپ میری بہن کی طرح ہیں۔

اس وقت اس صورت حال سے نکلنے کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔ وہ لڑکی اسے

کبھی بھی نہیں ملے گی کیونکہ نہ تو وہ اسے پسند کرتی تھی نہ ہی آج تک اس نے اس سے کوئی رابطہ کرنے کی

کوشش کی ہے اور پھر اتنا لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔"

وہ اس کا بچہ دیکھتی رہی۔

"دوسری بیوی۔۔۔ تو امام باغش یہ ہے تمہاری وہ تمہارے جواب تک تم سے پوشیدہ تھی۔" اس

نے سوچا۔

"اگر ڈاکٹر سہیل علی اس شخص کے بارے میں یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کو میرے لئے منتخب

کر رہے ہیں تو ہو سکتا ہے میرے لئے یہی بہتر ہو۔ میں جلال کی بھی تو دوسری بیوی بننے کے لئے تیار تھی،

اس سے محبت کرنے کے باوجود۔۔۔ اور اس شخص کی بیوی بننے پر مجھے کیا اعتراض ہو گا جس سے مجھے محبت

بھی نہیں ہے۔"

اسے ایک بار پھر جلال یاد آیا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ان کی بیوی جب بھی آئے وہ اسے رکھ سکتے ہیں۔ میں بڑی خوشی

سے ان کو یہ اجازت دیتی ہوں۔" مدھم آواز میں کسی عامل کے بغیر اس نے فرقان سے کہا۔

پندرہ منٹ بعد اسے پہلا شاک اس وقت لگا تھا جب نکاح خواں نے اس کے سامنے سالار سکندر کا

نام لیا تھا۔

"سالار سکندر۔۔۔ ولد سکندر عثمان۔" اسے نکاح خواں کے منہ سے نکلنے والے الفاظوں سے پیسے

کرکٹ لگا تھا۔ دو نام ایسے نہیں تھے جو ہر شخص کے ہوتے۔

"سالار سکندر۔۔۔ سکندر عثمان؟ اور پھر اس ترتیب میں۔ کیا۔۔۔ یہ۔۔۔ شخص زندہ۔۔۔

ہے۔؟"

اس کے سر پر جیسے آسمان آگرا تھا۔ اس کے چہرے پر چادر کا گھونگٹ نہ ہو تا تو اس وقت اس

کے چہرے کے تاثرات نے سب کو پریشان کر دیا ہوتا۔ نکاح خواں اپنے کلمات دو بار دہرا رہا تھا۔

امام کاؤ بن مآؤف اور دل ڈوب رہا تھا اگر یہ شخص زندہ تھا تو۔۔۔ میں تو اب تک اس کے نکاح میں

بار اس نے بڑے شوق سے اپنے ہاتھوں پر نقش و نگار بنوائے تھے منہ صرف ہاتھوں پر بلکہ جڑوں پر بھی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے تھے۔ مثال کو اپنے گرد پھینٹتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو اس کے نیچے چھپایا۔

”ابجد سے جلال۔ جلال سے فہد۔ اور فہد سے سالار۔۔۔ ایک شخص کو میں نے رو کیا، دو نے مجھے رو کر دیا اور چوتھا شخص جو میری زندگی میں شامل ہوا وہ سب سے بدترین ہے۔ سالار سکندر۔“

اس کے اندر دھواں سا بھر گیا۔ وہ اپنے اسی طبع کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ کھار کا بیان، گلے میں لٹکی زنجیر، پرینڈ میں بندھے بال، چھتی ہوئی تھلیک آمیز لٹریس، دانتیں کال پر مذاق اڑاتی مسکراہٹ کے ساتھ پڑنے والا ڈھیل، کھانسیوں میں لٹکتے بیڑا زور برسلٹ، عورتوں کی قصویروں والی گنگلی جیز۔

وہ جیسے اس کے زندگی کے سب سے خوب صورت خواب کی سب سے بھیاںک تعمیر بن کر سامنے آیا تھا۔ اس کے دل میں سالار سکندر کے لئے ڈھیر ابر عزت تھی۔

”میں نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں مگر میں اتنی بری نہیں ہوں کہ تمہارے جیسا ہر مرد میری زندگی میں آئے۔“ اس نے کئی سال پہلے فون پر اس سے کہا تھا۔

”شاید اسی لئے جلال نے بھی تم سے شادی نہیں کی کیونکہ ایک مردوں کے لئے ایک عورتیں ہوتی ہیں، تمہارے جیسی نہیں۔“

سالار نے جواب کیا تھا۔ امام نے اپنے ہونٹ ہچکچاتے۔

”چاہے کچھ ہو جائے سالار! میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ تم واقعی مر جاتے تو زیادہ اچھا تھا۔“ وہ بڑبڑاتی تھی۔

اس وقت ایک لمحے کے لئے بھی اسے خیال نہیں آیا تھا کہ سالار سکندر نے کبھی اس پر کوئی احسان کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر سیٹھ علی جس رات پاکستان واپس آئے تھے اس رات امام ان کے گھر پر ہی قحی مگر رات کو اس نے ان سے سالار کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ مریم ابھی لاہور میں ہی تھی اس لئے وہ سب آپس میں خوش گپیوں میں مصروف رہے۔

انگلے دن بھی وہ سب اسی طرح اٹھتے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ امام کو ان تھانف کے بارے میں بتاتے رہے جو وہ انگلیٹڈ سے امام اور سالار کے لئے کر آئے تھے۔ امام خاموشی سے سنتی رہی۔

”سالار بھائی کو تو آج افکار ہی پر بلائیں۔“ یہ مریم کی تجویز تھی۔

ڈاکٹر سیٹھ علی نے مریم کے کہنے پر سالار کو فون کیا۔ امام تب بھی خاموش رہی۔

وہ وہو پھر کو نماز پڑھنے کے لئے باہر جانے لگی تو امام ان کے ساتھ باہر پورج تک آگئی۔

”ابو! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”ابھی؟“ ڈاکٹر سیٹھ علی قدرے حیرانی سے ہوئے۔

”نہیں، آپ نماز پڑھ آئیں پھر واپسی پر۔“

وہ کچھ دیر تشویش سے اسے دیکھتے رہے اور پھر کچھ کچے بلیئر باہر چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

”میں سالار سے ملاقات لینا چاہتی ہوں۔“ وہ مسجد سے واپسی پر اسے لے کر اپنی اسٹڈی میں آگئے تھے اور امام نے بلا کسی تمہید یا توقف کے اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔

”آمنہ!“ وہ دم بخور ہو گئے۔

”میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ وہ مسلسل فرش پر غور ہی قحی۔

”منہ! آپ کے ساتھ اس کی دوسری شادی ضرور ہے لیکن اس کی پہلی بیوی کا کوئی پتا نہیں ہے۔ فرقان بتا رہا تھا کہ تقریباً نو سال سے ان دونوں میں کوئی رابطہ نہیں ہے اور شادی بھی نہیں، صرف نکاح ہوا تھا۔“

ڈاکٹر سیٹھ علی، اس کے انکار کو پہلی شادی کے ساتھ جوڑ رہے تھے۔

”کون جانتا ہے وہ کہاں ہے، کہاں نہیں۔ نو سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔“

”میں اس کی پہلی بیوی کو جانتی ہوں۔“ اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا۔

”آپ؟“ ڈاکٹر سیٹھ علی کو یقین نہیں آیا۔

”دو میں ہوں۔“ اس نے پہلی بار سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

وہ بولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

”آپ کو یاد ہے نو سال پہلے میں ایک لڑکے کے ساتھ اسلام آباد سے لاہور آئی تھی جس کے بارے میں آپ نے مجھے بعد میں بتایا تھا کہ میری پہلی نے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے۔“

”سالار سکندر۔۔۔“ ڈاکٹر سیٹھ علی نے بے اختیار اس کی بات کاٹی۔

”یہ وہی سالار سکندر ہے؟“ امام نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جیسے شاک میں تھے۔ سالار سکندر سے ان کی فرقان کے توسط سے پہلی ملاقات امام کے گھر سے پہلے آنے کے چار سال بعد ہوئی تھی اور ان کے ذہن میں بھی یہ نہیں آیا کہ اس سالار کا امام سے کوئی تعلق ہو سکتا تھا۔ چار سال پہلے سے جاننے والے ایک نام کو وہ چار سال بعد ملنے والے ایک دوسرے شخص کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے اور کبھی دیتے اگر وہ چار سال پہلے والے سالار سے ہی ملتے تھے تو وہ جس شخص سے ملے تھے، وہ حافظ قرآن تھا۔ اس

ہوں۔ میرے خدا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر سیٹھ علی اسے کیسے جانتے ہیں۔ اس کے ذہن میں ایک فشار برپا تھا۔

"آمنہ۔ بیٹا ہاں کہو۔" سعید واماں نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"سالار سکندر جیسے شخص کے لئے ہاں۔؟"

اس کا دل کسی نے اپنی مٹھی میں لے کر بیٹھایا۔ وہ "ہاں" کے علاوہ اس وقت کچھ اور کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ خوف اور شاک کے عالم میں اس نے کاغذات پر دستخط کئے تھے۔

"کاش کوئی مٹھو ہو۔ یہ وہ سالار سکندر نہ ہو۔ یہ سب ایک اتفاق ہو۔" اس نے اللہ سے دعا کی تھی۔ ان سب لوگوں کے کمرے سے پہلے جانے کے بعد مریم نے اس کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

اس کے چہرے کا رنگ بالکل سفید ہو چکا تھا۔

"کیا ہو؟" مہر مری کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ وہ کچھ نہیں سکتی۔ وہ اس سے کیا کہہ رہی تھی۔ اس کا ذہن نہیں اور تھا۔

"مریم! Just do me a favour!" اس نے مریم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں نے نکاح کر لیا ہے، مگر میں آج رخصتی نہیں چاہتی۔ تم سعید واماں سے کہو کہ وہ آج میری رخصتی نہ کریں۔ پلیز۔"

مریم اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیوں؟"

"اس تم اس وقت مجھ سے کچھ نہ پوچھو، کچھ بھی نہیں۔ سعید واماں سے کہو میں ابھی رخصتی نہیں چاہتی۔"

اس کے لیے میں کچھ نہ کیا ضرور تھا کہ مریم اٹھ کر باہر نکل گئی۔ وہ بہت جلد ہی واپس آگئی۔

"امامہ رخصتی نہیں ہو رہی ہے۔ سالار ابھی رخصتی نہیں چاہتا۔"

امامہ کے ہاتھوں کی پکیا پٹ کچھ کم ہو گئی۔

"ابو کافون آنے والا ہے تمہارے لئے۔ وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے امامہ کو حیران اظہار دی۔ وہ فون سننے کے لئے دوسرے کمرے میں آگئی۔ انہوں نے کچھ دیر بعد اسے فون کیا تھا۔ وہ اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ امامہ کا دل رونے کو چاہا۔

"سالار بہت اچھا انسان ہے۔" وہ کہہ رہے تھے۔ "میری خواہش تھی کہ آپ کی شادی اسی سے ہو، مگر چونکہ آپ سعید واماں کے پاس رہ رہی تھیں اس لئے میں نے ان کی خواہش اور انتخاب کو مقدم سمجھا۔" وہ سانس لینے تک کے قابل نہیں رہی تھی۔

"مجھے یہ علم نہیں تھا کہ سالار نے اس سے پہلے کبھی شادی کی تھی مگر تھوڑی دیر پہلے فرحان نے مجھے اس کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ صرف ضرور نکاحا جانے والا کوئی نکاح تھا۔ فرحان نے مجھے تفصیل نہیں بتائی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت ابھی نہیں ہے۔ میرے جانے والوں میں سالار سے اچھا کوئی شخص ہوتا تو اس کے نکاح کے بارے میں جان لینے کے بعد میں آپ کی شادی سالار سے کرنے کے بجائے کہیں اور کر دیتا لیکن میرے ذہن میں سالار کے علاوہ اور کوئی آیا ہی نہیں۔ آپ خاموش کیوں ہیں آمنہ؟"

انہیں بات کرتے کرتے اس کا خیال آیا۔

"ابو! آپ واپس کب آئیں گے؟"

"میں ایک ہفتے تک آ رہا ہوں۔" ڈاکٹر سیٹھ علی نے کہا۔

"مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ مجھے آپ کو بہت کچھ بتانا ہے۔"

"آپ خوش نہیں ہیں؟" ڈاکٹر سیٹھ علی کو اس کے لہجے نے پریشان کیا۔

"آپ پاکستان آجائیں پھر میں آپ سے بات کروں گی۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

☆☆☆☆

اور ات کو سونے سے پہلے وہ خود کرنے کے لئے ہاتھ رو م میں تھی۔ وہ شوکر کے واپس آتے ہوئے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ صحن میں برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ گھر میں اس وقت کوئی مہمان نہیں تھا۔ وہ اور سعید واماں بیٹھ کر طرح سمجھتے۔ سعید واماں تھکاوٹ کی وجہ سے بہت جلد سو گئیں۔ وہ امامہ کے ساتھ گھر میں موجود کام نہ پٹتی رہی۔ سالار سے اس بیٹے کے قریب ملازم بھی اپنا کام ختم کر کے سونے کے لئے چلی گئی۔ وہ شادی کے کاموں کی وجہ سے جھپٹلے کچھ دنوں سے وہیں رہ رہی تھی۔ امامہ، جگن اور اپنے کمرے کے بہت سے چھوٹے چھوٹے کام پٹتی رہی۔

وہ جس وقت ان سب کاموں سے فارغ ہوئی اس وقت رات کے سالار سے بارہ بج رہے تھے۔ وہ بہت تھک چکی تھی مگر سونے سے پہلے وہ شوکر کے بعد صحن سے گزرتے ہوئے یک دم ہی اس کا دل اپنے کمرے میں جانے کو نہیں چاہا۔ وہ وہیں برآمدے میں بیٹھ گئی۔ صحن میں پہلے والی روشنیوں میں اس نے اپنے ہاتھوں اور کارڈیوں پر لگی ہوئی مہندی کو دیکھا۔ مہندی بہت اچھی رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کہیں تک سرخ تیل بولوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے کل بہت سالوں کے بعد پہلی بار بے شوق سے مہندی لگوائی تھی۔ اسے مہندی بہت پسند تھی۔ تہواروں کے علاوہ بھی وہ اکثر اپنے ہاتھوں پر مہندی لگاتی تھی حتیٰ مگر سالار سے آٹھ سال پہلے اپنے گھر سے نکل آنے کے بعد اس نے کبھی مہندی نہیں لگائی تھی۔ غیر محسوس طور پر ان تمام چیزوں سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی مگر سالار سے آٹھ سال کے بعد پہلی

کے انداز و اطوار اور گفتار میں کہیں اس ذہنی مرض کا کس نہیں پایا جاتا تھا جس کا حوالہ انہیں امام نے کئی بار دیا تھا۔ ان کا دھوکا کھانا ایک فطری امر تھا یا پھر یہ سب اسی طرح سے "ملے کیا گیا تھا۔"
 "اور آپ نے نو سال پہلے اس سے شادی کی تھی؟" وہ اب بھی بے یقینی کا شکار تھے۔
 "صرف نکاح۔" اس نے دم اڑا دیا تھا۔

"اور پھر اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ ڈاکٹر سیٹھ علی بہت دیر خاموش رہے تھے پھر انہوں نے ایک گہرا سانس لینے ہوئے کہا۔

"آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے تھا۔ امین! آپ کی مدد کر سکتا تھا۔"
 امام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، مجھے آپ پر اعتبار کر لینا چاہئے تھا مگر اس وقت میرے لئے یہ بہت مشکل تھا۔ آپ کو انداز ہو ہی نہیں ہے کہ میں اس وقت کس ذہنی کیفیت سے گزر رہی تھی یا پھر شاہ میری قسمت میں یہ آزمائش بھی لکھی تھی اسے آسانی تھا۔"
 وہ بات کرتے کرتے رکی، پھر اس نے تم آنکھوں کے ساتھ سر اٹھا کر ڈاکٹر سیٹھ علی کو دیکھا اور مسکرائے کی کوشش کی۔

"لیکن اب تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو آپ طلاق لینے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔"
 "نہیں، میں اب اس طلاق میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ امین! میں نے اس سے آپ کی شادی کروائی ہے۔" انہوں نے جیسے یاد دلایا۔

"اسی لئے تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔ آپ اس سے مجھے طلاق دلوا دیا۔"
 "لیکن کیوں، میں کیوں اس سے آپ کو طلاق دلوا دوں؟"

"کیونکہ... کیونکہ وہ ایک... اچھا آدمی نہیں ہے کیونکہ میں نے اپنی زندگی کو سالار جیسے آدمی کے ساتھ گزارنے کا نہیں سوچا۔ ہم دو مختلف دنیاؤں کے لوگ ہیں۔" وہ بے حد لبرداشت ہو رہی تھی۔
 "میں نے کبھی اللہ سے شکایت نہیں کی ابو! میں نے کبھی اللہ سے شکایت نہیں کی مگر اس بار مجھے اللہ سے بہت شکایت ہے۔"

وہ گلو گریے میں پڑی۔

"میں اتنی محبت کرتی ہوں اللہ سے۔ اور دیکھیں اللہ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میرے لئے دنیا کے سب سے برے آدمی کو چنا۔"

وہ اب رو رہی تھی۔

"لڑکیاں اتنا کچھ مانتی ہیں... میں نے تو کچھ بھی نہیں مانا، صرف ایک "صالح آدمی" مانا تھا۔

اس نے مجھے دو تک نہیں دیا۔ کیا اللہ نے مجھے کسی صالح آدمی کے قابل نہیں سمجھا۔" وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

"امام! وہ صالح آدمی ہے۔"

"آپ کیوں اسے صالح آدمی کہتے ہیں؟ وہ صالح آدمی نہیں ہے۔ میں اس کو جانتی ہوں، میں اس کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"میں بھی اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"آپ اس کو اتنا نہیں جانتے جتنا میں جانتی ہوں۔ وہ شراب پیتا ہے، وہ نفسیاتی مریش ہے کئی بار خودکشی کی کوشش کر چکا ہے۔ گریبان کھلا چھوڑ کر پھرتا ہے۔ عورت کو دیکھ کر اپنی نظر تک پٹنی رکھ نہیں جاتا اور آپ کہتے ہیں وہ صالح آدمی ہے؟"

"امام! میں اس کے ماضی کو نہیں جانتا، میں اس کے حال کو جانتا ہوں۔ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں کرتا جو آپ کہہ رہی ہیں۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرتا۔ وہ جھوٹا اور مکار ہے۔ میں اس کو جانتی ہوں۔"
 "وہ ایسا نہیں ہے۔"

"ابو! وہ ایسا ہی ہے۔"

"ہو سکتا ہے اسے واقعی آپ سے محبت ہو۔ وہ آپ کی وجہ سے تبدیل ہو گیا ہو۔"

"مجھے ایسی محبت کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس کی نظروں سے گھن آتی ہے۔ مجھے اس کے کھلے گریبان سے گھن آتی ہے۔ میں ایسے کسی آدمی کی محبت نہیں چاہتی۔ وہ بدل نہیں سکتا۔ ایسے لوگ کبھی نہیں بدلتے۔ وہ صرف اپنے آپ کو پھینکا لیتے ہیں۔"

"نہیں، سالار! ایسا کچھ نہیں کر رہا۔"

"ابو! میں سالار جیسے کسی شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ ہر چیز کا مذاق اڑاتا ہے۔ مذہب کا، زندگی کا، عورت کا۔ کیا ہے جسے وہ چٹکوں میں اڑاتا نہیں جاتا۔ جس شخص کے نزدیک میرا اپنے مذہب کو چھوڑ دینا ایک حماقت ہے، جس کے نزدیک مذہب پر بات کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے جو صرف "What is next to ecstasy؟" کا مطلب جاننے کے لئے خود کشیاں کرنا پھرتا ہو، جس کے نزدیک زندگی کا مقصد صرف میٹھ ہے۔ وہ میرے ساتھ محبت کرے بھی تو کیا صرف محبت کی بنیاد ہے میں اس کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہوں؟ میں نہیں گزار سکتی۔"

"سازھے آٹھ سال سے وہ آپ کے ساتھ قائم ہونے والے اس اقلیتہ رشتے کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ آپ کو آپ کے تمہارے نظریات اور عقائد کو جانتے ہوئے بھی اور وہ آپ کے انتظار میں

بھی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ آپ اس کے ساتھ رہنے پر تیار ہو جائیں گی۔ کیا ان ساری خواہشوں کے ساتھ اس نے اپنے اندر کچھ تبدیلی نہیں کی ہوگی؟“

”میں نے اس کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی۔ میں نے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔“ وہ اب بھی اپنی بات پر مصر تھی۔ ”مجھے حق ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ نہ رہوں۔“

”لیکن اللہ یہ کیوں کر رہا ہے کہ اس شخص کو بار بار آپ کے سامنے لا رہا ہے۔ دودھ آپ کا کھانا ہو اور دونوں دھوا اسی آدمی سے۔“

وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”میں نے زندگی میں ضرور کوئی گناہ کیا ہو گا، اس لئے میرے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔“ اس نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آمد! آپ کبھی ضد نہیں کرتی تھیں پھر اب کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ ڈاکٹر سید علی حیران تھے۔

”آپ مجھے مجبور کریں گے تو میں آپ کی بات مان لوں گی کیونکہ آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں تو آپ کی کسی بات کو رد کر ہی نہیں سکتی لیکن آپ اگر یہ کہیں گے کہ میں اپنی مرضی اور خوشی کے ساتھ اس کے ساتھ زندگی گزاروں تو وہ میں بھی نہیں کر سکوں گی۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ کتنا تعلیم یافتہ ہے، کتنے اچھے عمدے پر کام کر رہا ہے یا مجھے کیا دے سکتا ہے۔ آپ ایک ان پڑھ آدمی سے شادی کر دیتے لیکن وہ اچھا انسان ہو تا تو میں بھی آپ سے کوئی شکوہ نہیں کرتی لیکن سالار، وہ آنکھوں دیکھی کبھی ہے جس کو میں اپنی خوشی سے نہیں نگل سکتی۔ آپ سالار کے بارے میں وہ جانتے ہیں، جو آپ نے سنا ہے۔ میں اس کے بارے میں جو جانتی ہوں، وہ میں نے دیکھا ہے۔ ہم پندرہ سال ایک دوسرے کے ہمسائے رہے ہیں۔ آپ تو اس کو چند سالوں سے جانتے ہیں۔“

”آمنہ! میں آپ کو مجبور کبھی نہیں کروں گا۔ یہ رشتہ آپ اپنی خوشی سے قائم رکھنا چاہیں گی تو ٹھیک ہے لیکن صرف میرے کہنے پر اسے قائم رکھنا چاہو تو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ایک بار سالار سے مل لیں پھر بھی اگر آپ کا یہی مطالبہ ہو تو میں آپ کی بات مان لوں گا۔“

ڈاکٹر سید علی بے حد شجیعہ تھے۔

اسی وقت ملازم نے آکر سالار کے آنے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر سید علی نے اپنی کھڑی پر ایک نظر دوڑائی اور ملازم سے کہا۔

”ا نہیں اندر لے آؤ۔“

”یہاں؟“ ملازم حیران ہوا۔

”ہاں، یہیں پر۔“ ڈاکٹر سید علی نے کہا۔

امامہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں ابھی اس طرح اس سے بات نہیں کرنا چاہتی۔“

اس کا اشارہ اپنی ستورم آنکھوں اور سرخ چہرے کی طرف تھا۔

”آپ نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں ہے۔ آپ اسے دیکھ لیں۔“ انہوں نے دھمکے لہجے میں اس سے کہا۔

”یہاں نہیں، میں اندر کمرے میں سے اس کو دیکھ لوں گی۔“

وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے اسے بند نہیں کیا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ وہ کھلے دروازے سے لاؤنچ سے آنے والی روشنی اتنی کافی نہیں تھی کہ کمرے کے اندر اچھی طرح سے دیکھا جاسکے۔ وہ اپنے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

اپنے بیڈ پر بیٹھ کر اس نے اپنی آنکھوں کو مسلا۔ وہ جہاں بیٹھی تھی وہاں سے وہ لاؤنچ کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ نو سال کے بعد اس نے وہ کھلے دروازے سے لاؤنچ میں اس شخص کو نمودار ہوتے دیکھا جسے وہ ایک طویل عرصہ پہلے مردہ سمجھ چکی تھی جس سے زیادہ غرت اور کھن اسے کبھی کسی سے محسوس نہیں ہوئی تھی جسے وہ بدترین لوگوں میں سے ایک سمجھتی تھی اور جس کے کھانا میں وہ پچھلے کئی سالوں سے تھی۔

تقدیر کیا اس کے علاوہ کسی اور چیز کو کہتے ہیں؟

اپنی آنکھوں میں آخری دھند کو اس نے آنکھوں کی پوروں سے صاف کیا۔ ڈاکٹر سید علی اس سے گلے مل رہے تھے۔ اس کی پشت امامہ کی طرف تھی۔ اس نے معاملہ کرنے سے پہلے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھول اور ایک ریٹ سٹینڈ پر رکھا تھا۔ معاملے کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور تب پہلی بار امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

کھلا کر بیان، گلے میں لٹکتی زنجیریں، ہاتھوں میں لٹکتے بیٹرز، بندھے ہاتھوں کی پونی، وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ کریم کلر کے ایک سادہ شلوار سوٹ پہ ڈاسٹ پہنتے ہوئے تھا۔

”ہاں ظاہری طور پر بہت بدل گیا ہے۔“ اسے دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ کبھی..... اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ اب ڈاکٹر سید علی سے باتیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر سید علی اسے شادی کی مبارکباد دے رہے تھے۔ وہ وہاں بیٹھی ان دونوں کی آوازیں جسانی سن رہی تھی اور وہ ڈاکٹر سید علی کے استفسار پر انہیں امامہ کے ساتھ ہونے والے اپنے نکاح کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اپنے پچھتاوے کا اظہار کر رہا تھا اس طرح اس نے جلال کی شادی کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا۔ کس طرح اس نے طلاق کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا۔

"میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اتنی تکلیف کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ وہ میرے ذہن سے نکلتی ہی نہیں۔"

وہ مجھے کچھ میں ڈاکٹر سبط علی کو بتا رہا تھا۔

"بہت عرصے تو میں انارمل رہا۔ اس نے مجھ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے دعا کی تھی۔ یہ کہہ کر کہ میں ایک مسلمان ہوں، غم نبوت پر یقین رکھنے والا مسلمان۔ میں دھوکا نہیں دوں گا اسے اور میری لچکتی کی انتہا دیکھیں کہ میں نے اسے دھوکا دیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت کرتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کھڑے نکل آئی اور میں اس کا مذاق اڑاتا رہا۔ اسے پاگل سمجھتا اور کہتا رہا۔ جس رات میں اسے لاہور چھوڑنے آیا تھا، اس نے مجھ سے راستے میں کہا تھا کہ ایک دن مجھے ہر چیز کی سمجھ آجائے گی، جب مجھے اپنی اوقات کا پتہ چل جائے گا۔"

وہ مجھ سے انداز میں بڑھا تھا۔

"اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ مجھے واقعی ہر چیز کی سمجھ آگئی۔ اتنے سالوں میں، میں نے اللہ سے اپنی دعا اور توبہ کی ہے کہ۔"

وہ بات کرتے کرتے ڈگ گیا۔ امام نے اسے سینٹر فیمل کے شیشے کے کنارے پر اپنی انگلی پھیرتے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ آنسو خیز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بعض دفعہ مجھے لگتا تھا کہ شاید میری دعا اور توبہ قبول ہوگئی۔" وہ ڈکا۔

"مگر اس دن۔۔۔ میں آمد کے ساتھ نکاح کے کاغذات پر دستخط کر رہا تھا تو مجھے اپنی اوقات کا پتا چل گیا۔ میری دعا اور توبہ کچھ بھی قبول نہیں ہوئی۔ ایسا ہوتا تو مجھے امام ملتی، آمد نہیں۔ خواہش تو اللہ انسان کو وہ دے دیتا ہے کہ مجھوں کے علاوہ کوئی چیز مجھ پر راکر ہی نہیں سکتی۔ میری خواہش دیکھیں میں نے اللہ سے کیا مانگا۔ ایک ایسی لڑکی جس سے محبت ہے، وہ جو مجھے اصل مسلمان سمجھتی ہے، جسے میں نو سال سے دھوڑ رہا ہوں مگر اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔"

اور میں۔۔۔ میں خواہش لئے پھر رہا ہوں اس کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے کی۔ یوں جیسے وہ مل ہی جائے گی، یوں جیسے وہ مل گئی تو میرے ساتھ رہنے کو تیار ہی ہو جائے گی، یوں جیسے وہ جلال اللہ کو بھلا سکی ہوگی۔ ویوں جتنی اور ویوں جیسی عبادت کرنا تو شاید اللہ میرے لئے یہ مجھے کر دیتا ہے میرے جیسے آدمی کے لئے۔۔۔ میری اوقات تو یہ ہے کہ لوگ خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر بخشش مانگتے ہیں۔ میں وہاں کھڑا ہو کر بھی اسے ہی مانگتا رہا۔ شاید اللہ کو یہی برا لگے۔"

امام کے جسم سے ایک گرت گزرا تھا۔ ایک جھماکے کی طرح وہ خواب اسے یاد آیا تھا۔

"میرے اللہ!" اس نے اپنے دونوں ہاتھ۔۔۔ نواں پر رکھ لئے۔ وہ بے یقینی سے سالار کو دیکھ رہی

تھی۔ وہ خواب میں اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ "کیا وہ یہ شخص تھا، یہ جو میرے سامنے بیٹھا ہے۔ یہ آدمی۔۔۔؟" اس نے جب خواب میں اس آدمی کو جال سمجھا تھا مگر اسے یاد آیا تھا جلال دراز قد نہیں تھا، وہ آدمی دراز قد تھا۔ سالار سکندر دراز قد تھا۔ اس کے ہاتھ کا پتہ نہ تھے۔ جلال کی رنگت گندہ تھی۔ اس آدمی کی رنگت صاف تھی۔ سالار سکندر کی رنگت صاف تھی۔ اس نے خواب میں اس آدمی کے کندھے پر ایک تیسری چیز بھی دیکھی تھی۔ وہ تیسری چیز؟

اس نے کا پتہ ہاتھوں سے اپنے چہرے کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا۔

وہ مجھوں کے نہ ہونے کی باتیں کر رہا تھا اور۔۔۔ اندر ڈاکٹر سبط علی خاموش تھے۔ وہ کیوں خاموش تھے۔ یہ صرف وہ اور امام جانتے تھے، سالار سکندر نہیں۔ امام نے اپنی آنکھیں رگڑیں اور چہرے سے ہاتھ ہٹا دیے۔ اس نے ایک بار پھر ہتھ بٹے آنسوؤں کے ساتھ اس شخص کو دیکھا۔

نہ وہ وہی تھا نہ وہ وہی۔۔۔ صرف بچے دل سے توبہ کرنے والا ایک شخص تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ جلال اور اس کے درمیان کیا چیز آخر کھڑی ہوگئی تھی جس نے اتنے سالوں میں جلال کے لئے اس کی ایک بھی دعا قبول نہیں ہونے دی۔ کون سی چیز آخری وقت میں فہد کی جگہ اس کو لے آئی تھی۔

اس شخص میں کوئی نہ کوئی بات تو ایسی ہوگی کہ اس کی دعائیں قبول ہوئیں، میری نہیں۔ ہر بار مجھے پتا کہ اس کی طرف بھیجا گیا۔

اس نے نرم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس نے ڈاکٹر سبط علی کو اسے صاف آدمی کہتے سنا۔ وہ جانتی تھی وہ یہ بات کس کے لئے کہہ رہے تھے۔ وہ سالار کو نہیں بتا رہے تھے۔ وہ امام کو بتا رہے تھے۔ وہ اسے صاف قرار نہ بھی دیتے تھے تب بھی وہ اسے صاف ماننے پر مجبور تھی۔

اس کے پاس جو گواہی تھی وہ وہ نیا کی ہر گواہی سے بڑھ کر تھی۔ اس کے پاس جو ثبوت تھا اس کے بعد اور کسی ثبوت کی ضرورت تھی نہ گمانش۔ اسے کیا "بتا" دیا گیا تھا، اسے کیا "جنا" دیا گیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔۔۔ صرف وہی جان سکتی تھی۔

انٹاری کے بعد سالار اور ڈاکٹر سبط علی ملازم ہونے کے لئے چلے گئے۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر کچن میں چلی آئی۔ ان کے آنے سے پہلے اس نے ملازم کے ساتھ مل کر کھانا لگا دیا تھا۔ سالار کی وہی کھانے کے بعد بھی تھی اور اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر سبط علی جس وقت کچن میں آئے، اس وقت امام کچن کی میز پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی متورم تھیں مگر اس کا چہرہ پر سکون تھا۔

"میں نے سالار کو آپ کے بارے میں نہیں بتایا لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ اب جلد از جلد اس

سے مل کر بات کر لیں۔"

ڈاکٹر سید علی نے اس سے کہا۔

"مجھے اس سے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ پانی پیتے ہوئے رک گئی۔ "اسے اللہ نے میرے لئے منتخب کیا ہے اور میں اللہ کے انتخاب کو رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ اس نے کہا ہے کہ وہ تو یہ کر چکا ہے وہ نہ بھی کرنا دیکھا ہے تو ایسا پہلے محتاب بھی میں اس کے پاس پہنچ جاتی اگر میں جان لیتی کہ اسے اللہ نے میرے لئے منتخب کیا ہے۔"

دو اب وہ بارہ پانی پی رہی تھی۔ "آپ اس سے کہیں مجھے لے جائے۔"

☆.....☆.....☆

سالار جس وقت مغرب کی نماز پڑھ کر آیا تب تک امامہ فرقان کی بیوی کے ساتھ کھانے کی میز لگا چکی تھی۔ فرقان اور سالار کی عدم موجودگی میں اس بار آمد اصرار کر کے اس کے ساتھ کام کرنے لگی تھی۔

سالار کے آنے پر وہ اپنے قلیف جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ سالار اور امامہ نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں، مجھے بچوں کے ساتھ کھانا کھانا ہے۔ وہ بے چارے انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"آپ انہیں بھی یہیں بلا لیں۔" سالار نے کہا۔

"نہیں بھئی، میں اس قسم کی فضول حرکت نہیں کر سکتی۔ امامہ تو پھر جہیں پتا ہے یہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لے گی۔" نوشین نے اپنی بیٹی کا نام لیا۔

"سالار بڑا پیار کرتا ہے امامہ کے ساتھ۔"

فرقان کی بیوی نے امامہ سے کہا۔ ایک لمحے کے لئے سالار اور امامہ کی نظریں ملیں پھر سالار برق رفتاری سے مڑ کر فٹیل پر پڑے گلاس میں جگ سے پانی اٹھ لینے لگا۔ نوشین نے حیرانی سے امامہ کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا مگر وہ سمجھ نہیں پائیں۔

"تم لوگ کھانا کھاؤ۔ سحری بھی میں ملازم کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔ تم لوگ کچھ تجارت کرنا۔"

ان کے جانے کے بعد سالار دروازہ بند کر کے وہاں آ گیا۔ امامہ کو مخاطب کئے بغیر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا لیکن اس نے کھانا شروع نہیں کیا۔

امامہ چند لمحے کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر خود بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھ جانے کے بعد سالار نے اپنے سامنے پڑی پلیٹ میں چاول کھانا شروع کئے۔ کچھ چاول کھا لے لینے کے بعد اس نے دائیں ہاتھ سے چاولوں کا ایک چمچہ منہ میں ڈالا۔ چند لمحوں کے لئے امامہ کی نظروں کے دائیں ہاتھ سے

ہوتی ہوئی اس کے چہرے پر گئی۔ سالار اس کی طرف متوجہ نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا وہ کیا دیکھ رہی تھی۔

کھانا بہت خاموشی سے کھایا گیا۔ امامہ کو اس کی خاموشی اب بری طرح چھینے لگی تھی۔ آخر وہ اس سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا؟

"کیا مجھے دیکھ کر اتنا شاک لگا ہے؟ کیا پھر؟"

اسے اپنی جھوک غائب ہوتی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی پلیٹ میں موجود کھانا ختم کرنا مشکل لگنے لگا۔ سالار اس کے برعکس بہت اطمینان اور تیز رفتاری سے کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے جس وقت کھانا ختم کیا اس وقت عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔

امامہ کے کھانا ختم کرنے کا انتظار کئے بغیر وہ میز سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ امامہ نے اپنی پلیٹ پیچھے سرکا دی۔

وہ میز پر پڑے برتن سینے لگی جب اس نے سالار کو تھیل شدہ لباس میں برآمد ہوتے دیکھا۔ ایک بار پھر اسے مخاطب کئے بغیر وہ قلیف سے نکل گیا تھا۔ امامہ نے بچے ہوئے کھانے کو فریج میں رکھ دیا۔ برتنوں کو سبک میں رکھنے کے بعد اس نے میز صاف کی اور خود بھی نماز پڑھنے پہنچ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ عشاء کی نماز کے بعد جس وقت وہاں لوٹا اس وقت وہ کچن میں برتن دھونے میں مصروف تھی۔ سالار اپنے پاس موجود چائے سے قلیف کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ سالار لاؤنج سے گزرتے ہوئے رک گیا۔ کچن کے دروازے کی طرف امامہ کی پشت تھی اور وہ سبک کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا دوپٹہ لاؤنج کے صوفے پر پڑا ہوا تھا۔

سالار نے پہلی بار اسے سعیدہ اماں کے ہاں کچھ گھنٹے پہلے دوپٹے کے بغیر دیکھا تھا اور اب وہ ایک بار پھر اسے دوپٹے کے بغیر دیکھ رہا تھا۔

نوسال پہلے وضو کرتے دیکھتے ہوئے اسے پہلی بار امامہ کو اس چادر کے بغیر دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی جو وہ اوڑھے رکھتی تھی۔ نوسال بعد اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اس نے نوسال میں کئی بار اسے اپنے کمر میں "محسوس" کیا تھا مگر آج جب وہ اسے وہاں "دیکھ" رہا تھا تو وہ دم بخود تھا۔ اس کے سیاہ بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں جوڑے کی شکل میں پیلے گئے تھے اور سفید سویٹر کی پشت پر وہ یک دم بہت نمایاں ہو گئے تھے۔

نکاح ناسے پر آمد بینین ولدہ ہاشم بینین احمد کو اپنی بیوی کے طور پر تسلیم کرنے کا اقرار کرتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے بھی کوئی شک پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہی ہاشم بینین احمد کے نام نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ سعیدہ اماں کی "بیٹی" سے شادی کر رہا تھا۔ اس کا نام امامہ ہاشم بھی ہوتا تھا۔ ابھی اس کے

وہم و گمان میں بھی یہ کبھی نہیں آتا کہ یہ وہی امام تھی، کوئی اور نہیں اور اسے سیدہ اماں کے صحن میں کھڑا دیکھ کر اسے ایک لمحہ کے لئے بھی شبہ نہیں رہا تھا کہ اس کا نکاح کس سے ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

”تمہیں پتا ہے امام انوسال میں کتنے دن، کتنے گھنٹے، کتنے منٹ ہوتے ہیں؟“
خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی آواز میں جہم کو چھو دینے والی غصہ لگ گئی تھی۔ امام نے ہونٹ ہینچے ہوئے لپ بند کر دیا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ اگر مرنے کی کوشش کرتی تو اس کا کندھا صاف سرور اس کے سینے سے ٹکرا جاتا۔ اس نے مرنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ اپنی گردن کی پشت پر اس کے سانس لینے کی مدد آواز سن سکتی تھی۔ وہ اب اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ سبک کے کناروں پر ہاتھ جمائے وہ علی سے گرتے ہوئے چند آخری قہقروں کو دیکھتی رہی۔

”کیا ان سالوں میں ایک بار بھی تم نے میرے بارے میں سوچا؟ سالار کے بارے میں؟“

اس کے سوال مشکل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر چپ رہی۔

”What is next to ecstasy?“ وہ جواب کا انتظار کئے بغیر کہہ رہا تھا۔

”تم نے کہا pain تم نے ٹھیک کہا تھا pain۔“

وہ ایک لمحہ کے لئے رکا۔

”میں یہاں اس گھر میں ہر جگہ تمہیں اتنی بار دیکھ چکا ہوں کہ اب تم میرے سامنے ہو تو مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

امام نے سبک کے کناروں کو اور مضبوطی سے تھام لیا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو روکنے کے لئے وہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

”مجھے لگتا ہے، میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ آنکھیں کھولوں گا تو۔“

وہ رکا۔ امام نے آنکھیں بند کر لیں۔

”تو سب کچھ ہو گا، بس تم نہیں ہو گی۔ آنکھیں بند کروں گا تو۔“

امام نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے گال ہلکے رہے تھے۔

”تو بھی اس خواب میں دوبارہ نہیں جا پاؤں گا۔ تم وہاں بھی نہیں ہو گی، مجھے تمہیں ہاتھ لگاتے ڈر لگتا ہے۔ ہاتھ بڑھاؤں گا تو سب کچھ تحلیل ہو جائے گا جیسے پانی میں نظر آنے والا عکس۔“

وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ ذرا ہلکا تو اس کے ہونٹ اس کے بالوں کو چھو جاتے مگر وہ اسے چھو نہیں چاہتا تھا۔

”اور تم ہو کون امام۔۔۔۔۔ آف؟ میرا وہم؟ یا پھر کوئی مجروح؟“

”کیا میں تمہیں یہ بتاؤں کہ مجھے۔۔۔ مجھے تم سے۔“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ امام کی آنکھوں سے نکلنے والا پانی اس کے چہرے کو بھگو تا ہوا اس کی خورزی سے لپک رہا تھا۔ وہ کیوں رکھا تھا، وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے زعم کی میں کبھی خاموشی اتنی بڑی نہیں لگی تھی جتنی اس وقت لگی تھی۔ وہ بہت دیر خاموش رہا۔ اتنی دیر کہ وہ اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی اور جب اسے پتا چلا وہ کیوں خاموش ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی بیگانہ تھا۔

وہ دونوں زعم کی میں پہلی بار ایک دوسرے کو اتنے قریب سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے قریب سے کہ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں نظر آنے والے اپنے اپنے عکس کو بھی دیکھ سکتے تھے پھر سالار نے اس سے نظریں چرانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اپنے ہاتھ سے اپنے چہرے کو صاف کر رہا تھا۔

”تم مجھ سے اور میں تم سے کیا چھپائیں گے سالار! سب کچھ تو جانتے ہیں ہم ایک دوسرے کے بارے میں۔۔۔۔۔“

امام نے مدھم آواز میں کہا۔ سالار نے ہاتھ روک کر سر اٹھایا۔

”میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ میں آنسوؤں کو صاف کر رہا ہوں تاکہ تمہیں اچھی طرح دیکھ سکوں۔ تم پھر کسی دھند میں لپی ہوئی نظر نہ آؤ۔“

وہ اس کے کان کی لو میں لٹکے والے اُن موتیوں کو دیکھ رہا تھا، جنہیں اس نے بہت سال پہلے بھی دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا آج وہ بہت قریب تھے۔ ایک بار اُن موتیوں نے اسے بہت ڈرایا بھی تھا۔ وہ موتی آج بھی راز دار ہے تھے، اپنے ہر ہلکے دے کے ساتھ وہ ہم سے جنش۔۔۔ جنش سے وہم بننے ہوئے۔

وہ اپنے کانوں کی لوؤں پر اس کی ٹھوس ٹھوس کر رہی تھی۔

”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی تمہارے اتنے قریب کھڑے ہو کر تم سے بات کر رہا ہوں گا۔“

وہ مسکرایا تھا لیکن تم آنکھوں کے ساتھ۔ امام نے اس کے دائیں گال میں چند لمحوں کے لئے اُبھرنے والا گڑھا دیکھا۔ مسکراتے ہوئے اس کے صرف ایک گال میں ڈھیل پڑا تھا، دائیں گال میں اور نو سال پہلے امام کو اس ڈھیل سے بھی بڑی جھجھلاہٹ ہوتی تھی۔ نو سال کے بعد اس ڈھیل نے پہلی بار عجیب سے انداز میں اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔

”میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی تمہارے کان میں موجود ایر رنگ کو ہاتھ لگاؤں گا اور تم۔۔۔۔۔“

وہ اب اس کے دامن کان میں بلکے رہتے ہوئے موتی کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے روک رہا تھا۔
”اور تم..... تم مجھے ایک تھپڑ نہیں بھیج رہی۔“

امامہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ سالار کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اگلے لمبے وہ سلیپ
چہرے کے ساتھ بے اختیار ہنسی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

”جہیں ابھی بھی وہ تھپڑ یاد ہے۔ وہ ایک reflex action تھا اور کچھ نہیں۔“

امامہ نے ہاتھ کی پشت سے اپنے ہیکے ہوئے گالوں کو صاف کیا۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ ذہیل ایک
بار پھر نمودار ہوا۔ اس نے بہت آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھ قلم لے۔

”تم جانتا چاہتے ہو کہ میں اتنے سال کہاں رہی، کیا کرتی رہی، میرے بارے میں سب کچھ؟“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ رہا تھا۔

”میں کچھ جانتا نہیں جانتا، کچھ بھی نہیں۔ تمہارے لئے اب میرے پاس کوئی اور سوال نہیں ہے۔

میرے لئے کافی ہے کہ تم میرے سامنے کھڑی ہو، میرے سامنے تو ہو۔ میرے جیسا آدمی کسی سے کیا
تحقیق کرے گا۔“

امامہ کے ہاتھ سالار کے سینے پر اس کے ہاتھوں کے نیچے دبے تھے۔ پانی نے اس کے ہاتھوں کو
سرد کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ کیوں اس کے ہاتھ اپنے سینے پر رکھے ہوئے تھا۔ لا شعوری طور پر وہ اس

کے ہاتھوں کی غنڈک ٹھٹھ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی بڑا کسی بچے کے سرد
ہاتھوں میں حرارت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے سینے پر ہاتھ رکھے وہ سوئر کے نیچے سے اس کے دل کی دھڑکن کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ

بے ترتیب تھی۔ تیز۔ پر جوش..... کچھ کہتی ہوئی..... کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہوئی..... اس کے سینے پر

ہاتھ رکھے وہ اس وقت اس کے دل تک پہنچی ہوئی تھی، اسے شبہ نہیں تھا۔

وہ شخص اس سے محبت کرتا تھا، کیوں کرتا تھا؟ اس کا جواب سامنے کھڑا ہوا شخص بھی نہیں دے سکتا

تھا۔ اس نے اس شخص سے یہ سوال ابھی نہیں تھا۔ سالار کی آنکھیں پر سکون انداز میں بندھنیں نہ بھی

ہوتیں جب بھی ان آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اب اسے کوئی الجھن نہیں ہو رہی تھی۔ ان آنکھوں میں جو کچھ

نوسال پہلے تھا اب نہیں تھا۔ جواب تھا وہ نوسال پہلے نہیں تھا۔

”ہم کیا ہیں، ہماری تھمتیں کیا ہیں، کیا چاہتے ہیں، کیا پاتے ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر میری آنکھیں لگی تھیں۔

”جلال انصر..... اور سالار سکندر..... خواب سے حقیقت..... اور حقیقت سے خواب..... زندگی

کیا اس کے سوا اور کچھ ہے؟“

امامہ نے آہستگی سے اپنے ہاتھ کھینچے۔ سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک
ٹاپے کے لئے آجمرنے والے تار کو صرف وہی پہچان سکتی تھی۔

پریشانی، اضطراب، خوف..... تینوں میں سے کچھ تھا۔ امامہ نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا

بھر سیاہ سوئر کے گلے سے باہر نکلے ہوئے سفید کارڈ کو دیکھا۔ کچھ کہے بغیر بہت نرمی کے ساتھ اس کی

گردن کے گرد بازو دھاکا کرتے ہوئے اس نے سالار کے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے

پہلی بار سالار کے کولون کی ہلکی سی مہک کو محسوس کیا۔ نوسال پہلے وہ بہت تیز جسم کے پر فوجر استعمال

کر رہا تھا۔ نوسال بعد.....؟

سالار بالکل ساکت تھا۔ یوں جیسے اسے یقین نہیں آیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس نے بڑی نرمی کے

ساتھ امامہ کے گرد اپنے بازو پھیلائے۔

”I am honoured“ (یہ میرے لئے اعزاز ہے)۔

امامہ نے اسے مدح آمیز میں کہتے سنا۔ وہ اس کی بند آنکھوں کو نرمی سے چوم رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ سالار کے ساتھ خانہ کعبہ کے گھن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار اس کے دائیں جانب تھا۔ وہ وہاں

ان کی آخری رات تھی۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے وہاں تھے۔ کچھ دن پہلے انہوں نے جہد ادا کی تھی۔ وہ

جہد کے نوافل کے بعد وہاں سے چلے جایا کرتے تھے۔ آج نہیں گئے، آج وہیں بیٹھے رہے۔ ان کے اور

خانہ کعبہ کے دروازے کے درمیان بہت لوگ تھے اور بہت قاصد تھا۔ اس کے باوجود وہ وہاں جہاں

بیٹھے تھے وہاں سے وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو بہت آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔

وہاں بیٹھنے وقت ان دونوں کے ذہن میں ایک ہی خواب تھا۔ وہ اس رات کو اب اپنی آنکھوں

سے دیکھ رہے تھے۔ حرم پاک کے فرش پر اس جگہ گھٹنوں کے تل بیٹھے ہوئے سالار سورہ رحمن کی

تلاوت کر رہا تھا۔ امامہ جان بوجھ کر اس کے برابر میں بیٹھنے کی بجائے دائیں جانب اس کے عقب میں بیٹھ

گئی۔ سالار نے تلاوت کرتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے اپنے برابر

والی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ امامہ اٹھ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔ سالار نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اب

خانہ کعبہ کے دروازے پر نظر جمائے ہوئے تھا۔

امامہ بھی خانہ کعبہ کو دیکھنے لگی۔ وہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہوئے اس خوش الحان آواز کو سنتی رہی جو اس

کے شوہر کی تھی۔ قبای الااء دیکھا نکلا بہان۔

اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

”تم جو کچھ کر رہی ہو امامہ! تم اس پر بہت بچھتاؤ گی۔ تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔“

نوسال پہلے پانچ مہینے میں اس کے چہرے پر تجھمارے ہونے کہا تھا۔

"ساری دنیا کی ذلت اور رسوائی، بدنامی اور بھوک تمہارا مقدر بن جائے گی۔"

انہوں نے اس کے چہرے پر ایک اور تجھمارا۔

"تمہارے جیسی لڑکیوں کو اللہ ذلیل و خوار کرتا ہے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا۔"

امام کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ایک وقت آئے گا جب تم دو بارہ ہمارے طرف لو لوگی۔ منت ساجت کرو گی۔ گونگڑاؤ گی۔ تب

بہر چھیں و حکمران دیں گے۔ جب تم جیج جیج کر اپنے منہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگو گی۔ کیونکہ کہ میں غلامی تھی۔"

امام انگلیاں آنکھوں سے مسکرائی۔

"میری خواہش ہے بابا! اس نے زہر لب کہا۔" کہ زندگی میں ایک بار میں آپ کے سامنے

آؤں اور آپ کو بتا دوں کہ دیکھ لیجئے، میرے چہرے پر کوئی ذلت، کوئی رسوائی نہیں ہے۔ میرے اللہ

اور میرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری حفاظت کی۔ مجھے دنیا کے لئے تمنا نہیں بنایا، نہ دنیا

میں بنایا ہے نہ ہی آخرت میں کسی میں رسوائی کا سامنا کروں گی اور میں آج اگر یہاں موجود ہوں تو

صرف اس لئے کیونکہ میں سیدھے راستے پر ہوں اور یہاں بیٹھ کر میں ایک بار پھر اقرار کرتی ہوں کہ محمد

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ ان کے بعد کوئی پیغمبر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا۔ میں

اقرار کرتی ہوں کہ وہی پیر کامل ہیں۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ ان سے کامل ترین انسان دوسرا کوئی نہیں۔

ان کی نسل میں بھی کوئی ان کے برابر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا اور میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے

آنے والی زندگی میں بھی بھی اپنے ساتھ شریک کروائے نہ ہی مجھے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے برابر کسی کو کھڑا کرنے کی جرأت ہو۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ زندگی مجھے سیدھے راستے پر

رکھے۔ بے شک میں اس کی کسی نعمت کو نہیں جھٹا سکتی۔"

سالار نے سورہ رحمن کی تلاوت ختم کر لی تھی۔ چند لمحوں کے لئے وہ کاکھڑکھڑے میں چلا گیا۔

سجدے سے اٹھنے کے بعد وہ کھڑا ہوتے ہوئے ٹک گیا۔ امام آنکھیں بند کئے دونوں ہاتھ پھیلائے دعا

کر رہی تھی۔ وہ اس کی دعا ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ امام نے دعا ختم کی۔

سالار نے اٹھنا چاہا، وہ اٹھ نہیں سکا۔ امام نے بہت نرمی کے ساتھ اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ

خیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ناکر جس سے محبت ہوئی وہ نہیں ملا۔ ایسا کیا ہے کیوں ہوتا ہے؟"

رات کے اس پچھلے پہر نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے وہ بیٹھیں آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے

ساتھ کہہ رہی تھی۔

"محبت میں صدق نہ ہو تو محبت نہیں ملتی۔ نوسال پہلے میں نے جب جلال سے محبت کی تو پورے

صدق کے ساتھ کی۔ دعائیں، گھنٹے، منٹیں، کیا تھا جو میں نے نہیں کر چھوڑا مگر وہ مجھے نہیں ملا۔"

دو گھنٹوں کے مل بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی نرم گرفت میں اس کے کھٹنے پر

دھرا تھا۔

"پتا ہے کیوں؟ کیونکہ اس وقت تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے تھے اور تمہاری محبت میں میری

محبت سے زیادہ صدق تھا۔"

سالار نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی ٹھوڑی سے چپکے والے آنسو اب اس کے ہاتھ پر گر رہے

تھے۔ سالار نے دوبارہ امام کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"مجھے اب لگتا ہے کہ اللہ نے مجھے بہت پیار سے بنایا تھا۔ وہ مجھے کسی ایسے شخص کو سوچنے پر تیار نہیں

تھا جو میری ناقدری کرے، تاہم مجھے ضائع کرنا اور جلال، وہ میرے ساتھ جیسا سبک چھوڑتا۔ وہ میری قدر رکھتی

نہ کرتا۔ نوسال میں اللہ نے مجھے ہر حقیقت بتا دی۔ ہر شخص کا اندر اور باہر دکھایا اور پھر اس نے مجھے

سالار سکندر کو سونپا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ شخص جو جس کی محبت میں صدق ہے۔ تمہارے علاوہ اور

کون تھا جو مجھے یہاں لے آتا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا تم نے مجھ سے پاک محبت کی تھی۔"

وہ بے حس و حرکت اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب اس کے ہاتھ کو نرمی سے چومتے ہوئے باری باری

اپنی آنکھوں سے لگا رہی تھی۔

"مجھے تم سے کتنی محبت ہو گی، میں نہیں جانتی۔ دل پر میرا اختیار نہیں ہے مگر میں جتنی زندگی

تمہارے ساتھ گزاروں گی تمہاری وفادار اور فرمانبردار رہوں گی۔ یہ میرے اختیار میں ہے۔ میں

زندگی کے ہر مشکل مرحلے، ہر آزمائش میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ میں ایتھے دونوں میں تمہاری

زندگی میں آئی ہوں۔ میں برسے دونوں میں بھی چھیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی اس نے جتنی نرمی سے اس کا

ہاتھ پکڑا تھا اس نرمی سے چھوڑ دیا۔ وہ اب سر جھکانے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو صاف کر رہی تھی۔

سالار کچھ کہے بغیر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ خان کعبہ کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ اسے زمین پر

اتاری جانے والی صالح اور بہترین عورتوں میں سے ایک بخش دی گئی تھی۔ وہ عورت جس کے لئے

نوسال اس نے ہر وقت اور ہر جگہ دعا کی تھی۔

کیا سالار سکندر کے لئے نعمتوں کی کوئی حد رہ گئی تھی اور اب جب وہ عورت اس کے ساتھ تھی تو

اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھاری ذمہ داری اپنے لئے لے بیٹھا تھا۔ اسے اس عورت کا گھٹیل بنانا پڑا

تھا، جو نیکی اور پارسائی میں اس سے کہیں آگے تھی۔

امام اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ تھام کر وہاں سے جانے کے لئے قدم

بڑھا دیئے۔ اسے اس عورت کی حفاظت سونپ دی گئی تھی، جس نے اپنے اختیار کی زندگی کو اس کی طرح کسی آلائش اور غلاظت میں نہیں ڈبویا، جس نے اپنی تمام جسمانی اور جذباتی کمزوریوں کے باوجود اپنی روح اور جسم کو اس کی طرح نفس کی بھیٹ نہیں چڑھایا۔ اس کا ہاتھ تھامے قدم بڑھاتے ہوئے اسے زندگی میں پہلی بار پار سائی اور تقویٰ کا مطلب سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے تھی۔ وہ حرم پاک میں بیٹھے اور چلتے لوگوں کی قطاروں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔

وہ اپنی پوری زندگی کو جیسے فلم کی کسی اسکرین پر چلتا دیکھ رہا تھا اور اسے بے تحاشا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ گناہوں کی ایک لمبی فہرست کے باوجود اس نے صرف اللہ کا کرم دیکھا تھا اور اس کے باوجود اس وقت کوئی اس سے زیادہ اللہ کے غضب سے خوف نہیں کھا رہا تھا۔ وہ شخص جس کا آئی کیو لیول ۱۵۰+ تھا اور جو فوٹو گرافک میموری رکھتا تھا نو سال میں جان گیا تھا کہ ان دونوں چیزوں کے ساتھ بھی زندگی کے بہت سارے مقامات پر انسان کسی اندھے کی طرح ٹھوکر کھا کر گر سکتا تھا۔ وہ بھی گرا تھا بہت بار..... بہت مقامات پر..... تب اس کا آئی کیو لیول اس کے کام آیا تھا نہ اس کی فوٹو گرافک میموری۔

ساتھ چلتی ہوئی لڑکی وہ دونوں چیزیں نہیں رکھتی تھی۔ اس کی مٹھی میں ہدایت کا ایک ننھا سا جگنو تھا اور وہ اس جگنو سے اُمدتی روشنی کے سہارے زندگی کے ہر گھپ اندھیرے سے کوئی ٹھوکر کھائے بغیر گزر رہی تھی۔

